ادارہ مصنفین پاکستان (پاکستان رائٹرز گلڈ)

حلقہ کراچی

قیمت ۳ روپے

ہوٹل ایکسلیر کراچی ۳

جلد ۱ شمارہ ۲

ہمارا منشور

"ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو اور وطن کی ترقی [illegible]
اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں۔ ہم ان حقوق انسانی پر ایمان رکھتے ہیں جن کا [illegible]
متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے [illegible]
حقوق کے حامی ہیں جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے
ملی ہیں، پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس [illegible]
جو صداقت کی عکاسی، حب وطن کی قدروں کی نشوونما، بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور
انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کما حقہ، آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ [illegible]
اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے
کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کے لئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم
ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں اور روحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے ہم علم
و سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بروز ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور)

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، صدر پاکستان

آزادیٔ اظہار

"..... میں سمجھتا ہوں کہ آپ جیسے ذی علم حضرات کو کسی نصیحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے لیکن اگر
ایک پڑھنے والے کی حیثیت سے مجھے بھی کوئی مشورہ پیش کرنے کی اجازت دی جائے تو میں یہ مشورہ دوں گا:

"اپنے ذہنوں کو آزاد رکھ کر سوچئے، اپنے اظہار میں آزادی سے کام لیجئے اور اپنے
گردوپیش سے آزادانہ تاثر قبول کیجئے۔ اپنے احساس کی باریکی کو خوف یا مصلحت
کے ہاتھوں کند نہ ہونے دیجئے۔ اپنی طرف سے میں آپ کو اس یقین دہانی سے [illegible]
پیش کر سکتا ہوں کہ والٹیر کے قول کے مطابق یہ ممکن ہے کہ میں آپ کی کسی بات سے
اختلاف کروں یا اس پر احتجاج بھی کروں، لیکن میں آپ کے حق [illegible]
ضرور کروں گا تا وقتیکہ آپ کی بات خود مادرِ وطن کی [illegible]

(ہم قلم میں شائع ہونے والی ہر تحریر کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ ان تحریروں کے حقوق بحق مصنفین محفوظ رہتے ہیں)

ترتیب

(حصہ اوّل)

اُدبی تخلیقات

ابتدائیہ

(حصہ دوم)

گلڈ کے دو سال

اِداریہ

اب سے پندرہ مہینے پہلے گلڈ کی کراچی شاخ نے چار صفحے کا ایک پندرہ روزہ "اطلاعیہ" شروع کیا تھا جو ٹائپ پر چھپتا تھا — اور کبھی کبھی چھپتا ہی نہ تھا۔

"ہم قلم" نام رکھنے پر بھی بہت سے اعتراضات ہوئے تھے۔ کچھ بزرگوں نے کہا کہ "ہم قلم" کی اور بات ہے لیکن "ہم قلم" غلط نام ہے اور اگر یہی نام رکھا جائے تو اس کی املا یوں ہونی چاہیے "ہمقلم"۔

پچھلے سال گلڈ کی مرکزی عاملہ نے فیصلہ کیا کہ گلڈ کو ادبی پرچے نکالنے چاہئیں اور ہمیں مالی وسائل کے سلسلے میں ضروری مدد بھی دی۔

اب اگست سے "ہم قلم" ادبی پرچے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ آج "ہم قلم" کی اشاعت کئی پرانے ادبی پرچوں سے زیادہ ہے۔ اس کی بدیہی وجہ یہ ہے کہ یہ ادیبوں کا اپنا پرچہ ہے اور اس میں سب ذمہ دار کارکن اعزازی ہیں۔

ہم قلم کی دو خصوصیات ہیں۔

ایک تو یہ کہ ہم ہر چھپنے والے فن پارے کا معاوضہ پیش کرتے ہیں۔ اس طرح ہم نے اس روایت کو محکم کیا ہے کہ ادبی کاوشوں کا کچھ نہ کچھ اعزازیہ ضرور ملنا چاہیئے۔ ہمیں احساس ہے کہ ہماری شرح ابھی کم ہے لیکن یہ بہت جلد بڑھا دی جائے گی۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہم صرف مشاہیر و اکابر کی تخلیقات کا انتظار نہیں کرتے۔ مشاہیر اور اکابر کی تو ان کی بھی مانگ ہے اور وہ "ہم قلم" کیا ہر جگہ چھپ سکتے ہیں۔ ہم نئے لکھنے والوں اور بالکل نئے لکھنے والوں کی دل شکنی نہیں کرتے کیونکہ ہمارا مقصد صرف اچھی مارکیٹ حاصل کرنا نہیں بلکہ تخلیقی ادب کو ہمت افزائی کے ذریعے فروغ دینا بھی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم اردو داں طبقے کو مرکزی گلڈ کے لائحہ عمل اور نصب العین سے روشناس کراتے رہتے ہیں۔ مرکز نے "ہم قلم" کے ذریعے چند اہم معرکے سر کئے ہیں۔ یہ معرکے ہر زبان کے ادیبوں کے مفاد میں ہوتے ہیں۔

ہم نے "ہم قلم" کے ذریعے اردو کے لئے کام کرنے کا بیڑا بھی اٹھایا ہے۔ ہمارے اداریے اس کے گواہ ہیں کہ ہم نے اس معاملے میں کن کن عناصر سے ٹکر لی ہے۔

ہم سے بار بار ہماری پالیسی کے بارے میں پوچھا جاتا ہے اور ہم اس کا جواب بھی دے چکے ہیں۔ "ہم قلم"

گلڈ کی ایک خاص تاریخ ہے اور گلڈ کی بنیادی پالیسی پر کاربند رہے گا۔ گلڈ اپنے اراکین کو ان کے موضوعات اور طریق اظہار کے بارے میں کوئی ہدایات جاری نہیں کرتا۔ گلڈ "ادب" کو مقدم رکھتا ہے نظریات اور عقائد سے علاقہ نہیں رکھتا ہاں وہ ایک قومی ادارہ ہونے کے سبب پاکستان کے خلاف کسی تحریک کی ہمت افزائی نہیں کرسکتا اور اگر ادب کی سطح پر کبھی ایسی صورت حال پیش آئی تو اسے سختی کے ساتھ روک دے گا۔ خدا کا فضل ہے کہ اب تک ایسی صورت حال پیش نہیں آئی ہے۔

ظاہر ہے کہ ادب اور صحافت میں فرق ہوتا ہے اس لئے ہم سے یہ توقع رکھنی بے کار ہے کہ ہم صحافتی سطح پر کوئی ادبی تحریک چلائیں گے۔ ہم ادیبوں اور ادب کی فلاح سے متعلق ہیں ادب کی تعریف کے اجارہ دار نہیں ہیں نہ کسی کو مانتے ہیں۔ ہمارے ملک میں خدا کے فضل سے بہت سے نقاد اور دانشور ہیں جو یہ کام کرتے ہیں جن کے مابین بہت سے نزاعات رہتے ہیں۔ گلڈ چونکہ تمام مختلف الخیال ادیبوں کا مشترکہ محاذ ہے، اس لئے ہم کسی ایک فرد یا مکتبہ خیال کی کیسے طرف داری کرسکتے ہیں۔

جو لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں وہ ایک بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کسی آزاد ملک میں دانشوروں کا کوئی ادارہ فنون لطیفہ کے بارے میں "فیصلے" کرنے کا اختیار حاصل نہیں کرسکتا اور دُور کیوں جائیے خود ہمارے برصغیر کی تاریخ شاہد ہے کہ جب ایسا قدم اٹھایا گیا وہ تحریک وہ ادارہ ناکام ہوگیا۔ تخلیقی قوتیں کوئی خارجی حاکمیت کوئی پابندی برداشت نہیں کرسکتیں —— جن ملکوں میں ایسی کوششیں کامیاب ہوئیں وہاں ادب پیدا ہونا بند ہوچکا ہے۔

جہاں تک ادب کے بارے میں بنیادی باتیں طے کرنے کا تعلق ہے وہ سب جانتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ ادب اور صحافت اور عام تحریر میں فرق ہوتا ہے سب جانتے ہیں کہ ادب ایک فن لطیف ہے، انسانی فلاح و بہبود کے لئے ایک مفید ادارہ۔ سب جانتے ہیں کہ ادب کی سمتیں مقرر کرنا ناممکن بات ہے اور یہ کہ ادب زندگی جیسا بلکہ اس سے بھی زیادہ وسیع، پیچیدہ اور عظیم مضمون ہے۔

ہم احتساب کا کام نہیں کرتے۔ ہم تبلیغ کا کام بھی نہیں کرتے۔ اگر ہماری تبلیغ ہمارا نصب العین کچھ ہے تو اوّلاً ہمارے وطن کی سالمیت ترقی اور عظمت ہے اور دوئم عام انسانوں کی عظمت اور خوش حالی جس کے لئے ہم ایک چھوٹے سے پیمانے پر مخلصانہ کام کرتے ہیں نعرے نہیں لگاتے۔

اس شمارے میں ایک حصہ ہم نے مرکزی ادارے کے لئے وقف کر دیا ہے جس میں ادارے کی تاسیس اور دو سالہ تاریخ منضبط کر دی گئی ہے۔ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے اور "ہم قلم" کو مسرت ہے کہ اس نے گلڈ کی تاریخ منضبط کرنے میں پہل کی۔

اس بار ہمارا ادبی حصہ اپنا ایک الگ کردار رکھتا ہے جس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کرنے کے بعد ہوگا۔ ہم نے اس دفعہ جان بوجھ کر افسانے شامل نہیں کئے کیونکہ ہم بہت جلد الگ ایک افسانہ نمبر شائع

کر رہے ہیں۔

ہم مشرقی پاکستان کی ذیلی شاخ برائے اُردو کے نمائندے قلمکاروں کا تہہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہ جریدہ ششماہی ہے اور ۲۸۳ صفحات پر مشتمل لیکن حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ اسے سہ ماہی کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مشرقی پاکستان میں اُردو کتابت و طباعت کے سلسلے میں بہت ہی مشکلات پیش آتی ہیں لیکن قلمکار اپنی حسن ترتیب اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے مغربی پاکستان اور ہندوستان کے کسی بھی ادبی جریدے سے کم نہیں ہے۔ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جدید بنگلہ ادب کے مشہور افسانوں کے ترجمے مشہور مترجمین سے کرائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے غیر ملکی ادب پارے بھی ترجمہ کئے گئے ہیں۔

ادارہ "ہم قلم" ادارہ قلمکار کو ان کی شاندار کوشش پر نہایت خلوص سے مبارکباد پیش کرتا ہے۔

"ہم قلم" ادبی انعامات

اس سال سے ادارہ ہم قلم کی جانب سے چار ادبی انعامات کا سلسلہ جاری کیا جا رہا ہے۔ ہر انعام کی رقم مبلغ پانچ سو روپے ہوگی۔ انعامات حسب ذیل اصناف میں شائع ہونے والی بہترین ادبی تخلیقات پر دیے جائیں گے۔

۱۔ لسانی یا ادبی تحقیقی مقالہ

۲۔ طویل نظم

۳۔ طویل افسانہ

۴۔ علاقائی ادب کا منظوم ترجمہ

ان انعامات کی تفصیلات اور مکمل شرائط کا اعلان "ہم قلم" کے آئندہ شمارے میں شائع کیا جائے گا۔
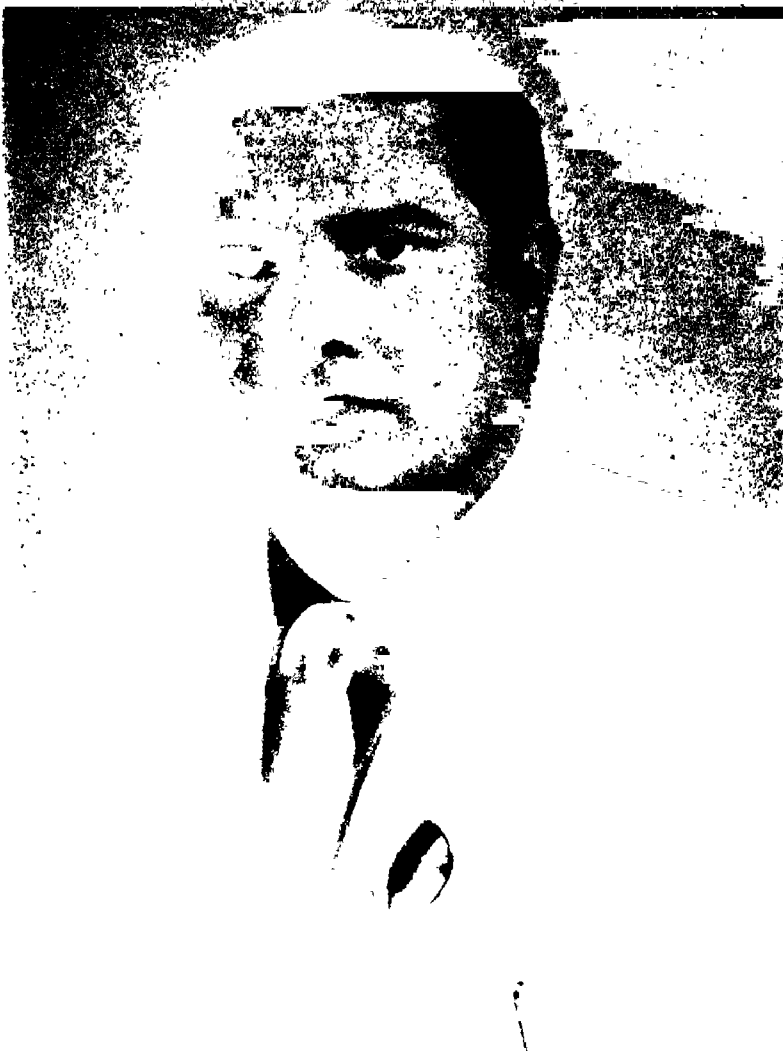
قدرت اللہ شہاب
سکریٹری جنرل

عبدالستار
(برش درشن)
مغلام عباس

آدم‌جی ادبی انعام کی تقسیم
۳ جنوری ۱۹۶۱ع
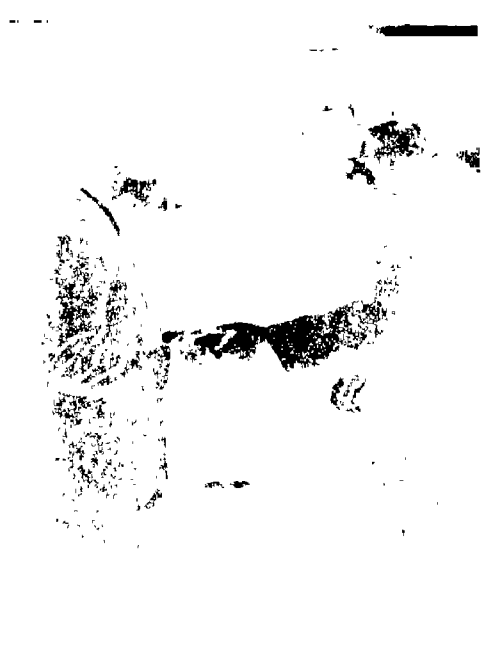
شوکت صدیقی

ڈاکٹر شہیداللہ
(برائے روشن یزدانی)

غلام عباس

افسانہ میری نظر میں

میں افسانہ نگاری کو ادب کی سہل ترین صنف سمجھتا ہوں جس کے لئے کم سے کم علمیت کی ضرورت ہے۔ میری رائے میں جو شخص بھی خط لکھ سکتا ہو وہ ذرا سی کاوش سے ایک کامیاب افسانہ نگار ہو سکتا ہے۔ یہ میں تفنن کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ آپ کو دعوت دیتا ہوں۔ کہ ذرا اس خیال کا تجزیہ کر کے دیکھئے۔

سب سے پہلے شاعری کو لیجئے۔ کہ یہ ادب کی سب سے ممتاز صنف ہے۔ شعر کہنے کے لئے آپ کو علم عروض سے تھوڑی بہت واقفیت ہونی ضروری ہے۔ یا پھر آپ فطرتاً طبع موزوں رکھتے ہوں۔ ڈراما لکھنے کے لئے "سٹیج" کے فن سے آپ کا واقف ہونا لازمی ہے۔ مضمون یا مقالہ لکھنے کے لئے آپ متعلقہ موضوع کے بارے میں معلومات فراہم کرنے پر مجبور ہیں۔ یہی حال تنقید تاریخ وغیرہ اور سفرنامہ لکھنے کا ہے۔ اور آخر میں ناول کو لیجئے۔ اور باتوں کے قطع نظر آپ کو مہینوں بلکہ برسوں مسلسل لکھتے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر افسانہ ایک ایسی چیز ہے کہ بس قلم اٹھایا اور لکھ ڈالا۔

آپ پوچھیں گے کہ افسانے میں کیا ہو' اس میں لکھا کیا جائے؟ اس کے جواب میں میں عرض کروں گا کہ ہر وہ بات جو آپ کے مشاہدے میں آئی ہو۔ اور آپ نے اس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا ہو۔ یا زندگی کا کوئی ایسا رُخ جو آپ نے دیکھ لیا ہو مگر جو عام طور پر لوگوں کی نظروں سے پنہاں رہتا ہو۔ اسکو بس اسی طرح لکھ ڈالئے جس طرح آپ نے دیکھا یا محسوس کیا ہو۔ اور افسانہ مکمل ہے۔

اس خیال کی وضاحت کے لئے میں ایک واقعہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں بچوں کے اخبار "پھول" کا ایڈیٹر تھا۔ ایک دن ایک لڑکا جس کی عمر تقریباً آٹھ برس ہوگی' میرے پاس ایک کہانی لے کر آیا۔ اور خواہش ظاہر کی۔ کہ اسے "پھول" میں چھاپ دیا جائے۔ کہانی کا عنوان تھا۔ "کھوٹا پیسہ" یہ کہانی اُس لڑکے کی اپنی زبانی تھی۔ اور کچھ اس طرح شروع ہوتی تھی . . . .

" ایک دن میں اسکول جا رہا تھا۔ راستے میں میں نے ایک اندھے فقیر کو دیکھا۔ جو ایک پتھر پر بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ اُس کے کپڑے بہت میلے اور پھٹے ہوئے تھے۔ اُس نے خیرات کے لئے ہاتھ پھیلا رکھا تھا۔

" مجھے اُس پر ترس آیا۔ مجھے امی ہر روز اکنّی اسکول میں خرچنے کے لئے دیا کرتی تھیں۔ وہ اکنّی میرے کوٹ کی جیب میں پڑی تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک کھوٹا پیسہ بھی جو بہت دنوں سے میری جیب میں یونہی پڑا تھا۔ میں نے سوچا اکنّی فقیر کو دوں گا۔ تو خود آدھی چھٹی کے وقت بھوکا رہوں گا بس اس کو کھوٹا پیسہ دے دوں جو میرے لئے بیکار ہے۔"

" یہ سوچ کر میں نے پیسہ جیب سے نکالا اور فقیر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ فقیر نے اپنی سوکھی' میلی اُنگلیوں سے پیسے کو ٹٹولا۔ دُعا دی اور پھر اپنی جھولی میں ڈال لیا۔

" میں اسکول پہنچا۔ اُس دن ماسٹر صاحب نے ہماری کتاب میں سے ایک سبق پڑھایا جو ایمانداری پر تھا۔ ماسٹر صاحب نے سبق کے علاوہ بھی بہت سی باتیں بتلائیں۔ انھوں نے کہا۔ نیکی ہمیشہ نیکی ہی ہوتی ہے۔ مگر سب سے اچھی نیکی وہ ہے جس میں نیکی کرنے والے کو خود تکلیف اٹھانی پڑے

یاوہ زبانی کرنی پڑے۔ اور سب سے بڑی بے ایمانی وہ ہے کہ جس سے کی جائے اُسے معلوم کرنے سے وہ لاچار ہو۔ یہ بے ایمانی کے ساتھ ساتھ ایک کمینہ حرکت بھی ہے۔

ماسٹر صاحب کی زبان سے "کمینہ" کا لفظ سُن کر میں گم سُم رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اچانک کسی نے چانٹا مار دیا ہو۔ مجھے افسوس ہوا کہ یہ حرکت میں نے کیوں کی۔ جب تک سبق جاری رہا میں اسی بات کو سوچتا رہا۔ جب آدھی چھٹی ہوئی تو میں جلدی سے اسکول سے نکلا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں خود بھوکا رہوں گا، اور وہ اکنی فقیر کو دیدوں گا۔ وہ جگہ جہاں میں نے فقیر کو دیکھا تھا۔ اسکول سے خاصی دُور تھی۔ میں دوڑنے لگا۔ تاکہ چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی واپس اسکول پہنچ سکوں۔

آخر جب ہانپتا ہوا اُس جگہ پہنچا۔ تو وہ فقیر مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ اور وہ پتھر جس پر وہ بیٹھا تھا، خالی پڑا تھا ....."

کہانی لکھنے کے اب تک جو اصول وقواعد متعین کئے جا چکے ہیں۔ اُن پر نظر رکھئے۔ اور پھر اس ننھی سی کہانی کو پرکھیئے۔ بلا شبہ آپ اسے ہر لحاظ سے مکمل پائیں گے اس میں ایک تجربہ ہے ایک مشاہدہ ہے۔ ایک کشمکش ہے۔ اس کہانی کا آغاز ہے، وسط ہے، انجام ہے۔

اگر اُس بچے نے فقیر کی شکل وصورت، اُس کا لباس، اُس کی مخصوص عادات کے بارے میں چند فقرے اور لکھ دیئے ہوتے یا کہیں کہیں منظر کشی کردی ہوتی تو شاید اس سے کہانی میں کچھ اور خوبصورتی پیدا ہو جاتی۔ ہر چند اس سے کہانی کے نفس مضمون میں فرق نہ آتا۔ یہ محض گھما گھمی کی چیزیں ہیں ہوں تو اچھی بات ہے نہ ہوں تو کچھ ایسا ہرج بھی نہیں۔

اس کہانی کی سب سے اہم چیز اس لڑکے کا مشاہدہ ہے۔ جسے میں افسانہ نگاری کے لئے سب سے ضروری سمجھتا ہوں لیکن بدقسمتی سے یہی وہ امر ہے جسے افسانہ نویس عام طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ فلسفیانہ نکتے بیان کرتے ہیں، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش دکھلاتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں یا تو اُنھوں نے کتابوں میں پڑھی ہوتی ہیں یا وہ سُنی سنائی ہوتی ہیں اُن کے اپنے مشاہدے کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے افسانے اثر سے خالی رہتے ہیں۔

اکثر اوقات نچلے یا درمیانہ طبقہ کے لوگ اونچے طبقے کی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ وہ ڈرائنگ روم، برتھ ڈے پارٹیز، ناچ گھر، کلب ہوٹل، ہوائی جہاز کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں امیر زادے اور امیر زادیاں غریب کے جھونپڑے، مٹی کے دیئے، راکھ بھرے چولہے، غربت، بیماری اور محنت مشقت کی زندگی پر اپنے افسانوں میں آنسو بہاتی ہیں نتیجہ ظاہر ہے۔

اسی طرح افسانہ نویس اگر عورت ہے تو مرد کے۔ اور مرد ہے تو عورت کے اُن رازوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو دل کی عمیق گہرائیوں میں چھپے ہوتے ہیں، اور جن کا اکثر صاحب راز کو بھی علم نہیں ہوتا۔ حسد، رقابت، احساس گناہ، ارتکاب جرم، پشیمانی یہ ایسے انسانی جذبات ہیں کہ جب تک خود اپنے پر وارد نہ ہوں، ان کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ قاتل کی کردار نگاری کے لئے مصنف کو خود قتل کا مرتکب ہونا پڑے۔ تجربہ، مشاہدہ، اور انسانوں کا مطالعہ رفتہ رفتہ افسانہ نویس میں یہ استعداد پیدا کر دیتا ہے، کہ وہ خود کو ہر قسم کے حالات میں فرض کر کے اپنے پر ہر قسم کی واردات گزرتی ہوئی محسوس کرنے لگے۔

جہاں تک میری اپنی افسانہ نویسی کا تعلق ہے میں خام مواد بڑی حد تک زندگی ہی سے لیتا ہوں۔ کہانی لکھنے کے لئے سب سے پہلے مجھے ایک کردار کی جستجو ہوتی ہے۔ یہ کردار سچ مچ کا یعنی گوشت اور پوست کا بنا ہونا چاہیئے۔ میں اسے اپنے ذہن میں تخلیق نہیں کرتا۔ بلکہ وہ مجھے زندگی ہی میں مل جاتا ہے۔ میرا اُس پر کچھ قابو نہیں ہوتا۔ اور نہ میں اپنے نظریات اُس کی زبان سے کہلواتا ہوں۔ میں تو چپکے چپکے اُس کی باتیں سنتا، اور اُس کے اعمال و افعال کو دیکھتا رہتا ہوں۔ اور یوں رفتہ رفتہ میں اُس کے مزاج کو کچھ کچھ پہچاننے لگتا ہوں۔ کردار سے افسانہ نگار کی اسی جان پہچان کو میں اصل کردار نگاری سمجھتا ہوں۔

کردار نگاری کے ساتھ ساتھ ایک بہت ضروری چیز ہے جزئیات نگاری۔ ان جزئیات کو براہ راست زندگی مشاہدے اور تجربے کا حامل ہونا چاہئے۔ بعض اوقات ایک معمولی سی بات فرض کر کے لکھ لی جاتی ہے، اگر وہ تجربے کے خلاف ہو، تو وہ افسانے کے سارے تاثر کو اسی طرح ختم کر دیتی ہے جس طرح ایک غلط سُر پورے راگ کو غارت کر کے رکھ دیتا ہے۔

اگر میں کسی افسانے میں کسی مسئلے کو وضاحت کے ساتھ پیش کر سکوں تو میں اسے اپنی بڑی کامیابی سمجھتا ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے پڑھنے والے بلکہ بعض اوقات نقاد بھی مجھ سے اُس کے حل کی بھی توقع کرنے لگتے ہیں اور یوں وہ ایک فن کار اور ایک مصلح کی شخصیتوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں۔

میری کوشش رہی ہے کہ میں اپنے افسانے میں وہی باتیں لکھوں جن کا تعلق براہ راست نفس مضمون سے ہو۔ غیر متعلقہ باتیں محض رونق یا جاذبیت پیدا کرنے کے لئے میں لکھنے سے گریز کرتا ہوں۔ یہی باعث ہے کہ میرے افسانے عموماً روکھے پھیکے معلوم ہوتے ہیں اور پھر افسانوں میں جو باتیں پڑھنے والے اپنے آپ سمجھ سکتے ہیں اُنھیں بھی میں نہیں لکھتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے افسانے روکھے پھیکے ہونے کے علاوہ کچھ ادھورے ادھورے سے بھی نظر آتے ہیں۔ مگر یہ ادھورا پن دانستہ ہوتا ہے۔ آخر کچھ تو قاری کو بھی دماغ پر زور ڈالنا چاہئے۔ شاعر غزل کے دو مصرعوں میں دنیا جہان کی باتیں بند کر دیتا ہے۔ اور شعر کے رسیا آپ ہی سارے خلا پُر کر لیتے ہیں۔ کیا افسانے کے قاری کو اتنی بھی توفیق نہیں کہ وہ یہ سوچنے کی تکلیف گوارا کرے۔ کہ آگے کیا ہوا یا کیا ہو سکتا ہے۔

ویسے میں افسانے کو یوں بھی ختم کر سکتا ہوں کہ پھر ہیرو اور ہیروئن کی شادی ہو گئی۔ پھر اُن کے بچے پیدا ہوئے۔ وہ بچے بڑے ہو گئے۔ مدرسے جانے لگے۔ پھر اُن کی شادیاں ہو گئیں۔ پھر ہیرو اور ہیروئن دادا دادی نانا نانی کہلانے لگے۔ اور آخر ایک دن آیا کہ اجل نے باری باری دونوں کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ اور اُن کی قبریں اُن کی وصیت کے مطابق پہلو بہ پہلو فلاں قبرستان میں واقع ہیں۔ اور مٹی کا ایک ایک پیالہ اُن کی قبر کے سرہانے نصب ہے۔ جن سے چڑیاں پانی پیتی ہیں۔

لیکن اس طرح بچوں کی طرح سمجھانا میں سمجھتا ہوں کہ قاری کی توہین ہے۔ البتہ اگر قاری کو میرے کسی افسانے کے انجام سے تشنگی کا احساس ہوتا ہو تو وہ مختار ہے کہ اپنے ذہن میں جس طرح چاہے اُسے مکمل کرے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ چکا۔

بقیہ صفحہ ۷۷ (حالی کی عشقیہ شاعری کا سرچشمہ)

اس میں کوئی ایسی قوت پنہاں ہوتی ہے جس کی بدولت وہ ہر جذبے کو چھو لیتا ہے، اپنا لیتا ہے، جذب کر لیتا ہے — اور اسے یوں پیش کرتا ہے، کہ وہ سب کا اپنا جذبہ بن جاتا ہے، اس کی زندگی بن جاتا ہے۔؟ ایسے بہت سے سوالات ہمارے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور ہم کوئی منطقی اور حتمی جواب دینے سے قاصر رہتے ہیں چنانچہ اس لحاظ سے ہمارے شعری ادب میں حالی کی غزلیں ایک سوال بن جاتی ہیں — جس کا جواب یا تو ان کی داستانِ زندگی میں ملے گا جو آنے والے حقائق کی روشنی میں لکھی جا سکتی ہے — یا تخلیق شعر کی پیچیدہ اور دشوار گذار راہوں کی تلاش و جستجو میں۔

(... محمد حالی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے انٹرنیشنل پریس میکلوڈ روڈ کراچی میں چھپوا کر ۲۰- ہوٹل ایمبیسیڈر کراچی سے شائع کیا)

ڈاکٹر عبادت بریلوی

جگرؔ صاحب

چند یادیں ——— چند تاثرات

جگرؔ صاحب کو میں نے مختلف زاویوں سے مختلف روپ میں دیکھا ہے۔ لیکن وہ مجھے ایک ہی روپ میں نظر آتے ہیں۔ بظاہر تو وہ بدلے ہیں لیکن درحقیقت ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ زمانے کی گردشوں سے وہ متاثر ہوتے ہیں لیکن ان کا مزاج ڈانوا ڈول نہیں ہوا ہے۔ حالات کی تبدیلیوں نے انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ لیکن ان کی طبیعت کے انداز میں تغیر نہیں ہوا ہے۔ ان کے زمانے میں سیاسی انقلابات ہوتے ہیں، معاشرتی تغیرات عمل میں آتے ہیں۔ تہذیبی ماحول میں تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن جگرؔ صاحب پر ان میں سے کسی کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا ہے۔ ان کے آس پاس طوفان اٹھتے رہتے ہیں، آندھیاں آتی رہی ہیں لیکن وہ ہمیشہ اپنے ایک مخصوص انداز میں قدم جمائے کھڑے رہے ہیں۔ اور انہوں نے ان آندھیوں اور طوفانوں کا منہ پھیر دیا ہے۔ وہ اپنی جگہ پر ایک ایسے پہاڑ کی طرح اٹل ہیں جو خود کسی چیز کا اثر قبول نہیں کرتا۔ دوسری چیزیں اس سے متاثر ضرور ہوتی ہیں۔

ایک زمانے تک مجھے ان کے قریب جانے کی جرأت نہیں ہوئی ہے اور میں انہیں ایک تماشائی ہی کی طرح دور سے دیکھتا رہا ہوں۔ پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا ہے جب میں نے انہیں مختلف لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے اور بات کرتے دیکھا ہے لیکن میں خود ان سے بات نہیں کر سکا ہوں۔ اور پھر وہ موقع بھی آیا ہے جب میری ان سے سرسری سی ملاقات ہوگئی ہے اور پھر ایک دفعہ ملنے کے بعد وہ مجھے کبھی نہیں بھولے ہیں۔ اور بالآخر وہ دن بھی میں نے دیکھے ہیں جب یہ سرسری ملاقات دوستی میں تبدیل ہوگئی ہے، اور انہوں نے بزرگ ہونے کے باوجود ہمیشہ مجھے اپنا دوست ہی سمجھا ہے۔ حالانکہ میں اس دوستی کے باوجود انہیں ایک بزرگ ہی سمجھتا رہا ہوں۔ اس طرح مجھے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے کے مواقع ملتے رہے ہیں۔ اور یقیناً میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ مجھے ایک ہی حال میں نظر آتے ہیں۔ میں نے ان میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں دیکھی ہے۔ ان کا طرزِ عمل کبھی بدلا ہوا نہیں پایا ہے۔ ان کے خیالات تبدیل ہوتے ہوئے نہیں دیکھے ہیں۔ زندگی کے اس پرآشوب دور میں اگرچہ ہر چیز اپنی جگہ سے ہل گئی لیکن جگرؔ صاحب کی نیکی اور شرافت، انسانیت اور محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس زمانے میں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے لیکن جگرؔ صاحب نہیں بدلے۔ اور یہی ان کی بڑائی کی نشانی ہے۔

میں جس زمانے میں اسکول کا ایک معمولی طالب علم تھا جگرؔ صاحب کی شہرت اپنے شباب پر پہنچ چکی تھی۔ اس زمانے میں بچے بچے کی زبان پر ان کا نام تھا مشاعرے انہیں کیلئے منعقد کئے جاتے تھے۔ انکی شرکت کے بغیر مشاعرہ پھیکا رہتا تھا۔ جس مشاعرے میں وہ آجاتے تو دھوم مچ جاتی تھی۔ لوگ مشاعرے میں شریک ہونے سے قبل آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے کہ کیا جگرؔ صاحب آرہے ہیں؟ اور جب انہیں یہ خوشخبری مل جاتی تو بڑے ذوق و شوق سے مشاعروں میں شریک ہوتے۔ جب تک

جگر صاحب مشاعرے کے ہال میں داخل نہ ہو جاتے ان کی آنکھیں دروازے کی طرف لگی رہتیں۔ اور جب جگر صاحب مشاعرے میں پہنچ جاتے تو ہر شخص کی توجہ انکی طرف ہو جاتی۔ لوگ اس قدر خوش ہوتے کہ بے اختیار تالیاں بجاتے اور سارا ہال ان تالیوں کے شور سے گونج اٹھتا۔ اگرچہ اس زمانے میں، "تالیاں بجانے کو آداب مشاعرہ کے خلاف سمجھا جاتا تھا لیکن جگر صاحب کو دیکھ کر لوگوں پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ وہ آداب مشاعرہ کی ان طنابوں کو توڑ دیتے تھے اور ضرور ان کا استقبال تالیوں سے کرتے تھے۔ اور پھر فرمائش شروع ہو جاتی تھی کہ جگر صاحب کو پڑھوائیے۔ اگرچہ یہ بات بھی آداب مشاعرہ کے خلاف تھی لیکن شوق و اشتیاق کے تند رو دھارے کے سامنے یہ پابندیاں بھی خس و خاشاک کی طرح بہہ نکلتی تھیں۔ مشاعرے کے منتظمین کو ترتیب کا خیال چھوڑنا پڑتا تھا اور وہ جگر صاحب کو پڑھوانے کیلئے مجبور ہو جاتے تھے۔ اس طرح مشاعرے میں وہ کئی بار پڑھتے تھے۔ اور جب ان کی مترنم آواز گونجتی تھی تو ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ لوگوں پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور جتنی دیر وہ پڑھتے تھے لوگ جھومتے رہتے تھے۔ ایک ایک شعر پر ایسی داد ملتی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مشاعرے کی چھتیں اڑی جا رہی ہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جب جگر صاحب کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا بس وہ شراب پیتے، شعر کہتے اور شعروں کو حد درجہ دل موہ لینے والے مترنم انداز میں پڑھتے تھے۔ انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ وہ کس عالم میں ہیں۔ ان کا لباس کیا ہے؟ صورت کیسی نظر آ رہی ہے؟ وہ کیا کر رہے ہیں؟ کن لوگوں سے مل رہے ہیں؟ ان کے آس پاس اور گرد و پیش کیا ہو رہا ہے؟ ہر وقت وہ نشے میں رہتے تھے اور ان پر مدہوشی کا عالم کچھ اس طرح طاری رہتا تھا۔ کہ انہیں دنیا و مافیہا کی خبر ہی نہیں رہتی تھی۔ وہ کسی نہ کسی شخص کا سہارا لیکر چلتے تھے۔ یہی ان کی زندگی کا عجیب و غریب دور تھا۔ اردو کے کسی شاعر پر شاید ہی کبھی ایسی کیفیت طاری رہی ہو جو جگر صاحب پر ایک زمانے تک طاری رہی۔

اس عالم کیف و مستی میں جگر صاحب کو میں نے بارہا دیکھا لیکن کبھی ان کے قریب جانے اور ان سے گفتگو کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ اس زمانے میں لکھنؤ کا شہر مشاعروں کیلئے مشہور تھا۔ خوب خوب مشاعرے ہوتے تھے۔ کئی ادبی انجمنیں تھیں ان کے علاوہ اسکول اور کالج تھے۔ ان سب کے زیر اہتمام مشاعروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اور ان میں بھی عجب عجب جدتیں ہوتی تھیں۔ کبھی چاندنی رات میں مشاعرہ ہو رہا ہے۔ کبھی دریا تے گومتی پر کشتیوں میں محفل شعر و سخن جمی ہوتی ہے۔ غرض لکھنؤ کے رومانی مزاج لوگ ان مشاعروں میں عجیب عجیب جدتیں کرتے تھے اور نوک پلک نکالتے تھے۔ جگر صاحب ان مشاعروں میں شرکت کیلئے ضرور آتے تھے۔ اور لکھنؤ کا شہر انکے نغموں سے گونج اٹھتا تھا۔

سب سے پہلے میں نے جگر صاحب کو اسلامیہ کالج لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں دیکھا۔ اسلامیہ کالج میں اس زمانے میں بہت بڑے پیمانے پر ہر سال ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوتا تھا۔ ہندوستان کے کونے کونے سے شاعر بلائے جاتے تھے۔ اور چند روز ان کی وجہ سے اچھی خاصی رونق ہو جاتی تھی۔ سال بھر تک ہم لوگ اس اہم مشاعرے کے انتظار میں رہتے تھے۔ میں ان دنوں گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ کے اسکول کی جماعتوں میں پڑھتا تھا۔ وہاں ہماری بھی ایک مختصر سی بزم ادب تھی۔ اسکے زیر اہتمام ہم لوگ کبھی کبھی جلسے تو کر لیتے تھے لیکن ایک زمانے تک کوئی اچھا مشاعرہ کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ کیونکہ ہمارے وسائل بہت محدود تھے۔ اس لئے ہم لوگوں کو اسلامیہ کالج کے سالانہ مشاعرے کا سال بھر تک انتظار رہتا تھا اور ہم بڑے ذوق و شوق سے اس کی مختلف نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ بعض اوقات یہ مشاعرہ دو دو تین تین دن تک جاری رہتا تھا۔ دن کو بھی نشست ہوتی تھی اور رات کو بھی۔

وہ منظر اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ مشاعرے کی پہلی نشست شروع ہوئی تھی۔ اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم اپنی اپنی غزلیں پڑھ رہے تھے۔ مشاعرہ

جما ہوا تھا کہ اتنے میں ایک شور سنائی دیا۔ سب لوگوں کی نگاہیں دروازے کی طرف ہو گئیں۔ جگر صاحب چند لوگوں کیساتھ مشاعرے میں داخل ہوئے۔ شعرا، اور سامعین نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا، اور وہ صدر صاحب کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ ابھی انہیں بیٹھے ہوئے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ہر طرف سے یہ آوازیں آنے لگیں کہ جگر صاحب کو زحمت دیجئے۔ ایک ہنگامہ تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہر طرف جگر صاحب، جگر صاحب کا شور بلند ہو رہا تھا۔

جگر صاحب کی حالت اس وقت دیکھنے والی تھی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہوش میں نہیں ہیں۔ انھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے انہیں آس پاس اور گرد و پیش کی مطلق خبر نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے جو انکے ساتھ تھے اور آس پاس بیٹھے ہوئے تھے، ان تک سامعین کی فرمائش پہنچائی۔ پہلے تو انہوں نے انکار کیا لیکن جب حاضرین کا اصرار بڑھنے لگا تو بالآخر پڑھنے کیلئے تیار ہو گئے۔ اور اپنی وہ مشہور مسلسل غزل شروع کی ؂

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا

بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا
توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی گیا

زاہد یہ میری شوخیِ رندانہ دیکھنا
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا

سرمستیِ ازل مجھے جب یاد آ گئی
دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا

آزردگیِ خاطرِ ساقی کو دیکھ کر
مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

[illegible] رہا جگر
کل عالم سیاہ پہ میں چھا کے پی گیا

اس غزل کے ایک ایک شعر کو انہوں نے کچھ اس طرح ڈوب کر اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ پڑھا کہ سامعین پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ جگر صاحب بدمستی کے عالم میں یہ اشعار پڑھتے رہے اور ایک دو دفعہ تو واقعی انہوں نے جیب سے بوتل نکالی، چند گھونٹ پیے اور پھر شعر پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ میرے لئے یہ بات بہت عجیب تھی کیونکہ میں نے اس سے قبل کسی شاعر کو اس طرح کھلے خزانے، ایسی بیباکی کے ساتھ پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن جگر صاحب کے اشعار نے کچھ ایسا سماں باندھ دیا تھا کہ میں اس وقت ان کے اس طرزِ عمل کے بارے میں مطلق کچھ سوچ نہ سکا البتہ جب وہ غزل ختم کر چکے تو مجھے ایک لمحے کو یہ احساس ہوا کہ ان کی یہ حرکت معیوب تھی اور انہیں بھری محفل میں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن دل نے یہ کہا کہ ایسے رندوں پر احتساب نہیں کرنا چاہئے جو شخص اپنے ہوش ہی میں نہ ہو اُسکو بھلا کوئی کس طرح روک سکتا ہے؟

اس وقت جگر صاحب کی جو شکل صورت تھی وہ اب تک میرے سامنے ہے۔ وہ دبلے پتلے اور چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ رنگ سیاہ تھا۔ چہرے پر چھوٹی سی سیاہ داڑھی تھی اور سر پر بڑے بڑے بال تھے جو ہر وقت بکھرے رہتے تھے۔ دیکھنے میں خاصے بدصورت آدمی تھے اس کے باوجود ان میں ایک کشش تھی۔ لباس سیدھا سادہ تھا اور اس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس رندِ بلا نوش کو اپنی کسی چیز کا ہوش نہیں ہے شیروانی پہننے کی نوبت بھی ذرا کم ہی آتی تھی۔ کرتے پائجامے ہی میں ہر جگہ پہنچ جاتے تھے اور یہ کرتا پائجامہ بھی اپنی خرابی اور خستگی کے باعث کسی عاشق کے گریبان کی یاد دلاتا تھا۔ اس صورت سے جگر صاحب اس زمانے میں سارے ہندوستان میں گھومتے پھرتے تھے۔ ان کے پاؤں میں چکر تھا اور یہ چکر تو ان کے پاؤں میں زندگی بھر رہا۔ وہ کسی ایک جگہ جم کر بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ انہیں کسی ایک جگہ پر قرار نہیں تھا۔ ایک سیمابی کیفیت ان کے ایک ایک انداز سے ٹپکتی تھی۔ وہ نہ جانے کس ان دیکھی ان جانی چیز کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ خدا جانے ان کے دل میں وہ کونسی کیفیت

تھی جو انھیں رواں دواں رکھتی تھی۔ مشاعرے تو ان کیلئے گھومنے پھرنے، رواں دواں رہنے اور ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ان گنت مقامات پر جاکر وقتی طور پر قیام کرنیکے بہانے تھے۔ اس کی تہہ میں تو کوئی اور ہی بات تھی۔ دیکھنے والوں کو تو اس پردۂ زنگاری میں کوئی اور ہی معشوق نظر آتا تھا۔ زندگی انہیں تو کشاں کشاں اور نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرتی تھی۔ انھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انھیں خود اس بات کا علم نہیں ہے کہ وہ کہاں جارہے ہیں۔ اور کیوں جارہے ہیں۔ اس زمانے میں ان کے چہرے پر ایک اضطرابی کیفیت کا رنگ نمایاں رہتا تھا اور ہر وقت وحشت سی ٹپکتی تھی۔ اس عالم میں جگر صاحب ہندوستان کے ہر شہر میں دیکھے جاتے تھے۔ ہر شخص انھیں جانتا تھا۔ کوئی جگہ انکے لئے اجنبی اور نامانوس نہیں تھی۔ بچے بچے کی زبان پر ان کا نام تھا۔ کسی شاعر کو شاید ہی ہندوستان کے ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگوں میں اتنی مقبولیت حاصل ہوتی ہو جتنی کہ جگر صاحب کو حاصل ہوئی۔ لوگ ان پر جان چھڑکتے تھے، اور واقعی انکی پرستش کی جاتی تھی۔

جگر صاحب کے ساتھ اس زمانے میں لوگوں کے جمگھٹے رہتے تھے۔ ہر شخص ان سے ملنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے اس زمانے میں کبھی بھی ان سے ملنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی بلکہ انہیں دیکھ کر کچھ ڈر سا لگتا تھا۔ مجھے تو اس وقت ان کے اشعار اور پڑھنے کے مترنم انداز سے دلچسپی تھی۔ ہمیشہ یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔ شراب پیتے ہیں۔ ہر وقت نشے میں چور رہتے ہیں۔ انھیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں ہے۔ ان سے ملنے کا اثر خراب ہی ہوگا۔ اس لئے ایک زمانے تک میں ان سے نہیں ملا۔ حالانکہ ملاقات کے مواقع بہت آسانی سے مل سکتے تھے۔ کیونکہ ہر مہینے جگر صاحب لکھنؤ کے ایک دو پھیرے ضرور کرتے تھے۔ البتہ مجھے جگر صاحب کی غزل سے بڑی دلچسپی تھی اور پھر ان کے پڑھنے کے مترنم انداز کا تو میں عاشق تھا۔ اس لئے یہی جی چاہتا تھا کہ جگر صاحب کو دور سے دیکھا کروں، اور وہ لہک لہک کر میرے سامنے غزلیں پڑھتے رہیں۔ جگر صاحب سے دور رہنے اور ان سے نہ ملنے کی اصل وجہ ان کی شراب نوشی تھی۔

شراب پینا میرے نزدیک انسان کا سب سے زیادہ قبیح فعل تھا۔ بات یہ ہے کہ میں نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں شراب پینے والے دنیا کی بدترین مخلوق سمجھے جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے والد کے ایک ہندو دوست تھے جو ان سے کبھی کبھی ملنے کی غرض سے مکان پر آتے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شراب پیتے ہیں۔ چنانچہ جس گلاس میں وہ شربت یا جس پیالی میں چائے پیتے تھے، ان کے رخصت ہونے کے بعد اس کو توڑ دیا جاتا تھا۔ ایک ایسے گھرانے میں پرورش پانے والا آدمی، ظاہر ہے کہ کسی شرابی کے قریب بھی نہیں جاسکتا۔ بچپن میں مجھ سے شرابیوں کے بارے ایسی ایسی باتیں کہی گئی تھیں کہ ان کے خیال ہی سے مجھے ڈر لگتا تھا۔ اس لئے اس زمانے میں جگر صاحب سے ملنے کی خواہش میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ میرے بعض ساتھی ان سے ملنے کی غرض سے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھنے اور بات کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن میں ہمیشہ ایسے مواقع پر کنی کاٹ جاتا تھا۔ یہی خیال ہوتا تھا کہ ایک تو جگر صاحب شاعر ہیں، اور شاعر اچھے آدمی نہیں ہوتے۔ پھر وہ بری طرح شراب پیتے ہیں، گریلا اور نیم چڑھا والی مثال ان پر صادق آتی ہے۔ ایک ایسے شخص سے دور ہی رہنا مناسب ہے۔

چنانچہ ایک زمانے تک میں جگر صاحب کو اسی عالم میں سے دیکھتا رہا۔ زندگی کے کئی سال انہوں نے اس بدمستی کے عالم میں گزارے۔ سنا ہے کہ اس زمانے میں وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ کسی کی بات کا ان پر اثر نہیں ہوتا۔ اصغر صاحب اس زمانے میں زندہ تھے۔ جگر صاحب پر ان کا اثر بھی تھا اور وہ انھیں اپنا پیر و مرشد بھی مانتے تھے۔ اصغر صاحب کے ڈر کی وجہ سے وہ کبھی کبھی شراب کم کر دیتے تھے اور ان سے چھپ کر پیتے تھے لیکن ہوتا یہ تھا کہ جیسے ہی ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوئے شراب کا کاروبار شروع کر دیا۔ غرض اس زمانے میں اس رند بلانوش کا کچھ عجیب عالم تھا۔ ہم لوگ آپس میں اکثر جگر صاحب اور ان کی بلانوشی کو اپنا موضوع بناتے تھے۔ ہم میں اکثر کا یہ خیال تھا کہ یہ ظالم شراب بہت جلد جگر صاحب کی جان لے لے گی اور وہ اس عالم میں زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ

سکیں گے۔ اور اس طرح اردو غزل اپنے ایک بہت بڑے علم بردار سے محروم ہو جائیگی۔ اردو غزل کا یہ خوش درخشید شعلہ ہمیں مستعجل معلوم ہوتا تھا۔ اور ہم یہ سوچکر اکثر مغموم ہو جاتے تھے کہ اردو غزل کا یہ خوش فکر و خوش خیال شاعر ہم سے بہت جلد رخصت ہو جائے گا۔

یہ خیالات ہمارے ذہن پر منڈلاتے رہے لیکن انکی شراب نوشی کا وہی عالم رہا۔ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں کچھ اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اور اسی طرح کئی سال گذر گئے۔ اس زمانے میں جگر صاحب کو کسی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ لے دے کے ایک اصغر صاحب تھے جن سے وہ اس زمانے میں بھی بہت قریب تھے اور انھوں نے جگر صاحب کو راہ راست پر لانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی وہ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ اسی لئے ان کی خواہش تھی کہ جگر صاحب متوازن زندگی بسر کریں۔ اسی خیال سے انھوں نے عینکوں کا کچھ کاروبار بھی ان کے سپرد کر دیا تھا، اور یہ بات بہت مشہور ہے کہ وہ اس زمانے میں کبھی کبھی عینکوں کی تجارت کر لیتے تھے۔ ایک بکس ان کے پاس رہتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ حضرت اصغر صاحب کی عقیدت نے انہیں اس کام کی طرف کسی حد تک متوجہ کر دیا تھا ورنہ ان کی رندی بھلا اس کام کے ساتھ کس طرح مطابقت پیدا کر سکتی تھی۔ ان کا اصل مشغلہ تو وہی تھا جس کیلئے وہ اس زمانہ میں بدنام تھے۔ جب وہ مشاعروں میں آتے تو اس رندی کا رنگ ان کی شخصیت میں کچھ اور بھی زیادہ رچا ہوا نظر آتا تھا۔ لوگوں کو اس زمانے میں ان کے شعر سُن کر تو یقیناً خوشی ہوتی تھی لیکن انکی حالت زار کو دیکھ کر ترس آتا تھا۔ اصغر صاحب کو خاص طور پر انکی بہت فکر رہتی تھی۔ جگر صاحب ان دنوں گونڈے میں انہیں کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ خبریں عام طور پر اس زمانے میں مشہور ہوتی تھیں کہ اصغر صاحب اکثر جگر صاحب کو سمجھاتے بجھاتے رہتے ہیں کہ وہ اس گناہ کے مرتکب نہ ہوں کبھی کبھی سرزنش بھی کرتے ہیں، جگر صاحب ان کی بات مان بھی لیتے ہیں لیکن پھر نہ جانے کسی وقت ان پر ایک دورہ سا پڑتا ہے اور کچھ ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وہ گھر چھوڑ کر باہر نکل جاتے ہیں اور پھر جام و مینا سے لو لگا کر اپنے دن گنت بتا لیتے ہیں۔ غرض مدت دراز تک جگر صاحب کی یہی کیفیت رہی۔ سنا ہے کہ ہر روز وہ اصغر صاحب کے سامنے توبہ کرتے لیکن دن میں کئی بار اس توبہ کو توڑ دیتے۔ اور پھر ان کا وہی حال ہو جاتا جس سے وہ اس زمانے میں پہچانے جاتے تھے۔

میں نے جگر صاحب کو کئی سال تک اسی عالم میں دیکھا۔ دن گزرتے گئے۔ میں اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی میں پہنچ گیا۔ لیکن جگر صاحب کی زندگی میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی مشاعروں میں اکثر انہیں دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور وہ ایک ہی حال میں نظر آتے تھے۔ یعنی اپنے آپ سے باہر، شراب کے نشے میں چور، آس پاس اور گرد و پیش سے بے نیاز ـــــ دنیا کی ہر چیز سے بے خبر۔ وہ محفلوں میں خود نہیں آتے تھے، لائے جاتے تھے۔ کسی کے سہارے کے بغیر ان کا چلنا تک مشکل تھا۔ لوگوں نے ان کی اس رندی کے ساتھ مطابقت پیدا کر لی تھی اور اب انھیں جگر صاحب کا یہ عالم کچھ عجیب نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ انہیں بری نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ بلکہ حالت تو یہ ہو گئی تھی کہ اگر جگر صاحب کسی دوسرے رنگ میں سامنے آتے تو شاید لوگوں کو زیادہ حیرانی ہوتی۔ جگر صاحب کے خیال سے پہلے ان کے سامنے ان کی رندی کا تصور آتا تھا۔ اس طرح جگر صاحب اور رندی و سیہ مستی ایک دوسرے کے مترادف ہو گئے تھے۔ اور جگر صاحب کے ساتھ اس رندی و سیہ مستی اور رندی و سیہ مستی کے ساتھ جگر صاحب کا خیال آتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جب جگر صاحب نے یکایک شراب چھوڑ دی تو عرصے تک کسی کو یقین نہیں آیا۔ شراب یوں بھی ذرا مشکل ہی سے چھوٹتی ہے۔ یہ کافر منہ سے لگ جائے تو اس سے پیچھا چھڑانا آسان نہیں ہوتا۔ جگر صاحب کے شراب چھوڑنے کی خبر جب مشہور ہوئی تو یہی خیال گذرا کہ کسی نے یہ خبر یوں ہی اڑا دی ہے۔ لکھنؤ میں تو ایسی ہوائیاں اکثر چھوٹتی رہتی تھیں۔ چنانچہ یہ واقعہ کئی مہینے تک لکھنؤ میں موضوع گفتگو بنا رہا۔ خیال آرائیاں ہوتی رہیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس زمانے میں جگر صاحب لکھنؤ بھی نہیں آئے۔ اس لئے اس خبر کی تصدیق نہ ہو سکی۔ یہ خبر حیران کن لیکن خاصی خوشگوار تھی اس لئے اسے صحیح مان لینے کو جی چاہتا تھا لیکن جگر صاحب کی رندی سامنے آکر

ڑی ہوجاتی تھی لیکن افسوس ہوتا تھا جیسے کہ رہی ہو یہ خبر غلط ہے
گر صاحب میرا ساتھ کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ ان کا میرا تو ہمیشہ سے
ک رشتہ ہے۔ زندگی بھر میرے ساتھ رہیں گے۔ یہ خبر تو دشمنوں
ی اڑائی ہوئی ہے لیکن چند مہینے کے بعد جب جگر صاحب لکھنؤ آئے اور
ختلف محفلوں میں انہیں دیکھا تو یقین ہو گیا کہ واقعی انھوں نے توبہ کرلی
ہے، رندی اور سیہ مستی سے انھوں نے رشتہ توڑ لیا ہے۔ اور وہ اچھے
نہ آدمی بن گئے ہیں۔ یہ ثقاہت اب ان کی صورت شکل، عادات و
طوار اور لباس سے بھی ظاہر ہوتی تھی۔ اب وہ کرتے اور قمیص
، چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہنے ہوتے نظر آنے تھے۔ سر پر ٹوپی بھی
تی۔ بال بھی بکھرے ہوئے نہیں تھے۔ اب کسی کے سہارے کی ضرورت
ھی انھیں پیش نہیں آتی تھی۔ جب انھیں اس بدلی ہوئی حالت میں
ئی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا تب مجھے یقین ہوا کہ واقعی وہ بدل چکے ہیں
یکن حیرت پھر بھی باقی رہی۔ جگر صاحب کی زندگی کا یہ انقلاب کم از
کم میرے لئے بہت عجیب تھا۔ کیونکہ یہ بات کسی طرح میرے وہم
گمان میں بھی نہیں آتی تھی کہ کوئی شخص شراب بھی چھوڑ سکتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جگر صاحب کو مسلسل ایک سال
لسل اس بدلی ہوئی حالت میں دیکھنے کے بعد، جب مجھے پوری طرح
یقین ہو گیا کہ واقعی جگر صاحب کی کایا پلٹ گئی ہے تب میں نے اپنی
ذاتی نوٹ بک میں یہ چند فقرے لکھے تھے۔

"یہ اکتوبر ۱۹۴۰ء ہے۔ جگر صاحب کو شراب چھوڑے
یک سال سے زیادہ ہو چکا ہے۔ ورنہ اس سے قبل تو یہ حالت تھی کہ
شراب کے بغیر ان کا زندہ رہنا ہی مشکل تھا۔ سب کے سامنے
کھلے خزانے پیتے پھرتے تھے۔ یہ انقلاب واقعی ان کی زندگی کا بہت
بڑا انقلاب ہے۔ اس انقلاب کے بعد ان کی شاعری کیا صورت
اختیار کرے گی؟ اس کا جواب تو وقت ہی دے گا۔"

آج کل وہ کتب فروشوں کے پاس جاتے ہیں اور قرآن مجید
کے مختلف نسخے تلاش کرتے ہیں۔ میں نے خود انھیں ان نسخوں کے بارے
میں دریافت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

جگر صاحب سے میری پہلی ملاقات بھی کتابوں کی ایک
دوکان پر اس وقت ہوئی جب وہ قرآن مجید کے نسخوں کی تلاش
میں آئے۔ اتفاق سے میں بھی وہاں موجود تھا۔ وہیں میری ان سے ملاقات ہوئی۔

ان دنوں میرا معمول یہ تھا کہ شام کو کچھ دیر کے
لئے مختلف کتابوں کی دوکانوں میں ضرور جاتا تھا۔ اور لکھنؤ کے
اکثر کتب فروشوں سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ یہ سب
کے سب میرا بہت خیال کرتے تھے، اور اکثر شام کا کچھ وقت میں
ان کے پاس گزارتا تھا۔ اس طرح نئی نئی کتابیں دیکھنے کو مل جاتی
تھیں۔ کچھ کتابیں میں خرید بھی لیتا تھا لیکن جن کو نہیں خرید سکتا تھا،
انھیں ان دوکانوں میں بیٹھ کر پڑھ لیتا تھا۔ کتب فروشوں سے
دوستانہ تعلقات تھے اسی لئے انہیں یہ بات ناگوار بھی نہیں تھی۔

ایک شام میں حسب معمول مکتبۂ جامعہ (لکھنؤ) میں بیٹھا ہوا
کسی کتاب کو پڑھنے میں محو تھا۔ مکتبہ کے منیجر نسیم احمد صاحب اپنی جگہ
مجھے بٹھا کر تھوڑی دیر کے لئے کہیں چلے گئے تھے۔ ان کو گئے ہوئے
ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ جگر صاحب مع اپنے دو تین ساتھیوں
کے دوکان پر آگئے۔ پوچھنے لگے "نسیم صاحب کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "آپ تشریف رکھئے۔ بس وہ آتے ہی
ہوں گے!"

جگر صاحب نے کہا "کہیں دور تو نہیں گئے ہیں!"

میں نے کہا "کہیں آس پاس گئے ہیں۔ بس چند منٹ
میں آجائیں گے۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرمایئے!"

جگر صاحب کہنے لگے "مجھے قرآن مجید کے مختلف نسخوں کی
ضرورت ہے!"

یہ سن کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے وہ الماری
کھول دی جس میں قرآن مجید کے نسخے رکھے ہوئے تھے، اور جگر
صاحب سے کہا کہ "یہ نسخے دیکھ لیجئے!"

اور وہ قرآن مجید کے نسخے دیکھنے میں محو ہو گئے۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ نسیم صاحب آگئے۔ جگر
صاحب انھیں پہلے سے جانتے تھے۔ بہت اچھی طرح ملے۔ دیر تک
ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے جگر صاحب

میرا بھی تعارف کرا دیا، اور وہ مجھ سے بھی نہایت خندہ پیشانی سے
باتیں کرنے لگے جب نسیم صاحب نے انھیں یہ بتایا کہ میں اردو ادب
کا طالب علم ہوں، اور کچھ لکھنے لکھانے کا بھی شوق ہے تو جگر صاحب
اور بھی خوش ہوئے اور خاصی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ میرے
بارے میں سب کچھ انھوں نے پوچھ لیا۔ تمام حالات معلوم کر لئے۔
تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے نسیم صاحب سے قرآن مجید کے
دو ایک نسخے لئے۔ ہدیہ کی رقم ادا کی اور پھر میرے ساتھ گفتگو کرنے
لگے۔ یہ جگر صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔

چلتے وقت میں نے ان سے کہا " میں آپ سے کسی وقت
ملنا چاہتا ہوں۔ مفصل ملاقات کی ایک زمانے سے آرزو ہے لیکن
آج تک یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہی ہے۔"

جگر صاحب کہنے لگے " میں بھوپال ہاؤس میں ٹھہرا ہوا
ہوں۔ آپ وہاں کسی وقت بھی آجایئے۔ ملاقات ہو جائے گی۔
یا پھر آپ جہاں کہیں میں وہاں پہنچ جاؤں۔"

میں نے کہا " میں انشاء اللہ صبح کو حاضر ہوں گا۔"

جگر صاحب نے کہا " ضرور آیئے۔ میں منتظر رہوں گا۔"

یہ کہہ کر انھوں نے مصافحہ کیا، اور رخصت ہو گئے۔

صبح کو میں بھوپال ہاؤس پہنچ گیا۔

وہاں جا کر دیکھا تو جگر صاحب انتظار کر رہے تھے۔ ایک دن
پہلے ان سے جو مختصر سی ملاقات ہوئی تھی اس کو انھوں نے بھلایا نہیں
تھا۔ بڑی شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ جو لوگ ان کے پاس بیٹھے
ہوئے تھے، ان سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں تعارف کرایا اور پھر اسی
غیر مربوط اور بے ربط انداز میں باتیں کرنے لگے۔

جگر صاحب اچھی باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی گفتگو ذرا بھی
مربوط نہیں ہوتی تھی۔ جب وہ باتیں شروع کرتے تھے تو خدا جانے الفاظ
ان سے دور کیوں بھاگتے تھے۔ رک رک کر بولنا اور بول بول کر رکنا ان
کا خاص انداز تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی انتہائی ناہموار سطح پر
چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یا کوئی خار دار جھاڑیوں میں سے ہو کر گزر
رہا ہے۔ جہاں قدم قدم پر اس کا دامن کسی کانٹے سے الجھ جاتا ہے۔

غرض جگر صاحب دیر تک اپنی اس گفتگو سے میرے سامنے
ناہموار سطح پر چلنے یا کانٹوں سے الجھ کر گزرنے کے نقشے پیش کرتے رہے
لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے بہت کھل مل کر باتیں کیں۔ ان
کی باتوں میں خلوص کا رنگ اور شفقت کا آہنگ تھا۔ اسی لئے
ان میں غضب کی کشش تھی۔ جتنی دیر وہ باتیں کرتے رہے مجھے یوں
محسوس ہوتا رہا جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں اور میں اپنے
آس پاس اور گرد و پیش ان پھولوں کی مہک سی محسوس کر رہا ہوں۔

جگر صاحب کی محبت بھری باتوں نے مجھ پر گہرا اثر کیا تھا،
اور میں اس وقت ان کی شخصیت کی جذب و کشش کے علاوہ اور
کسی چیز کو محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ واقعی ان کی شخصیت میں ایک مہک
تھی جس نے پھیل کر مجھے ہر طرف سے محصور کر لیا تھا۔

اس پہلی مفصل ملاقات میں جگر صاحب سے میں نے ان
گنت موضوعات پر باتیں کیں۔ اور ان باتوں سے ان کے مزاج،
افتاد طبع، ذہنی رجحانات، عقائد و توہمات، اور افکار و خیالات
کے بہت سے پہلو میری آنکھوں کے سامنے آگئے۔ ان پہلوؤں
کی روشنی میں جب میں نے جگر صاحب کا جائزہ لیا تو مجھے یوں محسوس
ہوا کہ جگر صاحب کے بارے میں جو رائے میں نے اس سے قبل
قائم کی تھی وہ صریحاً غلط تھی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ جگر صاحب ایک
بوہیمین ٹائپ کے شاعر ہیں۔ ان کے مزاج میں ذرا بھی باقاعدگی نہیں
ہے۔ وہ دوسرے شاعروں کی طرح لاابالی ہیں۔ انھوں نے کچھ سوچا
نہیں ہے۔ لیکن اب جو ان سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ ان خیالات کی
جن عمارتوں کو میں نے تعمیر کیا تھا ان کی بنیاد ریت پر قائم تھی۔
اب مجھے احساس ہوا کہ جگر صاحب تو بالکل ہی مختلف آدمی
ہیں۔ ان کے مزاج میں بڑی باقاعدگی ہے۔ تھوڑی سی لاپروائی ان
کی طبیعت میں ضرور ہے لیکن اس سے ان کے کردار پر حرف نہیں آتا۔
وہ آداب کا خیال رکھتے ہیں انسانیت ان کے مزاج کا جزو ہے اور انسان
دوستی ان کی زندگی کا معیار ہے۔ وہ محبت کے بندے ہیں اور نفرت
سے ان کو دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

میں نے دوران گفتگو میں ان سے کہا، "جگر صاحب میں

آپ سے پہلی ہی ملاقات میں محبت پیدا ہوں ۔"
حیرت سے پوچھنے لگے "کس طرح ؟"
میں نے کہا "اس ملاقات سے قبل مجھے آپ سے ملنے کی خواہش
کبھی پیدا نہیں ہوئی ۔ البتہ آپ کو دیکھنے اور شعر سننے کو ضرور جی چاہتا تھا
یہ خواہش مشاعروں میں پوری ہو جاتی تھی اس لئے آپ سے ملنے اور
ملاقات کرنے کا خیال میرے دل میں کبھی بھی نہیں آیا ۔"
کہنے لگے "آخر ایسا کیوں تھا ؟ ـــــ ویسے مجھ میں کوئی خاص
بات بھی نہیں تھی کہ آپ کے دل میں مجھ سے ملنے کا خیال پیدا ہوتا ۔"
میں نے کہا "جگر صاحب یہ بات نہیں تھی ۔ اس سے قبل مجھے
آپ سے ڈر لگتا تھا ۔"
جگر صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ۔ اس لئے پوچھنے لگے "آخر
ڈرنے کی کیا بات تھی ؟ میں اتنا بدصورت آدمی تو نہیں ہوں ۔"
اس پر سب لوگ ہنسنے لگے مجھے بھی ہنسی آگئی لیکن میں نے
ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا "ڈرنے کی بات یہ تھی کہ آپ شراب پیتے
تھے اور جو لوگ شراب پیتے ہیں ان سے مجھے ڈر لگتا ہے ۔"
جگر صاحب کہنے لگے "شراب کوئی اچھی چیز نہیں تھی ۔ اس کو
میرا زمانۂ جاہلیت سمجھئے ۔ وہ بھی ایک عالم تھا ۔ اب تو آپ مجھ سے
نہیں ڈرتے ؟"
میں نے کہا "اب ڈرنے کا کیا سوال ہے ۔ اب تو میں آپ
کو انسان نہیں فرشتہ سمجھتا ہوں ۔ شراب چھوڑ کر آپ نے ایک مثال
قائم کی ہے ۔ اسی لئے تو آپ سے ملنے کی ہمت پڑی ہے ۔"
اس کے بعد جگر صاحب سنجیدہ ہو کر بولے "صاحب! انسان
زندگی میں عجیب عجیب مقامات سے گذرتا ہے ۔ اس کو خود خبر نہیں ہوتی
کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے ۔ لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے انسان
کو اپنے آپ پر قابو ہونا چاہیے ۔"
میں نے جواب دیا "لیکن انسان مجبور بھی تو ہوتا ہے ۔"
جگر صاحب کہنے لگے "میں انسان کو مجبور نہیں سمجھتا ۔ اگر وہ
قوت ارادی سے کام لے تو سب کچھ کر سکتا ہے ۔"
جگر صاحب کی یہ باتیں سن کر مجھے خوشی ہوئی ۔ کیوں کہ میں
اب تک ان کے بارے میں یہی سمجھتا تھا کہ وہ دوسرے غزل گو شاعروں
کی طرح زندگی سے بیزار، حالات سے ناآسودہ اور ماحول کے شکوہ سنج
ہوں گے ۔ انسان کی مجبوری اور معذوری کا احساس انہیں بہت شدید ہوگا
لیکن صورت حال اس کے برعکس نظر آئی ۔ اور میں نے انہیں زندگی اور
جولانی، حوصلے اور ولولے سے بھرپور پایا ۔"
یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ چائے آگئی ۔
میں ہمیشہ چائے بنانے کے لئے خود تیار ہو جاتا ہوں ۔ چنانچہ
اس روز بھی میں نے حسب عادت ایسا ہی کرنا چاہا لیکن جگر صاحب نے
مجھے روک دیا اور کہنے لگے "چائے میں خود بناؤں گا ۔"
میں نے کہا "نہیں میں بنائے دیتا ہوں ۔ آپ کو زحمت ہوگی ۔"
کہنے لگے "زحمت کی کوئی بات نہیں ۔ اس وقت تو آپ مہمان ہیں ۔"
میں نے کہا "مجھے شرم آتی ہے میں چھوٹا ہوں یہ کام مجھے کرنے دیجئے ۔"
اس پر جگر صاحب نے کہا "جب میں آپ کے یہاں جاؤں گا تو
آپ کو ایسا کرنے کی پوری آزادی دی جائے گی ۔"
غرض جگر صاحب نہیں مانے ۔ اور انھوں نے اپنے ہاتھ
سے چائے بنا کر مجھے دی ۔
دیر تک ہم لوگ چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے ۔ انسانیت،
معاشرت، تہذیب، اخلاق، ادب، شاعری، تصوف، فلسفہ، غرض
بے شمار موضوعات پر ہم نے باتیں کیں ۔ ان باتوں نے جگر صاحب
سے مجھے بہت قریب کر دیا ۔ مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ وہ کس مزاج
کے آدمی ہیں، ان کے خیالات و نظریات کیا ہیں اور زندگی کی کون سی
قدریں انہیں عزیز ہیں ۔
اس کے بعد جگر صاحب سے بے شمار ملاقاتیں ہوئیں ۔ دوسرے
تیسرے مہینے وہ ضرور لکھنؤ آتے اور ملنے کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور
نکل آتی تھی ۔ ان ملاقاتوں نے مجھے جگر صاحب سے بہت قریب کر دیا ۔
ان کی شفقت اور محبت میرے لئے ایک دولت بیش بہا ثابت ہوئی
میں نے ان کی صحبت میں زندگی کے بعض بہت ہی بیش قیمت لمحے
گذارے ۔ ان سے بہت کچھ سیکھا ، اور انہیں قریب سے دیکھنے، جاننے
اور سمجھنے کے بھی مواقع ملے ۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ملاقاتیں اچھی خاصی

دوستی میں تبدیل ہوگئیں۔ اور کئی سال کا عرصہ اسی طرح گذر گیا۔

پھر ایک دفعہ ایسا موقع بھی آیا کہ جگر صاحب سے میری لڑائی ہوگئی۔ لڑائی بھی اسے نہیں کہہ سکتے۔ بس ایک بات ایسی ہوگئی کہ کچھ ملال سا ہوا اور میں نے تہیہ کرلیا کہ اب ان سے کبھی نہیں ملوں گا۔
وہ دوست کم اور مشاعروں میں شرکت کرنے والے پیشہ ور شاعر زیادہ ہیں۔

بات یہ ہوئی کہ دلی میں اینگلو عربک کالج سوسائٹی نے اپنے سالانہ اجلاس کے موقع پر ایک مشاعرے کا پروگرام بھی بنایا تھا۔ اس کا مقصد اس سوسائٹی کے تعلیمی اداروں کے لئے چندہ فراہم کرنا تھا تقسیم سے قبل اس سوسائٹی کے زیر اہتمام کئی اسکول شہر کے مختلف حصوں میں چل رہے تھے۔ ایک کالج جس کے سرپرست قائد اعظم محمد علی جناح اور صدر شہید ملت نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب مرحوم تھے۔ کالج کی مالی حالت تو خراب نہیں تھی، البتہ اسکول بُرے حال میں تھے۔ ان اسکولوں میں زیادہ تعداد ایسے مسلمان بچوں کی تھی جو بہت غریب تھے، اور جن کے لئے معمولی فیس دینی بھی مشکل تھی۔ چنانچہ اینگلو عربک سوسائٹی کے کارکنوں نے یہ سوچا کہ سالانہ اجلاس کے ساتھ ایک مشاعرہ بھی کردیا جائے۔ اس سے جو آمدنی ہوگی، اس سے کچھ اسکولوں کا حال بہتر ہوجائے گا اور کچھ ان اسکولوں کے طالب علموں کی مالی امداد ہوجائے گی۔ قرعۂ فال میرے نام پڑا اور متفقہ طور پر یہ بات طے پائی کہ مشاعرے کا سارا انتظام مجھے کرنا ہوگا۔ کام نیک تھا، اس لئے میں نے اسے قبول کرلیا اور اس مشاعرے کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب قبلہ سے صدارت کے لئے درخواست کی۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ وہ میری بات کبھی ٹالتے نہیں۔ وہ تیار ہوگئے۔ شاعروں کو خطوط لکھے۔ تقریباً تمام اہم شاعروں نے اس میں شرکت کرنے کا وعدہ کرلیا۔ حسرت، جوش، سیماب، روش، ساغر، مجاز، جاں نثار اختر، جذبی وغیرہ کے جواب آگئے۔ ان میں سے بیشتر نے یہی لکھا کہ انھیں تاریخوں میں دلی ریڈیو سے ایک مشاعرہ ہونے والا ہے۔ سب لوگ دلی ہی میں ہوں گے۔ اس لئے عربک سوسائٹی کو انھیں سفر کا بوجھ بھی نہیں اٹھانا پڑے گا۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی کہ تمام شعراء نے اس مشاعرے کی اہمیت کو محسوس کیا اور میری بات مان لی۔

صرف جگر صاحب کا یہ جواب آیا کہ وہ پانچ سو روپے لیں گے کیونکہ یہ ان کا اصول ہے۔ اور جہاں تک مشاعروں میں شرکت کرنے کا تعلق ہے، وہ اس اصول کو توڑنے کے لئے تیار نہیں۔

جگر صاحب کے اس جواب کو پڑھ کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے پھر انہیں خط لکھا کہ اردو کے تقریباً تمام چوٹی کے شاعروں نے میری بات مان لی ہے اور وہ بغیر کسی معاوضے کے اس مشاعرے میں شریک ہو رہے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کو معاوضے کی اتنی رقم کیسے دی جائے۔ عربک سوسائٹی کا حال بھی اچھا نہیں ہے۔ ایسی صورت میں میری گذارش یہی ہے کہ آپ ریڈیو کے مشاعرے میں تو دلی تشریف لا ہی رہے ہیں اس مشاعرے میں بھی میری خاطر شرکت کرلیجئے گا۔ اس مشاعرے کا مقصد کاروباری نہیں ہے۔ مسلمانوں کے چند تعلیمی اداروں اور مسلمان طالب علموں کی خدمت ہے۔ لیکن جگر صاحب اس کے باوجود نہیں مانے۔ جواب آیا کہ میں اپنے اصول کو نہیں توڑ سکتا۔ اس لئے مشاعرے میں شریک ہونے سے معذور ہوں۔

اس جواب کے بعد میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ اور جن شاعروں نے وعدہ کرلیا تھا، ان کے ناموں کا اعلان کردیا کہ وہ عربک کالج سوسائٹی کے مشاعرے میں شرکت کر رہے ہیں۔ اس میں صرف جگر صاحب کا نام نہیں تھا۔ جگر صاحب ریڈیو کے مشاعرے میں شرکت کرنے کی غرض سے دلی آگئے تھے۔ اور انہیں علم ہوگیا تھا کہ مشاعرہ فلاں تاریخ کو ہو رہا ہے، اور اس میں تقریباً تمام چوٹی کے شاعر شریک ہو رہے ہیں۔ انھیں یہ بھی علم تھا کہ ان شاعروں نے صرف میری خاطر اس مشاعرے میں شریک ہونے کا وعدہ کیا ہے۔

مشاعرے کی تاریخ آگئی۔ مشاعرہ ٹھیک وقت پر بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ ہزارہا آدمی سامعین کی حیثیت سے جمع ہوئے۔ پنڈال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری دلی مشاعرے میں آگئی ہے جن شاعروں نے وعدہ کیا تھا وہ بھی سب کے سب پہنچ گئے۔ بابائے اردو کی اجازت سے میں نے مشاعرے کی کارروائی کا آغاز کیا۔ شروع میں میں نے سامعین کے سامنے ان تمام شعراء کے نام پڑھ کر سنا دیئے جو

شاعرے میں موجود تھے، اور یہ بھی کہہ دیا کہ صرف جگر صاحب اس
شاعرے میں موجود نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کا قیام دلی میں ہے لیکن وہ
ان مجبوریوں کے باعث اس محفل میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس
اعلان کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا، اور بابائے اردو کے افتتاحی خطبے
کے بعد شعرا اپنا اپنا کلام سنانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہی مشاعرہ گرم ہوگیا
اور لوگ اس میں لطف لینے لگے۔ یہ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا
تھا اور پھولا نہیں سماتا تھا کہ میری کوشش بار آور ہوئی اور دلی کی تاریخ
میں یہ مشاعرہ ایسا ہوا ہے کہ لوگ اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اس وقت
غالباً گیارہ ساڑھے گیارہ کا وقت ہوگا۔ غالباً روش صدیقی اس وقت
پڑھ رہے تھے۔ ابھی انھوں نے غزل کا مطلع ہی پڑھا تھا کہ پیچھے کی صفوں
میں دروازے کے قریب کچھ شور ہوا۔ میں سمجھا لوگوں کو سنائی نہیں دے رہا
ہے یا کوئی اور بات ہوگئی ہے کہ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ جگر صاحب
صدر دروازے سے پنڈال میں داخل ہوئے۔ کئی لوگ ان کے ساتھ تھے
میں انھیں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آخر کیسے آگئے۔ انھوں نے انکار کر دیا تھا
لیکن حیرت کے ساتھ مجھے خوشی بھی ہوئی اور یہ یقین ہوگیا کہ یہ مشاعرے میں
شریک ہونے ہی کی غرض سے آئے ہیں۔ میں اسٹیج سے نیچے اترا اور جگر
صاحب کے قریب پہنچا۔ ہم دونوں کی عجیب کیفیت تھی، نہ وہ مجھ سے
کچھ کہہ سکے نہ میں ان سے کچھ پوچھ سکا۔ انھوں نے سامنے کی صفوں میں
نیچے بیٹھنے کی کوشش کی لیکن میں انھیں اسٹیج پہ لے گیا۔ اور ان سے بغیر
پوچھے ہوئے یہ اعلان کیا کہ جگر صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ یہ
ہم سب کی خوش قسمتی ہے۔ وہ ضرور اپنا کلام سنائیں گے۔ اس کے بعد
روش صاحب نے اپنی غزل جناب صدر اور سامعین کی فرمائش پر
از سر نو مطلع سے شروع کی۔ اور جگر صاحب میری طرف متوجہ ہوئے
کہنے لگے "بالآخر مجھے آنا ہی پڑا"

میں نے کہا "آپ کی اس نوازش کا کس طرح شکریہ ادا کروں
آپ نے میری آبرو رکھ لی"

کہنے لگے "اگر نہ آتا تو زندگی بھر ایک خلش سی رہتی"

میں نے کہا "جگر صاحب آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ مجھے اس
وقت کتنی خوشی ہوئی ہے اور یہی حال ان لوگوں کا بھی ہے جو اس وقت
یہاں جمع ہیں"

اب جگر صاحب کا موڈ کچھ ٹھیک ہو چکا تھا۔ چنانچہ انھوں
نے ڈبیا میں سے نکال کر اپنا پان کھایا اور ہنس کر کہنے لگے "آپ
میں بڑی کشش ہے۔ نہ آنے کی بہت کوشش کی لیکن آنا ہی پڑا"

میں نے کہا "جگر صاحب آپ بہت بڑے [illegible] ہیں"

یہ سن کر جگر صاحب تو خاموش ہوگئے۔ لیکن مشاعرے کے
صدر (بابائے اردو) مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اور اگرچہ
انھوں نے کچھ کہا نہیں لیکن میں نے یہ محسوس کر لیا کہ انہیں میرا اس
طرح باتیں کرنا پسند نہیں ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ بات آداب مشاعرہ
کے خلاف تھی۔

روش صاحب کی غزل کا ایک شعر بھی میں نہ سن سکا۔ جتنی
دیر وہ غزل پڑھتے رہے میں جگر صاحب کے ساتھ گفتگو میں مصروف
رہا اور مولوی صاحب مجھے برابر گھورتے رہے۔ لیکن میں مجبور تھا
بات ہی کچھ ایسی تھی۔ جگر صاحب کچھ اس طرح آئے تھے کہ ان سے بات
کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اس لئے آداب مشاعرہ کی خلاف ورزی مجھے
کرنی پڑی۔

بالآخر جگر صاحب نے تمام شعراء کے بعد اپنا کلام سنایا۔ سامعین
کا یہ عالم تھا کہ جیسے انہیں کوئی بیش بہا دولت مل گئی ہے۔ باصرار فرمائش
کر کے انھوں نے جگر صاحب سے کئی غزلیں سنیں۔ اور اس طرح وہ مشاعرہ
رات گئے تک خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رہ کر بخیر و خوبی ختم ہوگیا۔
سب لوگ رخصت ہوگئے۔ جگر صاحب بھی چلے گئے۔ اللہ
پھر میں یہ سوچتا رہا کہ میں نے جگر صاحب کے ساتھ زیادتی کی۔ اس
معاملے میں غصہ نہیں آنا چاہئے تھا۔ خط و کتابت میں لہجے کی ترشی کا
اچھی بات نہیں تھی۔ جگر صاحب ایک عظیم انسان ہیں ان کی بڑائی کی
یہ ہے کہ وہ ان باتوں کا خیال کئے بغیر میری خاطر مشاعرے میں بغیر
اطلاع کے آگئے۔ اسی لئے کہ وہ میرا دل رکھنا چاہتے تھے۔ کوئی اور شخص
ان واقعات کے بعد شاید ایسا کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ لیکن جگر صاحب
نے ان باتوں کو بھلا دیا۔ اپنے اصول توڑ دیے اور اپنے ایک نیاز مند کی
خواہش پوری کر دی۔

اس واقعے نے جگر صاحب کی عظمت کے ایسے نقوش میرے دل پر ثبت کئے ہیں جو کبھی ماند نہیں پڑ سکتے۔ اس کے بعد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کی خلوص اور محبت، نیکی اور شرافت، دوستی اور انسانیت کا قائل ہو گیا۔ یہ حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی کہ انسان دوستی ان کی گھٹی میں پڑی ہے وہ ہر انسان کا خیال رکھتے ہیں اور جس سے ذرا سا بھی تعلق ہوتا ہے، اس کے لئے تو وہ اپنی انفرادیت تک کی بازی لگا دیتے ہیں۔ لوگوں کی مدد کرنا اور دوستوں کی خاطر اپنے تن من دھن کی بازی لگا دینا ان کے مزاج میں داخل ہے۔

جگر صاحب بڑے پُر خلوص آدمی تھے انہیں روپے پیسے سے ذرا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ مشاعرے میں شرکت کے لئے انھوں نے بعض اصول ضرور بنا رکھے تھے، اور وہ اس سلسلے میں دوستوں تک سے صاف صاف بات کرتے تھے لیکن انھیں دولت کی ہوس مطلق نہیں تھی۔ وہ معاوضے کے معاملے میں اکثر اڑ جاتے تھے لیکن اس کا سبب ایک اصول تھا جس کو بہت عزیز رکھتے تھے ملک میں ان کی بڑی قدر تھی۔ کوئی مشاعرہ ان کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے مشاعروں سے خاصی آمدنی تھی لیکن یہ رقم وہ اپنے اوپر خرچ نہیں کرتے تھے۔ اس کا زیادہ حصہ ان کے عزیزوں اور دوستوں کی نذر ہو جاتا تھا وہ ان میں سے ہر ایک کا خیال رکھتے تھے، اور بعضوں کی تو پرورش انھوں نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ عزیزوں اور رشتے داروں کے علاوہ بعض ضرورت مند دوستوں کی بھی مدد کرتے تھے، اور یہ مدد کچھ اس طرح ہوتی تھی کہ اس دوست کو احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً اگر سخت سردی پڑ رہی ہے اور کسی ضرورت مند دوست کے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں تو وہ اسے کچھ اس طرح کپڑے دیں گے کہ گویا ان کپڑوں کی ضرورت انھیں نہیں تھی اور ان کا بہترین مصرف یہ ہے کہ وہ دوست اس کو استعمال کرے۔ ایک صاحب کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ اس واقعے کو میں نے مختلف لوگوں کی زبانی سنا ہے۔ خود انھوں نے اس کو اپنے ایک مضمون میں لکھ بھی دیا ہے۔ اس لئے انہیں کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں۔

"گفتگو کے دوران میں جگر صاحب کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں ان دنوں دلی کی خوبصورت سڑکوں پر بیکار مارا مارا پھرتا ہوں اور مجھے ابھی تک کوئی ایسا کام نہیں مل سکا ہے جو میری معمولی ضرورتوں کی کفیل ہو جائے۔ کچھ اندازہ وہ انھوں نے میری حالت سے بھی لگا لیا۔ جنوری کی ان ابتدائی تاریخوں میں جب سردی کی مار اپنے عروج پر تھی میرے پاس اپنے بدن کی حفاظت کے لئے معمولی سا سوئٹر بھی نہ تھا اور میں صرف کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ جب ہم اٹھنے لگے تو جگر صاحب نے مجھے روک لیا "آپ ذرا ٹھہرئیے کچھ کام ہے" اتنا کہہ کر سرہانے سے لیٹر پیڈ اٹھایا اور کچھ لکھنے لگے۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ قلم کی رفتار سست تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے میں تین صفحے لکھ سکے۔ انھیں الگ کر کے تہہ کیا اور وہ مجھے دیتے ہوئے بولے "یہ میرا خط ہے جامعہ ملیہ میں حامد علی خاں صاحب کو پہنچا دیجئے۔" میں خط لے کر اٹھنے لگا تو پھر کہا "آپ سردی کی پروا نہیں کرتے" میں نے ہنس کر جواب دیا "جی ہاں مجھے سردی زیادہ محسوس نہیں ہوتی"۔ میرے جواب پر ایک ایسے بزرگانہ انداز میں مسکرائے جس کی تشریح میرے لئے ممکن نہیں۔ اور اپنا سوئٹر اتار کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "پھر بھی یہ پہن لیجئے۔" مجھے انکار کی تاب نہ ہو سکی۔ میں نے وہ سوئٹر لیکر پہن لیا۔ یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ وہ تین صفحے کا جو طویل خط جامعہ ملیہ کی پبلشنگ برانچ کے اس وقت کے انچارج، حامد علی خاں صاحب کو لکھا گیا تھا۔ اس کی غرض وغایت صرف اتنی تھی کہ مجھے وہاں سے کوئی کام مل جائے۔ جگر صاحب نے خط میں مجھے اپنا ایک قریبی عزیز ظاہر کیا تھا۔"

(نصرت، لاہور، ۱۸ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء)

یہ واقعہ جگر صاحب کی انسانیت اور انسان دوستی کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے اور اسی پر کیا منحصر ہے ایسے نہ جانے کتنے واقعات ہیں جو جگر صاحب کی شخصیت کے اس پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔ وہ کسی شخص کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ خدمت کا خیال ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ خلوص ان کا ایمان تھا۔ محبت کو وہ نصب العین سمجھتے تھے۔ اور ان سب باتوں کا مظاہرہ ان کی حرکات و سکنات اور طور طریقوں سے ہوتا رہتا تھا۔ وہ خود کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ انھوں نے کسی کے ساتھ کیا کیا ہے کبھی بھولے سے بھی وہ ان باتوں کا ذکر نہیں کرتے تھے اور اشارتاً اور کنایتاً بھی اس کا اظہار نہیں ہوتا تھا کہ انہوں نے کس کی کتنی مدد کی ہے۔

چند سال ادھر کی بات ہے لاہور سے ایک ناشر جگر صاحب کے پاس بہت آتے تھے۔ بھیگی بلی بن کر ان کے سامنے بیٹھتے تھے جیسے ان سے ڈرتے ہوں۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ بچھے جا رہے ہیں۔ کوئی دیکھتا تو یہ سمجھتا کہ ان سے زیادہ جگر صاحب کا کوئی اور دوست اور عزیز نہیں ہے۔ جگر صاحب انھیں جانتے بھی نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے چند روز ان کے پاس بیٹھ کر انھیں یہ احساس دلایا کہ وہ ناشر کم اور دوست زیادہ ہیں۔ اور ان کی اس میل ملاقات کا سبب عقیدت اور محبت ہے۔ جگر صاحب بھی سمجھنے لگے کہ وہ واقعی پُرخلوص آدمی ہیں۔ چنانچہ ان سے بڑی محبت سے پیش آنے لگے۔ انھوں نے دعوتیں کیں جگر صاحب نے قبول کرلیں۔ دو ایک محفلیں منعقد کیں ان میں بھی وہ شریک ہوتے۔ اور اس طرح میل ملاقات کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

ایک روز یہ صاحب آتے اور جگر صاحب سے کہنے لگے۔ "میں آپ کی کوئی کتاب چھاپنا چاہتا ہوں"

جگر صاحب نے جواب دیا "میرے پاس فی الحال تو کوئی کتاب تیار نہیں ہے۔ تیار کروں گا تو دیکھا جائے گا" اس پر وہ صاحب کہنے لگے "میری یہ دلی خواہش ہے۔ کتاب ایسی چھاپوں گا کہ زندۂ جاوید ہوجائے گی"

جگر صاحب نے کہا "کیا آپ مجھے بھی زندۂ جاوید کردیں گے؟"

انھوں نے جواب دیا "کتاب زندۂ جاوید ہوگی تو مصنف بھی زندۂ جاوید ہوجائے گا"

جگر صاحب کہنے لگے "پھر تو بہت اچھی بات ہے"

ناشر صاحب بولے "پبلشر ہی مصنف کو زندۂ جاوید بناتا ہے۔ کتاب اگر اچھی نہ چھپے تو کون پڑھے گا" جگر صاحب کو یہ باتیں ناگوار ہوتیں لیکن انھوں نے ان کو ناشر کی حماقت پر محمول کرکے مذاق میں ٹال دیا۔

بات آئی گئی ہوگئی۔

ایک سال گزر گیا۔ اس عرصے میں مختلف طریقوں سے ناشر صاحب نے جگر صاحب کو یہ احساس دلایا کہ ان کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ اگر جگر صاحب انھیں اپنی کتاب اشاعت کے لئے دے دیں گے تو خاصا سہارا مل جائے گا اور حالت کچھ بہتر ہوجائے گی۔ ظاہر ہے جگر صاحب اس کے بعد انکار نہیں کرسکتے تھے۔ یہ ان کی کمزوری تھی۔ کسی شخص کو ان کی ذات سے فائدہ پہنچتا ہو تو وہ اپنا نقصان بھی گوارا کرلیتے تھے۔

جگر صاحب نے کتاب چھاپنے کے لئے دے دی۔ یہ طے پایا کہ یہ صاحب ایک ہزار کا ایڈیشن چھاپیں گے۔ خدا جانے تحریری معاہدہ ہوا یا نہیں۔ طباعت کا کام شروع کردیا گیا۔ تھوڑی بہت رقم بھی انھوں نے جگر صاحب کو دی۔ وہ انھوں نے لے لی اور اس کو عزیزوں دوستوں پر خرچ کردیا۔

چند مہینوں میں کتاب چھپ کر آگئی۔ لیکن جگر صاحب اس کو دیکھ کر ذرا بھی خوش نہیں ہوتے۔ ناشر نے ان کے کلام کی ترتیب بدل دی تھی، اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ایک پیش لفظ بھی اپنے نام سے لکھ دیا تھا۔ جگر صاحب کو یہ باتیں ناگوار ہوتیں۔ انھوں نے مجھ سے اس کا اظہار بھی کیا لیکن کسی اور سے کچھ نہیں کہا۔ بعد میں انہیں یہ بھی اطلاع ملی کہ ناشر نے پلیٹیں بھی نکلوا لی ہیں اور ان کی نیت خراب ہے۔ اگرچہ یہ بھی صریحاً معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔ لیکن اس پر بھی وہ کچھ نہ بولے۔

دن گزرتے گئے۔ کتاب فروخت ہوتی رہی۔ خدا جانے سال ڈیڑھ سال میں اس کے کتنے نسخے فروخت ہوگئے۔ ایڈیشن ختم ہوگیا۔ لیکن ناشر صاحب یہی کہتے رہے کہ ادبی کتاب بکتی نہیں، اور اس سے ناشر کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کہیں جگر صاحب رائلٹی کی رقم نہ طلب کریں۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ شاید انھیں روپے کی ضرورت نہیں تھی، اور ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ انھوں نے تو ناشر کی مدد کی ہے۔ اس سے کوئی کاروباری معاملہ نہیں کیا ہے۔

لیکن چند مہینے کے بعد اتفاق ایسا ہوا کہ جگر صاحب کو کچھ روپے کی ضرورت پیش آگئی بات یہ ہوئی کہ ایک دن انارکلی میں کسی شخص نے ان کا بٹوا جیب میں سے نکال لیا۔ اس میں کوئی گیارہ سو روپے تھے۔ یہ رقم انھوں نے اپنے کسی عزیز کو دینے کے

پڑ گئی تھی کسی اور جگہ سے تو اب اتنی رقم ملنے کی توقع نہیں تھی۔ اس
لئے انھوں نے سوچا کہ کتاب کے ناشر سے کچھ رقم طلب کر لی جائے۔
ظاہر ہے کہ اس نے کتاب کا ایک ایڈیشن فروخت کیا ہے۔ اس کے
پاس کچھ روپیہ ضرور ہوگا۔ چنانچہ وہ ناشر کے پاس گئے۔ یہ سارا قصہ
سنایا اور رائلٹی کی جائز رقم طلب کی۔ لیکن وہاں سے جواب یہ ملا کہ
آجکل کاروبار کی حالت کچھ اور بھی خراب ہوگئی ہے۔ کیونکہ ایک پریس
بھی لگالیا ہے۔ اس کے اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ ساری رقم اسی
میں پھنسی ہوئی ہے۔ کچھ آجکل تو انہیں خود روپے کی ضرورت ہے۔
جگر صاحب کو یقین آگیا کہ یہ باتیں صحیح ہیں۔ اور وہ خود شرمندہ
ہوتے کہ انھوں نے ایک ایسے شخص کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار
کیوں کیا جو خود ضرورت مند ہے۔ اس زمانے میں وہ جب ابھی ملتے تو
اس واقعے کا تذکرہ ضرور کرتے۔

اور پھر اسی زمانے میں چند روز کے اندر ان کے پاس کہیں
سے ہزار روپے کی رقم آگئی۔ اس رقم کو لے کر وہ سب سے پہلے اپنے
ناشر کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ آجکل پریشان ہیں۔ آپ کو روپے
کی ضرورت ہے۔ میرے پاس ایک جگہ سے کچھ رقم آگئی ہے۔ سوچا آپ
کو یہ رقم دے دوں۔ یہ رقم لے لیجئے۔ میں اس وقت اسی مقصد سے
آپ کے پاس آیا ہوں۔"

یہ سن کر ناشر کے تو ہوش اُڑ گئے۔ غیرت سے پانی پانی
ہوگیا۔ جگر صاحب کی بڑائی اور عظمت آخر کہاں تک اس پر اثر نہ کرتی۔
اس نے رقم لینے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ اب حالات کچھ بہتر ہوگئے
ہیں۔ ایک جگہ سے کچھ روپیہ قرض مل گیا ہے۔"
جگر صاحب نے پھر بھی ضد کی اور کہا "اس روپے سے آپ
قرض ادا کر دیجئے۔ خواہ مخواہ آپ پر بوجھ رہے گا۔" لیکن وہ رقم ناشر نے
نہیں لی۔

اس واقعے کے بعد خود انھیں اس بات کا احساس ہوگیا ہوگا کہ
جگر صاحب بہ حیثیت انسان کے کتنے عظیم ہیں۔ وہ دوسروں کی مدد
کرنے کے لئے کس طرح تیار رہتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں خلوص
اور محبت کا رنگ کیسا رچا ہوا ہے۔ یقیناً اسی احساس نے انھیں وہ رقم
لینے سے باز رکھا ہوگا جو جگر صاحب اس وقت انہیں دینا چاہتے تھے۔
انسانیت کی تاریخ میں کسی ادیب اور شاعر نے ناشر کے
ساتھ ایسا دوستانہ برتاؤ نہیں کیا ہوگا خصوصاً ایسے ناشر
کے ساتھ جس نے اس کے کلام کی ترتیب میں ردّ و بدل کر کے تعداد
سے زیادہ نسخے چھاپ کے اور پوری رقم ادا نہ کر کے زیادتی بھی کی ہو۔
یہ سب کچھ جگر صاحب ہی کر سکتے تھے۔

اس واقعے کی روداد جب مجھے ایک صاحب سے معلوم
ہوئی تو میں نے ایک دن موقع پاکر جگر صاحب سے اس کی تصدیق کی۔
کہنے لگے "واقعہ تو یہ صحیح ہے لیکن آپ کو اس کا علم کیسے ہوا؟"
میں نے کہا "جگر صاحب بات کبھی چھپتی نہیں"
کہنے لگے "یہ ایسی بات ہے کہ میں چاہتا تھا کسی کو اس کا
علم نہ ہو۔"
میں نے کہا "آپ نے تو حد ہی کر دی" میں تو سوچ بھی
نہیں سکتا تھا کہ آپ ایسا کریں گے۔" خصوصاً ان حالات میں کہ جب خود
آپ کو روپے کی ضرورت تھی۔"
جگر صاحب مسکراتے اور کہنے لگے "مجھے اپنی ضرورت سے
زیادہ ان کی ضرورت کا خیال تھا۔ میرے کام تو نکل ہی جاتے ہیں۔"
میں نے پھر کہا "پھر وہ رقم انھوں نے لے لی؟"
جگر صاحب بولے "مجھے اسی بات کا تو افسوس ہے کہ انہوں
نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید انھیں ضرورت نہیں تھی۔ خیر میرا فرض
ادا ہوگیا۔"

میں نے دوران گفتگو میں یہ محسوس کیا کہ جگر صاحب اس
موضوع پر زیادہ بات کرتے ہوئے گھبرا رہے ہیں۔ اس لئے موضوع بدل
دیا۔ دوسرے موضوعات پر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن میرے
ذہن میں ان کی دوستی اور محبت، اخلاص مندی اور انسانیت کے خیالات
منڈلاتے رہے۔ اور میں یہ سوچتا رہا کہ وہ واقعی عظیم انسان ہیں۔ اپنے
اوپر جبر کر کے دوسروں کی خدمت کرنا انہی کا کام ہے۔ وہ ساری
زندگی دوسروں کے گریبان سینے کی کوشش کرتے رہے اور اس
کوشش میں خود ان کا گریبان تار تار ہوگیا۔ لیکن انھوں نے اس کی

پروا نہیں کی۔ یہ سب کچھ ایک ایسا ہی شخص کرسکتا ہے جس کے دل میں انسانیت کا درد ہو۔ جگر صاحب کے دل میں انسانیت کا یہ درد تھا کسی کی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ضرورت کے وقت وہ دشمن تک کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ لیکن ان کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ کیونکہ دشمن کو بھی وہ ہمیشہ دوست ہی سمجھتے تھے اور دوستوں ہی کی طرح اس کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے۔ جب شخص کا نصب العین محبت اور خدمت ہو اس سے بھلا کوئی دشمنی کیسے کرسکتا ہے۔

جگر صاحب کی لغت میں دشمنی کا لفظ نہیں تھا۔ وہ ہر شخص کے دوست تھے اور ہر شخص ان کا دوست تھا۔ جو بھی ان سے ایک دفعہ مل لیتا وہ ان سے بار بار ملنے کی کوشش کرتا، اور ان کی دوستی کا دم بھرتا۔ جگر صاحب بھی ہمیشہ اس کا خیال رکھتے۔ ہندوستان اور پاکستان کا کوئی مقام ایسا نہیں تھا جہاں ان کے دوست موجود نہ ہوں۔ ہر طبقے، ہر خیال اور ہر عمر کے لوگ ان کے دوستوں کی صف میں شامل تھے۔ جگر صاحب کے نزدیک دوستی کا یہ رشتہ بہت مقدس تھا اور وہ اس رشتے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ایک دفعہ جو دوست بن گیا وہ زندگی بھر کے لئے ان کا دوست تھا۔ اس سے تعلقات منقطع نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کا دوست ان سے ناراض نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ نہ تو خود ناراض ہوتے تھے نہ کسی دوست کو ناراض کر سکتے تھے۔ اس کی علیحدگی انہیں گوارا نہیں تھی۔ وہ خود کبھی اس کا موقع ہی نہیں دیتے تھے لیکن کبھی دو دوستوں کے درمیان آپس میں ذرا سی بھی کشیدگی پیدا ہو جاتی تو جگر صاحب بے چین ہو جاتے تھے۔ کسی کروٹ انھیں چین نہیں پڑتا تھا۔ کبھی کبھی کسی غلط فہمی کی بنا پر دوستوں کے درمیان وقتی کشیدگی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ جگر صاحب اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جب تک صلح صفائی نہ ہو جاتے۔ چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ ان کا کھانا، پینا تک حرام ہو جاتا تھا۔ ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔

ہم لوگوں کے دوستوں میں ایک صاحب زود رنج واقع ہوئے ہیں۔ غصہ تو ان کی ناک پر رکھا رہتا ہے۔ ذرا سی بات خلاف طبیعت ہوئی اور بس وہ ناراض ہوئے۔ جگر صاحب بھی انھیں بہت عزیز رکھتے۔ پختہ عمر کے آدمی تھے لیکن طبیعت بچوں کی سی تھی۔

چند سال ادھر کی بات ہے میرے ایک عزیز دوست نے ایک ادبی کانفرنس کا ڈول ڈالا۔ بڑے پیمانے پر کئی ادبی جلسے کئے۔ اس میں ایک اجلاس تنقید کے بارے میں تھا، دوسرا افسانے کے بارے میں تیسرا نظم کے بارے میں اور چوتھا غزل کے بارے میں۔ ان جلسوں کا مقصد یہ تھا کہ ان اصناف ادب میں ایک ایک تنقیدی مضمون کسی اچھے نقاد سے پڑھوایا جائے، اور اس کے بعد اہم افسانہ نگار اور شاعر اپنی اپنی تخلیقات پیش کریں۔ صدارت ایسے لوگ کریں جو ان موضوعات کے ماہر ہوں۔ سب اجلاس تو بخیر و خوبی ختم ہو گئے، لیکن جب آخری اجلاس غزل کے بارے میں شروع ہوا تو اس کے مجوزہ صدر صاحب موجود نہیں تھے۔ انھیں کسی ضرورت سے کہیں جانا پڑا۔ چنانچہ انہوں نے معذرت کر دی۔ کانفرنس کے کارکنوں نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے کہا کہ غزل کے اجلاسوں کے لئے جگر صاحب سے بہتر صدر کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ جگر صاحب سے میں نے درخواست کی۔ پہلے تو انہوں نے انکار کیا لیکن جب ضد کی تو مان گئے۔ جلسہ شروع ہوا اور جگر صاحب نے صدارت کی کرسی سنبھال لی۔ ادھر کوئی صاحب ہمارے دوست سے بھی صدارت کے لئے کہہ چکے تھے اور انھوں نے صدارت کرنے کے لئے تیاری کر لی تھی۔ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ جگر صاحب سے صدارت کے لئے درخواست کی گئی ہے تو یہ بات انھیں بہت ناگوار گزری اور حسب عادت ان کا منہ پھول گیا۔ وہ یہ توقع کر رہے تھے کہ اجلاس کی صدارت کے مستحق صرف وہ ہیں اور کانفرنس کے کارکنوں نے انھیں صدر نہ بنا کے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے، چنانچہ سخت ناراض ہو گئے۔ جلسے میں شرکت نہیں کی۔ اور اپنی جائے قیام پر واپس چلے گئے۔

جگر صاحب کو فوراً اس کا احساس ہو گیا، اور وہ چند لمحوں میں اس واقعے سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ جلسے کی کارروائی کو آگے بڑھانا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ بار بار پوچھتے تھے کہ وہ کہاں چلے گئے؟ ضرور ناراض ہو گئے ہوں گے۔ انھیں بلائیے۔ اور جب ان سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ اس کی وجہ صدارت ہے تب تو انہوں نے کانفرنس کے

کارکنوں کو چپکے چپکے برا بھلا کہنا شروع کیا - وہ تو کہئے جلسے کی کارروائی جاری تھی، اور جگر صاحب وہاں بندھے بیٹھے تھے - اگر ایسا نہ ہوتا تب تو وہ اچھا خاصا ہنگامہ ہی برپا کر دیتے -

جب تک جلسہ جاری رہا جگر صاحب بیٹھے رہے لیکن ان کی طبیعت پر ایک بوجھ سا رہا - جیسے جلسہ ختم ہوا، انہوں نے کہا کہ وہ حضرت ضرور خفا ہو گئے ہیں - انھیں منانے کے لئے چلنا چاہئے چنانچہ ہم لوگ جگر صاحب کے ساتھ ان کے پاس پہنچے - دیکھا تو واقعی ان کا پارہ چڑھا ہوا تھا - صدارت تو ایک بہانہ بن گئی - وہ ویسے ہی بھرے بیٹھے تھے - ان جلسوں کا انداز انھیں کچھ پسند نہیں آیا تھا - اس لئے جیسے ہی ہم لوگ ان کے پاس پہنچے - انھوں نے جلسے کے کارکنوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا، اور دیر تک جو کچھ جی میں آیا وہ کہتے رہے - جگر صاحب نے بھی ان کی باتیں سنیں، اور بہت کوشش کی کہ کسی طرح مان جائیں اور ان کا غصہ دور ہو جاتے لیکن وہ نہیں مانے - کہنے لگے ابھی واپس جا رہا ہوں - شام کو ڈنر میں بھی شریک نہیں ہوں گا - جگر صاحب نے بہت کہا لیکن وہ اپنے ارادے پر قائم رہے - سامان باندھ لیا اور گاڑی کے وقت کا انتظار کرنے لگے - اتفاق سے گاڑی آدھی رات جاتی تھی - اس لئے چند گھنٹے انھیں بہر حال ٹھہرنا پڑا - لیکن رات کو ڈنر میں شریک نہیں ہوتے - ڈنر کے موقع پر جگر صاحب کی حالت دیکھنے والی تھی - وہ اپنے اوپر جبر کر کے کھانا کھا رہے تھے لیکن باتیں اپنے دوست کے ناراض ہو جانے کی کر رہے تھے - ان کی ایک ایک بات سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں اس کا بہت صدمہ ہے -

اس عرصے میں وہ صاحب اسٹیشن جا چکے تھے - جگر صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ معذرت کرنے کی غرض سے خود پہنچے اور جب تک گاڑی روانہ نہیں ہوئی ان کے ساتھ رہے - انھیں سب سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ ایک بہت معمولی سی بات نے خواہ مخواہ ایک دوست کا دل دکھایا - وہ اسٹیشن سے رات گئے واپس آئے اور آرام کی غرض سے لیٹ گئے لیکن رات بھر انھیں نیند نہیں آئی - صبح کو بھی ان کی گفتگو کا موضوع یہی واقعہ تھا - غرض مہینوں ان پر اس واقعے کا اثر رہا - جب بھی بات چھڑتی تو وہ یہی کہتے کہ انسان میں بہت سی کمزوریاں ہوتی ہیں لیکن ان کمزوریوں کو نظر انداز کر دینا چاہئے - انسان کی بڑائی اسی میں ہے اور اگر ہر انسان اس پر عمل کرے تو یہ زندگی بہت حسین بن سکتی ہے -

جگر صاحب خود کبھی ناراض نہیں ہوتے تھے - میں نے انھیں کبھی غصے میں نہیں دیکھا - البتہ اگر ان کے کسی دوست کے خلاف کبھی کوئی بات ہو جاتی تو وہ اس کا بہت اثر لیتے تھے - بس ایسے مواقع پر کبھی کبھی ان کا مزاج برہم ہوتا تھا - ایک دو دفعہ تو ایسا ہوا کہ کسی دوست کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو گئی تو انہوں نے مشاعرے تک میں شریک ہونے سے انکار کر دیا -

چند سال قبل کوئٹہ میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا - جگر صاحب وہاں کسی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے گئے تھے - کچھ اور شاعر بھی ان کے ساتھ تھے - میں بھی ان دنوں کوئٹہ میں گرمیوں کا موسم گزار رہا تھا - جب مجھے یہ علم ہوا کہ جگر صاحب بھی مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے کراچی سے کوئٹہ آئے ہوتے ہیں تو میں ان سے ملنے گیا - معلوم یہ ہوا کہ کوئٹہ کی ایک ادبی انجمن نے چند ادبی جلسوں کا پروگرام بنایا ہے، اس میں ایک مشاعرہ بھی شامل ہے - یہ وہی انجمن تھی جس کے کارکن اس سے قبل مجھ سے مل چکے تھے، اور انہوں نے مجھ سے جدید ادب پر تقریر کرنے کے لئے کہا تھا - صبح کو میری تقریر ہونے والی تھی - شام کو مشاعرہ تھا - جگر صاحب کو میری تقریر کی اطلاع تھی - چنانچہ جب میں رخصت ہونے لگا تو کہنے لگے کل صبح ملاقات ہوگی - آپ کی تقریر کی اطلاع مجھے مل چکی ہے میں بھی اس جلسہ میں شریک ہوں گا -

صبح کو نو بجے کے قریب وہ جلسہ شروع ہوا - جگر صاحب اور دوسرے شعرا بھی اس میں آئے - جلسے کی صدارت جگر صاحب کو کرنی تھی لیکن وہ کسی معروفیت کی وجہ سے نہ آ سکے - ریڈیو کے ایک بڑے افسر بھی جلسے میں موجود تھے - کارکنوں نے ان کو صدر بنانا مناسب سمجھا - چنانچہ انھوں نے صدارت کی - میں نے جدید اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور جدید ادب کے تمام معاملات و مسائل پر مفصل بحث کی تاکہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے - ایک گھنٹے کی اس تقریر کو جگر صاحب غور سے سنتے رہے - اور جب

میں تقریر کرنے کے بعد ان کے پاس آکر بیٹھا تو بہت تعریف کی۔ اس وقت وہ بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔ لیکن میری تقریر کے فوراً ہی بعد صدر صاحب نے ایک تقریر شروع کر دی، خدا جانے وہ کب سے بھرے بیٹھے تھے کہ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں مجھ کو خوب خوب ہدف بنایا۔ میری تقریر پر بے شمار اعتراضات کئے۔ ان کی گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ جو تقریر اس وقت ہوئی ہے، وہ بالکل مہمل ہے۔ اس سے تمام حاضرین کی طبیعت بدمزہ ہوئی۔ بظاہر اس کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ میں نے اپنی تقریر میں جدید ادب پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کا نام نامی نہیں لیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنے آپ کو جدید دور کا ایک اہم شاعر بھی سمجھتے ہیں۔ جگر صاحب میرے برابر بیٹھے ہوئے اس صدارتی تقریر کو سنتے رہے۔ میں ان کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ان کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ انہوں نے دو ایک بار یہ آواز بلند اس کا اظہار بھی کیا کہ صدر صاحب کی باتیں مہمل ہیں۔ ان کا اصل تقریر سے کوئی تعلق نہیں۔ جگر صاحب کی بات سن کر سامعین میں بھی کچھ برہمی سی پیدا ہوئی۔ اور کچھ بدمزگی کے آثار نظر آنے لگے تو میں نے کھڑے ہو کر مداخلت کی، اور یہ کہا کہ صدر صاحب کے ارشادات کو غور سے سننا چاہیے۔ صدارتی تقریر کبھی بحث کا موضوع نہیں بنتی۔ اس پر کچھ فضا بدلی۔ لیکن جگر صاحب برہم رہے۔

جلسے کے آخر میں بعض لوگوں نے جگر صاحب اور دوسرے شعراء سے کلام سنانے کے لئے گذارش کی لیکن جگر صاحب کی طبیعت اس وقت تک ایسی بدمزہ ہو چکی تھی کہ انہوں نے اس کو منظور نہیں کیا اور اصرار کے باوجود کلام سنانے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ دوسرے شعراء نے ایک ایک غزل سنائی اور جلسہ برخاست ہو گیا۔ اور جگر صاحب کے ساتھ ہم سب لوگ اٹھے۔ اس روز کسی صاحب نے دن کے کھانے کی دعوت کی تھی۔ وہاں پہنچے۔ جگر صاحب پر اس واقعے کا اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ اس روز سوائے اس کے کسی اور موضوع پر بات نہ کر سکے۔ میں نے موضوع بدلنے کی بہت کوشش کی لیکن جگر صاحب پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ چونکہ نشانہ میں ہی بنا تھا۔ اس لئے وہ مجھ ہی سے اس بدمزگی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اگرچہ مجھ پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں تھا لیکن جگر صاحب یہ سوچ کر باتیں کر رہے تھے کہ مجھے بہت تکلیف پہنچی ہے، اور میرا دل دکھا ان کا فرض ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی تمام باتیں میری دلجوئی کے لئے تھیں۔

جگر صاحب انجمن کے کارکنوں سے بھی ناراض ہوئے۔ کہنے لگے

"یہ لوگ بھی نہایت واہیات ہیں۔ انہوں نے ایک واہیات اور بیہودہ گو شخص کو صدر کیوں بنایا۔ میں ان کے مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گا۔"

اب میں نے سوچا کہ بات بگڑتی جا رہی ہے۔ اگر جگر صاحب مشاعرے میں شریک نہ ہوئے تو غضب ہی ہو جائے گا۔ مشاعرے میں کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکے گی اور بہت سے لوگوں کی آرزوؤں کا خون ہو جائے گا۔ اس لئے میں نے کہا۔

"مشاعرے میں تو آپ کو ضرور شریک ہونا چاہئے۔"

جگر صاحب بولے "میرا خیال یہ ہے کہ ہم یہاں سے کسی کو بھی مشاعرے میں شرکت نہیں کرنی چاہئے۔"

میں نے کہا "مشاعرے کا اس جلسے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے ان دونوں کو آپس میں نہ ملایا جائے تو اچھا ہے۔"

جگر صاحب کہنے لگے "آخر اس مشاعرے میں وہ بھی تو شریک ہو گا جس نے آج جلسے میں صدارت کی تھی۔ ایسے بدتمیز اور بدلحاظ شخص کی موجودگی میں کم از کم میں تو شعر نہیں پڑھ سکتا۔"

میں نے کہا "جگر صاحب یہ اردو کا معاملہ ہے۔ اس سے اردو کو نقصان پہنچے گا۔ اس لئے آپ کی شرکت تو اس میں بہرحال بہت ضروری ہے۔"

میں جانتا تھا کہ یہ جگر صاحب کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اردو کا نام لے کر ان کو مشکل سے مشکل کام کے لئے آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ میرے ترکش میں یہی آخری تیر تھا۔ خیر، یہ نشانے پر لگا۔

جگر صاحب مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن ان کی طبیعت کا ملال دور نہ ہوا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کے خیال کے مطابق اس جلسے میں مجھے ایک شخص نے ذلیل کیا تھا اور یہ مشاعرہ بھی اسی ادبی انجمن کے زیر اہتمام ہو رہا تھا جس نے وہ ادبی محفل منعقد کی تھی۔ پھر انہیں یہ بھی خیال تھا کہ وہ شخص بھی اس مشاعرے میں شریک ہو گا جس نے اپنی جہالت کا اظہار دن کے وقت ادبی محفل میں کیا تھا۔ کیونکہ وہ بہرحال اپنے آپ کو شاعر بھی سمجھتا تھا۔ اور اپنے شعر سنانے

کے لئے بے چین پھرتا تھا۔

میرے اصرار پر جگر صاحب نے اس مشاعرے میں شرکت تو کر لی لیکن وہ خوش نہ ہوئے۔ کیونکہ یہ محفل ان کے مزاج کے مطابق نہیں تھی، اور اس میں ایک ایسا شخص بھی شریک تھا جس نے ان کے ایک دوست کی توہین کی تھی اور جو اس کے لئے تکلیف کا باعث بنا تھا۔ میں خود اس مشاعرے میں نہیں گیا۔ جو لوگ شریک ہوئے تھے، ان سے مجھ کو یہ اطلاع ملی کہ جگر صاحب تھوڑی دیر کے لئے مشاعرے میں آئے اور اپنی ایک نامکمل غزل کے صرف چار شعر پڑھ کر چلے گئے۔ منتظمین نے بہت اصرار کیا کہ ایک غزل اور پڑھ دیں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ حالانکہ اس کا اصل سبب یہ نہیں تھا۔ اس کی تہہ میں تو کوئی اور ہی بات تھی۔

ماحول اگر مزاج کے مطابق نہ ہو تو جگر صاحب شعر پڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔ سب سے زیادہ خوشی انہیں احباب کے سامنے شعر پڑھ کر ہوتی تھی۔ اپنے اشعار کو وہ اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔ اس لئے یہ سب سے بڑی دولت تھی جو وہ احباب کو دے سکتے تھے۔ چنانچہ اکثر یہ دیکھا کہ چند احباب بیٹھے ہیں۔ جگر صاحب باتیں کر رہے ہیں۔ یکایک ان کے اندر ایک لہر سی اٹھتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ "یہ تازہ غزل کہی ہے، جی چاہتا ہے، سناؤں" اور ترنم کے ساتھ سناتے۔ کبھی کبھی بعض پرانی غزلیں اسی طرح سناتے۔ کبھی فارسی کی غزلیں سنانے لگتے۔ جگر صاحب پر شعر سنانے کا کبھی کبھی موڈ طاری ہوتا تھا، اور وہ بغیر کہے ہوئے از خود شعر سناتے تھے۔ اس کا سبب دوستوں کا خیال تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے دوست ان کا کلام سننا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ شعر سنا کر ان دوستوں کی خاطر تواضع کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ دوستوں کو کئی کئی غزلیں خوش خط لکھ کر دیتے تھے تاکہ ان کی تحریر احباب کے پاس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے۔ بہت کم ان کے ایسے دوست ملیں گے جن کے پاس ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلیں محفوظ نہ ہوں۔ بعض اوقات تو میں نے یہ دیکھا ہے کہ وہ خاص طور پر اچھا اور دبیز کاغذ اسی غرض سے خرید کر اپنے بکس میں ساتھ رکھتے تھے۔ خالی وقت میں ان پر دوستو کے لئے غزلیں لکھتے تھے، اس کاغذ پر اس دوست کا نام بھی ہوتا تھا جس کے لئے یہ غزل لکھی جاتی تھی۔

اگر دوستوں کا اصرار ہو تو کئی کئی غزلیں سناتے تھے۔ کسی دوست کی بات کو ٹالنا۔ ان کے مزاج ہی میں نہیں تھا۔ میں نے تو یہ دیکھا کہ ان کی طبیعت خراب ہے لیکن اگر کسی دوست نے اصرار کیا ہے تو اس عالم میں بھی انہوں نے غزل سنا دی ہے۔

ایک واقعہ تو آج تک میری نظروں کے سامنے ہے۔

دو سال ہوئے جگر صاحب لاہور آئے تو وقار عظیم صاحب کے یہاں ان کے اعزاز میں ایک مختصر محفل شعر و سخن منعقد کی گئی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ جی بھر کے جگر صاحب کا کلام سنا جائے گا۔ لیکن اس خیال سے کہ جگر صاحب کی صحت ٹھیک نہیں ہے، اور وہ زیادہ دیر تک پڑھیں گے تو ان کی طبیعت پر خراب اثر ہوگا، [illegible] اور شاعروں کو بھی رخصت دی گئی تھی۔ جگر صاحب کے اصرار پر اس محفل نے اچھے خاصے مشاعرے کی صورت اختیار کر لی۔ حکیم حافظ جلیل احمد صاحب مرحوم نے صدارت کی۔ تمام شعراء نے اپنا اپنا کلام پڑھا۔ آخر میں جگر صاحب کی باری آئی۔ اس وقت تک ان پر قلب کا دورہ پڑ چکا تھا۔ پسینے آنے لگے۔ بہت سے احباب کو اس کا علم بھی نہیں تھا کہ جگر صاحب کی طبیعت واقعی خراب ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان سے شعر سنانے کی فرمائش شروع کی۔ میں جگر صاحب کے قریب بیٹھا تھا۔ اور ان کی حالت دیکھ کر یہ محسوس کر رہا تھا کہ ان کے لئے تو سانس لینا بھی مشکل ہے۔ لیکن جگر صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ یہ محفل انہیں کے لئے منعقد کی گئی ہے اور جو لوگ جمع ہیں وہ سب کے سب ان کے اشعار سننے کے مشتاق ہیں۔ اس لئے انہوں نے چائے کی ایک پیالی مانگی۔ میں نے چائے بنا کر دی۔ چائے پینے سے قبل، انہوں نے جیب سے ایک ڈبیا نکالی۔ اس ڈبیا میں دوا تھی۔ یہ دوا انہوں نے یہ کہہ کر کھائی کہ "آج ہی ڈاکٹر صاحب نے مجھے یہ دوا دی ہے، اور اس سے مجھے بہت فائدہ ہے۔ یہ فوراً اپنا اثر کرے گی اور میں ابھی آپ کے سامنے غزل پڑھوں گا۔" میں نے منع بھی کیا لیکن جگر صاحب نہیں مانے۔ دوا کھائی۔ چائے پی۔ پسینہ پونچھا اور لگ بھگ دس منٹ کے بعد کہنے لگے۔ "غزل حاضر ہے۔" اور اپنی مخصوص آواز میں پوری غزل سنا دی۔ [illegible] کا خیال نہ ہوتا اور ان کی خاطر منظور نہ ہوتی تو وہ اس عالم میں ہرگز

ں نہ سناتے لیکن صرف دوستوں کے کہنے سے انہوں نے یہ تکلیف گوارا کی۔
و جانتے تھے کہ اس محفل میں تمام احباب صرف ان کا کلام سننے ہی کی
رض سے جمع ہوئے ہیں۔ اگر وہ شعر نہیں سنائیں گے تو انھیں مایوسی ہوگی۔
ں لئے انہوں نے اپنے اصول کے خلاف جبر کرکے اپنا کلام سنایا۔ غرض احباب کے
لئے وہ بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کر لیتے تھے۔ اپنے دوستوں کا خیال رکھنا
ر انھیں خوش کرنا ہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔

بات یہ ہے کہ جگر صاحب بڑے جذباتی آدمی تھے۔ اسی لئے
ن سے کبھی ایک دفعہ کوئی رشتہ قائم ہو جاتا تو اسے ہمیشہ برقرار رکھنے
کی کوشش کرتے۔ ان کی جذباتیت ہمیشہ انھیں یہ احساس دلاتی رہتی
کہ زندگی کبھی ہموار سطح پر نہیں چلتی۔ اس میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔
س لئے اس رشتے کے ٹوٹ جانے کا امکان ہر وقت رہتا ہے۔ انسان
نھیں خود بھی توڑنا چاہے تب بھی یہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ زمانہ انھیں توڑ
یتا ہے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ یہ سوچتے تھے کہ خدا جانے ایک دفعہ ملنے کے
بعد کسی دوست سے پھر ملاقات ہو بھی سکے گی یا نہیں۔ زمان و مکان
کے فاصلے بھی اس زندگی میں کچھ کم نہیں ہیں۔ پھر موت بھی موجود ہے
جو ہر وقت سامنے کھڑی رہتی ہے۔ خدا جانے کس وقت دوستوں کو ایک
دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر دے۔ اسی لئے وہ دوستوں کے
معاملے میں بہت جذباتی تھے اور ان میں سے ہر ایک کا خیال رکھتے تھے۔
جب کسی دوست سے ملنے کا وقت آتا تھا تو انھیں بہت خوشی ہوتی لیکن
جب اس سے رخصت ہونے لگتے تو ان پر ہمیشہ رقت طاری ہو جاتی تھی۔
جب بھی جگر صاحب احباب سے رخصت ہوتے تو یہ معلوم ہوتا کہ
اب ان کے آنسو نکلنے ہی والے ہیں۔ آواز کانپنے لگتی۔ اسی عالم میں وہ
ایک ایک سے گلے ملتے۔ معانقہ کرتے جیسے کہ یہ آخری ملاقات ہے،
اور اب اس کے بعد ملنے کی کوئی صورت کبھی بھی پیدا نہیں ہوگی۔

اس عالم میں میں نے جگر صاحب کو بارہا دیکھا ہے۔ زندگی میں
بے شمار ایسے لمحے آتے ہیں جب وہ لکھنؤ، دلی یا لاہور سے رخصت ہونے
لگے ہیں۔ ہمیشہ ان پر یہی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اور آخری بار جب
وہ آج سے کوئی دو سال قبل لاہور سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوئے ہیں اس
وقت تو ان کی کچھ عجیب سی حالت تھی۔ لاہور میں اپنے ایک ایک جاننے
والے سے ملے۔ جو لوگ لاہور کے آس پاس تھے۔ ان کو لکھا کہ کسی
ملاقات کی کوئی صورت نکالیں۔ اگر ان کی صحت ٹھیک ہوتی تو وہ خود
ان لوگوں سے ملنے جاتے لیکن سفر کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ راولپنڈی میں
ان کے بہت سے جاننے والے عزیز اور دوست تھے۔ ایک ایک کا
نام لے کر مجھ سے کہنے لگے کہ ان سب کو بلا لیجئے۔ لکھ دیجئے کہ ضرور مل
لیں۔ خدا جانے آئندہ ملاقات ہو یا نہ ہو۔ میں نے ایک دعوت کو
تقریب ملاقات بنایا اور ان کے دوستوں اور جاننے والوں کو تار
دیئے لیکن ان میں سے بہت کم لاہور پہنچ سکے۔ جگر صاحب کو اس کا
بہت صدمہ ہوا۔ میرے عزیز دوست اور پرانے ساتھی ممتاز اللہ بیگ
کو جگر صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ جگر صاحب بھی ان کا بہت خیال
رکھتے تھے۔ اس لئے خاص طور پر انھوں نے تاکید کی تھی کہ ممتاز صاحب
کو ضرور بلا لیجئے۔ میں نے انہیں تار دے کر بلایا لیکن وہ فوج میں بڑے
افسر ہیں۔ اس زمانے میں کسی ضروری کام میں مصروف تھے اس لئے
لاہور آ کر جگر صاحب سے نہ مل سکے۔ چنانچہ جاتے وقت بھی جگر صاحب
یہی کہتے ہوئے گئے کہ ممتاز سے نہ ملنے کا افسوس ہے۔ اب شاید ان
سے کبھی بھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔ اور واقعی ان کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔

غرض جگر صاحب اپنے دوستوں کے معاملے میں جذباتی
تھے۔ ان کے احباب کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ حکومتوں کے سربراہ اور
وزیر، بڑے بڑے سول اور فوجی حکام، کالج کے پروفیسر، طالب علم،
ادیب، شاعر، ڈاکٹر، حکیم، تاجر سب ان کے دوست ہو سکتے تھے۔ ان
میں سے ہر ایک کے ساتھ جگر صاحب کا برتاؤ مثالی حیثیت رکھتا تھا۔
یہ لوگ بیک وقت ان کی محفلوں میں شریک ہو سکتے تھے لیکن اس
کے باوجود اس محفل کے رنگ میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ مختلف قسم
کے لوگ جگر صاحب کے آس پاس جمع رہتے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ
خندہ پیشانی سے پیش آنا ان کا مسلک تھا۔ جگر صاحب کبھی کسی کو
اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اس سے اکتا رہے
ہیں یا اس کی باتوں سے انھیں گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ میں نے انھیں بیس
بیس، پچیس پچیس آدمیوں کے درمیان بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ بعض
اوقات تو عجیب عجیب لوگ ان سے ملتے اور ان کی صحبت میں کچھ

وقت گزارنے کی غرض سے آتے تھے۔ جگر صاحب انھیں ہاتھوں ہاتھ
لیتے تھے، مزاج پوچھتے تھے، خاطر تواضع کرتے تھے اور ایسی باتیں کرنے کی
کوشش کرتے جو ان لوگوں کے مزاج سے مناسبت رکھتی تھیں۔ وہ ایک
مجلسی آدمی تھے۔ تنہا بیٹھنا ان کے لئے مشکل تھا۔ جب تک لوگ ان
کے آس پاس جمع نہ ہوں وہ زندگی میں ایک خلا محسوس کرتے تھے۔ لیکن
اس میں شبہ نہیں کہ ان کا بہترین وقت وہی ہوتا تھا جب ان کے ہم مذاق
دوست آس پاس جمع ہو جاتے تھے۔ ان کے ساتھ وہ اچھی باتیں کرتے۔
ہنستے ہنساتے، مختلف معاملات پر تبادلۂ خیالات کرتے۔ ہر چند کہ جگر صاحب
کو گفتگو کا فن نہیں آتا تھا لیکن دوستوں کے مجمع میں ان کی زبان کھلتی تھی۔ اور
وہ کبھی کبھی بہت دلچسپ باتیں بھی کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایک آدھ لطیفہ بھی
انھیں یاد آجاتا تھا۔ لیکن میں نے ان مجلسوں اور محفلوں میں ان کی زبان
سے کبھی کوئی مبتذل بات نہیں سنی۔ بے تکلف دوستوں میں بھی وہ ثقاہت
کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ان کا مذاق کوئی معمولی سا فقرہ ہوتا
جس کو وہ مخصوص لہجے میں ادا کر دیتے، اور اس کے ساتھ ہی ایک نہایت
ہی لطیف سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر کھیلنے لگتی۔ زور سے ہنسنا تک
ان کے نزدیک معیوب تھا۔ خیر، تو جگر صاحب ایک مجلسی آدمی ضرور
تھے لیکن ان کی مجلس کے کچھ آداب تھے۔ ان آداب کی پابندی سب
سے زیادہ خود جگر صاحب کرتے تھے۔ اس لئے دوسروں کو بھی ان کا
پابند ہونا پڑتا تھا۔

جگر صاحب ہر شخص سے مل سکتے تھے۔ صرف نک چڑھے
سرمایہ داروں اور شاہی قسم کے افسروں سے انہیں الجھن ہوتی تھی چنانچہ
ایسے لوگوں سے وہ ہمیشہ کنی کاٹتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسا ہوا
ہے کہ اگر کبھی ایسے شخص کے ساتھ ان کی مڈبھیڑ ہو گئی ہے تو انھوں نے
نہایت سلیقے سے اس بات کا احساس دلا دیا ہے کہ وہ شخص ان کی محفل میں
بیٹھنے کے قابل نہیں ہے۔ میں نے کبھی کسی سرمایہ دار سے انہیں ملتے ہوئے
نہیں دیکھا۔ اس کے برخلاف وہ غریب اور نادار لوگوں سے اچھی طرح
ملتے تھے۔ اس کے ساتھ گھل مل جانا ان کے مزاج میں داخل تھا۔ ایک
لمحے کو بھی وہ اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ غریب اور
نادار شخص جو ان سے ملنے کے لئے آیا ہے وہ غریب اور نادار ہے۔

ایک منظر تو آج تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

جگر صاحب ایک روز اپنے کچھ احباب کے ساتھ بیٹھے
ہوئے تھے۔ ادیبوں اور شاعروں کا مجمع تھا۔ بہت دلچسپ باتیں
ہو رہی تھیں۔ کہ ایک شخص عطر اور تیل کا ایک بکس لئے ہوئے داخل
ہوا۔ اور آتے ہی کہنے لگا۔

"میاں آپ نے مجھے پہچانا نہیں ؟"

جگر صاحب نے اس شخص کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اور
بولے "بھئی تمھیں کون نہیں پہچانے گا"

وہ بولا "میں تو یہی سمجھا تھا کہ آپ مجھے نہیں پہچانیں گے۔
بہت دنوں کے بعد آپ کو دیکھا ہے۔ پندرہ برس ضرور ہوتے ہوں گے۔
آج مجھے یہ خبر ملی کہ آپ یہاں آتے ہوتے ہیں۔ پتہ پوچھتے پوچھتے یہاں
پہنچ گیا۔ آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا"

جگر صاحب کہنے لگے "بہت اچھا کیا تم آگئے۔ مراد آباد سے
کب آئے تھے ؟"

اس نے کہا "میاں کئی سال ہو گئے ہیں۔ اب تو میں یہیں
کا ہو رہا ہوں"

جگر صاحب نے پوچھا "یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

اس نے جواب دیا "نہیں میاں خدا کا فضل ہے گزر بسر
ہو جاتی ہے"

جگر صاحب بولے "کیا کام کرتے ہو؟"

اس نے کہا "عطر تیل کا کاروبار ہے۔ پھیری میں بیچتا ہوں"

جگر صاحب نے پوچھا "کتنی آمدنی ہو جاتی ہے"

اس نے جواب دیا "بس بال بچوں کا پیٹ بھر جاتا ہے"

جگر صاحب نے دریافت کیا "کتنے بچے ہیں ؟"

اس نے کہا "آپ کے غلام چار ہیں"

اور اسی طرح دیر تک وہ اس سے بے شمار باتیں کرتے رہے۔
یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ برسوں کا ملاقاتی ہے۔ حالانکہ بات صرف
اتنی سی تھی کہ کسی زمانے میں جگر صاحب مراد آباد میں اس سے کچھ چیزیں
خرید لیتے تھے۔ وہاں اس کی حالت نسبتاً اچھی تھی۔ یہاں آکر خراب

ئی ۔ اس لئے جگر صاحب نے اس کو ذرا بھی یہ احساس نہیں ہونے
ہ دو عزیب اور پریشان حال ہے ۔ جب وہ رخصت ہونے لگا تو اس
کہا کہ "تھوڑا سا عطر اور تیل ہیں بھی دیتے جاؤ۔ اس نے دو شیشیاں
ے دیں ۔ جگر صاحب نے ضد کرکے اس کی قیمت ادا کردی۔ وہ شخص
رکرتا رہا لیکن جگر صاحب نہیں مانے ۔ بلکہ چند روپے زیادہ ہی دیتے
یہ کہا کہ " بچوں کے لئے میری طرف سے مٹھائی لیتے جانا "

میں اس منظر کو دیکھ کر حیران رہ گیا لیکن جگر صاحب کے لئے یہ
، عجیب اور غیر معمولی بات نہیں تھی ۔ وہ اکثر ایسا ہی کرتے رہتے تھے ۔
وصیت کے ساتھ ان کا برتاؤ ایسا ہی ہوتا تھا۔

جب وہ شخص رخصت ہوگیا تو میں نے جگر صاحب سے پوچھا
س شخص سے باتیں کرنا اور کچھ چیزیں خریدنا تو میری سمجھ میں آتا ہے لیکن
ہ مٹھائی کے لئے آپ نے اسے روپے دیئے اس کا کیا مطلب تھا ؟"

جگر صاحب کہنے لگے "کسی کی مدد کرنے کے بہت سے طریقے
تے ہیں "

میں نے کہا " آپ نے اس کی نہیں اس کے بچوں کی مدد کی ہے "

جگر صاحب نے کہا " وہ یقیناً خوش ہوں گے ۔ اسی خیال سے
، نے ایسا کیا " اور پھر ایک زمانے کے بعد یہ شخص مجھ سے ملا ۔ اس
، بچوں کے لئے مجھے کچھ نہ کچھ تو دینا ہی چاہئے تھا یہ جگر صاحب ایسی
ں اکثر کرتے تھے ۔ بظاہر تو ان باتوں کی کوئی خاص اہمیت نظر نہیں
، لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو ان کی تہہ میں جگر صاحب کی انسانیت
، انسان دوستی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے ۔

وہ واقعی ایک بہت بڑے انسان تھے ۔ میں نے کسی شاعر
، اتنی انسانیت نہیں دیکھی جتنی کہ جگر صاحب میں تھی ۔ جہاں تک
، پہلو کا تعلق ہے وہ ایک عجیب وغریب انسان تھے ۔

شاعر عام طور پر لاابالی ہوتے ہیں۔ یہ لاابالی پن تو جگر صاحب
، بھی تھا لیکن جہاں تک انسانیت اور انسان دوستی کا تعلق ہے ان
، مزاج میں بڑی باقاعدگی تھی ۔ اسی لئے وہ اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ
انسان اچھا شاعر اور اچھا شاعر برا انسان نہیں ہو سکتا ۔ اچھا شاعر
نے کے لئے اچھا انسان ہونا ضروری ہے ۔

میں نے اس موضوع پر ان سے بحث کی ہے اور مثالیں دے
کر یہ ثابت کیا ہے کہ بہت برے انسان بھی بہت اچھے شاعر
گزرے ہیں ۔ جگر صاحب میرے ساتھ بحث تو کیا کرتے کہ بحث
کرنا تو انہیں آتی ہی نہیں تھی ۔ لیکن وہ اپنی بات پر اڑے رہے ہیں
اور انھوں نے میری بات کو تسلیم نہیں کیا ہے ۔

اور بالآخر میں نے یہ کہہ کر ہار مان لی کہ " صرف آپ کی
مثال ہی ایسی ہے جو اس خیال کو صحیح ثابت کرتی ہے " لیکن جگر صاحب
نے اس کو بھی تسلیم نہیں کیا ہے ۔ وہ یہی کہتے رہے ہیں کہ ان کی ذات
کو اس بحث میں نہیں لانا چاہئے ۔ یہ تو ایک کلیہ ہے جو انہوں نے
پیش کیا ہے ۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا ۔

اور یہی ان کے ایک عظیم انسان ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے ۔

جگر صاحب بڑے مہذب آدمی تھے ۔ انھیں آداب کا بہت
خیال رہتا تھا ۔ ان کی زندگی کے کچھ حدود تھے ۔ ان حدود سے باہر
نکلنا ان کے لئے ناممکن تھا ۔ انہیں حدود کو وہ زندگی سمجھتے تھے ۔ یوں
تو ان کے مزاج میں ایک لاابالی پن تھا ۔ ایک رندی اور آزاد مشتی
تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے کچھ قیود اپنے اوپر عائد کر رکھے
تھے اور بعض پابندیوں کو اپنے مزاج کا جزو بنالیا تھا ۔ ان قیود اور پابندیوں
میں وہ لطف لیتے تھے ۔ اور انھیں ان کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں
ہوتی تھی ۔

ان کے احباب کا حلقہ وسیع تھا لیکن وہ ان دوستوں سے بہت
زیادہ بے تکلف ہونا نہیں جانتے تھے ۔ انہیں حفظ مراتب کا بہت خیال
رہتا تھا ۔ چھوٹوں سے چھوٹوں کی طرح اور بڑوں سے بڑوں کی طرح
ملتے تھے ۔ ان کے مزاج میں ایک قسم کی شگفتگی ضرور تھی ۔ کبھی وہ
ایک آدھ دلچسپ فقرہ بھی کہہ جاتے تھے لیکن ہنسی مذاق کا ماحول
انھیں پسند نہیں تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہنستے ہنساتے تو ضرور تھے
لیکن نوبت مذاق تک ذرا کم ہی پہنچتی تھی ۔ ابتذال سے تو انھیں دور
کا واسطہ بھی نہیں تھا میں نے کبھی بھی ان کی زبان سے کوئی ایسا فقرہ نہیں
سنا جس سے ابتذال کی بو آتی ہو ۔ اٹھتے بیٹھتے ، چلتے پھرتے ، ملتے جلتے ،
ہنستے بولتے تک میں وہ بعض معیاروں کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے ۔

انھیں اپنی بڑائی کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ تعلّی تو انہیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو نمایاں کرنا نہیں جانتے تھے۔ کوئی ان کی تعریف کرتا تو انھیں سخت الجھن ہوتی تھی۔ انھوں نے کبھی کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ اسے نظر انداز کر رہے ہیں۔ اجنبیوں سے بھی یوں ملتے تھے جیسے برسوں کی شناسائی اور ملاقات ہو۔ عجز و انکسار کا رنگ ان کی طبیعت میں بہت گہرا تھا۔ اس طرح جھک کر ملتے جیسے دوسروں کے سامنے انھوں نے اپنی انفرادیت کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بچھے جا رہے ہیں۔ خاطر تواضع میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ کوئی ان جان اور اجنبی بھی آ جاتا تو اس کو چائے پلاتے اور پان کھلاتے۔ وہ لاکھ انکار کرتا لیکن جگر صاحب ایسی باتوں کو جیسے سنتے ہی نہیں تھے۔ کسی عزیز یا دوست کے گھر جاتے تو بازار سے مٹھائی خریدتے۔ وہاں پہنچ کر بچوں کو پیسے دیتے۔ اس اعتبار سے ایک عجیب آدمی تھے۔

چند سال ادھر کی بات ہے جگر صاحب لاہور میں ڈاکٹر عبدالعزیز خان صاحب کے مہمان تھے۔ میں شام کو اکثر ان سے ملنے کے لئے خان صاحب کی کوٹھی پر چلا جاتا تھا۔ ایک شام میں پہنچا تو جگر صاحب چپ چاپ لیٹے ہوتے تھے۔ چھوٹے سے کمرے میں دو کرسیاں تھیں۔ ان دونوں پر دو صاحبان بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا جگر صاحب مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔ میں نے کہا "آپ لیٹے تو رہئے۔ میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی"۔

جگر صاحب کہنے لگے "بہت اچھا ہوا آپ آ گئے۔ اس وقت آپ سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا"۔

میں نے کہا "میں آپ کے قریب ہی بیٹھوں گا"۔

اور میں پائنتی کی طرف بیٹھنے لگا تو جگر صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے اور خود پائنتی کی طرف کھسک کر کہنے لگے "آپ ادھر سرہانے کی طرف بیٹھئے"۔ میں نے ان سے لاکھ کہا کہ آپ لیٹے رہئے۔ آپ کی طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جگر صاحب ایسی باتیں کب سنتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے سرہانے کی طرف بیٹھنا پڑا۔ جگر صاحب اس کے بعد لیٹے نہیں۔ اور دیر تک بیٹھے ہوئے پان کھاتے اور باتیں کرتے رہے۔

اس دوران میں مجمع بڑھتا رہا۔ لوگ آتے رہے۔ اور اس چھوٹے سے کمرے میں کوئی دس بارہ آدمی ہو گئے۔ کچھ کرسیاں اور منگوائی گئیں ایک ایک کرسی پر دو دو آدمی بیٹھے۔ چارپائی پر بلا مبالغہ پانچ آدمی ضرور بیٹھے ہوں گے۔ جگر صاحب سمٹ کر چارپائی کے آخری کونے پر چلے گئے تھے۔ لیکن وہ بہت خوش تھے اور ہر ایک سے اس کے مزاج کے مطابق باتیں کرتے جاتے تھے۔

جب حاضرین کی تعداد پندرہ سے تجاوز کر گئی تب جگر صاحب کو خیال آیا کہ چائے کا انتظام ہونا چاہئے۔ اگرچہ کھانے کا وقت ہو چکا تھا لیکن سردی بہت بڑھ گئی تھی اس لئے انھیں خیال ہوا کہ جو لوگ آئے ہیں ان کے لئے چائے کا انتظام ضروری ہے۔ چنانچہ یہ کہہ کر اٹھے کہ ایک منٹ کی اجازت چاہتا ہوں۔ کمرے سے باہر گئے اور نوکر کو پکارا۔ اب میں دروازہ کے قریب بیٹھا تھا، اس لئے نوکر سے جو باتیں وہ کر رہے تھے وہ میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

جگر صاحب نوکر سے کہہ رہے تھے "پندرہ آدمی یہاں بیٹھے ہیں۔ ان کے لئے چائے کا انتظام کرو۔ لیکن ڈاکٹر صاحب یا ان کی بیگم صاحبہ کو خبر نہ ہو۔ کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔ گھر میں سب کو تکلیف ہوگی۔ اس لئے آس پاس کے کسی اچھے ہوٹل سے کہہ دو بیرا یہاں چائے پہنچا دے گا"۔

یہ بات ظاہر ہے کہ چھپنے والی نہیں تھی۔ جس طرح میں سُن رہا تھا اسی طرح سن کر کسی نے یہ خبر گھر کے لوگوں تک بھی پہنچا دی۔ دس پندرہ منٹ میں اندر سے چائے آ گئی۔ اور ڈاکٹر خان صاحب خود بھی آ گئے۔ انہوں نے کچھ کہا تو نہیں لیکن برتنوں کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ یہ چائے ہوٹل سے نہیں بلکہ اندر سے آئی ہے۔ اور صرف چائے ہی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کھانے کی بھی کچھ چیزیں ہیں۔ جگر صاحب اس نوکر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے رہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ اس موقع پر کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔

یہ ڈرامہ میرے سامنے ہوتا رہا اور میں اس سے لطف لیتا رہا۔ جگر صاحب کتنے عظیم آدمی تھے۔ انہیں یہ احساس تھا کہ

کھانے کے وقت چند معتقدین کے لئے چائے کا انتظام گھر والوں کے
لئے دشوار ہوگا۔ اس لئے انہوں نے ذکر کر کے ہوٹل سے چائے منگوانے
کی صورت نکالی یہ اور بات ہے کہ اس کا علم ان کے میزبان کو ہو گیا،
اور پھر چائے اندر ہی سے آئی۔

سب لوگ چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ اور میں جگر
صاحب کی شخصیت کے اس پہلو پر غور کرتا رہا۔ میرے ذہن میں یہ
خیالات آتے رہے کہ جگر صاحب کیسے عجیب آدمی ہیں۔ ان کی طبیعت
خراب ہے لیکن جو لوگ ان سے ملنے کے لئے آتے ہیں ان کی خاطر تواضع
کو ضروری سمجھتے ہیں۔ انھیں اپنے میزبان کی تکلیف کا بھی خیال ہے۔
اس لئے ایک ایسی صورت نکال رہے ہیں جس سے کسی کو تکلیف نہ
ہو اور کام بھی ہو جائے۔

چند روز کے بعد پھر اس سے ملتی جلتی صورت حال پیدا ہوئی۔
حسب معمول شام کو میں جگر صاحب کے پاس پہنچا۔ ملاقات
ہوئی۔ دو تین جاننے والے اور بھی آ گئے۔ ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔
شام ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جگر صاحب بولے "آج کہیں باہر
سیر کے لئے چلنا چاہئے"۔

میں نے کہا "ضرور چلئے۔ کمرے میں بیٹھنے سے زیادہ بہتر یہ ہے
کہ ہم لوگ ذرا کھلی فضا میں ٹہلیں"۔ سب لوگوں نے اس تجویز کی
مزید تائید کی، اور ہم لوگ ڈاکٹر خان کی کوٹھی سے مال روڈ کی
طرف چل دیئے۔

چاندنی رات تھی۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ کوئنس روڈ اور
مال روڈ کے چوراہے پر پہنچ کر باغ جناح کی طرف وہ مڑیں گے۔
اور وہاں جا کر تھوڑی دیر چاندنی رات کا لطف اٹھائیں گے۔ لیکن
میری توقع کے خلاف وہ دوسری طرف مڑ گئے۔ اور تھوڑی ہی دور
آگے چل کر کہنے لگے "آج کسی خوبصورت ریسٹوران میں چائے پینے
کو جی چاہتا ہے"۔

اس وقت تک ہم لوگ ارجنٹینا کے قریب پہنچ چکے تھے۔
اس لئے میں نے کہا "آئیے پھر ارجنٹینا میں بیٹھتے ہیں۔ یہ صاف ستھرا
ریسٹوران ہے، اور یہاں سکون بھی خاصا ہے"۔

جگر صاحب فوراً تیار ہو گئے جیسے وہ یہی چاہتے تھے۔
اور ہم لوگ ارجنٹینا میں داخل ہوئے۔ جگر صاحب نے آرڈر
دیا۔ اور چائے کے ساتھ نہ جانے کیا کیا کچھ منگوا لیا۔ اور اصرار کر کے
ہم میں سے ہر ایک کو کھلانے لگے۔

دیر تک ہم لوگ چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے۔
جب چائے کا سلسلہ ختم ہوا تو میں نے بل منگوایا اور جب
جگر صاحب سے یہ کہہ کر بل کو ادا کرنے کی کوشش کی کہ اس شہر میں
مہمان ہیں تو وہ کہنے لگے "اس وقت تو آپ لوگ میرے مہمان ہیں پھر
آپ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں۔ بل ادا کرنا بڑے کا حق ہوتا ہے۔
البتہ سامان اٹھانے کی اجازت آپ کو دی جا سکتی تھی۔ کیونکہ علی گڑھ
کی اصطلاح میں سامان تو جونیئر اٹھاتا ہے، اور آپ ظاہر ہے کہ اس
وقت میرے مقابلے میں جونیئر ہیں"۔ اس پر سب لوگ ہنسنے لگے اور
جگر صاحب نے بل دے دیا۔

اور پھر میں سوچتا رہا کہ سیر کا خیال تو اس ریسٹوران میں
ہم لوگوں کو لا کر چائے پلانے کا ایک بہانہ تھا۔ جگر صاحب وہاں
اپنے میزبان کو تکلیف نہیں دینا چاہتے تھے، اور ہم لوگوں کو چائے
پلانی بھی ضروری تھی۔ اس لئے انہوں نے اس کی یہ ترکیب نکالی کہ
سیر کے بہانے سے باہر نکلنا چاہئے تاکہ کسی ریستوران میں خاطر تواضع
کا خاطر خواہ موقع مل سکے۔

یہ سب کچھ جگر صاحب ہی کر سکتے تھے۔

ایک دفعہ تو جگر صاحب نے حد ہی کر دی۔ ڈاکٹر عبدالعزیز
خان صاحب نے ان کے اعزاز میں ایک محفل ترتیب دی اور شہر
کے بہت سے معززین کو بلایا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ پہلے
چائے ہو جائے گی، اس کے بعد تھوڑی دیر شعر و سخن کا سلسلہ رہے گا۔
شام کا وقت تھا۔ میں اس محفل میں کچھ تاخیر سے پہنچا۔ اس وقت تک
چائے ختم ہو چکی تھی، اور سب لوگ ان کے ڈرائنگ روم میں جمع ہو
چکے تھے۔ فرشی نشست تھی لیکن انہوں نے محفل کے صدر اور جگر
صاحب کے لئے ایک تخت پر قالین بچھا کر نشست کا علیحدہ انتظام
کیا تھا۔ ظاہر ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ جگر صاحب کو سب لوگ

دیکھ سکیں۔ مجمع خاصا تھا۔ میں چونکہ تاخیر سے پہنچا تھا، اس لئے بہ عادت پیچھے جاکر ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ جگر صاحب اسٹیج کے قریب نیچے فرش پر بیٹھے تھے۔ ابھی جلسہ شروع نہیں ہوا تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ غالباً صدر صاحب بھی ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ ان کا انتظار بھی ہو رہا تھا۔ اگرچہ میں جگر صاحب سے خاصے فاصلے پر تھا لیکن نہ جانے کیسے مجھ پر ان کی نظر پڑ گئی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آ گئے۔ میں نے ان سے لاکھ کہا کہ آپ وہیں تشریف رکھئے۔ میری وجہ سے زحمت نہ کیجئے۔ لیکن وہ ایسی باتوں کو کب سنتے تھے۔ پوچھنے لگے "آپ کب آئے؟"

میں نے کہا "آج یونیورسٹی میں ایک جلسہ تھا۔ مجھے اس میں دیر ہو گئی۔ تاخیر سے آیا۔ اسی لئے پیچھے آکر بیٹھ گیا، تاکہ میری وجہ سے لوگوں کو تکلیف نہ ہو" جگر صاحب کہنے لگے "آپ نے چائے پی؟"

میں نے جواب دیا "چائے تو میں پی کر آیا تھا"

اس پر وہ ذرا مسکرائے اور کہنے لگے "—— میرا مطلب ہے یہاں کی چائے؟"

میں نے کہا "خواہش نہیں تھی۔ اس لئے میں نے مناسب نہیں سمجھا"

میرے اس جواب پر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "آئیے میرے ساتھ چلئے۔ ابھی واپس آ جائیں گے۔ اور وہ مجھے اپنے ساتھ اس کمرے میں لے گئے جہاں چائے کا انتظام تھا۔ اور کہنے لگے "چائے ضرور پیجئے۔ کچھ کھائیے بھی —— میں بھی آپ کا ساتھ دوں گا۔

مجھے معلوم تھا کہ جگر صاحب چائے کی ایک پیالی پینے کے بعد دوسری پیالی کبھی نہیں پیتے۔ میں نے ان سے کہا بھی کہ آپ کو دوسری پیالی پینے کی عادت نہیں ہے لیکن وہ یہی کہتے رہے "میں تو دوسری پیالی ضرور پیوں گا —— پہلی پیالی پئے ہوئے تو اب خاصی دیر ہو چکی ہے"

بالآخر چائے آئی۔ ہم لوگوں نے وہ چائے پی، اور پھر جاکر وہیں بیٹھ گئے جہاں اس سے قبل بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جگر صاحب سے پھر کہا کہ آپ سامنے اسٹیج کے قریب تشریف لے جائیے۔ بہت سے حضرات وہاں آپ کے منتظر ہیں۔ ڈاکٹر خان اور دوسرے حضرات انھیں بلاتے بھی رہے لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ یہی کہتے رہے "ابھی حاضر ہوتا ہوں"

اور مسلسل ہم لوگوں سے باتیں کرتے رہے۔

جلسہ کی کارروائی شروع ہو گئی، جب سنانے کے لئے حاضرین کا اصرار بڑھا تب جگر صاحب وہاں سے اٹھ کر اسٹیج پر گئے۔ غزل سنائی۔ لیکن واپس آکر پھر وہیں بیٹھ گئے۔

دراصل انہیں یہ خیال تھا کہ اگر وہ ہم لوگوں کو چھوڑ کر آگے بیٹھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں لکھنے لکھانے والوں اور اپنے دوستوں سے زیادہ ان افسروں اور سرمایہ داروں سے دلچسپی ہے جو اس محفل میں زیادہ تعداد میں موجود تھے۔

ہمارا دل رکھنا بھی ان کے لئے ضروری تھا۔ اس لئے وہ ہم لوگوں کے پاس ہی بیٹھے رہے۔

جگر صاحب جب کسی جگہ سے رخصت ہونے لگتے تھے۔ تب تو ان کے اس انداز میں کچھ اور بھی شدت پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ بنیادی طور پر جذباتی آدمی تھے، اس لئے جو لوگ انھیں رخصت کرنے کے لئے آتے تھے ان کا جگر صاحب کو بہت خیال رہتا تھا۔ جب تک ان میں سے ایک بھی کھڑا رہتا خود نہیں بیٹھتے۔ ساتھ ہی ان کی یہ بھی کوشش ہوتی تھی کہ ہر ایک کو اپنے قریب بٹھائیں، مزاج پوچھیں اور ہر ایک سے ایسی باتیں کریں جو اس شخص کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہوں۔ اس عالم میں خاطر تواضع بھی کرتے جاتے تھے۔ وقت ہوتا تو چائے منگوا لیتے۔ ورنہ پان کی ڈبیا آگے بڑھاتے۔ بعض لوگ پانوں کے معاملے میں نفاست برتتے ہیں۔ جگر صاحب دوسروں کو پان کھلا کر خوش ہوتے تھے۔

جب وہ آخری بار لاہور سے دلی جانے لگے تو بہت سے دوست احباب انہیں رخصت کرنے کی غرض سے اسٹیشن پہنچے۔ ہندوستان کی گاڑی پر وقت سے پہلے پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے سے کچھ زیادہ ہی وقت جگر صاحب کے دوستوں نے ان

ے ساتھ گزارا۔ گاڑی تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا لیکن جگر صاحب نے اس
ے لئے خاص طور پر کسٹم والوں سے اجازت لے لی تھی۔ جس ڈبے میں ان
ی سیٹ تھی اس میں سفر کرنے والے تو صرف دو ہی تھے لیکن ان کے
وستوں کا اتنا مجمع تھا کہ تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ جگر صاحب
نے یہ دیکھا کہ کچھ لوگ کھڑے ہوئے ہیں تو خود بھی کھڑے ہو گئے۔ جو لوگ
بیٹھے ہوئے تھے، ان سے کہا کہ آپ لوگ بیٹھے رہئے۔ مجھے اس وقت اسی
رح آرام مل رہا ہے۔ چنانچہ وہ کوئی ایک گھنٹہ اسی طرح کھڑے رہے۔
لانکہ ان کی طبیعت خراب تھی لیکن انھوں نے طبیعت کی خرابی کا مطلق
بال نہیں کیا۔ اور پھر یہیں پر بات ختم نہیں ہوئی۔ انھوں نے بیرے
بلا کر چائے بھی منگوائی، اور جتنے دوست وہاں جمع تھے۔ ان سب
چائے پینے کے لئے مجبور کیا۔ اس طرح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کا وقت
م زدن میں گزر گیا۔

اور جب گاڑی چلنے لگی تو میں نے دیکھا جگر صاحب پر رقت طاری
ی اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ
دنے ہی والے ہیں۔ دوستوں کے خیال سے ضبط کئے ہوئے تھے۔
گے چل کر یقیناً وہ جی بھر کے روئے ہوں گے۔

جگر صاحب اپنے چھوٹوں کا بہت خیال رکھتے تھے اور ان کے
اتھ ہمیشہ ان کا برتاؤ ایسا ہی ہوتا تھا جیسے کسی بزرگ کا اپنے چھوٹوں کے
اتھ ہوتا ہے۔ مثلاً وہ چھوٹوں کے ساتھ کبھی زیادہ بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔
ن ان کے انداز سے شفقت اور محبت کی کرنیں پھوٹی پڑتی تھیں۔ کبھی
ئی نوجوان ان کے پاس آتا تو وہ اس سے یہ ساری تفصیل پوچھتے کہ وہ
کر رہا ہے اور آئندہ کے لئے اس کے کیا ارادے ہیں؟ اس کے
تقبل کے بارے میں اگر کوئی بات ذہن میں آتی تو اس کو ضرور سمجھاتے۔
ر ہر لحاظ سے اس کی مدد کرتے۔ دوستوں سے ملنے کے لئے ان کے
ر جانا جگر صاحب کے پروگرام میں ضرور شامل ہوتا۔ جب جاتے تھے
ان کے بچوں کے لئے پہلے مٹھائی ضرور خریدتے وہاں پہنچ کر بچوں
بڑے شوق سے مٹھائی تقسیم کرتے اور پیسے بھی بانٹتے۔ ان کے جو
ست عمر میں ان سے چھوٹے تھے ان کی تو بیویوں تک کو روپے ضرور
یتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری شادی کے بعد جب جگر صاحب

پہلی دفعہ میرے یہاں آئے تو میری بیوی کو دس روپے دیئے۔ وہ یہ
دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ آخر جگر صاحب نے یہ روپے کیوں دیئے ہیں۔
لیکن انہوں نے یہ کہہ کر کہ یہ منہ دکھائی کے روپے ہیں ان کی حیرانی کو
دور کر دیا۔ غرض ان کا انداز پرانے بزرگوں کا سا تھا، اور ان تمام
آداب کے سختی سے پابند تھے۔ جن کو پرانے بزرگوں نے ہمیشہ اہمیت دی
تھی۔ جگر صاحب نے نیا زمانہ بھی دیکھا تھا۔ نئی روشنی کے لوگوں سے
بھی ان کا قریبی تعلق تھا لیکن یہ لوگ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکے تھے۔ جہاں
تک پرانی روایات کو برتنے کا تعلق ہے وہ اس میں ہمیشہ پیش پیش
رہتے تھے۔

ان کی ہستی مشرق کی تہذیبی روایات کا ایک مثالی نمونہ تھی
اور وہ بڑے ہی وضع دار آدمی تھے۔ اس وضع داری کو انہوں نے ساری
زندگی نباہیا۔ ان کے ملنے جلنے کے آداب تو خیر کیا بدلتے کہ ان کو تو جگر
صاحب نے پوری طرح اپنے مزاج کا جز بنا لیا تھا، ان کی صورت
شکل اور لباس تک میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان کا عہد بڑے
اہم معاشرتی اور تہذیبی انقلابات کا عہد تھا لیکن جگر صاحب ان انقلابات
سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے۔ نئی تہذیب تک کا ان پر کوئی اثر نہیں
ہوا۔ اور وہ ساری زندگی ایک ہی روپ میں نظر آئے۔ یہ روپ ان
کے نکھرے ہوئے انداز اور انداز کی ایک نستعلیق کیفیت سے پہچانا
جاتا تھا۔

وہ صورت شکل کے اعتبار سے اگرچہ بہت اچھے نہیں تھے
لیکن اس کے باوجود ان میں ایک عجیب جذب و کشش کی کیفیت تھی۔
اور اس جذب و کشش کی بنیاد ان کا وہ نستعلیق انداز تھا جس میں
ہندی مسلمانوں کی تہذیب کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ ان کے چہرے
پر ہمیشہ داڑھی رہی لیکن اس داڑھی کے کچھ حدود تھے۔ وہ ان حدود
سے کبھی بھی باہر نہیں نکلے۔ جگر صاحب کے مزاج میں جو لاابالی پن تھا
اس کے پیش نظر اس داڑھی کو بے ہنگم ہو جانا چاہئے تھا لیکن ان کی
داڑھی کبھی پھیلی یا بڑھی ہوئی نہیں دیکھی گئی۔ اس کو خشخشی داڑھی کہا
جا سکتا تھا۔ ان کے چہرے پر یہ خشخشی داڑھی اپنے توازن کی وجہ سے
حسن پیدا کرتی تھی۔ جگر صاحب کے سر پر بڑے بڑے بال تھے لیکن

ان باتوں نے کبھی بڑھ کر کاکلوں کی صورت اختیار نہیں کی البتہ یہ بال کچھ پٹوں سے ملتے جلتے ضرور تھے۔ ان کا عام انداز یہ تھا کہ چہرے کے دونوں طرف ایک بڑی سی ٹوپی میں سے باہر کی طرف نکلے رہتے تھے۔ ان بالوں کی تراش خاص قسم کی تھی اور اس تراش میں ساری زندگی بال برابر بھی فرق نہیں آیا۔ داڑھی اور بالوں کے اس مخصوص انداز ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کی شکل صورت بہت اچھی نہ ہونے کے باوجود نوک پلک سے درست معلوم ہوتی تھی اور انہیں دیکھ کر یہ تاثر سب سے پہلے ہوتا تھا کہ وہ صد درجہ نستعلیق آدمی ہیں اور وضعداری ان کے مزاج کا بنیادی جز ہے۔

ان کا لباس کبھی بدلا نہیں۔ وہ چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے۔ ساری زندگی چوڑی دار پاجامہ ہی پہنتے رہے۔ انھوں نے کبھی علی گڑھ کاٹ یا بڑے پائنچوں کا پاجامہ نہیں پہنا۔ وہ ہمیشہ شیروانی پہنتے تھے اور ہمیشہ شیروانی ہی پہنتے رہے۔ یہ شیروانی ان کے جسم پر ڈھیلی ہوتی ہوتی تھی کبھی اس پر ایک شکن بھی نہیں دیکھی گئی۔ جگر صاحب اس شیروانی کے بغیر کبھی باہر نہیں نکلتے تھے۔ صرف قمیص پاجامہ پہن کر باہر نکلنا ان کے نزدیک معیوب تھا۔ اس لئے اس شیروانی کو ان کے لباس میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ شیروانی کو وہ پورے اہتمام کے ساتھ پہنتے تھے۔ اس کا ایک بٹن کبھی کھلا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ جگر صاحب کے سر پر ایک بڑی سی ٹوپی بھی ضرور ہوتی تھی۔ اس ٹوپی کو انہوں نے کبھی بدلا نہیں۔ بس یہی ان کا لباس تھا۔ اس لباس میں سادگی اور پرکاری تھی۔ اس میں تکلف اور تصنع تو نہیں تھا۔ البتہ وہ تھوڑا سا اہتمام اس سلسلے میں ضرور کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے لباس میں ہمیشہ ایک باقاعدگی نظر آتی تھی۔ اور اس باقاعدگی کا محرک وضع داری کا خیال تھا۔

جگر صاحب اس صورت شکل، وضع قطع اور لباس سے پہچانے جاتے تھے۔ ان سب کا مجموعی تاثر یہی ہوتا تھا کہ ان کی ذات مشرق کی اس تہذیبی روایت کی تصویر ہے جو اس برصغیر کے مسلمانوں کے ہاتھوں صدیوں میں کہیں جاکر پیدا ہوئی تھی۔

اس روایت کا شیرازہ ہندوستان میں تو عرصہ ہوا منتشر ہوچکا تھا۔ اسی لئے جگر صاحب ہندوستان میں کچھ اجنبیت سی محسوس کرتے تھے۔ ان کے بہت سے عزیزوں اور دوستوں کا قیام پاکستان میں تھا۔ چنانچہ وہ اپنا زیادہ وقت یہیں گزارتے تھے۔ یہاں کے ماحول سے انھیں ایک ذہنی مناسبت بھی تھی۔ یہاں کی ہر چیز سے وہ ایک جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دل میں کبھی مستقل طور پر ہندوستان کو چھوڑنے اور پاکستان میں قیام کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ وہ بڑے پکے مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی تہذیب انھیں عزیز تھی۔ وہ ان کے معاشرتی معاملات کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے یہاں مستقل طور پر رہنے کا ارادہ نہیں کیا۔ حکومت کے بیشتر لوگوں سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ مستقل طور پر یہیں قیام کریں لیکن جگر صاحب اس کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اور اس کی بنیادی وجہ ان کی وضعداری تھی۔

ایک دن میں نے یہ موقع پاکر کہ جگر صاحب سال کا بیشتر حصہ یہیں ہم لوگوں کے ساتھ گزارتے ہیں اور ہندوستان اگر جاتے بھی ہیں تو صرف چند روز کے لئے جاکر واپس لوٹ آتے ہیں ان سے کہا۔

"آپ کو اب مستقل طور پر یہیں قیام کرنا چاہئے۔ تمام احباب کی یہی خواہش ہے۔"

جگر صاحب کہنے لگے "جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے لیکن وضع داری درمیان میں حائل ہے۔"

میں نے کہا "اس میں وضع داری کا کیا سوال ہے۔"

جگر صاحب بولے "ساری زندگی تو عشق بتاں میں کٹی اب آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے۔"

میں نے کہا "یہ باتیں بہت بلیغ ہیں۔ لیکن اب آپ ہم لوگوں کے پاس ہی رہنے کی کوئی صورت نکالئے۔"

جگر صاحب کہنے لگے "سمجھ میں نہیں آتا کہ اب آخر عمر میں اس جگہ کو کیسے چھوڑوں جہاں میں پیدا ہوا اور جس جگہ میں نے ساری زندگی بسر کی۔ وہاں کے لوگ کیا کہیں گے۔"

جب بھی جگر صاحب سے اس موضوع پر گفتگو ہوتی تو وہ ایسی ہی باتیں کرکے ہم لوگوں کو خاموش کر دیتے۔ انھیں یہاں سکونت اختیار کرنے سے مادی طور پر بہت فائدہ ہو سکتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے انھیں

س پہلو کی طرف متوجہ بھی کیا۔ حکومت کے بعض اہم لوگوں سے ان کے
ذہبی تعلقات تھے لیکن جگر صاحب اس کے لئے تیار نہ ہوئے۔ ان کی فط
اری اس راستے میں ہمیشہ حائل رہی۔ ان کا دل یہیں تھا۔ اس لئے وہ مسلسل
دو دو سال تک یہاں آ کے قیام کرتے تھے۔ لیکن ان کی وضع داری انہیں
ہیں کے ہو کر رہ جانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

جگر صاحب کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا وہ سیاسی
حالات پر گفتگو نہیں کرتے تھے کبھی ان کی محفل میں سیاست کی بات چھڑ
جاتی تو وہ اس سے بچنے کی کوشش کرتے اور ان کی کوشش یہ ہوتی کہ
کسی طرح یہ موضوع بدل جائے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ کوئی بھی پھلکی بات
شروع کر دیتے اور اس طرح موضوع بدل جاتا۔

مذہبی اور دینی معاملات سے بے شک انھیں دلچسپی تھی لیکن اس
کے باوجود ایسے کچھ زیادہ مذہبی آدمی نہیں تھے۔ ان پر مذہب کا اثر ضرور
تھا۔ جہاں تک ان کے عقائد کا تعلق ہے وہ بڑے پکے مسلمان تھے۔
لیکن کٹھ ملا نہیں تھے۔ اسی لئے مذہب اور مذہبی معاملات سے دلچسپی
لینے کے باوجود ان میں خشکی نہیں تھی۔ مذہب کے اثر سے ان کا مزاج نہیں
بدلا تھا۔ ان کی شگفتگی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مذہبی اصولوں کے بھی
وہ سختی سے پابند نہیں تھے۔ عملی طور پر ان کا برتنا جگر صاحب کے لئے
مشکل تھا۔ ان کی نماز قضا ہو جاتی تھی۔ وہ روزے بھی چھوڑ سکتے تھے
لیکن نماز روزے کی اہمیت ان کے نزدیک مسلم تھی۔ چنانچہ وہ اس
خیال کا اظہار بھی کرتے تھے کہ نماز روزے کا چھوڑنا کوئی اچھی بات نہیں
ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں اس کی باز پرس ہوگی اور اس کا خمیازہ
انہیں بھگتنا پڑے گا۔

جگر صاحب نے ایک زمانے میں مختلف دینی علوم کا باقاعدگی
سے مطالعہ کیا تھا۔ قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ کو حاصل کرنے میں وہ
پیش پیش رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ عالم دین بننے کی صلاحیت
نہیں رکھتے تھے۔ ان کا مزاج ان علوم کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا تھا۔
چنانچہ جب کبھی وہ ان موضوعات میں سے کسی پر اظہار خیال کرنے لگتے
تھے تو خدا جانے کیا کیا کچھ کہتے تھے۔ آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہتے
تھے۔ بات کرنا تو انھیں یوں بھی نہیں آتا تھا۔ دینی علوم پر بات کرتے

ہوئے تو وہ کچھ اور بھی الجھ جاتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی
بکھرے ہوئے پتھروں پر چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ توحید کے قائل تھے، اور بعض اوقات اپنے ٹوٹے پھوٹے
الفاظ میں اس پہلو پر گفتگو کرتے تھے۔ کسی وقت کوئی لہر آجاتی تھی اور
وہ صوفیوں کی طرح باتیں شروع کر دیتے تھے۔ لیکن ان باتوں کا سمجھنا
آسان کام نہیں تھا۔ خدا جانے جگر صاحب کیا کیا کچھ کہتے تھے۔ ان کی
باتیں سن کر تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ باتیں خود ان کے ذہن میں واضح
نہیں ہیں۔ لیکن جب ان باتوں کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیتے تو وہ
آئینہ ہو کر سامنے آجاتی تھیں اور دل و دماغ دونوں ان کے خیالات
سے محظوظ ہوتے تھے۔

جگر صاحب عشق رسول سے سرشار تھے۔ دین کے بارے
میں ان کی باتیں یہیں سے شروع ہوتی تھیں اور یہیں پر ختم ہو جاتی
تھیں۔ چند سال قبل انھوں نے ایک نعت فارسی میں کہی تھی۔ اس
نعت کو وہ اصرار کر کے سناتے تھے۔ ایک دفعہ تو لاہور کے دوران
قیام میں انہوں نے کوئی آٹھ دس دفعہ یہ نعت سنائی اور پھر اپنے قلم
سے لکھ کر بھی دے دی تاکہ یہ نسخہ ہمیشہ میرے پاس محفوظ رہے۔ جگر صاحب
کی آواز میں اس نعت کے یہ اشعار آج تک میرے ذہن میں گونجتے ہیں
اور شاید زندگی بھر اسی طرح گونجتے رہیں گے۔

نعت سرور کونین

اے از لب صادقت شنیدہ
نادیدہ خدا، خدا ندیدہ
اے مثل تو در جہاں نگارے
یزداں دگرے نہ آفریدہ
اے آں کہ بہ امتزاج کامل
در جملہ صفات برگزیدہ
تو پر تو حسن ذات و از تو
یک رشتہ بہ دیگراں رسیدہ

اے بے ہمہ خلق و با ہمہ خلق
اے از ہمہ خلق برگزیدہ
آں خیر کہ بود، در زمانت
بعد از تو زمانہ ہم ندیدہ
در عشق و وفا دگر مثالے
نے دیدہ و نے کسے شنیدہ
امروز بہ بیں کہ مردماں را
کارے بہ بلا کشے رسیدہ
مشرق ہمہ پُر ز فتنہ و شر
مغرب ہمہ مست و سرکشیدہ
کے عشق تواں رسد بہ پایاں
ہم عشق ہنوز نا رسیدہ
لولاک لما خلقت الافلاک
درج مدح تو جانِ ہر قصیدہ
اے آں کہ دورانِ پردہ راز
از خویش بہ خویشتن رسیدہ
وز سدرہ بہ منتہائے تو بین
باعظمت خاص رہ بُریدہ
طے کردہ مراحل و منازل
تا رسد رہ بہ ساعتے رسیدہ
اے آگاہ کہ ز شوقِ بے نہایت
حق را ہمہ آشکار دیدہ
اے اسم تو حرزِ جانِ عُشاق
اے ذکر تو نورِ قلب و دیدہ
اے بر تو نثار شرمِ عصیاں
اے بر تو فدا دلِ تپیدہ
رحمت بہ اشارہ تو جوشاں
جنت بہ نگاہت آرمیدہ
یک گوشۂ چشم التفاتے
بر اُفتیانِ غم رسیدہ
استاد بہ پیش بارگاہت
پیرے بہ رُخ آستین کشیدہ
شاید جگرؔ حزیں ہمیں است
از بارِ گنہ کمر خمیدہ

جب بھی جگرؔ صاحب نے یہ نعت مجھے سنائی ہے، میری زبان سے یہی الفاظ نکلے ہیں، "جگرؔ صاحب آپ نے اپنی بخشش کا سامان کرلیا ہے"، اور وہ ہمیشہ میرے اس جملہ پر کچھ اس انداز سے مسکراتے ہیں کہ گویا ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

ایک دن جگرؔ صاحب نے اپنے مخصوص موڈ میں یہ نعت مجھے سنائی۔ اتفاق سے ان اشعار کے ساتھ اسی موضوع سے متعلق مجھے علامہ اقبالؒ کے کچھ اشعار یاد آ گئے۔ میں نے کہا "جگرؔ صاحب علامہ اقبالؒ نے بھی کیا خوب کہا ہے" :

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر — بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبی — از خدا محبوب تر گردد نبی

ان اشعار کو سُن کر جگرؔ صاحب جھوم جھوم اٹھے ہیں۔ اور ان پہ دیر تک وجد کا سا عالم طاری رہا ہے۔

جگرؔ صاحب پر تصوف کا اثر ضرور تھا۔ وہ راہ طریقت کے مسافر تھے۔ انھیں شریعت سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اصغرؔ صاحب کا ان پہ گہرا اثر تھا۔ وہ انھیں اپنا مرشد اور پیر مغاں سمجھتے تھے۔ ان کے اثر سے تصوف کا یہ رنگ ان کی شخصیت میں کچھ اس طرح رچ گیا تھا کہ وہ چاہتے بھی تو اس سے علیٰحدگی اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ وہ سالک تھے۔ راہ سلوک پہ گامزن تھے اور راہ و رسم منزلہا سے بے خبر نہیں تھے۔

اس تصوف کے گہرے اثر کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کے مزاج میں ہمیشہ ایک رندی رہی۔ عالم ہوش اور عالم بے ہوشی دونوں میں وہ ایک رند ہی تھے ایک زمانہ وہ تھا جب ان پر شراب مسلط تھی۔ اس عالم میں انہیں اپنا مطلق ہوش نہیں تھا لیکن جب انھوں نے شراب چھوڑ دی تب بھی وہ بدلے نہیں۔ ان کے مزاج کا وہی عالم رہا۔ رندی اور لاابالی پن، اپنے آپ سے بے خبری اور بے نیازی ان کی زندگی کا جزو رہی۔ انہیں اپنا خیال نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ اپنی ذات سے ہمیشہ

بے خبری رہتے تھے۔ ان کے پاؤں میں چکر تھا۔ وہ کسی ایک جگہ جم کر
نہیں بیٹھ سکتے تھے کسی ایک مقام پر انہیں قرار نہیں آتا تھا۔ وہ بہت کم
سوتے تھے۔ راتوں کو جاگتے رہنا ان کے معمولات میں داخل تھا۔ وہ
ئی کام مستقل مزاجی سے نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لئے زندگی میں انہوں
نے سوائے شاعری کے کوئی اور کام نہیں کیا۔۔۔۔ بس رندوں کی طرح
اوقت گزارتے رہے۔ خدا جانے کون سی اندرونی کیفیت تھی جس
نے انہیں ان خیالات سے دوچار کر رکھا تھا۔

جگر صاحب بنیادی طور پر لاابالی آدمی تھے اور انھیں اپنا ہوش
ہیں تھا۔ ان پر ہمیشہ ایک اضطراب کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ یہی
ب ہے کہ وہ سارے ہندوستان میں چکر لگاتے پھرتے تھے۔ مشاعروں
تو انہوں نے ادھر ادھر جانے اور چکر لگانے کا بہانا بنا لیا تھا۔ حقیقت
ت یہی تھی کہ وہ کسی ایک جگہ چین سے بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ آج اس
ہر میں ہیں کل اس شہر میں۔ آج ایک دوست کے پاس ہیں کل دوسرے
ست کے پاس ۔۔۔ بس اسی طرح ان کا وقت گزرتا تھا۔ سال میں
کل سے مہینہ بھر وہ اپنے مکان پر ٹھہرتے تھے ورنہ ہر وقت انہیں سفر
درپیش رہتا تھا۔ اور جگر صاحب اس سفر کے عالم میں خوش رہتے تھے۔
عالم سفر میں گھومنا پھرنا، دوستوں سے ملنا، ان کی صحبت میں اچھا
ت گزارنا، محفلیں جمانا، دعوتوں میں جانا، شعر سننا سنانا ان کا مقصد
تھا۔ ایسی زندگی ایک رند لاابالی ہی گزار سکتا ہے۔

میں نے جگر صاحب کو رات رات بھر جاگتے ہوئے دیکھا ہے۔
جانے وہ سوتے کس وقت تھے۔ دن رات میں ان کے سونے کا
سط دو گھنٹے سے زیادہ نہ ہوگا۔ اور اس میں بھی باقاعدگی نہیں تھی۔
ن اوقات تو ایسا ہوتا تھا کہ کئی کئی دن بغیر سوئے ہوئے گزر جاتے
۔ لیکن ان پر اس نہ سونے کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔ راتوں
اگنا ان کا مزاج بن گیا تھا۔ جاگنے کے لئے انہیں احباب کی ضرورت
تی تھی۔ وہ تنہا نہیں جاگ سکتے تھے۔ احباب آس پاس موجود ہوں
یں سونے کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔ رات گئے تک بیٹھے یا تو باتیں
ے رہتے تھے یا کسی کھیل میں محو ہو جاتے تھے۔ ان کا محبوب کھیل تاش
اور تاش میں بھی رمی۔ اس رمی میں تو وہ اس طرح گم ہو جاتے کہ

انہیں کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ بلا مبالغہ تین تین چار چار
مسلسل روز رمی کھیلتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ لیکن جگر صاحب کی طبیعت
سیر نہیں ہوتی تھی۔ وقت کا احساس ہی مٹ جاتا تھا اور وہ اسی میں گم
رہتے تھے۔ ان کی طبیعت کی ناسازی بھی اس راہ میں حائل نہیں ہو سکتی
تھی۔ بیماری کے عالم میں بھی یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ایک زمانہ
تو ان پر ایسا گزرا ہے کہ ہر وقت وہ رمی کھیلنے کے خیال میں رہتے تھے۔
ہر لمحہ انھیں یہی انتظار رہتا تھا کہ کسی طرح کھیل شروع ہو۔ چنانچہ احباب
کو اسی مقصد سے جمع کرتے تھے۔ اور ان کے گھروں پر بھی جاتے تھے۔ کبھی
کوئی نہیں ملتا تھا تو اکیلے ہی تاش کے پتوں کو الٹ پلٹ کرتے رہتے تھے۔

اس کا اثر ان کی صحت پر خراب ہو رہا تھا۔ اس لئے ہم لوگوں
کی یہ خواہش تھی کہ انہیں کسی طرح رات رات بھر جاگنے اور رمی کھیلنے
سے روکا جائے۔ ان سے براہ راست تو یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ رمی چھوڑ
دیں کیونکہ سب جانتے تھے کہ جگر صاحب پر ان باتوں کا اثر نہیں ہوگا،
اس لئے ان سے چھپ کر یہ منصوبے بنائے جاتے تھے کہ جگر صاحب کو
اس کا خیال ہی نہ آئے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کا موقع
مل سکے۔ لیکن جگر صاحب کو اس کا علم ہو جاتا تھا۔ اور وہ کچھ اس انداز
سے اس خواہش کا اظہار کرتے تھے کہ ہم لوگوں کو اس کے سامنے سپر ڈالنی
پڑتی تھی۔ اور ہر شخص اس کھیل میں ان کے ساتھ شریک ہو جاتا تھا۔

چند سال ادھر کی بات ہے جگر صاحب میرے ایک عزیز
دوست کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میرا قیام بھی ان دنوں وہیں تھا۔
ایک شام انہوں نے جگر صاحب کے اعزاز میں کھانے کا انتظام کیا۔
ادب و شعر سے دلچسپی لینے والوں کو خاصی تعداد میں جمع کرنے کی کوشش
کی۔ سب لوگ جمع ہو گئے۔ کھانا کھایا گیا۔ کھانے کے بعد شعر و سخن کی
محفل شروع ہوئی۔ تھوڑی دیر اس کا سلسلہ جاری رہا۔ جگر صاحب
نے اس روز کئی غزلیں سنائیں۔ بارہ بجے کے قریب جب یہ محفل ختم
ہوئی اور بیشتر مہمان رخصت ہو گئے تو میں نے جگر صاحب سے کہا

"آپ بہت تھک گئے ہوں گے۔ اب آرام کیجیے۔ تو مناسب ہے" یہ
جگر صاحب اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور کہنے لگے
"جی ہاں، خیال تو اچھا ہے لیکن ۔۔۔"

میں نے کہا "کیا آپ تھکے نہیں ہیں۔ میرا تو برا حال ہو رہا ہے"

انہوں نے کہا "ابھی تو صرف بارہ بجے ہیں۔ تھوڑی دیر اور بیٹھیے ہیں"

میں سمجھ گیا کہ جگر صاحب آرام کرنا نہیں چاہتے۔ وہ تاش ضرور کھیلیں گے۔ بس انتظار کر رہے ہیں کہ کسی طرح یہ سلسلہ شروع ہو۔ اس وقت وہاں ہم تین چار دوست موجود تھے۔ مجھے تاش کا کوئی کھیل نہیں آتا۔ رات کو ذرا جلدی سونے کا عادی ہوں کیوں کہ صبح کو جلدی جاگتا ہوں اور سیر کے لئے نکلتا ہوں۔

جگر صاحب کو بھی اس کا علم تھا۔ وہ درحقیقت یہ چاہتے تھے کہ میں تو کسی طرح سونے کے لئے رخصت ہو جاؤں اور وہ بقیہ احباب کے ساتھ رمی کی محفل جمالیں۔ لیکن ابھی تک ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

میں ان کے دل کی بات سمجھ گیا تھا۔ اس لئے میں نے خود ہی کہا "جگر صاحب رمی کھیلنے کا ارادہ تو نہیں ہے"

جگر صاحب بولے "احباب چاہیں گے تو دو چار ہاتھ کھیل لیں گے"

اب سب لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ جگر صاحب کی خواہش یہی ہے اور ان کی یہ خواہش پوری ہونی چاہیے۔ چنانچہ تاش منگوائے گئے، اور کھیل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

میں نے جگر صاحب سے اجازت لی اور دوسرے کمرے میں جاکر سو گیا۔

صبح کو حسب معمول ساڑھے چار بجے اٹھا تو دیکھا جگر صاحب کے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ تاش کا کھیل جاری ہے۔ اس وقت ان کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور بغیر اطلاع کئے ہوئے صبح کو سیر کے لئے باہر چلا گیا۔

ساڑھے چھ بجے کے قریب واپس لوٹا تو دیکھا جگر صاحب برآمدے میں ٹہل رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ کھیل ابھی ابھی ختم ہوا ہے اور اب جگر صاحب چائے کا انتظار کر رہے ہیں۔

جگر صاحب مجھے دیکھ کر بولے "آپ سیر کر کے واپس آ رہے ہوں گے"

میں نے کہا "جی ہاں میں منہ اندھیرے ہی نکل گیا تھا۔ اس وقت آپ کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ لیکن میں نے آپ کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے بغیر ملے ہوئے چلا گیا"

جگر صاحب کہنے لگے "آپ آ گئے ہوتے۔ میں تو جاگ رہا تھا۔ رات بھر رمی ہوتی رہی۔ ابھی ابھی یہ سلسلہ ختم ہوا ہے۔ چند منٹ ہوئے میں باہر نکلا ہوں"

میں نے کہا "آپ کی طبیعت خراب تھی لیکن آپ پھر بھی جاگتے رہے"

جگر صاحب نے جواب دیا "بس کھیل ایسا شروع ہوا کہ اس کے ختم ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس وقت بھی یہ سلسلہ ختم نہ ہوتا۔ لیکن کچھ لوگوں کو دفتر جانا تھا۔ اس لئے مجبوراً ختم کرنا پڑا"

میں نے کہا "جگر صاحب مجھے تو رات ہی یقین ہو گیا تھا کہ اب آپ حضرات رات بھر کھیلیں گے۔ اور اسی طرح صبح ہو جائے گی"

جگر صاحب خاموش ہو گئے۔

ان پر رات کے جاگنے کا کوئی خاص اثر نہیں تھا۔ موقع ملتا تو وہ دن میں بھی کھیل کو جاری رکھتے۔ لیکن ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی طبیعت ابھی سیر نہیں ہوئی ہے۔ وہ تو کہئے کہ کھیلنے والوں میں سے بعض لوگوں کو دفتر جانے کی وجہ سے جلد اپنے اپنے گھروں کو پہنچنا تھا۔ اس لئے مجبوراً کھیل کو ختم کرنا پڑا۔

ہم لوگ برآمدے میں ابھی ٹہل ہی رہے تھے کہ نوکر نے اطلاع دی کہ چائے لگا دی گئی ہے۔ اور ہم لوگ چائے پینے کے لئے اندر کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

میں نے کرسی پر بیٹھے ہوئے جگر صاحب سے پوچھا "آپ کو رات کے وقت جاگنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی؟"

جگر صاحب کہنے لگے "مجھے جاگنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ ایک زمانے سے راتوں کو جاگتا رہتا ہوں۔ اب اگر کوشش بھی کروں تو رات کو نیند نہیں آتی۔ اس لئے کوئی نہ کوئی شغل پیدا کر لیتا ہوں"

میں نے دریافت کیا "جگر صاحب کیا آپ ہمیشہ سے جاگتے

رہے ہیں؟"

جگر صاحب بولے "مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ زندگی کے کسی دور میں بھی میں نصف شب سے قبل کبھی سویا ہوں۔"

میں نے پوچھا "آخر اس کا سبب کیا ہے؟"

جگر صاحب نے جواب دیا "مشاعرے اس کا ایک سبب ہو سکتے ہیں۔ ہمیشہ سے مجھے مشاعرے پڑھنے کے لئے راتوں کو جاگنا پڑا ہے۔ میری باری ہمیشہ نصف شب کے بعد ہی آتی ہے۔ اس لئے اب کچھ ایسا عادی ہو گیا ہوں کہ رات بھر جاگتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔"

سبب جو کچھ بھی ہو لیکن جگر صاحب جاگتے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جاگتے تھے اس لئے تاش کھیلتے تھے یا تاش کھیلتے تھے اس لئے جاگتے تھے۔ بہر حال جاگنا اور تاش کھیلنا دونوں کو انہوں نے اپنے مزاج میں داخل کر لیا تھا۔ وہ جاگتے تھے اس لئے تاش کھیلتے تھے اور تاش کھیلتے تھے اس لئے جاگتے تھے۔

تاش کھیلنے کی انہیں لت سی پڑ گئی تھی۔ بغیر اس کے ان کا زندہ رہنا مشکل تھا۔ رمی کھیلتے ہوتے انھیں کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ احباب کی دعوت اس لئے قبول کرتے تھے کہ کھانے کے بعد رات بھر رمی کا سلسلہ جاری رہے گا۔

3 3517

میں ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ جگر صاحب کو کسی طرح رات کے وقت آرام کرنے کا موقع مل جائے۔ اس لئے جب کبھی میں نے انھیں اپنے یہاں بلایا ہے تو میری یہی کوشش رہی ہے کہ کھانے کے بعد تاش کا سلسلہ شروع نہ ہو اور جگر صاحب کھانے سے فارغ ہو کر زیادہ سے زیادہ آرام کریں۔ لیکن میری یہ کوشش کبھی بارآور نہیں ہوئی ہے۔ جگر صاحب نے ہمیشہ کچھ ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ چار چھ آدمی ضرور ان کے ساتھ تاش کھیلنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں اور میں بھی اس کے لئے تیار ہو گیا ہوں۔"

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے جگر صاحب کی باقاعدہ دعوت کی اور ان کے تقریباً تمام دوستوں کو بلایا۔ جگر صاحب وقت سے پہلے آگئے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آٹھ بجے کے قریب کھانا کھایا۔ اس کے بعد شعر و شاعری شروع ہوئی اور اس طرح کوئی گیارہ بج گئے۔ سخت سردی تھی۔ بہت سے لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ لیکن جگر صاحب نے اٹھنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا اور میجر منان اللہ بیگ مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر شفیق الرحمن اور دو تین دوسرے احباب سے باتیں کرتے رہے۔ دراصل وہ اس انتظار میں تھے کہ اب کوئی رمی کھیلنے کی تجویز پیش کرے گا۔ لیکن میں نے پہلے سے کہہ رکھا تھا کہ آج تاش نہیں ہوں گے۔ اس لئے کسی نے یہ تجویز پیش نہیں کی۔ میں نے ڈاکٹر شفیق الرحمن کے سپرد یہ کام کیا تھا کہ وہ کھانے کے بعد جگر صاحب کو اپنی گاڑی میں واپس ان کی جائے قیام پر لے جائیں گے۔ اس لئے انہوں نے کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب رخصت ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ جگر صاحب خاموش رہے۔ وہ تو ابھی بیٹھنا چاہتے تھے اور ان کا ارادہ رمی کھیلنے کا تھا۔ شفیق الرحمن کا اصرار جاری رہا۔ بالآخر سب لوگوں نے یہ طے کیا کہ اب رخصت ہونا چاہئے۔ چنانچہ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور موٹروں میں سوار ہونے کے لئے باہر نکلے۔ شفیق الرحمن نے موٹر کا دروازہ کھولا تو جگر صاحب کہنے لگے "اچھا صاحب تو آج رمی نہیں ہوگی۔ میری تو خواہش یہی تھی کہ ذرا دیر یہ سلسلہ رہتا۔ مجھے تو رات بھر نیند نہیں آتے گی۔" یہ باتیں انہوں نے کچھ اس انداز میں کہیں کہ سب کو جگر صاحب پر ترس آگیا اور طے پایا کہ تھوڑی دیر رمی ضرور ہونی چاہئے۔ جگر صاحب تو اس کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ موٹر میں بیٹھنے کی بجائے جلدی سے ڈرائنگ روم واپس چلے گئے۔ تاش ان کے پاس موجود تھے بس چند منٹ میں رمی کی محفل جم گئی۔ وہ یہی چاہتے تھے۔ احباب نے ان کی خواہش کو پورا کر دیا اس لئے ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ میں نے تو چند منٹ کے بعد اجازت لے کر سونے کے لئے چلا گیا۔ منہ اندھیرے اٹھ کر سیر کے لئے جانے لگا تو دیکھا ڈرائنگ روم میں محفل باقاعدگی سے جمی ہوئی ہے اور کھیل کا سلسلہ جاری ہے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ رات بھر جگر صاحب سخت سردی میں ایک پہلو سے بیٹھے رمی کھیلتے رہے ہیں ان پر نہ تو سردی کا کوئی اثر ہوا ہے اور نہ انہیں نیند ہی آتی ہے۔ نو بجے دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد کھیل ختم ہوا۔ جگر صاحب نے اس کے بعد منہ ہاتھ دھویا۔ ناشتہ کیا اور پھر اپنی جائے قیام پر گئے۔

یہ پروگرام ان کے معمولات میں داخل ہوگیا تھا۔ کھانے کے بعد جب تک رمی نہ ہو تو انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان کی دعوت کی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص اس بات کی کوشش کرتا کہ رمی کا سلسلہ شروع نہ ہو تو جگر صاحب حسرت کی تصویر بن کر کچھ اس طرح اس خواہش کا اظہار کرتے کہ اسے اپنے اوپر جبر کر کے ان کی بات ماننی پڑتی۔ جگر صاحب کچھ اس طرح سے کہتے کہ ان کا دل رکھنا احباب کے لئے ضروری ہو جاتا، اور وہ خود بھی ان کے ساتھ جاگنے کے لئے تیار ہو جاتے۔

جگر صاحب اس کھیل میں کچھ اس طرح گم ہو جاتے تھے کہ انہیں اپنے آس پاس اور گرد و پیش کا خیال ہی نہیں رہتا تھا۔ لوگ ان کے پاس جاتے رہتے تھے لیکن وہ اس میں کچھ اس طرح محو رہتے تھے کہ انہیں ان کے آنے کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ کوئی آیا تو اسی محویت کے عالم میں اس سے دو ایک باتیں کر لیں لیکن محویت کے اس عالم میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ایک دن تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

جگر صاحب رمی کھیل رہے تھے کہ ایک صاحب ان سے ملنے کے لئے آ گئے۔ عرصے کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تھی اس لئے جگر صاحب نے ان سے باتیں تو شروع کیں لیکن کھیل بند نہیں کیا۔ باتیں کرتے جاتے تھے لیکن دھیان کھیل کی طرف تھا۔

جگر صاحب نے ان سے پوچھا "آپ کا مزاج تو اچھا ہے؟"

وہ صاحب بولے "خدا کا شکر ہے۔ میں بالکل اچھا ہوں۔"

جگر صاحب نے تاش کا پتہ پھینکتے ہوئے کہا "آپ کے گھر میں تو سب خیریت ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "اللہ کا احسان ہے۔"

جگر صاحب پھر تاش کے پتوں میں محو ہو گئے اور کچھ سوچ کر بولے "آپ کے والد صاحب تو اچھی طرح ہیں؟"

وہ صاحب کہنے لگے "ان کا تو انتقال ہو گیا۔"

جگر صاحب اس وقت بری طرح تاش میں گم تھے۔ ان کے منہ سے بے خیالی کے عالم میں نکلا "اچھا تو ان کا انتقال ہو گیا۔ اچھا ہوا۔"

خدا جانے یہ فقرہ ان کی زبان سے کیوں نکلا۔

وہ صاحب خاموش رہے۔

لیکن ایک لمحے کے بعد جگر صاحب کو نہ جانے کیا خیال آیا کہنے لگے "آپ نے کیا کہا انتقال ہو گیا؟"

انہوں نے کہا "جی ہاں۔"

اب جگر صاحب کو اس بات کا احساس ہوا کہ بے خیالی میں ایک ایسا جملہ ان کے منہ سے نکل گیا ہے جو نہیں نکلنا چاہئے تھا۔ اس لئے چند منٹ کے لئے انہوں نے کھیل بند کر دیا اور دیر تک معذرت کرتے رہے۔

رمی کھیلتے ہوئے اکثر ایسے لمحے آتے تھے جب جگر صاحب کو اسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ محویت کے عالم میں وہ نہ جانے کیا کچھ کہہ جاتے تھے لیکن فوراً ہی انہیں احساس ہو جاتا تھا تو وہ اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک زمانہ جگر صاحب پر ایسا گزرا ہے جب انہیں رمی کھیلنے والوں کی تلاش رہتی تھی۔ بعض احباب انہیں مل جاتے تھے اور وہ محض ان کا دل رکھنے کے خیال سے ان کے ساتھ رمی کھیلتے تھے۔ جب احباب میں سے کوئی انہیں نہیں ملتا تھا تو وہ اکیلے ہی تاش سے دل بہلاتے رہتے تھے۔

غرض ایک زمانے میں انہیں رمی کھیلنے کی دھن سی ہو گئی تھی اور وہ چوبیس گھنٹے اسی کے خیال میں گم رہتے تھے۔ اس زمانے میں انہیں دیکھ کر ہمیشہ کچھ یوں محسوس ہوا ہے کہ زندگی میں انہیں سوائے اس کے کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔

خدا جانے زندگی میں کون سی ایسی کمی تھی جو وہ اس کھیل سے پوری کرنی چاہتے تھے۔ خدا جانے کونسا ایسا غم تھا جس کو اس طرح غلط کرنا ان کے پیش نظر تھا۔ خدا جانے کونسا ایسا خلا تھا جس کو وہ اس طرح پُر کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

میرے لئے تو رمی سے ان کی یہ غیر معمولی دلچسپی ہمیشہ ایک معمہ رہی ہے، اور میں آج تک اس معمے کو حل نہیں کر سکا ہوں۔

دراصل بات یہ ہے کہ جگر صاحب ایک ذہین و فطین آدمی تھے۔ ان کے "جینیس" ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ایک جینیس

میں جو انتہا پسندی ہوتی ہے اور جو غیر متوازن انداز ہوتا ہے وہ ان میں
بھی تھا۔ انہیں جس بات کی دھن ہو جاتی تھی وہ اسے انتہا تک پہنچا دیتے
تھے۔ انہوں نے شراب پی تو اسی طرح پی کہ معلوم ہوتا تھا زندگی بھر اس
سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکیں گے اور پھر جب اس کو چھوڑا تو اس طرح چھوڑا
گویا اس سے کبھی کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ یہی شروع کی تو اس طرح
کہ اس کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

اس انتہا پسندی اور غیر متوازن انداز میں ان کے لاابالی پن
کو یقیناً دخل تھا لیکن اس کے باوجود ان میں بعض ایسی خصوصیات تھیں
جن سے عام طور پر ایسے مزاج کے لوگ محروم ہوتے ہیں۔ ان کا احساس
جمال بہت ہی نکھرا ہوا تھا اور وہ ہر معاملے میں اپنے ستھرے ذوق
جمال کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں بڑی لطافت تھی اور
ہر لطیف چیز کو دیکھ کر خوش ہونا ان کے مزاج میں داخل تھا۔ وہ
نفاست کے پرستار تھے اور یہ نفاست کہیں بھی ہو انہیں اپنی طرف
متوجہ کر لیتی تھی۔ حسن کسی شکل میں بھی ہو انھیں متاثر کرتا تھا۔ ان کی صورت
شکل، لباس، چال ڈھال اور رہن سہن کے انداز سب میں یہ لطافت
و نفاست نظر آتی تھی۔ ان کے پیشِ نظر حسن کا ایک معیار تھا، اور اس
معیار کو وہ کبھی بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے، اور سب کچھ دیکھ کر ان کے
توازن اور اعتدال کا قائل ہونا پڑتا تھا۔ وہ توازن اور اعتدال کو حسن و
جمال اور حسن و جمال کو توازن اور اعتدال سمجھتے تھے۔ یہی ان کے نزدیک
حسن کا معیار تھا۔ اور اسی زاویۂ نظر سے وہ ہر چیز کو دیکھتے تھے۔
جو چیز اس معیار پر پوری اترتی تھی وہ ان کے نزدیک حسین تھی اور
جو اس پر پوری نہیں اترتی تھی، اس کو وہ بدصورت سمجھتے تھے۔

میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ جگر صاحب کی نگاہیں اسی حسن
کی تلاش میں [illegible]

[illegible]

بھی انھیں حسن کا یہ پہلو نظر آ جاتا تھا اور وہ گھنٹوں اس کو سراہتے
رہتے تھے۔

ایک دفعہ سخت سردیوں کے زمانے میں جگر صاحب میرے
یہاں تشریف لائے۔ ماگھ پوس کی سردی تھی۔ دانت سے دانت
بج رہا تھا۔ میں نے ان کے لئے جس کمرے میں قیام کا انتظام کیا
وہاں سلیقے سے انگیٹھی دہکا دی۔ مسہری پر بہت موٹے موٹے گدے
بچھائے اور اس پر ایک سیاہ رنگ کی ریشمی رضائی جس پر سنہرے
رنگ کے خوبصورت پھول پڑے ہوئے تھے ڈال دی۔ جگر
صاحب رات کے وقت اس کمرے میں داخل ہوئے تو خوش ہو گئے۔
بار بار اس رضائی کی تعریف کرتے جاتے تھے۔ اگرچہ اس میں کوئی
خاص بات نہیں تھی لیکن اس کا انداز عام رضائیوں سے ذرا مختلف
تھا۔ چمک دار سیاہ رنگ پر سنہرے پھول بہت اچھے معلوم ہوتے
تھے۔ جگر صاحب نے اس کی اس قدر تعریف کی کہ مجھے وہ رضائی
اچھی معلوم ہونے لگی، ورنہ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ پھر
انگیٹھی میں دہکتے ہوئے انگاروں کے حسن کی تعریف کرنے لگے۔ غرض
جگر صاحب بہت معمولی معمولی چیزوں میں حسن کو دیکھتے اور اس
حسن سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

یہ احساسِ حسن ان کے یہاں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ کسی صحیح
چیز کو غلط جگہ یا غلط چیز کو صحیح جگہ پر نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ایک بار جگر صاحب سے ایک ایسے صاحب ملنے کی غرض
سے آئے جو صورت شکل کے بہت اچھے تھے۔ لباس بھی معقول تھا۔
بات چیت بھی اچھی طرح کرتے تھے۔ غرض خاصے مہذب آدمی تھے۔ لیکن
ان کے ہاتھ میں سونے کی گھڑی کے ساتھ [illegible]

[illegible]

[illegible] صاحب ہنس کر بولے "یہ گھڑی کی چین تھی یا کنگن ؟"

میں نے کہا "ایسی کلائی میں تو کنگن ہی کھنکنا چاہئے۔"

کہنے لگے "ان حضرات کے ذوق جمال کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ [illegible] تو عورتوں کے لئے ہے اور انہیں کے ہاتھوں کو زیب دیتا ہے۔"

میں نے کہا "جگر صاحب مردوں کے لئے بھی تو آخر کوئی زیور چاہئے۔"

جگر صاحب کہنے لگے "جی ہاں یہ چین زیور ہی کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔"

میں نے کہا "اب تو یہ فیشن ہو گیا ہے۔ اپنی دولت کو ظاہر کرنے کے لئے لوگ اب سونے کی چین لٹکاتے ہیں۔"

جگر صاحب کہنے لگے "یہ ذہنی اور جمالیاتی افلاس کی دلیل ہے۔"

ایسے نہ جانے کتنے واقعات ہیں جو جگر صاحب میں رچے ہوئے احساس حسن اور ذوق جمال کو ظاہر کرتے ہیں۔

جگر صاحب بہت نازک اور سبک سے جوتے پہنتے تھے، [illegible] جوتوں کے معاملے میں حد درجہ نفاست پسند واقع ہوتے تھے۔ اس لئے کسی کے پاؤں میں بھاری جوتوں کو دیکھ کر انھیں بڑی کوفت ہوتی تھی۔ میں ہمیشہ موٹے سول کے بھاری جوتے پہنتا ہوں چنانچہ جگر صاحب جب بھی مجھ سے ملتے تو سب سے پہلے ان کی نظر میرے جوتوں پر جاتی۔ ان جوتوں کو دیکھ کر وہ کہتے تو کچھ نہیں تھے لیکن ان کی معنی خیز مسکراہٹ اس سلسلہ میں کہ نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ جاتی تھی۔

ایک دن مجھ سے [illegible] کے جوتے پہنے [illegible] جوتوں کی تعریف [illegible] ہیں؟"

[illegible] جگر صاحب [illegible] ہے جو [illegible]

[illegible] موٹے اور بھدے جوتے سے انسان کا پاؤں [illegible] آپ کو [illegible] نہیں ہوتی؟"

میں نے کہا "مجھے تو اس میں بہت آرام ملتا ہے۔"

کہنے لگے "آپ کو یہ خوبصورت بھی معلوم ہوتے ہیں؟"

میں نے کہا "جگر صاحب حسن طاقت اور صحت میں بھی تو ہے۔ مجھے اپنے بھاری بھرکم جوتوں میں ایسا ہی حسن نظر آتا ہے۔ مجھے تو یہی جوتے حسین معلوم ہوتے ہیں۔"

جگر صاحب بولے "میرے خیال میں تو جوتا وہی ہے جو ہلکا ہو، نرم اور سبک ہو۔ کہ اسی میں اس کا حسن ہے۔"

میں نے کہا "مجھے تو ایسے جوتے میں انحطاط و زوال کی تصویر نظر آتی ہے۔"

جگر صاحب کہنے لگے "مجھے یہ انحطاط و زوال کی نشانی بہت عزیز ہے۔ اس سے کم از کم لطافت اور نفاست ٹپکتی ہے۔"

غرض وہ لطافت اور نفاست کے پرستار تھے۔ ہر لطیف اور نفیس موزوں اور متوازن چیز انہیں متاثر کرتی تھی اور وہ اس میں حسن کی دنیا میں دیکھتے تھے۔

وہ بنیادی طور پر ایک شاعر تھے اور ان میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو عام طور پر شاعروں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ نکھرا ہوا احساس حسن اور ذوق جمال بھی دراصل ان کے فطری شاعر ہونے ہی کا نتیجہ تھا۔ شاعری ان کے خیال میں زندگی اور حسن سے عبارت تھی اور وہ زندگی کو حسن اور حسن کو زندگی سمجھتے تھے۔ حسن کے لئے حسن نظر اور زندگی کے لئے ذوق زندگی کو بھی انہوں نے ہمیشہ اہمیت دی۔ اور ان کی زندگی اور شاعری دونوں میں انہیں پہلوؤں کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ وہ اکثر اس خیال کا اظہار کرتے تھے کہ شاعر زندگی کا صحیح ترجمان اور خالق جمال ہوتا ہے۔ شاعر کو زندگی اور زندگی کو شاعر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اچھا انسان ہی اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔ شاعر میں زندگی اور جوانی ہونی چاہئے۔ جو شخص بوسیدگی اور قنوطیت کا شکار ہو اس کو شاعری سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ شاعری کرتا ہے لیکن اس کی شاعری مردہ ہوتی ہے۔ جگر صاحب شاعری میں [illegible] ترنم اور نغمگی کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک [illegible]

ہم پاکستان رائٹرز گلڈ کی دوسری سالگرہ

کے موقع پر ہدیۂ مبارکباد

پیش کرتے ہیں

حبیب ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

اے ۔ ۲۰ ایس آئی ٹی ای

منگھو پیر روڈ ۔ کراچی

ٹر وحید اختر

اُردو ادب کے ۳۰ سال

(تحریکیں، رجحانات اور افراد)

(یہ مضمون ایک ہندوستانی ادیب کا ہے۔ اس کی افادی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں ان کی رائے سے تعرض نہیں لیکن شاید صاحبِ مضمون کو پاکستان کے اردو ادیبوں کے بارے میں پوری واقفیت نہیں)

(ادارہ)

پہلی جنگ عظیم سے قبل ہی اُردو دنیا ایسی بہت سی آوازوں
پوری طرح روشناس ہو چکی تھی جو جدید اُردو ادب میں ایک نئے
سکی نقیب سمجھی جاتی ہیں، حالی، شبلی، اکبر، اقبال، شاد، حسرت
ہ چند اپنی انفرادی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے، فانی، اصغر، یگانہ
نام بھی نئے نہیں رہے تھے۔ لگ بھگ اسی زمانے میں یا اس کے
بعد عبدالرحمٰن بجنوری، مہدی افادی، سجاد انصاری، سجاد حیدر
بم، جوش، جگر، ظفر علی خاں، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری
ن کے ساتھ بہت سے نام نئے نئے رجحانات کی نمائندگی کرنے
تھے۔ پہلی جنگ نے ساری دنیا کو مادّی طور پر ہی آگ میں نہیں
کا بلکہ آگ کی اس آزمائش سے انسانی معتقدات اور اقدار کو بھی
نا پڑا۔ اس آگ کے دریا میں روح بھی جھلسی اور ذہنوں کے آتش
ا بھی لاوا اگلنے لگے۔ انیسویں صدی میں سائنس کی ہمہ گیر اور ہمہ جہتی
نے مذہب کی جگہ انسانیت دوستی کی اقدار کو دے دی تھی۔ ان اقدار
ہارے روح کو سفر کرنے کے لئے کچھ سہارے تو مل ہی گئے تھے
لی پیمانے پر انسان کے ہاتھوں انسان کے قتل، مہذب قوموں
تھوں تہذیبوں اور قوموں کی تباہی دیکھنے کے بعد انسانیت دوستی
اقدار جو انسان کی بنیادی نیکی و شرافت کو مانتی تھیں اور تہذیب
نا کی اعلیٰ روایات اگرچہ ختم نہیں ہوئیں مگر مجروح ضرور ہوئیں۔
ل جنگوں کا میدان بنا ہے والا یورپ اپنی زمین کے زخموں کو
نما کوشش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے دریاؤں کے پانی کو خون

سے پاک بھی نہیں دیکھ سکتا تھا اسی جنگ میں دنیا نے پہلی بار یہ محسوس
کیا کہ یورپ میں ہونے والی جنگ کے شعلوں سے ایشیا کی زمین اور
روح بھی جھلس سکتی ہے، ہندوستان کی نوآبادیاتی حکومت تو براست
اس جنگ میں شریک تھی اور ہندوستانیوں کو غیر ممالک کے اجنبی محاذ
پر اُن دشمنوں سے لڑنا پڑا جن سے ان کی اپنی کوئی لڑائی نہ تھی۔ ان
دوستوں کے دوش بدوش رت قبول کرنے پر آمادہ ہونا پڑا جو جنگی
دولت اور ذہن کا استحصال کر رہے تھے اس بھیانک حقیقت کے
انکشاف نے غیر ملکی قوتوں کے محاذ پر لڑنے والے ایک کرانچی کے سپاہی
کو نذرالاسلام جیسا آتش نوا شاعر نہیں بنایا بلکہ سارے ہندوستان
میں انقلاب کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کر دیا۔ جنگ کے دوران میں
آزادی کی جو تحریک چل رہی تھی وہ جنگ کے خاتمے کے بعد اور تیز ہوگئی
اس لئے کہ سفید فام آقاؤں نے سپاہی فراہم کرنے کے لئے ملک کی آزادی
کے جو وعدے کئے تھے وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ اس جدوجہد
میں دوش بدوش لڑنے والے سب ہی طرح کے لوگ تھے نئے خیالات
والے اور پرانی اقدار کو سینے سے لگانے والے بھی۔ اگر ایک طرف
تہذیبی احیا پرستوں نے ہندوستان کو اپنی پرانی عظمت گم گشتہ کے
خواب دکھائے، مسلمانوں کو ان کی اپنی تہذیبی روایات کے دفینے
سے خبردار کیا تو دوسری طرف مغربی تعلیم کے اثرات نے یورپ کے
نئے نئے سائنسی، مادّی، اور سیاسی فلسفوں کے لئے بھی جو راہ ہموار کی
زمین ہموار کی ۔۔ اس صدی کے دوسرے دہے میں، تمام

زیادہ نمایاں ہو چکے تھے ۔ دوسری طرف خود ہمارے ملک کے
برسر اقتدار طبقے نچلے طبقوں اور محنت کش کسانوں اور مزدوروں کا
کا جابرانہ استحصال کر رہے تھے ، دیہی معیشت تباہ ہو چکی تھی اور
شہری معیشت جو بدقسمتی سے اب تک اس برصغیر کے معاشی نظام
کی بنیاد نہیں بن سکی ۔ نئے صنعتی اداروں اور ان کی ضرورتوں سے
آگاہی ہو رہی تھی۔ اکبر کو اندھی مغرب پرستی کا غم تھا تو علی گڑھ تحریک
سے وابستہ افراد نئے مغربی رجحانات کو ہی اپنی فلاح کا ذریعہ سمجھ
رہے تھے۔ مگر اب یہ دونوں متضاد رجحانات آزادی کی جدوجہد میں
عجیب طریقے سے آمیز بھی ہوتے جا رہے تھے۔ پریم چند کسانوں کی
زندگی اور دیہاتوں کی معاشی ابتری کا نوحہ بھی لکھ رہے تھے اور اس
زندگی کی انسانی اقدار کا قصیدہ بھی حقیقت پسندی کی تحریک تصوریت
کے خوابوں کا سہارا لئے ہوئے تھی۔ انقلاب کے سیاسی نظریے
رومانیت کی راہگذاروں میں اپنی منزل تلاش کر رہے تھے ۔ غزل
زندگی کے نئے تقاضوں کی نبض ڈھونڈھ رہی تھی۔ نظم حالی اور اقبال
سے آگے بڑھ کر رومانی انقلاب کے نعروں سے گونجنے لگی تھی ، افسانہ
پریم چند کے ہاتھوں شروع ہو کر حقیقت نگاروں کی روایات سے
آشنا ہونے کے بعد ایک بے سبب رومانیت کا شکار ہو گیا تھا
جو فرار بھی تھا اور حقیقت کی تلاش میں روح کی آسودگی کا سہارا
بھی۔ زندگی اور ادب کے سماجی و مادی رشتوں کے نباض مجنوں
گورکھپوری اس وقت پر اسرار افسانے لکھ رہے تھے ۔ آزاد خیالی
اور عقلیت پرستی کے سب سے اہم شارح نیاز فتحپوری "شباب
کی سرگذشت" اور "شاعر کا انجام" لکھ رہے تھے ۔ جوش کی آزادی
کا ولولہ جوان محنت کش عورتوں کے جسم کے پیچ و خم کی تصویر کشی کر رہا
تھا۔ ابو الکلام آزاد کا آتش نوا قلم جس نے اردو صحافت کو ادب کا
اچھوتا اور اعلیٰ اسلوب دے کر اسے تخلیقی ادب کے زمرے میں داخل
کر دیا تھا محض سیاسیات میں الجھ چکا تھا ۔ قاضی عبد الغفار کی روشن
خیالی اور ترقی پسندی طوائف کی سماجی حیثیت کا خاکہ کھینچ چکی تھی
مہدی افادی اور سجاد انصاری نے گناہ کو آرٹ اور حسن پرستی کو
مذہب بنانے کی سعی بھی کر ہی ڈالی تھی ۔ ظفر علی خاں کی عملی سیاست

طنزیہ شاعری کو جنم دے رہی تھی ۔ یہ ادب ایسے کتنے ہی افراد
جنھوں نے اردو ادب میں نئی نئی شمعیں روشن کر رہی تھیں ۔ ا
شیرانی رومانی شاعروں کے ساتھ ریحانہ اور سلمیٰ کو گم کر دینے وا
وادیوں میں انقلاب کو بھی ساتھ ہی ساتھ آواز دے رہے
نام ہی اگر گنانا ہو تو اس دور کے شاعروں میں احسان دانش
روش ، ساغر ، علی اختر ، علی منظور ، کے نام بھی آتے ہیں اور ا
نگاروں میں سدرشن ، علی عباس حسینی ، اعظم کریوی ، سلطان
جوش ، حجاب امتیاز علی ، اور امتیاز علی تاج بھی اس وقت لک
رہے تھے ۔ لیکن اگر ناموں سے قطع نظر صرف تحریک کی حد تک ا
اس تحریک کے اہم افراد کی تحریروں تک بحث محدود رکھی جائے تو
اس دور کے ادب میں ایک التباس سا ہوتا ہے کہ شاید یہ دور "ا
تحریک" کا عہد کہا جا سکتا ہے ۔ جس طرح ادب میں REUDO-
CLASSIC کی اصطلاح استعمال ہو سکتی ہے ۔ اسی طرح ا
کے اس دور کے لئے REUDO -ROMANTIC AGE
کی نئی اصطلاح گڑھنا بے جا نہ ہوگا ۔ جن معنوں میں یورپ میں ا
کو رومانی تحریک نظر آتی ہے ، ان معنوں میں اردو میں کسی تحریک
کا وجود تلاش کرنا لا حاصل ہوگا ۔ اگر رومانیت کے معنوں کو پ
اقدار اور نظام ، پرانے ادب کی روایات اور معیاروں سے با
انحراف سمجھا جا سکتا ہے تو ایک حد تک اس تحریک کا اردو میں
سراغ ملے گا ۔ جس طرح سے یورپ کے رومانی ادوار میں پرانی
اقدار و روایات سے انحراف کے ساتھ ساتھ فکر کی ایک معین
سمت بھی نظر آتی ہے اس طرح اس دور میں فکر کی کوئی واضح
نہیں ۔ مختلف الخیال ادیبوں اور شاعروں نے اپنے ادبی اظہار
لئے اسلوب میں کچھ جدتیں کیں اور موضوعات کے انتخاب میں بغ
کا راستہ اختیار کیا ۔ مہدی افادی اور سجاد انصاری کے مضا
نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری کے افسانے ، جوش اور اختر ش
کی شاعری ، قاضی عبد الغفار اور چودھری محمد علی کے افسانے ایک د
سے مزاج میں مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک طرف تو جمالیاتی حظ
فراہم کرتے ہیں دوسری طرف حقیقت نگاری یا نئے موضوعات ک

ضوعات کے انتخاب میں اپنے باغیانہ طرزِ اظہار کے ساتھ روح کی موت
ہی کا آئینہ ہیں ۔ اس سے ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ لکھنے والے لکھ تو
رہے تھے مگر ان کا اجتماعی شعور ابھی اپنے عہد کو پہچان نہیں پایا تھا
رشاید اس عہد کی خود بھی یہ خصوصیت تھی ، ورنہ اس طرح کا
ب پیدا ابھی نہ ہو سکتا تھا ـــــ رومانی بغاوت کا یہ سلسلہ ہم
" انگارے " کے مصنفین کے اندازِ تحریر اور موضوعات سے
ا نظر آتا ہے ۔ اس لحاظ سے " انگارے " کو ایک دور کی آخری
ر دوسرے دور کی پہلی کڑی کہا جا سکتا ہے ۔ " انگارے " کے
مانے اپنے موضوعات اور باغیانہ طرزِ فکر و اظہار کے لحاظ سے
ی ا پنے سے پہلے والے دور کی پیداوار بھی ہیں اور ایک نئی ادبی
ریک کا آغاز بھی ۔ اور اگر اس مجموعہ کے مصنفین خارجی طور پر کسی نئی
ریک کا آغاز نہ کرتے تو شاید " انگارے " اس دور کی عام روش
ں کھو کر رہ جاتے ۔

——— (۱) ———

حالی اور محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے نام سے اردو
ں نظم نگاری کی مقصدی کی تحریک کا آغاز کیا ۔ سرسید کی علیگڑھ
ریک نے مقصدی ادب کو فروغ دینے میں حصہ لیا ۔ اکبر اگرچہ تنقید پر
نز کرتے رہے مگر ان کی شاعری کا طنزیہ دار بھی ایک خاص مقصد
ے تحت تھا ۔ شبلی نے مسلمانوں کو ان کی مٹتی ہوئی تہذیب کا آئینہ
ھلایا ۔ پھر خلافت تحریک ۔ مولانا آزاد کی تحریریں ۔ اقبال کی شاعری
س میں پہلی مرتبہ زندگی کا ایک مربوط تصور اور شاعری کا مقصد (ایک
د تک محدود سہی) سامنے آیا ۔ چکبست ، ظفر علی خاں اور دوسروں
ی سیاسی شاعری ۔ جوش کی انقلابی رومانیت ۔ ان سب نے مل کر اردو
یں اس تحریک کے لئے زمین ہموار کی جو اس صدی کی چوتھی دہائی میں
ر دو پکڑنے والی تھی ۔ پریم چند نے حقیقت نگاری کی بنیاد پر افسانے
ی صنف کی جڑیں ہندوستانی زمین میں کافی گہری پیوست کر دی
تھیں ۔ یگانہ اور فراق (چاہے ترقی پسندی ان میں سے کسی کے وجود
ی اہمیت سے منکر ہی ہوں) زندگی کے مسائل کو تغزل کے سانچے
یں ڈھال کر اس قدیم صنف کے امکانات کو چمکا رہے تھے حسرت

کی سیاست کتنی ہی جاندار رہی مگر ان کی سیاسی شاعری بھی ان کی
شخصیت کی طرح سادہ تھی ، صرف یگانہ اور فراق کی غزل ہی میں
اتنا کس بل تھا کہ وہ نئی غزل کے امکانات سے انصاف کرتی ۔ اسی
ادبی پس منظر کے ساتھ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا ۔ لطف یہ ہے
کہ ہندوستان کی یہ ادبی تحریک شروع ہوئی لندن میں ، جہاں
ملک راج آنند اور سجاد ظہیر نے پیرس کانفرنس (۱۹۳۵ء) سے
قبل اس تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی ۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں اس کی
کانفرنس پریم چند کی صدارت میں منعقد ہوئی ۔ عین اسی زمانے میں
بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے ناگپور کے اجلاس میں پنڈت جواہر
لال نہرو ، آچاریہ نریندر دیو ، مولوی عبدالحق ، منشی پریم چند اور
اور اختر رائے پوری کی مشترکہ کوشش سے ایک اعلان نامہ شائع
کیا گیا ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا منشور اور یہ دوسرا اعلان
نامہ ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے ۔ دونوں میں ہندوستانی
سیاست کے عوامل کو سمجھنے اور ادب کو اس جد و جہد میں ایک مؤثر
حربہ بنانے پر زور دیا گیا تھا ۔

ساہتیہ پریشد کے اعلان نامے کا آخری حصہ ۔

" ہندوستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع واجب اور
جائز ہے کہ وہ یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ ادب کی بنیاد
زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر و تبدل
کی کہانی ہے زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج
کو بدلنا چاہتا ہے اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور
جملہ بنی نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے "

اس اعلان نامے کی رو سے حسن اور آرٹ کی غیر جانبداری
بھی اتنا ہی جرم تھی جتنا جرم محض واقعہ نگاری کی تصویر کشی کو
قرار دیا گیا تھا ۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے اعلان نامے میں سائنسی
عقلیت پسندی کے فروغ ، ادب اور عوام کے براہ راست رشتے
پر زور دیا گیا تھا اور ادب میں شدید قسم کی ہیئت پرستی اور گریز کن
منفی رجحانات کی مخالفت پر کمر باندھی گئی تھی ۔

دراصل یہ مقصدی ادب کی ایک خاص سمت کی طرف نشان دہی تھی۔ اس وقت برصغیر ہند میں آزادی کی جنگ اپنے پورے شباب پر تھی — اور دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر نازیزم کا خطرہ دوسری جنگ عظیم کے روپ میں دنیا کے سر پر منڈلا رہا تھا اس تحریک کا مقصد ایک طرف تو ہندوستان کے معاشی استحصال اور غلامی کے خلاف جدوجہد کو تیز کرنا تھا اور دوسری طرف عالمی مسائل کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنا اور ادب کے پڑھنے والوں میں ان کا شعور پیدا کرنا تھا۔ اس دور کے ہندوستان میں محاذ آزادی پر تمام مختلف لخیال پارٹیاں، گروہ تحریکیں اور افراد ایک مقصد کے تحت مورچہ بندی کر رہے تھے اس لئے اس تحریک کو ہر طرف سے سراہا گیا، پریم چند، عبدالحق، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، ڈاکٹر عابد حسین، نیاز فتحپوری، قاضی عبدالغفار، فراق، مجنوں گورکھپوری، علی عباس حسینی، ساغر نظامی نے اس تحریک کا خیر مقدم کیا۔ ٹیگور، جواہر لال نہرو، اچاریہ نریندر دیو نے نئے ادیبوں کی اس تنظیم کے نیک مقاصد پر خوشی ظاہر کی۔ اقبال نے بھی حوصلہ افزائی کی — یہ تحریک اردو ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کی دوسری تمام زبانوں میں بہت جلد مقبول ہو گئی — اور اس کا اثر بڑھتا گیا۔

اگر ادب میں اس نام کی کوئی تحریک بالکل نئی سمجھی جائے تو سوال یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے ہندوستانی سماج میں اردو کے ادیبوں اور شاعروں کا کیا رول رہا تھا؟ میر، سودا، انشا، نظیر، مصحفی، غالب، ذوق، مومن، انیس، سجاد حالی، آزاد، پریم چند، اقبال، شبلی اور سرسید کے افکار ادب کے ذریعہ کس مقصد کو پیش کرتے رہے؟ اس بات کو ماننے میں اس وقت کسی کو تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ ان تمام شاعروں اور ادیبوں نے ہندوستانی زندگی اور سیاست کے مسائل سے ہمیشہ اپنا رشتہ قائم رکھا اور اکثریت ترقی پسند قوتوں کے ساتھ ہی رہی ہے۔ اس لحاظ سے اردو کیا ساری دنیا کی زبانوں کے اعلیٰ ادب کا تمام دور ترقی پسند ہی کہلایا جا سکتا ہے۔ لیکن جب ہم اس نام سے بحث کرتے ہیں تو ہمارے پیش نظر ادیبوں کی وہ تنظیم ہوتی ہے جو ۱۹۳۶ء میں شروع ہوئی۔ اس لئے ضروری ہے کہ تحریک اور تنظیم کو دو مترادف اصطلاحیں سمجھ کر غلط بحث نہ کیا جائے۔

ابتدا میں جن پرانے اور نئے لکھنے والوں نے اس تنظیم کا ساتھ دیا۔ ان میں مختلف سیاسی خیالات رکھنے والے افراد تھے، اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر تاثیر، کرشن چندر، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، عصمت چغتائی، سبط حسن، خواجہ احمد عباس، سعادت حسن منٹو، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، راجندر سنگھ بیدی، احتشام حسین، حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی، اختر جمال، سجاد ظہیر، آل احمد سرور، رشید جہاں، فیض، محمود الظفر، ڈاکٹر علیم، احمد علی، اختر انصاری، سید فرید خیرابادی — اتنے بہت سے ناموں کی طویل فہرست میں اب بھی بہت سے نام چھوٹ گئے ہیں لیکن یہ ذہن میں رکھنا ہے کہ بہتوں نے ۱۹۳۶ء کے بعد لکھنا شروع کیا ہے اس لئے ان کا ذکر اس مضمون کی دوسری دہائی میں کرنا ضروری ہوگا۔

ایک طرف تو اس تنظیم سے ڈاکٹر علیم، سجاد ظہیر، کرشن چندر، سبط حسن، مخدوم، رشید جہاں، احتشام حسین، سردار جعفری جیسے کٹر مارکسی نقطۂ نظر رکھنے والے ادیب وابستہ تھے جو بہت جلد اس تنظیم میں زیادہ سے زیادہ دخیل ہوتے گئے۔ دوسری طرف مجاز، جذبی، فیض ایسے شاعر جو کسی سیاسی فلسفے کے ساتھ خلاقانہ بصیرت بھی رکھتے تھے پھر حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی ایسے ادیب بھی تھے جو کانگریس سے وابستہ تھے۔ منٹو، عصمت، راشد، اختر حسین رائے پوری، عزیز احمد، احمد علی، ایسے مصنفین بھی تھے جن پر "عریانی"، "بے راہ روی" اور "رجعت پسندی" کے الزام لگنے والے تھے۔ ابتدا میں تو یہ تمام مختلف دھارے ایک ہی سمت میں ایک ہی ساتھ بہتے رہے لیکن بہت جلد اس میں نئی نئی شاخیں پھوٹنے لگیں۔ ۱۹۴۲ء کا اندولن ایسا نقطہ تھا جہاں سے حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی اور ان کے اکثر ہم خیال لکھنے والے اس تحریک سے بدظن ہو گئے، منٹو، عصمت، راشد پر جب عریانی اور فحاشی کے لیبل لگائے جانے لگے تو "ترقی پسندوں" نے گھبرا کر خود ہی ان سے

ں کا اظہار شروع کر دیا - اور اس طرح چھ سات سال کے عرصے
ں یہ تنظیم بکھرنے لگی اور ساتھ ساتھ وہ گروہ جو اپنی انتہا پسندی
ساتھ اس تنظیم پر قابض تھا اپنی نظریاتی گرفت کو محدود سے
دتر اور مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر میرا جی
پنی ساری بوقلمونیوں اور رنگا رنگیوں، جدت پسندیوں اور تنقیدی
افیوں، نفسیاتی الجھنوں اور فنکارانہ پیرایوں کے ساتھ۔ ترقی
دں کو جن لکھنے والوں سے بہت جلد اپنی بیزاری کا اظہار کرنا پڑا
شاید میرا جی کا نام سرِ فہرست ہے۔ اختر حسین رائے پوری، احمد
ن م راشد، ڈاکٹر تاثیر اور عصمت تو بہت بعد میں ترقی پسند
کی زد میں آئے۔ دراصل اس زمانے میں نئے ادب کے تجربوں
نئے موضوعات کی تلاش کے ساتھ تنقیدی شعور جو بہت ہی خام
پوری طرح انصاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اشتراکی عقیدہ رکھنے
ترقی پسند نقاد چند معاشی نظریوں اور تنقیدی اصولوں سے
رور واقف تھے، مگر ادب اور زندگی، روایت اور تجربے، کلاسیکی
ے اور نئی انفرادیت کے رشتوں کا عرفان نہ رکھنے کی وجہ سے ان
لوں کا میکانکی اطلاق بھی کرتے تھے اور رَد میں متضاد باتیں بھی
اتے تھے۔

آپس کے ان اختلافات کے ساتھ ساتھ دوسرے ادیبوں کی طرف
ی اس تنظیم سے وابستہ ادیبوں پر حملے ہو رہے تھے جن کی سب سے
اب مدافعت مجنوں گورکھپوری نے کی۔ مجنوں گورکھپوری اس
سے پہلے کے آدمی تھے، وہ سارے اُردو ادب کو کھنگال چکے تھے
بی ادب پر گہری نظر رکھتے تھے، تنقیدی اصولوں کو برتنا جانتے تھے
زبان کے مزاج کے ساتھ اس نئے عہد کے ادبی مزاج کو بھی
ن رہے تھے اس لئے انھوں نے تنقید کا صحیح معنوں میں حق
لیا۔ آج نئی نسل کا شاخسانہ کوئی بہت ہی جدید قسم کا فتنہ سمجھا
ے لگا ہے۔ اور ایسا وہ لوگ سمجھ رہے ہیں جو کسی زمانے میں اپنے
نئی نسل سمجھ کر پرانے بوڑھوں سے نبرد آزما رہ چکے ہیں پرانی
نئی نسل کی جنگ نئی نہیں بلکہ اتنی ہی پرانی ہے جتنی ادب میں
یم اور جدید کی بحث۔ ہمیشہ چند برسوں کے بعد جب ادبی مزاج
بدلتا ہے تو اس کے ساتھ ایک نئی نسل سامنے آتی ہے اور پہلے سے
لکھنے والی نسل پرانی ہو جاتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ پرانی نسل کے
بعض لکھنے والے اتنے زمانہ شناس ہوں اور ان کی شخصیت میں
اتنا تنوع، گہرائی اور وسعتِ نظر کی لچک ہو کہ وہ تمام عمر پرانے نہ ہو
سکیں۔ یہی حال مجنوں گورکھپوری کا ہے جو کبھی "قدیم" نہیں ہو سکے۔
۳۰ء اور ۴۰ء کے درمیان ایک ادبی بحث میں ان کا یہ اقتباس
اپنی جگہ اب بھی اہم ہے۔

"نیا ادب اور ترقی پسندی کے سلسلے میں جتنے جھگڑے
ہوئے ہیں، ان پر غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا
ہے کہ دراصل جھگڑا ایک ہے اور وہ دو نسلوں
کا یعنی بڈھوں اور جوانوں کا جھگڑا ہے اور مجھے
اس میں زیادتی بڈھوں کی معلوم ہوتی ہے .....
مجھے سب سے زیادہ حیرت ان ہوش مند اور
فرزانہ بڈھوں پر ہوتی ہے جو نوجوانوں کو بھی خواہ
مخواہ شکنجے میں کس کر وہیں رکھنا چاہتے ہیں جہاں
وہ خود ہیں۔"

اس جگہ پہنچ کر اگر ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ دراصل یہ تحریک "نئے ادب"
کی تحریک تھی جس میں اس دور کی تمام مخالف و متضاد رویں شامل
تھیں، موضوع اور ہیئت میں نئے نئے تجربے ہو رہے تھے، فرسودگی
اور کہنگی کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ اس لحاظ سے ایک حد تک اس
رجحان کو بھی "رومانیت" کا نام دیا جا سکتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ نئی
رومانیت انقلابی عناصر رکھتی تھی اور اپنی کیفیت و شکل کے لحاظ سے
پرانے اسالیب سے ایک انحراف بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور
میں نظم، غزل، افسانہ، تنقید سب پر "انقلابی رومانیت" چھائی ہوئی
تھی ورنہ کوئی سبب نہ تھا کہ جوش ایسے شاعر کو اس مقصدی ادب کے
دور میں سب سے بڑا انقلابی شاعر تسلیم کر لیا جاتا۔ اور تقریباً تمام نئے
شاعر شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی نقل کرتے، مجاز، مخدوم، سردار
جعفری، جاں نثار اور بعض بعض جگہ جذبی پر تو یہ اثر بہت ہی نمایاں
ہے البتہ پنجاب کے شعرا ن۔ م۔ راشد، فیض، تاثیر، اس اثر

ایک حد تک محفوظ نظر آتے ہیں۔ اگر ہم اس دور کے "نیا ادب" کے قائل دیکھیں تو یہ سب ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں، اور آج اتنے برس گزر جانے کے بعد موجودہ معیاروں کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کسی کا سرمایۂ شعر اس وقت اس قابل نہیں تھا جو آج بھی ان کے نام کو باقی رکھنے کے لئے کافی ہو۔ دوسروں کو چھوڑیئے فیض جو ابتدا سے اپنی سنبھلی ہوئی اور متوازن طبیعت کے لئے منفرد رہے ہیں۔ اس وقت "سورج" ایسی نظمیں لکھتے تھے۔ مجازؔ کا ڈکشن اور اسلوب البتہ ان سب سے زیادہ پختہ اور جاندار تھا۔ مجازؔ، جذبیؔ جاں نثار اور سردار جعفری کی شاعری اپنی ہیئت اور موضوعات کے لحاظ سے بڑی حد تک "روایت کی پابند تھی"۔ ن۔م۔ راشد، فیض اور تاثیر کے یہاں نئے تجربے نظر آتے ہیں۔ در اصل یہ دور تجرباتی دور تھا جس میں شعرا اپنے آپ کو نئے موضوعات سے ہم آہنگ کرنے کی "شعوری کوشش" کر رہے تھے، بعضوں نے روایتی FORMS کا سہارا لیا اور بعض FORM کے نئے تجربوں کی طرف مائل ہو گئے اس وقت بندھے ٹکے فارم میں نظمیں لکھنا زیادہ محفوظ طریقہ تھا اس لئے کہ ہر فارم کے ساتھ کچھ روایتیں بھی ہوتی ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جن شعرا نے نئی ہیئت اختیار کی انھیں زیادہ دشواری سے گزرنا پڑا۔ اس لئے کہ ایک تو ان پر موضوع کا نیا پن بھی حاوی تھا دوسری طرف اسلوب اور ہیئت کی کچی زمین جو اس سے پہلے فصلیں اگانے کے لئے بہت کم آزمائی گئی تھی۔ لے دے کے چند تجربے ملتے تھے وہ بھی ایسے گویا کسی کسان نے اپنی زمین میں ہل چلاتے چلاتے تھوڑی دیر اکتا کر ایک نئی اور سنگلاخ زمین میں کچھ دیر تجربہ کیا اور اسے چھوڑ دیا۔ اگر قریب ترین ماضی میں ایسی کوئی کوشش نظر آتی بھی تھی تو وہ عظمت اللہ خاں کے تجربے تھے۔ مگر اردو شاعری کے وسیع و عریض لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے درمیان اس کی حیثیت ایک منفرد چھوٹی سی کیاری کی سی تھی نئے شعرا کو نہ صرف اس زمین کو زرخیز بنانا تھا بلکہ اسے وسعت بھی دینی تھی۔ اور یہ فطری ہے کہ ایسی جرأت کرنے والے زیادہ تر تجربوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اور پہلا ہوا بھی، اس سلسلے میں میراجی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جو

عذرا پاؤنڈ کی طرح ایک نئی طرز کی شاعری کے بانی تو بنے مگر اپنے ذہن اور تجربے کا شکار ہو گئے، ان کے تجربوں سے فائدہ دوسروں نے اٹھایا۔ اسی دور میں ن۔م۔ راشد کی آزاد نظم بھی تھی جو سب سے زیادہ جاندار امکانات رکھتی تھی، راشد نے زبان اور طرزِ اظہار میں بڑی حد تک روایتی اصنافِ شعر کی زبان کو اختیار کیا یہی وجہ ہے کہ پرانے لوگ بھی اس کے تجربوں کو چونک چونک کر دیکھنے لگے۔ اس کامیابی کے لحاظ سے اس دور کی آزاد شاعری میں ن۔م۔ راشد کی شاعری سب سے اہم ہو جاتی ہے۔

اختر حسین رائے پوری نے ۳۳ء سے ۳۷ء تک کے ادب کا جائزہ لیتے ہوئے فرانسیسی اور روسی ادب سے آشنائی ہندی گیت کا اثر، ملک کا بڑھتا ہوا سیاسی شعور اور سیاسی تحریک سے عوام کی وابستگی، مولویانہ تعصب کی کمی اور عورت سے براہ راست تخاطب کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اشتراکی تحریک کے ادب پر براہ راست اثر انداز ہونے کو بھی اہمیت دی ہے جس کی وجہ سے تنقیدی احساس پیدا ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> "ہندوستانی سماج بیک وقت تاریخ کے مختلف دوروں سے گزر رہا ہے ایک طرف نشاۃ ثانیہ کی تحریک ہے جو ادب کو کلاسیکل دور کی طرف لے جاتی ہے دوسری طرف آزادی کی جنگ ہے جس سے رومان کا رجحان وابستہ ہے، تیسری طرف سماجی انقلاب کا پرچار ہے جو حقیقت نگاری کا محرک ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنے آرٹ کو انقلاب، اشتراکیت یا ترقی کا مظہر سمجھتے ہیں، آپ اپنی تحریر میں ان کا اظہار کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوتے۔"

اس کے آگے جوش کی شاعری کو ترقی پسند شاعری کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "شراب و شباب کی محبت جوش اسکول کو ترقی پسندی کی طرف لے گئی ہے اور اس پر اب بھی یہ ہیئت

کا رنگ گہرا ہو گو کہ اس میں تنزل کی کیفیت باقی نہیں رہی ہے۔"

اس عجیب بیان سے اس دور کی تنقید کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے:
(۱) شراب و شباب کی محبت ترقی پسندی کی بنیاد بن سکتی ہے۔ (۲) بہیمیت کا رنگ ہوتے ہوئے بھی تنزل کی کیفیت نہیں۔ حالانکہ شراب و شباب سے ایک "نام نہاد رجعت پسند" شاعر بھی اتنی ہی محبت کر سکتا ہے اور بہیمیت اکثر تنزل ہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے اقبال کو "رجعت پسند" اور فاسطیت اور احیا پرست سب کچھ لکھ دیا تھا لیکن وہ جوش کے فاشستی رجحانات کو بھی تنزل ماننے کے لئے تیار نظر نہیں آتے۔ اس سے دلچسپ تر مثال سردار جعفری کے مضمون کا وہ حصہ ہے جہاں انھوں نے معترضین کے اس بیان کی تردید کرتے ہوئے کہ "ترقی پسند ادیب مایوسی اور ناامیدی کی فضا پیدا کر رہے ہیں" ترقی پسند شاعری سے رجائیت کی یہ مثالیں دی ہیں۔

مٹے گی، مٹے گی یہ سرمایہ داری تو گرے گی اگرے کی عمارت یہ ساری

(جاں نثار اختر)

یہ ہو کر رہے گا، یہ ہو کر رہے گا
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

(جمیل مظہری)

غریبوں نے سمبندھ مل کر کیا ہے۔

خوشی بڑھ رہی ہے کہ غم بڑھ رہے ہیں تو نگاہوں سے آگے قدم بڑھ رہے ہیں
سنبھلنا امیرو کہ ہم بڑھ رہے ہیں تو بڑھتے جا رہے ہیں

(تاثیر)

یہ مثالیں رجائیت کی ہوں تو ہوں (حالانکہ انھیں رجائیت کی بجائے کھوکھلی اور سطحی نعرہ بازی کہنا زیادہ مناسب ہے) شاعری کی مثالیں نہیں ہیں۔ آگے چل کر تو اس قسم کی شاعری کو بہت ہی زیادہ فروغ حاصل ہوا اور شاعری محض سیاسی نعرہ بازی بن کر رہ گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ذمہ داری شاعروں سے زیادہ اس دور کے نقادوں کے سر جاتی ہے جنھوں نے ایسی شاعری کو بطور مثال پیش کر کے دوسروں کو ایسی شاعری کرنے کی طرف راغب کیا۔ عوامی گیتوں اور عوامی شاعروں کی "پیداوار" پر بہت زور دیا گیا، جس کا ایک اچھا اثر تو یہ ہوا کہ بعض شاعروں نے عوامی گیتوں کے فارم میں بہت کامیاب تجربے کئے ہیں۔ اس ضمن میں مطلبی فرید آبادی اور وامق جونپوری کا نام لیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف شاعری کو عوام کی سطح تک پہنچانے کی کوشش میں شاعری کو بُری طرح مجروح بھی کیا گیا۔ مقصد پر ضرورت سے زیادہ زور دینے اور اُسے سیاسی جنگ میں ہتھیار بنانے کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ اس اچھے مقصد کو سراہتے ہوئے بھی یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ اکثر نقادوں نے ادب کو مقصدیت کی نذر کر دیا اور وہ ادب اور مقصد کے اس رشتے کو واضح نہ کر سکے جس کا تعلق کسی قوم کی شاعری کے مزاج اور روایتوں سے بھی ہوتا ہے۔ سیاسی تنگ نظری اور انتہا پسندی کے ساتھ مل کر اس رجحان نے تو ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک ترقی پسند تنظیم کو بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے نہ صرف دور کر دیا بلکہ یہ بھی ہوا کہ جو ساتھ رہے وہ اس افراتفری کا شکار ہو کر ایسے ادب کی برسوں تخلیق کرتے رہے جو آج خود ان کی نظروں میں معتبر نہیں۔

اس دور میں باوجود تمام خامیوں اور کمزوریوں کے اردو شاعری نئی روایات سے روشناس ہوئی، موضوعات کے لحاظ سے بھی، جذبے اور احساس کی شدت کے لحاظ سے زیادہ جاندار بنی اور فارم کے کامیاب تجربوں کے جلو میں نئی وادیوں تک پہنچی۔ اس عہد کا جائزہ لیتے ہوئے ہمدردانہ نقطۂ نظر اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کی خامیوں کے ساتھ ان نئے لکھنے والوں کی مجبوریوں کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ سب نہیں اس ادب کا ایک حصہ تو آج بھی ہمارے اچھے ادبی ورثہ کا جاندار حصہ ہے۔ شاعری کی طرح افسانہ نگاری میں بھی نمایاں ترقی ہوئی اور اردو افسانہ پریم چند سے اٹھ کر مغربی افسانے سے آنکھیں ملانے کی سطح پر پہنچ گیا۔ اتنا سے مصنفین کے بعد ایک ساتھ اتنے بہت سے اہم نام سامنے آگئے کہ ہم اس دور کو افسانے کی حد تک اُردو ادب کا سب سے زیادہ جاندار اور روشن دور کہہ سکتے ہیں۔ شاعری میں اضافہ ضرور ہوا مگر یہ اتنا روشن اور جاندار، کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے اتنا وقیع نہیں جتنا افسانوں کی حد تک سمجھا سکتا ہے، جیسا کہ افسانہ نگار

خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، عصمت، کرشن چندر
غلام عباس، سہیل عظیم آبادی اختر اورینوی، اختر انصاری، احمد ندیم
قاسمی، اور آگے چل کر بلونت سنگھ، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی،
ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انور اور بہت سے دوسرے لکھنے والے
یہاں اس بحث کی گنجائش تو نہیں کہ ان افسانہ نگاروں کے درجوں
کا تعین کیا جائے۔ لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ آج بھی ان میں سے اکثر
ہمارے افسانے کی آبرو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ کرشن چندر کو اپنے
رومانی اور شاعرانہ طرزِ تحریر کی وجہ سے سب سے زیادہ اہمیت حاصل
ہوئی اور انھیں مقبولیت بھی غضب کی ملی لیکن بیدی کے فن کی بھی
داد دی گئی، عصمت اور منٹو نے بھی اپنا لوہا منوایا، البتہ حیات اللہ
انصاری اور غلام عباس کو ان کا مناسب مقام نہ مل سکا، یہ دونوں
افسانے کی تکنیک اور مکمل ابلاغ کی حد تک کرشن چندر سے آگے
نہیں تو پیچھے بھی نہیں رہے۔ دوسرے افسانہ نگاروں کے امکانات
آگے چل کر زیادہ واضح ہوئے۔

تنقید میں بھی بہت سے نام اُبھرے سبط حسن، ڈاکٹر
علیم، احتشام حسین، سجاد ظہیر، سردار جعفری، فیض کے مضامین اکثر
چھپتے رہے۔ آلِ احمد سرور کا نام ترقی پسند نقادوں کی صف میں تو نہیں
لیا جاتا مگر ان کی تنقیدوں کی اہمیت اور ان کے مضامین میں ان کے
مخصوص طرزِ نگارش اور فنی بصیرت کا جو اظہار رہتا ہے وہ انہیں اس
دور کے اکثر ناقدین سے ممتاز کرتا ہے۔ ڈاکٹر علیم نے بہت کم لکھا ہے
مگر ان کی تحریریں سلجھی ہوئی اور متوازن ہوتی تھیں۔ احتشام حسین
نے ادب کے معاشی اور جدلیاتی رشتوں کو واضح کرنے میں مجنوں
صاحب کے بعد سب سے زیادہ نمایاں کام کیا ہے۔

ترقی پسند تحریک و تنظیم کے زیرِ اثر اب اُردو ادب اس منزل
پر پہنچ گیا تھا جہاں پہنچ کر دوریاں پیدا ہوئیں۔ ہم قافلہ بچھڑے، اور
بعض گوشوں سے اس خلیج کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی کوشش
بھی ہوئی ایک طرف تو پنجاب کے شاعروں نے "حلقۂ اربابِ ذوق" قائم
کر کے میراجی کی قیادت کو تسلیم کر کے اشاریت پسندی اور جدید نظم کی
تحریک شروع کی دوسری طرف بعض لکھنے والے مختلف سیاسی گروہوں
میں چلے گئے اور جو تنظیم نئے لکھنے والوں کے تنے بڑے قافلے کو کشش
کر سکی تھی آہستہ آہستہ سمٹ کر ایک تنگ دائرے میں آ گئی۔ اگر اشتراکی
نظریہ ہی بنیاد ہوتا تو اتنی افراتفری نہ پھیلتی کیونکہ اب بھی نئے لکھنے
والوں کی اکثریت اس سیاسی نظریے کو کلّی یا جزوی طور پر بہرحال
قبول کرتی تھی۔ مگر سیاسی پارٹی بندی کی انتہا پسندی نے اپنے
بہت سے ہمدردوں کو بھی علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

(۲)

ترقی پسند تحریک نے اپنی کمزوریوں کے باوجود اُردو اَدب
کو مختلف سمتوں میں وسعت سے آشنا کیا۔ نظم، افسانہ اور
تنقید کی اصناف میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ پہلی بار شعوری طور پر ادب
کی مقصدیت و افادیت پر اجتماعی تنظیم کے ساتھ زور دیا گیا۔ ادب
کو جدوجہد آزادی میں ایک مؤثر حربے کے طور پر کامیابی سے استعمال
کیا گیا۔ پھر بھی بعض لکھنے والوں نے اس تحریک سے اثر تو ضرور لیا مگر
اسے من وعن قبول نہیں کیا۔ اس سلسلے میں اختر حسین رائے پوری
کے مضمون "اردو ادب کے جدید رجحانات۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۳ء"
کا اقتباس صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے

"یہ امر نہایت دلچسپ ہے کہ یو۔پی کا ادیب یا شاعر
تکنیک یا اسلوب میں تجربے کی طرف نہیں جاتا اور
اس قسم کی تمام کاوشیں یو۔پی سے باہر خصوصاً پنجاب
میں ہوتی رہی ہیں ...... پنجاب میں ترقی پسند
شاعری کا زیادہ چرچا نہیں ہوا۔ لیکن وہاں سے
ایک بہت اہم رجحان کا آغاز ہوا ہے جس کا اظہار
نظم جدید کے ذریعہ ہو رہا ہے جس میں باقافیہ
اور بے قافیہ کے علاوہ نظم آزاد بھی شامل ہے۔
جدید نظم کی خصوصیت اس کی اشاریت پرستی ہے۔"

اختر حسین رائے پوری اشاریت پرستی کو فنی اعتبار سے
دور رس بھی سمجھتے ہیں اور اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ جب نظم کی
پابندیوں میں الفاظ کے وسیلے سے خیال کا اظہار دشوار ہو جائے تو
اشارے اور کنائے کا استعمال ضروری ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ

"جدید نظم کی یہ تحریک ترقی پسندی سے براہ راست متعلق ہوتی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ماحول سے بیزاری ترقی پسندوں کے ہاں بھی تھی ہے اور اشاریت پسندوں کے ادب میں بھی۔ مگر اشاریت پسندی ابہام اور اضمحلال کی وادیوں میں بھٹکنے لگتی ہے۔"

ترقی پسند ادب میں مقصدیت اور افادیت پر جتنا زور دیا گیا وہ زمانے کی ضرورت کے مطابق تھا اور اس سے فائدہ بھی ہوا۔ اشاریت پسندوں نے موضوع بھی نیا چنا، ماحول کی عکاسی کو بھی ضروری سمجھا، مگر انھوں نے واضح مقصدیت اور افادیت کی بجائے اشاریت پر زور دیا۔ انھوں نے اردو شاعری کی روایات سے زیادہ مکمل بغاوت کی مگر یہ ہیئت کے تجربوں کے ساتھ موضوعات کے ابہام کا شکار ہو گئے۔ در اصل یہ تحریک نظم سے متعلق تھی اور اس کے مقاصد بھی ترقی پسند ادب سے زیادہ مختلف نہ تھے مگر دونوں کی سمت میں بڑا تضاد نظر آتا ہے۔ ۱۹۳۹ء کے قریب "حلقۂ ارباب ذوق" قائم ہوا اور اسی سال میرا جی نے یوسف ظفر اور قیوم نظر کے ساتھ مل کر اس رجحان کی بہترین نظموں کا انتخاب شائع کیا۔ جدید اردو شاعری کو جب روایت پرستوں کی طرف سے ہدف ملامت بنایا گیا تو اکثر اسی گروہ کی نظموں کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا۔ الطاف گوہر نے اپریل ۱۹۴۶ء کے ادبی دنیا میں "پنجاب کے نوجوان اسکول کا نظریۂ شعر" پیش کرتے ہوئے اس بات پر بہت زور دیا کہ "نئے" یا "جدید" کی اصطلاح ہماری شاعری کے لئے اغیار نے استعمال کی تاکہ وہ عام لوگوں کو جو روایت پسند ہوتے ہیں اس کی طرف سے بدظن کر سکیں۔ ان کے نزدیک جدید شاعری کوئی الگ قسم کی شاعری نہیں بلکہ "وہی ہے جو ہر ملک اور ہر زمانے کی اعلیٰ شاعری رہی ہے۔ یعنی کہ وہ اپنے ماحول سے آشنا ہوتے ہوئے ہمہ گیر تاثر کی حامل ہو۔" وہ یہ چاہتے ہیں کہ شاعری کو پہلے شاعری کے روپ میں دیکھا جائے، پھر جدید اور قدیم کی اصطلاحیں استعمال کی جائیں۔ ترقی پسند تحریک اس انتہا پسندی کا غیر شعوری طور پر مظہر رہی تھی کہ جدید ادب میں مقصدیت اور افادیت پہلے ڈھونڈی جائے خواہ وہ ادب ہو یا نہ ہو۔ اس لحاظ سے اس تحریک کو ادب کے دوسرے رخ کا ترجمان سمجھا جا سکتا ہے۔ اس مضمون کے چند جملے اس بحث پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

"اگر کوئی اپنی نااہلی کو چھپانے کی غرض سے قافیہ اور ردیف ترک کر دے اور موسیقی کے کسی اصول کو مدنظر رکھے بغیر چھوٹے بڑے مصرعے ٹانک دے تو وہ نیا ہو تو ہو مگر شاعر کم از کم نہیں۔"

"پابند نظم، نظم معریٰ، اور نظم آزاد مغربی ادب کے اثرات میں پروان چڑھتی ہوئی، ہماری قدیم روایات کی مختلف شکلیں ہیں۔"

"ترقی پسند" یہ ایک اور لیبل ہے جو کئی دفعہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ اس تحریک سے ہمارا قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے نزدیک وہ شاعری جسے کسی لیبل کی ضرورت ہو شاعری نہیں۔ ہمیں بنیادی طور پر اس ترقی پسند نظریئے سے اختلاف ہے کہ شاعر کو ارادی طور پر سماج کی بہتری کے لئے نظمیں کہنا چاہیئے۔"

اس بنیادی اختلافات کی وضاحت کے باوجود اسی مضمون میں ماحول سے آشنائی (جمود کے خلاف بغاوت (روایت کے خلاف نہیں) اور شدید طور پر محسوس کئے ہوئے تجربے کے مکمل اظہار کو اس تحریک کی شاعری کی خصوصیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اختر حسین رائے پوری نے اسے اضمحلال اور ابہام کا شکار دکھایا ہے اور سردار جعفری کی نظر میں یہ جاگیرداری اور بورژوا انحطاط کی گندگی کا بدرو تھا۔ سردار جعفری کی انتہا پسندی نے اس تحریک کے اصل عوامل کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ورنہ آسانی سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ تحریک بھی اپنے عہد کی منطقی پیداوار تھی۔ ایک طرف تو مقصدیت پر ضرورت سے زیادہ زور ہی بعض شاعروں کو بدظن کرنے کے لئے کافی تھا، دوسری طرف خود ترقی پسند ہر نئی چیز کو ہنوز ترقی پسند سمجھتے رہے۔ مارکس کے ساتھ ساتھ فرائڈ کے نظریات کو بھی ایک زمانے تک ترقی پسند ادب کی بنیاد سمجھا گیا۔ فرائڈ کی موت پر "نیا ادب" نے اس ماہر نفسیات کی بڑائی اور

کارناموں کا جن الفاظ میں اعتراف کیا ہے اس سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تعلیمات کو بھی بڑی اہمیت دی جا رہی تھی۔ اشاریت پسند اگر غیر شعوری طور پر فرائڈ کے توسط سے جنس پرستی کا شکار ہو گئے یا یورپ کے انحطاطی ادب کی تقلید میں ہیئت پرستی میں مبتلا ہو گئے تو یہ کوئی غیر متوقع حادثہ نہیں تھا، اس وقت ترقی پسندوں کے ذہن میں بھی بہت سی سمتوں کا واضح شعور نہ تھا اور نئے لکھنے والوں میں سے اکثر "نئے پن" کے زیادہ دالہ و شیدا تھے اور اُس "نئے پن" کی کمزوریوں یا خرابیوں سے بے پرواہ تھے۔

میراجی، قیوم نظر، یوسف ظفر، اور مختار صدیقی اس گروہ کے اہم نمائندے ہیں، افسانے میں ممتاز مفتی کا نام لیا جا سکتا ہے ان لوگوں نے بھی اپنی کمزوریوں اور فکر کی غلط سمت کے باوجود اردو ادب کو نئے اور وسیع تجربوں سے آگاہ کیا۔ اگر ایک طرف موضوع کے لحاظ سے ترقی پسند شاعری، اُردو شاعری کے نئے امکانات روشن کر رہی تھی تو دوسری طرف اشاریت پسندی جدید نظم کی ہیئت اور مزاج کی تشکیل میں آگے چل کر بڑی حد تک اثر انداز ہوئی۔ جس طرح بہت سارے ترقی پسند شاعر وقتی نعروں کی افادیت کے لیے شاعری کی دوسری خصوصیات سے ہاتھ دھو بیٹھے اسی طرح اشاریت پسندی نے ابہام اور ابہام نے کچھ عجیب سی شکل اختیار کر کے اس گروہ کی شاعری کو بھی محض "ایک دلچسپ تجربہ" بنا دیا۔ میراجی اپنی تمام جنسی الجھنوں کے ساتھ اس تحریک کے سب سے اہم نمائندے ہیں جو سب سے زیادہ ناکام رہے ہیں۔ حفیظ جالندھری نے ہلکے پھلکے گیت لکھنے چھوڑ کر "شاہنامۂ اسلام" لکھنے کی کوشش میں اپنی شاعری کے امکانات کا خون کیا تھا کہ یہ بھی ایک طرح کی مقصدیت یا افادیت کی شکل تھی جو اقبال یا اردو کا فردوسی بننے کی خواہش کا نتیجہ تھی، میراجی نے بھی گیتوں میں بڑے کامیاب اور حسین اضافے کئے مگر جدید نظم کے ہاتھوں ان کی شاعری ایک ایسی دلدل میں پھنس گئی جس سے وہ پھر نکل نہ سکے۔ انفرادی ناکامیوں کے باوجود "اشاریت پسندی" نے ایک نئی روایت کا آغاز ضرور کیا۔

ساقی کے اکتوبر کے شمارے میں فیض نے جدید اُردو شاعری میں اشاریت کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے۔ وہ بھی اس دور کے رجحانات کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے "غزل میں علامات کو جب مستقل مضامین کی حیثیت دے دی گئی تو علامت و اشاریت ایک جامد روایت بن گئی۔ نئی شاعری نے نئی علامات ڈھونڈنے کی کوشش کی جس میں انھیں کہیں کامیابی ہوئی اور کہیں ناکامی۔ ان میں سے بعض کی علامات اتنی داخلی ہو گئیں کہ سوائے ان کے دوسروں کی سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔ (اس سلسلے میں فیض نے میراجی کی ایک نظم کا ذکر کیا ہے)۔ "لکھنے والے اور پڑھنے والے کے تجربے میں فروگی بات مشترک ہونا چاہیئے ورنہ شعر کا پہلا مقصد یعنی ترجمانی فوت ہو جائیگا"۔ اس کے آگے وہ نئے شاعروں کو تین گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں: "پہلا گروہ تو وہی ہے جس کی علامات ابہام کی نذر ہو گئیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس کی علامات داخلی اور تمثیلی ہوتے ہوئے بھی بعید از قیاس نہیں (اس کی سب سے کامیاب مثال راشد کی شاعری کو قرار دیا گیا ہے۔ اور بین السطور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض خود کو بھی اسی گروہ میں شامل سمجھتے ہیں۔) تیسرے گروہ وہ شعرا ہیں جو اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں یہ لوگ شاعری کو عام فہم اور سلیس بنانا چاہتے ہیں۔ اس لئے اوّل تو ان کے ہاں علامات کی زیادہ بھرمار نہیں اور جو علامات ہیں روزمرہ کے قریب ہیں۔" (اس ضمن میں مجاز، مخدوم اور سردار جعفری کے نام لئے گئے ہیں۔

"ماورا" کا دیباچہ کرشن چندر نے لکھا اور راشد کو ایشیا کا بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ فیض انھیں ایک کامیاب شاعر سمجھتے ہیں۔ "نئے زاویے" کی دونوں جلدوں میں بہت سے ایسے شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہیں جو حلقۂ اربابِ ذوق سے متعلق تھے۔ یہ مظاہر بتلاتے ہیں کہ باوجود بنیادی رجحانات کے فرق کے اس وقت ادب کی ایک سمت تھی اور کئی متوازی رَویں ایک ہی سمت میں بہہ رہی تھیں۔ اس کا رُخ جدیدیت اور مستقبل کی طرف تھا۔

اس دور میں جو نئے لکھنے والے سامنے آئے وہ ایک طرف تو ترقی پسند تحریک سے متاثر اور بڑی حد تک اس کے ساتھ تھے دوسری طرف حلقۂ اربابِ ذوق کی اشاریت پسندی سے بھی اثرات قبول کئے ہیں

تھے ۔ اختر الایمان، مجید امجد، ظہیر کاشمیری، قتیل شفائی، ساحر، مختار صدیقی، کمال احمد صدیقی، شاعری میں، نثر اور افسانے میں حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، حمید اختر، ممتاز حسین، انور بلونت سنگھ، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ۔ پھر ایک گروہ تھا خالص ترقی پسند شاعروں کا جن میں مجروح، کیفی، نیاز حیدر، غلام ربانی تاباں اور سلیمان اریب کے نام آتے ہیں حسن عسکری ابتدا میں ترقی پسندی بڑے پرجوش داعی اور مبلغ رہے، عزیز احمد نے "ترقی پسند ادب" پر مستقل کتاب لکھی مگر جلد ہی ان دونوں کی سمت میں واضح تبدیلی ہوگئی حسن عسکری فرانس کے ادب سے اور وہاں کی تحریکوں سے زیادہ متاثر تھے عزیز احمد ناول میں نئے اور کامیاب تجربے کر رہے تھے ۔ قرۃ العین حیدر جن کے اسٹائل کا ابتدا میں کافی مذاق اڑا ، اپنے اندر بہت ہی جاندار امکانات رکھتی تھیں جو آگے چل کر نمایاں ہوئے۔ ممتاز حسین مارکسی نقطۂ نظر سے مضامین لکھتے تھے۔ مگر ان کی تحریر میں بڑا الجھاؤ تھا جو شاید ان کے ذہن میں بہت سارے نظریات کے گڈ مڈ ہونے کا نتیجہ تھا۔ بلونت سنگھ نے پنجاب کی زندگی اور دیہات کا بڑا خوبصورت نقشہ کھینچا اور ابتدا رہے ہی ان کے افسانوں نے متوجہ کر لیا۔ مختار صدیقی نے موسیقی اور آزاد نظم کو ہم آہنگ کرنے میں بڑے کامیاب تجربے کئے۔ مجید امجد "اصطلاحی معنوں" میں جدید نظم کے شاعر تھے مگر بنیادی طور پر فکر کے لحاظ سے ترقی پسند رہے۔ ظہیر کاشمیری مارکسی نظریئے سے متاثر ہوتے ہوئے۔ اشاریت پسندوں سے بھی قریب تھے۔ ساحر نے فیض کا اثر قبول کیا۔ کمال احمد صدیقی کچھ دنوں تک اشاریت پسند گروہ کے ساتھ چلے اور پھر خالص موضوعاتی نظمیں کہنے لگے۔ مجروح غزل کے راستے سے ترقی پسندی کی طرف آئے۔ ان کی غزل جدید غزل کا سب سے پہلا اور کامیاب تجربہ ہے جس میں تغزل کے ساتھ ساتھ نئے مسائل سے بھی انصاف ہوا ہے۔ کیفی، نیاز حیدر، غلام ربانی تاباں، پرویز شاہدی، سلیمان اریب، احمد راہی اور کئی شاعر ترقی پسند تحریک کے ساتھ تھے۔ ان کی نظموں میں ترقی پسند مقصدیت کی خامیاں بھی نظر آتی ہیں اور خوبیاں بھی۔ اختر الایمان ابتدا میں میراجی سے بہت متاثر رہے اور ان کی شاعری کو اس گروہ سے منسوب کیا جاتا رہا مگر وہ مارکسی نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ اور دراصل ان کی شاعری میں دونوں عناصر یکجا تھے جیسے جیسے اختر الایمان اشاریت پسندی کے ابہام سے نکل کر اشاروں کی زبان کو اپنی نظموں میں کامیابی سے استعمال کرنے پر قادر ہوتے گئے۔ ان کی شاعری کی انفرادیت چمکتی گئی اس دور کے شاعروں میں سب سے اہم اور وقیع نام یہی ہے۔ عزیز الرحمٰن بھی اس دور کے شاعر ہیں جن کے پاس دونوں تحریکوں کے بہت ہی صحت مند عناصر یکجا نظر آتے ہیں۔

دوسری جنگ چھ سال جاری رہی۔ اس جنگ نے ہندوستان کے ان ادیبوں اور شاعروں کے ذہن کو الجھائے رکھا۔ ابتدا میں "جانبداری" غیر واضح تھی مگر آہستہ آہستہ ترقی پسند اور اشاریت پسند سبھی فاشزم کی مخالفت میں امن اور جمہوریت کی فتح کے لئے روس برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی اتحادی طاقتوں کے ساتھ ہو گئے۔ اسی جنگ کی ہولناکی کا اثر بنگال کے قحط (۱۹۴۳ء) کی شکل میں ظاہر ہوا بنگال کے قحط نے نئے لکھنے والوں کو بڑا اہم موضوع دیا۔ جگر نے اپنی غزل گوئی کی قید میں رہتے ہوئے، اس سانحے کا ذکر کیا۔ وامق جونپوری اپنے گیت "بھوکا ہے بنگال" سے منظر عام پر آئے۔ ابراہیم جلیس بھی اسی زمانے میں ابھرے اور انھوں نے بنگال کے قحط پر لکھے ہوئے ادب کا ایک انتخاب بھی شائع کیا۔ ابراہیم نے اپنی چند برس کی ادبی زندگی میں لوگوں کو بڑا چونکایا تھا، وہ دراصل انشائیہ اور طنزیہ کے فنکار تھے۔ افسانے کی حیثیت سے ان کے افسانوں کے ادبی درجے کا تعین محل نظر ہوگا۔ اسی زمانے میں بنگلور سے "نیا دور" صمد شاہین کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا جس کی سب سے اہم دریافت "ممتاز شیریں" تھیں، نیا دور نے کئی نئے لکھنے والوں کو روشناس بھی کرایا اور ان کی انفرادیت و اہمیت کی طرف بھی متوجہ کیا، اس رسالے میں۔ عطا محمد شعلہ، نے بعض بڑے چونکا دینے والے مضامین لکھے۔

ایک طرف آزادی کی منزل آرہی تھی، دوسری طرف سیاسی پارٹیوں کے اختلافات بڑھتے جارہے تھے مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاست نے بہت سے نئے لکھنے والوں کو توڑ لیا، جو بچے وہ بھی نظریاتی تصادم کے باعث بہت دور تک ساتھ نہ چل سکے۔ ترقی

پسندوں نے انتہا پسندی کی راہ اختیار کی، اور ادیب کے لئے "کمیونسٹ" ہونا ضروری شرط پایا تو خواجہ احمد عباس اور ساغر نظامی بھی اس معیار پر پورے نہ اترے۔ آپس میں اختلافات بڑھے۔ ادب میں "اشتہار بازی اور تحسین باہمی" کے فروغ نے اور بھی نفسی نفسی کا عالم پیدا کر دیا۔ ادب کے ان اختلافات سے قطع نظر حکومت نے ادیبوں اور شاعروں کی قید و بند کی سختیوں اور آزمائشوں سے گزارا۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک کا عہد بڑے ہی انتشار، پریشانی، ابتری اور بحران کا دور رہا اور اس کا عکس ادب میں بھی نمایاں ہو کر رہا۔ فسادات کی آگ بھڑکی تو اس نے اگرچہ ہندوستان کے چند علاقوں میں تباہی مچائی لیکن تمام ملک ذہنی طور پر جھلسا، روح کی اذیت سے گزرا اس لئے ادب میں بھی فسادات کا مدتوں ذکر ہوتا رہا۔ کرشن چندر، منٹو، عصمت، احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، عزیز احمد کے کئی اچھے افسانے اسی حادثے کا نتیجہ ہیں۔ اسی حادثے نے قرۃ العین حیدر سے "جلاوطن" اور اشفاق احمد سے "گڈریا" ایسے لافانی افسانے لکھوائے۔ قدرت اللہ شہاب کا "یا خدا"، راما نند ساگر کی ناول "اور انسان مرگیا"، اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کا رپورتاژ دلی کے فسادات کی جیتی جاگتی کہانی ہے۔ منٹو کی "سیاہ حاشیے" اس دور کی اس لحاظ سے سب سے اہم کتاب ہے کہ اس پر مختلف ادبی حلقوں میں بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں، اور منٹو کو اپنی انسانیت دوستی کے باوجود ترقی پسندوں کا ہدف ملامت اس لئے بننا پڑا کہ اس پر حسن عسکری نے دیباچہ لکھتے ہوئے بھی بہت سے اپنے ذہنی تصورات کا جواز ڈھونڈ نکالا تھا۔ اسی زمانہ میں ممتاز شیریں بھی اپنی بعض تحریروں کی وجہ سے انحطاط پسند سمجھی جانے لگیں۔ حسن عسکری کا نام تو مستقلاً ایک "متنازعہ فیہ مسئلہ" بن کر رہ گیا۔

۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان بعض ایسے شاعر بھی لکھ رہے تھے جن کا کسی گروہ سے تعلق نہ تھا، شوق علیگ، شاد عارفی، نشور واحدی، جمیل مظہری، اور بعض نئے لکھنے والے جو ویسے تو ترقی پسند تنظیم سے قریب رہے مگر ذہنی طور پر کسی نئی سمت کے متلاشی نظر آتے تھے۔ نشور اور جمیل مظہری کی شاعری میں اختر انصاری اور احمد ندیم قاسمی کی شاعری سے ایک طرح کی مماثلت ہے کہ چاروں شاعر خارجی موضوعات کے شاعر ہیں اگرچہ انھوں نے داخلی موضوعات کو بھی برتا ہے ان سب کی شاعری بڑی حد تک الفاظ اور ہیئت، انداز بیان اور مزاج کے لحاظ سے روایتی ہے۔ اگرچہ انھوں نے ہیئت اور انداز بیان کے نئے تجربے بھی کئے۔ پھر ان کے ہاں ایک طرح کی یکسانیت ہے، موضوعات کے تنوع میں بھی ایک طرح کی یک رنگی ہے۔ اختر انصاری اپنے قطعات کی انفرادیت کے لحاظ سے ممتاز ہیں، نشور اپنی مخصوص طرز نگارش کی وجہ سے متوجہ کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور جمیل مظہری نے بہت لکھا اور ان کی شاعری کی کمیت کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نشور واحدی غزل کے شاعر ہیں۔ جگر کے بعد غزل لکھنے والوں میں وہ اپنی خاص متغزلانہ کیفیت اور نئے مسائل کو غزل میں سمونے کے لحاظ سے منفرد ہیں، ویسے اس قبیل کے غزل گویوں میں عابد علی عابد، اثر، حفیظ ہوشیارپوری کے نام بھی آسکتے ہیں۔

نظم میں ساحر نے بڑی مقبولیت حاصل کی، ان کی نظموں میں انیس بیس سال کے نوجوانوں کو اپیل کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ اپنے انداز بیان، ترکیبوں اور زبان کے لحاظ سے وہ اب تک فیض کے اثر سے نہیں نکل سکے ان کی شاعری میں سطحیت ہونے کے باوجود داخلیت اور شعریت کی آنچ ملتی ہے۔ قتیل شفائی اور سلام مچھلی شہری بھی سطحی موضوعات کے شاعر ہیں، عدم نے اپنی خمریات کے بعض نشتروں سے بڑی دھوم مچائی، مگر ان کا شمار بھی اس گروہ میں ہوتا ہے۔ ان سب میں سلام کی انفرادیت اپنی تہی دامانی اور کم نگری کے باوجود ایک کامیاب تجربے اور اسٹائل کے لحاظ سے اہم ہے۔

میں یہاں جان بوجھ کر ان شاعروں اور افسانہ نگاروں کو نظر انداز کر رہا ہوں جن کی اکثریت نے ۴۷ اور ۵۰ کے درمیان ہی لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن ان کی انفرادیت بعد میں بنی۔ ان میں سے اکثر ترقی پسند تحریک کے ساتھ تھے اور ساتھ ہی اشاریت پسندی کے کامیاب تجربوں کو بھی اپنانے کی کوشش کر رہے تھے۔

۱۹۵۰ء کے بعد تنقید میں کچھ نام اور ابھرے جن میں سب سے اہم نام خورشید الاسلام کا ہے ان کے پہلے مضمون ہی نے مولانا ابوالکلام آزاد، نیاز فتحپوری، ذاکر حسین، آل احمد سرور کو متوجہ کر لیا تھا۔ پھر ان کے منفرد طرز تحریر نے عبدالحق، عبدالماجد دریابادی اور کئی بتانِ نثر سے اپنی قدر سامانی کی داد لی۔ "امراؤ جان ادا"، شبلی و حالی اور خطوط نگاری ایسے مضامین ہیں جن میں ان کے خاص اسلوب کے ساتھ ان کی فنی بصیرت بھی ظاہر

ہوتی ہے۔ ان مضامین پر ادب کے مادی اور معاشی نظریئے کا اثر بہت واضح
نظر آتا ہے۔ اس دور کے ایک اور اہم ناقد وحید قریشی ہیں جنھوں نے نفسیاتی
تحلیل و تجزیے کے کچھ کامیاب نمونے پیش کئے۔ عبادت بریلوی نے تنقیدی
موضوعات پر مضامین کا انبار لگا دیا۔ کمیت کے باوجود ان کے ہاں کیفیت
نظر نہیں آتی۔ محمد حسن نے اسی دور میں لکھنا شروع کیا ویسے ان کے مضامین
بعد کے دور میں زیادہ سامنے آئے۔ عالم خوندمیری ان ناقدین میں سے
ہیں جنھوں نے بہت کم لکھا مگر ہر مضمون میں فکر و نظر کا کوئی نیا گوشہ روشن
کیا۔ ان کا تعلق مارکسی مکتب خیال سے رہا۔ لیکن وہ CONFUSION
کا شکار نظر آتے ہیں اور بعد کے مضامین میں یہ چیز اور نمایاں ہوتی گئی
جس کا سبب ایک تو یہ ہے کہ وہ ذہنی طور پر ۳۶ء اور ۴۷ء میں لکھنے والی
نسل کے ساتھ رہے اور انہی سے متاثر بھی ہوئے لیکن اپنے مضامین میں
انھوں نے بعض نئے رجحانات کو اپنانے کی بھی کوشش کی، اور اسی لئے
ابتک اپنا راستہ نہیں بنا سکے۔ خورشید الاسلام کے علاوہ ان میں سے کسی
کے ہاں مخصوص طرز نگارش نہیں ملتا۔ اردو کے اکثر نقادوں نے احتشام
حسین کی نثر کی روایت کو اپنایا جو واضح بھی ہوتی ہے اور ادب کے مادی، معاشی
جدلیاتی رشتوں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ مگر مضامین میں نثر کا لطف نہیں ہوتا
اسی لحاظ سے اردو تنقید میں دو چار ہی نام لئے جا سکتے ہیں جو صاحب
طرز ہیں۔ نیاز فتحپوری اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضامین کے
کچھ حصے۔ رشید احمد صدیقی کے چند جملے، مجنوں گورکھپوری اور آل احمد سرور کے
چند مضامین۔ اسی فہرست میں خورشید الاسلام کا نام بھی شریک کیا جا سکتا ہے نئی نسل
کے دو تین نقاد تو ایسے مل ہی جائیں گے جنھوں نے تنقید میں بھی اپنا الگ اسلوب
بنایا ہے مگر ان کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

تقسیم اور فسادات کے حادثات کے ساتھ بعض شاعر بھی سامنے آئے
جن میں پرانی نسل دبستانِ دہلی کے دو شاعر عرش ملسیانی اور جگن ناتھ آزاد نے
کافی شہرت حاصل کی۔ نئی نسل کے ایک منفرد شاعر بلراج اسی زمانے میں اپنی نظم "اکیلی"
کے ذریعہ اردو شاعری میں روشناس ہوئے۔ اسی زمانے میں اردو ادب میں جمود کی بحث
چھڑی اور اسی بحث نے نئی نسل کے بہت سے لکھنے والوں کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔

(۳)

"پچھلی طاقتوں نے جو کمایا وہ ان کے لئے تھا، تم جو کماؤ گے وہ تمہارے

آزادی، تقسیم، فسادات، ہجرت کتنے بہت سے واقعات تھے جو شاذ کے قریب
ایک ساتھ رونما ہوئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں کشت و خون کے بہت سے ادوار مل
جائیں گے مگر ایسا دور کم ہی ملے گا جب ایک ساتھ اتنے بڑے سیاسی اور معاشرتی ذہنی
اور روحانی انقلابات واقع ہوئے ہوں۔ ادب کی ترقی پسند تحریک اور سیاسی جدوجہد نے
جو قومی اور ملی احساس، جو اجتماعی اور سیاسی شعور، اپنی تہذیب، ثقافت اور علمی و روحانی
ورثے کا جو عرفان پیدا کیا تھا اس نے یہ احساس تو پیدا کر ہی دیا تھا کہ ادب اور کلچر دو
ناقابلِ تقسیم تہذیبی ورثہ ہیں۔ اردو لکھنے والوں کے لئے یہ حادثات بڑے روح فرسا ثابت
ہوئے، آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں، مختلف الخیال گروہ
اور افراد ایک مشترکہ اجتماعی مقصد رکھتے تھے جس نے ادب کو ایک خاص سمت عطا کر دی تھی
مگر ان حادثات سے مقصد کی یہ یگانگت بھی مجروح ہوئی۔ اور پھر آزادی ملنے کے بعد ذہنی
دنیا میں ایک طرح کا انتشار بھی پیدا ہوا۔ آزادی جسکے لئے ایک صدی سے زیادہ قربانیاں
دی گئی تھیں اپنے محبان وطن کے ہاتھوں رہنمائے وطن کے خون کی قیمت پر بھی قبول کرنی پڑی۔
دلوں میں خلیجیں حائل ہوئیں، پوری پوری آبادیاں تو نقل مکانی ہوئیں یا مسافرتیں انہوں
کے ہاتھوں لوٹی گئیں، پرائے دیاروں میں اجنبی ہو کر رہنے کیلئے پہنچیں۔ مہاجر ایک معاشی
مسئلہ ہی نہیں، ایک نفسیاتی مسئلہ بھی تھے اور ہیں وہ لوگ جنھوں نے ہجرت میں اپنے
بچپن اور جوانی کے خواب زاروں کو چھوڑ کر پردیس اختیار کیا جب لکھنے بیٹھے تو ان کا
روحانی کرب تحریروں میں جھلکا۔ یہ اپنے گھر سے بچھڑے ہوئے، روٹھے، اپنی زمینوں سے
نکالے ہوئے اجنبی، اپنے خوابوں سے جھنجھوڑ کر جگائے ہوئے بے خواب دیدہ وراں، اپنے
قریہ ہائے نگاراں اور کوچہ ہائے بتاں سے ہجرت کرنے والے دل زدگاں، خود بھی
ایک معاشرتی المیہ تھے اور ان کی روحیں بھی ایک نفسیاتی مسئلہ تھیں۔ انتظار حسین کا نام
ان لکھنے والوں میں سب سے نمایاں ہے۔ ہجرت کی نفسیات اور اس کے معاشرتی عواقب و نتائج
کو اتنی خوبی سے اور کسی نے اجاگر نہیں کیا۔ پرانے افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر کئی اچھے
افسانے ضرور لکھے مگر ان کا کردار پہلے سے متعین تھا اسی لئے انتظار حسین کے افسانے
کے کرداروں کو جنم دیا جو اپنا دیس چھوڑنے کے بعد آج تک کبھی نئے کربلا کے ریگزاروں میں
کھوئے ہوؤں کی جستجو کر رہے ہیں اور کبھی دلی اور لکھنؤ کے مقبروں کو چل رہے ہیں۔
قرۃ العین حیدر کے افسانوں اور ناولوں میں اسی واقعے نے بڑا اہم
کردار ادا کیا اور یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اسی ہجرت نے
قرۃ العین کے اسلوب کو چمکایا اور انھیں وہ کچھ بنا دیا کہ آج انکا نام

اُردو کے افسانوی ادب میں سرِفہرست نظر آتا ہے۔ اشفاق احمد کا "گڈریا" اور قرۃ العین کا "جلاوطن"۔ اس دور میں نئی نسل کے ذہن اور مزاج کے ساتھ ان کا اسلوب اور فن پر قدرت کے دو مکمل شہ کار ہیں۔ مجھے قرۃ العین آزادی کے بعد آنے والی نئی نسل میں اس لئے شریک کرنا پڑا کہ وہ ذہنی طور پر اسی قافلے کی رفیق ہیں اور ان کی انفرادیت، ان کا اسلوب اسی دور کے ساتھ ساتھ بنا ہے جو بہت بعد میں جاکر "آگ کا دریا" میں مکمل اور بھرپور فنی اظہار کے سانچے میں ڈھلا۔

نئے لکھنے والوں میں سے کئی ایک آزادی سے قبل ہی چھپنا شروع کر چکے تھے۔ خلیل الرحمن اعظمی، ابن انشا، تیغ الہ آبادی (مصطفےٰ زیدی) شاذ تمکنت جمیل الدین عالی، حامد عزیز مدنی، باقر مہدی، ضیا جالندھری، ظہور نظر، حمایت علی شاعر، عبدالرؤف عروج، ناصر کاظمی، باقی صدیقی، شہرت بخاری وزیر آغا، انتظار حسین، احمد ریاض، اے حمید، صلاح الدین اکبر، آغا بابر، دیویندر اسر، ریاض احمد ——— اور کئی شاعر و افسانہ نگار۔ ان میں سے بہت سے ترقی پسند تحریک کے ساتھ رہے، کچھ ذہنی سفر میں حلقۂ اربابِ ذوق کے ہمراہ تھوڑی دور چلے، کچھ حسن عسکری کی انفرادیت سے متاثر رہے۔ مگر ان سب کے مزاج کی انفرادیت ۵۰ اور ۶۰ء کے درمیانی عرصے میں بنی۔

ایک طرف تو ترقی پسند تحریک اپنا حلقۂ اثر تمام ذہنوں تک پھیلا چکی تھی، دوسری طرف وہ عملی طور پر سکڑتی جارہی تھی اور اس میں بہت ہی محدود اور تنگ حلقہ بنتا جارہا تھا جو ذرا سا اختلاف رکھنے والوں کو بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا، ان نئی نسل کے افراد نے اسی زمانے میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فضا میں ادبی ہوش سنبھالا تھا اور وہ ترقی پسندی سے ذہنی طور پر متاثر بھی رہے تھے، ان لوگوں نے اپنے پیشرو ادیبوں اور شاعروں کی شخصیت سے بھی اثرات قبول کئے۔ تنگ نظری اور انتہا پسندی کے دور میں انہیں اپنا ادبی مقام بنانے میں بھی بڑی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ وہ دور تھا جب "خود ساختہ عظمتوں" کے جھنڈے ایک دوسرے کے سینے پر آویزاں کئے جا رہے تھے ——— ادب میں بڑے نام مانے نہیں منوائے جا رہے تھے۔ وقتی شہرتوں اور ہنگامی نعروں کے عرصۂ محشر میں نہ کوئی میزانِ عدل تھی نہ داد و حشر

ہر ایک اپنا اعمال نامہ لئے اپنی نیکیاں بڑے بلند بانگ لہجے میں سُناتا تھا، ایک کورس تھی، جس میں اگر کسی کی آواز دوسروں سے ذرا مختلف ہوئی تو اسے "برادری باہر" کردیا جاتا ——— آزادی کے حصول کا اجتماعی مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ اور ادب کو جس حد تک صحافت بننا چاہئے وہ اس سے تجاوز بھی کر چکا تھا ——— منزل قدموں میں تھی، مگر یہ تو ایک مرحلہ تھا۔ ابھی تو سامنے دشوار تر مقامات تھے جن کیلئے راہیں متعین نہیں ہو سکی تھیں ——— راستوں کی تلاش میں لوگ بھٹک رہے تھے۔ انتشار، تذبذب، تشکیک اور بحران کا دور تھا ——— یہی اس عہد کا مزاج تھا اور یہی اس زمانے کی روح۔ پرانی اقدار مجروح ہو چکی تھیں، نئے سیاسی اور معاشرتی ڈھانچے میں شکست و ریخت کا عمل جاری تھا۔ مذہبی اور اخلاقی قدریں چھینی جارہی تھیں، ان کی جگہ انسان دوستی اور روشن خیالی کی جو نئی اقدار آئی تھیں، ان میں ابھی اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ بے سہارا روحوں اور مجروح دلوں پر مرہم رکھ سکیں ——— پرانی اقدار کے قدموں تلے سے زمین کھسکتی جارہی تھی اور نئی اقدار نے ابھی اپنے قدموں پر کھڑا ہونا نہیں سیکھا تھا۔ وقت کی طنابیں کچھ اس تیزی سے کھینچی گئی تھیں کہ ذہنی دنیا کے راکب اور نظریات و عقائد کے مرکب خلا میں معلق رہ گئے تھے۔ زمین اُن کے قدموں کے نیچے ٹھہر نہیں رہی تھی بلکہ تیزی سے گذر رہی تھی۔ سیاسی پارٹیاں اعتبار کھوتی جارہی تھیں، نظریات پر سے یقین اٹھتا جارہا تھا۔ پھر بھی نئی نسل بہت دور تک پرانی تحریکوں کے ساتھ چلی۔ اس ہم سفری سے بڑا فایدہ یہ ہوا کہ ہم نے ان تحریکوں کے جاندار اور اچھے عناصر کو نہ صرف قبول کرلیا، بلکہ انہیں ذہنی طور پر ہضم کر کے اپنے مزاج اور روح میں رچا بسا بھی لیا ——— اب انحراف کی منزل آرہی تھی۔ جب ادب میں جمود کا نعرہ دیا گیا اور ۴۶ء ۴۷ء کی نسل نے اپنی تخلیقی پیداوار میں کمی اور انحطاط دیکھ کر یہ فیصلہ کر دیا کہ ادب میں ٹھیراؤ پیدا ہو گیا ہے تو انہوں نے اس طرح سے اسی اصول کی نفی کرنے کی کوشش کی جس کی بنیاد پر انہوں نے اپنی تخلیقات کی عمارت کھڑی کی تھی، ادب اور ذہن میں بحران تو پیدا ہو سکتا ہے مگر جمود ناممکن ہے۔ سیاسی اور معاشرتی بحران نے ادب میں بھی مزاج اور بحران، انتشار اور تشکیک کی فضا پیدا کر دی تھی۔

بلنے لکھنے والے جن تحریکوں سے INSPIRATION لیتے تھے. ان موضوعات پر لکھتے تھے وہ خود کمزور پڑ چکے تھے یا ان میں اتنی جان نہیں رہی تھی کہ تخلیق کے لئے محرّک بن سکیں۔ اس عہد ہی میں بہت سے شاعروں اور افسانہ نگاروں نے قلم رکھا ہے تو پھر آج تک اٹھا نہ سکے. نئی نسل جس نے ابھی قلم پکڑا تھا یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھی کہ "صریرِ خامہ" "نوائے سروش" کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے۔ اس نسل نے اپنی تحریروں سے اپنے وجود کو منوایا یہ الگ بات ہے کہ آج تک بعض ناقدین نئی نسل کا وجود ماننے کو تیار نہیں اور اگر مانتے ہیں تو اس کے ذہنی، روپے کا ماتم کرتے ہیں یا اس پر بے راہ روی، تن آسانی، بے مائیگی اور کلاسیکی ادب سے ناواقفیت کے بہتان تراشتے ہیں۔ اور ایسا کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ تنقید جو اس طرح غیر ذمہ داری سے فیصلے صادر کرتی ہے زیرِ نظر ادب کا نہیں بلکہ خود ناقد کے ذہن اور رُوح کا آئینہ ہوتی ہے۔ نئی نسل نے ترقی پسند اور اشاریت پسند تحریکوں سے وابستہ افراد سے زیادہ کلاسیکی ورثے سے فیض اٹھایا ہے۔ عالمی ادب کے خزانے دیکھے ہیں، تہذیبوں کے سمندر کھنگالے ہیں، علم کے مختلف ساحلوں سے صدف چنے ہیں، وہ اپنے کلاسیکی سرمائے پر زیادہ گہری نظر رکھتی ہے۔ اس بات سے تو انکار ہی محال ہے کہ نئی تحریکوں نے ابتدا میں تمام کلاسیکی سرمائے کو فرسودہ، کہنہ، جاگیرداری اور انحطاط کی پیداوار کہہ کر ٹھکرا دیا تھا۔ نئی نسل نے اپنے پیشرو ادیبوں کی معاصر تخلیقات سے مایوس ہو کر کلاسیکی ورثے کا رُخ کیا، اس لحاظ سے میر کے رنگ میں کہنے کا رواج عام ہونا محض فرار نہیں تھا بلکہ عہد کا تقاضہ تھا ——— اسی رجحان نے ہمارے بعض نئے شاعروں کی انفرادیت کی تشکیل میں نمایاں حصّہ لیا ہے، ابنِ انشا کی نظموں میں جب "فلتے والوں" "درویشوں" اور "الف لیلہ کی راتوں" کا ذکر ملتا ہے تو اسے محض ایک تقلیدی رجحان کہنا زیادتی ہوگی، یہ بھٹکی ہوئی رُوحوں کی مقابر پسندی نہیں تھی بلکہ زندہ انسانوں کی وہ جستجو تھی جو ماضی کے نہاں خانوں میں "آتشِ رفتہ کا سُراغ" ڈھونڈ رہی تھی، ناصر کاظمی کا لہجہ میر ہی نے بنایا ہے، ان کی غزل کی انفرادیت نئی علامتوں اور نئے EXPRESSIONS کے ساتھ کلاسیکی ادب کے خمیر ہی سے اٹھی ہے، خلیل الرحمٰن اعظمی، جو ایک زمانے تک سیاسی موضوعات اور ہنگامی نعروں کا ساتھ دیتے رہے تھے، جب اس شاعری سے اُکتائے تو ان کے اُس مطالعے نے ہی جو میر اور آتش، حسرت اور درد کی دنیائیں دیکھ چکا تھا، ان کی شاعری کے نئے مزاج کی تعمیر میں حصّہ لیا۔ وہ نئی نسل کے مزاج شناسوں کے ہراوّل دستے کے ایک اہم رکن ہیں اور مسلسل ان کے فن میں ارتقا ہوتا جا رہا ہے۔

اس دور میں امن کا موضوع تمام دنیا کے ادب میں عام تھا، ہندوستان اور پاکستان میں امن تحریک نے کہیں کہیں ادب کے اچھے نمونے بھی پیش کئے ——— نئی نسل جو دوسری جنگ کے دوران میں ہوش سنبھال رہی تھی، جس نے اس عالمگیر نفرت اور خوں ریزی میں حصّہ نہیں لیا تھا، جنگ کے بعد بھی اس کے ہولناک اثرات کو نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ ان سے گذر رہی تھی، محسوس کر رہی تھی اور اپنے کو "روحانی خلا" میں پا رہی تھی ——— ان لوگوں نے امن تحریک کا بھی ساتھ دیا ——— اور امن کے موضوع پر خوبصورت چیزیں بھی لکھیں۔ لیکن ابھی یہ فنی طور پر اتنے پختہ نہیں ہوئے تھے کہ نعرہ بازی اور ادبی صحافت سے اپنے آپ کو بچا سکتے۔ ایشیا میں نوآبادیاتی ممالک کی آزادی کی جنگیں اپنے عرُوج پر تھیں، صدیوں کے کچلے ہوئے مشرق کی رُوح کی یہ بیداری بجائے خود بڑا INSPIRATION تھی "تشنگی" میں ابنِ انشا نے امن کے مطالبے اور اس بیداری کی تحریک کو ملا کر اس عہد کا مزاج بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اسی دور میں جیلانی بانو ترقی پسند قافلے کے ساتھ ساتھ ادب میں داخل ہوئیں۔ ابتدا میں ان کے افسانے سیاسی نعروں اور ادبی صحافت بازی سے بہت متاثر رہے ہیں۔ "موم کی مریم" میں ان کے فن نے نئی کروٹ لی اور ان کی فنی بصیرت انہیں نئے عہد کے مزاج کے قریب لے آئی۔ "روشنی کے مینار" کے وہی افسانے خوبصورت اور جاندار ہیں جن میں انہوں نے اشاریت اور حقیقت نگاری، ترقی پسندی کی اچھی روایات اور موجودہ زمانے کے تقاضوں کو فنی حسن کے ساتھ باہم گر ملا لیا ہے۔ انور عظیم اور شوکت صدیقی دو مختلف سمتوں سے آئے، یہ دونوں پہلے سے لکھ رہے تھے، شوکت صدیقی نے پاکستان

کی نئی سوسائٹی پر بعض بڑے "سنسنی خیز" مگر خوبصورت افسانے لکھے لیکن افسوس ہے کہ ان کا افسانہ آگے چل کر "سنسنی" کا شکار ہو کر رہ گیا شاید منٹو اور کرشن چندر کے ابتدائی دور کی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ غیر معمولی حادثے یا غیر فطری کردار (ABNORMAL CHARACTERS) ہی افسانے کا موضوع بن سکتے ہیں۔ انور عظیم ابتدا میں کچھ اچھے افسانے لکھنے کے بعد "صحافتی انداز" میں کھو کر رہ گئے۔ آغا بابر، صلاح الدین اکبر، غلام علی چودھری اور خلیل احمد نے بہت کامیاب کہانیاں لکھیں، جن کی تعداد کم سہی۔ مگر اہمیت مسلم ہے۔ خلیل احمد کا طویل مختصر افسانہ "خزاں بدوش بہار و غبار زہر آلود" افسانے کی نئی تکنیک کے ساتھ نئے مزاج کا بھی عکاس ہے۔ اسے حمید کا نام ایک زمانے میں بہت چلتا رہا ہے۔ کرشن چندر کے رومانی طرز نگارش کو خالص رومانی موضوعات کے ساتھ جس حسن سے انہوں نے نبھایا وہ بجائے خود ایک قابل تعریف کام ہوتے ہوئے ان کی اپنی انفرادیت کو بھی نمایاں کرتا ہے" زرد گلاب" اور "کچھ یادیں، کچھ آنسو" ان کے نمایندے افسانے ہیں، ناول سے وہ پوری طرح عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ ابو الفضل صدیقی بھی بہت پرانے لکھنے والے ہیں مگر آزادی کے بعد انہوں نے کافی شاندار تجربے کئے ہیں، جہاں تک اسلوب کا سوال ہے، ابو الفضل صدیقی منفرد افسانہ نگار ہیں اور ان کے رنگ میں کوئی دوسرا شاید ہی اتنے مکمل اور دلچسپ افسانے لکھ سکے۔

۵۰ء اور ۵۵ء کے درمیان لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد سامنے آ چکی تھی۔ یہ تمام لکھنے والے ہندوستان اور پاکستان کے مختلف حصّوں سے اٹھے اور اپنے ساتھ نئے تجربوں، نئی آرزوؤں نئی فضاؤں نئی امیجری، اور نئی علامتوں کی ایک دنیا لائے ——— اس وقت تک بہتیرے پرانے لکھنے والے یا تو ادب سے تائب ہو چکے تھے یا پھر غزل کی طرف واپس آگئے تھے۔ سنہ کی نسل میں سلیمان اریب، غلام ربانی تاباں، وامق، قتیل شفائی، ظہیر کاشمیری، پرویز شاہدی، مجروح، نظر حیدر آبادی، لطیف ساجد لکھتے رہے۔ مجروح نے اپنے مختصر سے "سرمایۂ غزل" میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا۔ سلیمان اریب جو ترقی پسندی کے انتہا پسند دور میں بعض کامیاب نظمیں سیاسی موضوعات پر لکھ چکے تھے۔ غزل کی طرف مائل ہو گئے، ابتدائی چند برسوں میں انہوں نے کئی اچھی غزلیں لکھیں جن میں تازگی اور شگفتگی ہے، غلام ربانی تاباں جو نظم میں کامیاب نہیں رہے تھے غزل کی طرف آئے تو کلاسکیت کے رجحان کو اپنایا، وامق جنہوں نے گیتوں اور ایک دو نظموں سے مقبولیت حاصل کی تھی زیادہ تر غزلیں ہی لکھتے رہے، ظہیر کاشمیری نے نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی، اس طرح وہ اپنی زندگی کا ثبوت دیتے رہے۔ لطیف ساجد چند اچھی چیزیں لکھ کر "جوانا مرگی" کا شکار ہو گئے ——— قتیل شفائی کا موضوع محدود ہوتے ہوتے طوائف اور معطر بہ پر آکر ٹک گیا۔ یہ لوگ اب بھی لکھ رہے ہیں اس لئے توقع کی جا سکتی ہے کہ ان میں چند اگر فنی ریاض جاری رکھیں تو آگے کچھ کر سکتے ہیں۔ احمد ریاض نے سیاسی موضوعات پر چند اچھی نظمیں لکھیں مگر اپنے امکانات نمایاں کرنے سے پہلے ہی غیر طبعی موت کی نذر ہو گئے ——— حمایت علی شاعر کی شاعری کا آغاز بھی "سیاسی نعروں" سے ہوا تھا مگر آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ کو نئے مزاج کے ساتھ ڈھالنے میں کامیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ عبد الرؤف عروج نے مختلف رنگوں میں اچھے تجربے کئے ہیں۔ مصطفٰی زیدی، جب تک تیغ الہ آبادی رہے ان کی شاعری میں بہت تیز دھار تھی، انہوں نے جوش کے رنگ میں بھی لکھا اور فراق سے بھی اثر قبول کیا، اشاریت کی تحریک سے بھی متاثر ہوئے اور جدید مغربی تحریکوں سے بھی فیض اٹھایا، اس شاعر سے نئی نسل کی اب بھی امیدیں وابستہ ہیں، خطرہ ہے تو یہ کہ یہ کہیں مختلف تجربوں ہی میں کھو کر نہ رہ جائیں جب تک "موج مری صدف صدف" گھومتی رہے اچھا ہے مگر اس موج تخلیق کو اپنی انفرادیت کے لئے کسی ایک صدف کو انتخاب کرنا ہی چاہیئے۔ حامد عزیز مدنی نے بعض اچھی نظمیں لکھی ہیں مگر کبھی کبھی یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں ابہام اور جنسی موضوعات کے خول میں گھر کر نہ رہ جائیں۔ ان کی شاعری زیادہ وسعت کی حامل ہو سکتی ہے۔ شاد عارفی پرانے ہوتے ہوئے بھی اس دور میں نئے رہے، ان کی شاعری کا انداز طنز منفرد بھی ہے اور کٹیلا بھی، وہ جن موضوعات کے شاعر ہیں ان کے لئے وہی زبان اور وہی انداز بھی اختیار کرتے ہیں جس سے بہتر دوسرا FORM ہی نہیں ہو سکتا۔ نشور واحدی کی

زوں میں آج بھی جان ہے۔ شعور لکھ رہے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
ہے کے ہاں اُکتا دینے والی یکسانیت پیدا ہو چکی ہے۔ شان الحق حقی کی
ل کی آواز اور لہجے میں بہت تازگی اور نیا پن ہے۔

۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۶ء کی تحریکوں نے جن شاعروں کو جنم دیا ان میں سے
چار آج بھی تخلیقی طور پر زندہ ہیں ——— فیض کی شاعری "دست صبا"
ر "زنداں نامہ" میں "نقش فریادی" کی فضا سے بہت آگے نکل آئی
، اُن کی طرز فغاں کی گلشن گیر مقبولیت ان کے ہمہ گیر نشانہ ہی ضرور
تی ہے مگر ان کے "انداز" کو مقبولیت کی سند دے کر محدود بھی کر رہی
۔ فیض نے ترقی پسند غزل اور نظم کی روایت بنتی ہوئی "علامتوں"
از سر نو زندگی دی اور جدید شاعری کے سرمایے میں کلاسیکی علامات
شارات کو نئی معنویت بھی عطا کی ——— یہ ان کی خوبی بھی ہے
ران کے اسلوب کی تنگی بھی، فیض نے اس دور میں بھی غزل اور نظم کے
ے مزاج کو پوری طرح سمجھا اور برتا ہے مگر ان کی علامتیں چند خاص
قعات و حادثات تک محدود بھی ہو کر رہ گئی ہیں ——— فیض
شاعری کی حد تک اس کا یہ حسن اور تازگی بہت نیک ہے مگر
ب نئے لکھنے والے اس "خطرناک اسلوب" کو اپنانے کے لئے
شاں نظر آتے ہیں تو اس میں بڑا خطرہ بھی درپیش ہوتا ہے۔
بض کے اسلوب کو میں نے "خطرناک" اس لئے کہا ہے کہ فیض
بہت سے معاصرین نے بھی اس اسلوب کا اثر اس طرح قبول
اکہ اپنا اچھا بھلا انداز چھوڑ کر گلشن کی مقبولیت کے پھیر میں پڑ گئے
ں۔ اپنی شاعری کے امکانات کو فیض ہی نمایاں کر سکتے ہیں
ن کی تقلید کرنے والے صرف بھٹک سکتے ہیں ——— فیض کے ساتھ
دو نام اور آتے ہیں جذبی اور مخدوم ——— ان دونوں نے نئے
ملنے میں بھی کئی نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں اور اپنے معیار کو برقرار
ھا ہے۔ ان کی چیزیں اتنی گواہی تو دیتی ہی ہیں کہ ان میں تخلیقی زندگی
ئی ہے ——— اور ابھی اُردو شاعری کو ان سے مایوس ہونے
ضرورت نہیں۔

اختر الایمان ——— ایک نام، ایک رجحان، ایک علامت
تر الایمان کو ان کا اصل مقام اسی عہد میں ملا ہے، وہ جس سیاسی
افراتفری میں گم ہو کر رہ گئے تھے، اس کے فرو ہونے کے بعد ان
کی شاعری خود بخود نمایاں ہو کر سامنے آگئی۔ اختر الایمان کی نظم میں
فیض کے مقابلے میں زیادہ جدیدیت ہے اور اس کے اسلوب
میں وہ خطرے بھی نہیں ہیں جو فیض کے ہاں ہیں۔ ان کی نظم جدید
شاعری کی سب سے اہم اور کامیاب نمائندگی کرتی ہے ——— نئی نسل
نے ان کی انفرادیت کو تلاش بھی کیا اور ان کی نظم کے امکانات کو
بھی دریافت کیا ——— پرانے شاعروں میں وہ آج کے شاعروں
سے سب سے زیادہ قریب ہیں، بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان
کے ساتھ ہیں، اپنے تجربوں کی دولت اور اپنی نظر کی ہمہ گیری کے
ساتھ ——— شعوری یا غیر شعوری طور پر نئی نسل کے شاعروں
نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مجید امجد بھی نئی نظم کے اہم نمائندوں
میں سے ہیں اگرچہ ان کی شاعری اور موضوعات کے امکانات اتنے
وسیع نہیں جتنے اختر الایمان کے یہاں ملتے ہیں۔

آزاد نظم، تصدق حسین خالد اور ن۔م۔ راشد کی روایت کے
ساتھ آگے بڑھی، راشد نے خود بھی اس پر اضافہ کیا ان کا نیا مجموعہ
"ایران میں اجنبی" خود ان کی قائم کی ہوئی روایت پر اچھا اضافہ ہے۔
آزاد شاعری میں دوسری روایت سردار جعفری نے قائم کی، جنکی
بیانیہ آزاد نظم اپنی نئی امیجری اور نئے EXPRESSIONS کے
ساتھ آزاد نظم میں کامیاب تجربہ ہے، اگر سردار جعفری اپنے اسی
کامیاب تجربے پر اور توجہ کریں تو وہ آزاد نظم کے امکانات کو ضرور
وسعت دے سکتے ہیں۔ نئے شاعروں میں بلراج کومل، وزیر آغا،
ظہور نظر، ضیا جالندھری، رضی ترمذی نے خوبصورت اضافے کئے
ہیں، وزیر آغا ایمائیت سے کام لیتے ہیں، ظہور نظر اور ضیا جالندھری
کی شاعری میں وضاحت کے ساتھ ساتھ ایمائیت کا خوبصورت
امتزاج ہے، بلراج کومل کی شاعری میں وضاحت اور براہ راست
بات کہنے کا انداز APPROACH کی انفرادیت کی وجہ سے نئی
چیز بن جاتا ہے۔ رضی ترمذی نے بیانیہ نظمیں بھی لکھی ہیں اور اشاریتی
بھی ——— اس وقت جدید تر نسل کے شاعروں میں کئی نام ہیں
جو اس صنف میں حوصلہ آزمائی کر رہے ہیں، مختصر آزاد نظموں کے

بہت ہی اچھوتے تجربے شہریار کے پاس ملتے ہیں، ان کی شاعری میں انفرادیت بنانے کے بہت واضح امکانات ہیں —— منیر نیازی چھوٹی چھوٹی نظموں میں نئے نئے اور کبھی کبھی بڑے تجربے کرتے رہتے ہیں —— کم ازکم ان کی انفرادیت کو تو ماننا ہی پڑتا ہے شہریار نظم کے تجربوں کے ساتھ غزل کے نئے مزاج سے بھی پوری طرح آشنا ہیں۔

آزاد نظم کے سلسلے میں بعض بالکل نئے شاعروں کے نام آ ہی گئے ہیں —— اب ذرا تھوڑی دور پیچھے جاکر نو واردان بساطِ ادب کا ایک سرسری جائزہ لے لیا جائے۔ ابن انشا، ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، حامد عزیز مدنی، مصطفیٰ زیدی کے بعد ہی کچھ نئے نام بھی نظم کی نمایندگی کرتے ہیں جعفر طاہر، شاذ تمکنت، عبدالعزیز خالد۔ جعفر طاہر اور عبدالعزیز خالد بیانیہ نظموں کے شاعر ہیں، دونوں کا ڈکشن بہت وسیع ہے، جعفر طاہر کے تجربے زیادہ وقیع ہیں، عبدالعزیز خالد مشکل پسندی کے رجحان میں اپنی زبان دانی کے مظاہرے کے کہیں کہیں خودصید ہو جاتے ہیں۔ شاذ تمکنت ان شاعروں میں نمایندہ کہے جا سکتے ہیں جو داخلی اور عشقیہ موضوعات پر لکھتے ہوئے آرائش بیان کا بھی بہت خیال رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کی زبان اور امیجری پر جوش اور فراق کے ملے جلے اثرات نمایاں ہیں، مگر ان کی نظموں کی مخصوص فضا ان کی ترکیبوں کی آرائش (جو کہیں کہیں عریب بھی ہو جاتی ہیں) ان کی اپنی تخلیقی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ان کے اندازِ بیان میں جو حسن ہے وہ ان کی نظموں میں دہرائے جانے والے موضوعات، جذبات اور احساسات کو چھپا لیتا ہے —— اب وہ فنی پختگی کی اس منزل پر ہیں جہاں انہیں سوچنا ہوگا کہ

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

اس دور کے نمایاں شاعروں میں ساقی فاروقی، شہاب جعفری، باقر مہدی، قاضی عبدالستار، راہی معصوم رضا، وارث کرمانی —— اعجاز حسین، جلیل حشمی، شہزاد احمد، صہبا اختر، سلیم احمد، رضی اختر شوق، نریش کمار شاد، زبیر رضوی، محمد علی تاج، اختر سعید، اظہر سعید، مشفق خواجہ، محمود ایاز، اختر ہوشیارپوری، تابش دہلوی، رفیق خاور، عارف عبدالمتین، صدیق کلیم، عبدالعزیز فطرت، قمر بخاری، جمیل ملک، انجم رومانی، ظفر اقبال، شاد امرتسری، اصغر سلیم، عظیم قریشی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کا اپنا رنگ نہیں۔ کچھ کی انفرادیت کی تعمیر ہو رہی ہے۔ احمد مشتاق اور ظفر اقبال، ناصر کاظمی کے رنگ میں غزل کے نئے مزاج کو برت رہے ہیں، مشفق خواجہ، شہاب جعفری، بشیر بدر، امین اشرف، سلیم احمد، صہبا اختر، اختر ہوشیارپوری نئی غزل کے اچھے نمایندے سمجھے جا سکتے ہیں۔ عزیز چشتی نظم کے شاعر ہیں، اور ان کے موضوعات داخلی ہوتے ہوئے بھی خارجی دنیا کے مسایل سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ شفیق فاطمہ کا "نسائی لب لہجہ" اور سماجی موضوعات اردو شاعری میں نئی چیز ہیں۔ عورتوں کے جذبات کی نمایندگی اب تک اس کامیابی سے اردو شاعری میں نہیں ہو سکی تھی پھر وہ اپنی فنی بصیرت اور تنوع کے لحاظ سے کسی اچھے ہم عصر سے پیچھے نہیں۔ قاضی سلیم آزادی سے پہلے کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان کا مزاج آج کا ہے اور ان کی نظمیں اس عہد کے بہت سے نئے اچھے شاعروں کی نظموں کے جاندار عناصر پہلے بھی رکھتی تھیں اور آج بھی اندازِ فکر اور APPROACH کے لحاظ سے منفرد ہوتی ہیں۔ نریش کمار شاد جس تیزی سے چمکے تھے، اتنی ہی جلدی بجھ بھی گئے۔ شیر نواز غزل اور نظم کے اچھے شاعر ہیں۔ انور معظم نے نظموں میں ڈرامائی تکنیک برتنے کا نیا تجربہ کیا ہے، اگر وہ اسی سمت میں کوشش کرتے رہیں تو کامیاب افسانے کہہ سکتے ہیں، محمود ایاز نئے موضوعات کو زیادہ تر کلاسیکی انداز میں پیش کرتے ہیں، مگر ان کی بعض نظمیں "جدیدیت" کے نمایاں عناصر بھی رکھتی ہیں —— ساقی فاروقی نظم میں اور باقی صدیقی غزل کی مزاج شناسی میں اس دور کے شاعر ہیں۔ باقی کی غزل میں غضب کی انفرادیت ہوتی ہے۔

آج کی غزل اپنے تحت غنائی مزاج کے لئے نمایاں ہے، فراق کی غزل کے اس پہلو سے نئے غزل گویوں نے بڑا فایدہ اٹھایا ہے۔ اب غزل بھی وحدتِ تاثر اور ایک ہی فضا کا آئینہ بنتی جا رہی ہے۔ اردو غزل کا کلاسیکی سرمایہ اتنا وسیع، اتنا متنوع اور اتنا جاندار ہے کہ اب اس پر کوئی اضافہ کرنا مشکل ہے، فضا، تاثر، علایم و رموز اور اندازِ بیان کی حد تک تو نئے عناصر داخل ہو سکتے ہیں مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ صنف ان نئی تبدیلیوں کے باوجود کب تک اردو شاع

ے جدید تقاضوں کا ساتھ دے سکے گی۔ جدید نظم کے امکانات بھی
ے استعمال نہیں کئے گئے ہیں اس لئے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ
دو شاعری کا مستقبل نظم سے وابستہ ہے، غزل سے نہیں ـــ مگر
جا سے خود ایک مستقل بحث ہے۔ یہاں کہنا صرف یہ مقصود ہے کہ
غزل وحدتِ تاثر اور ایمائیہ بیان کی وجہ سے اب خود نظم سے قریب
ں جا رہی ہے۔ خالص غزل اور تغزل جو روایتی مزاج تھا، اس نے
سرت، فانی، یگانہ، جگر اور فراق کو پیدا کر دیا۔ ترقی پسند غزل بھی ان
اعروں سے آگے نہیں بڑھ سکی اور آج کا کوئی غزل گو بھی اور تو اور
ر کی سطح تک بھی پہونچنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ خود ترقی پسند شاعروں
ں جنہوں نے جگر کی تقلید کی وہ بھی جگر کی شاعری کی اونچی سطح کو نہ پا سکے۔
اہرہی میں الجھ کر رہ گئے۔ فراق اس وقت بھی غزل کے امکانات
ے لئے سب سے بڑا سہارا ہیں، وہ غزل گو اساتذہ کے سلسلے
ی "آخری کڑی" ہیں اور شاید اب ہماری شاعری میں اس
ے کے غزل گو پیدا ہی نہ ہو سکیں ـــــ اگر اضافہ ہوگا تو
لم کی صنف میں۔

جدید نظم کے اور بھی چند اہم نمائندے ہیں، ڈاکٹر منیب الرحمٰن
ن کے لئے کسی نے کہا تھا کہ یہ بھٹکا ہوا مسافر اپنا راستہ تنہا
ھونڈ رہا ہے۔ محمد صفدر، مختار صدیقی بھی نئی نظم کے نمائندے
ں اگر منیب الرحمٰن اب بھٹکے ہوئے مسافر نہیں ان کے ساتھ نئے
اعروں کا ایک قافلہ ہے جو انہی راستوں پر نئے امکانات کی تلاش
یں گھوم رہا ہے جن پر وہ کبھی اکیلے دیکھے گئے تھے ـــــ
رشید الاسلام نے نقاد کی حیثیت سے تو اپنی حیثیت سنہ ۴۵ء
کے قریب ہی منوا لی تھی۔ مگر وہ شاعری بھی اسی وقت سے کر رہے
ں۔ ان کے لہجے میں اعتماد اور طنز کے تیکھے پن کے ساتھ اپنی
خصیت کا مکمل اظہار ملتا ہے۔ جو ان کی انفرادیت ہے۔ زندگی اور
سائل کا گہرا شعور رکھنے کے ساتھ ان کی شاعری میں کلاسیکی اسلوب
ی ملتا ہے۔ جمیل الدین عالی بھی اختر الایمان، خورشید الاسلام،
د صفدر، اور مختار صدیقی کے ساتھیوں میں سے ہیں، انہوں نے
وہے کہ نئی شاعری میں ایک صنف کا اضافہ کیا، ان کا یہ تجربہ
کامیاب بھی رہا اور دوسرے شاعروں نے بھی اسے اپنایا وہ
دوہے سے اچھی غزل کہتے ہیں جس میں نئے مزاج کے ساتھ تغزل
کی بہت ہی رچی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔

یہ وہ مختلف افراد اور رجحانات ہیں جو نئی شاعری کی
تشکیل میں اہم حصہ لے رہے ہیں ـــ ان میں سے کچھ کی انفرادیتیں
بن گئی ہیں اور کچھ کی انفرادیت کے امکانات نمایاں ہو رہے ہیں۔
ان کا اپنا ایک اجتماعی ذہن اور مزاج ہے جو ان کے مختلف تجربوں
اور عقاید، شکوک اور نظریوں میں جھلکتا ہے۔ ان کے یہاں ترقی
پسندی، اشاریت پسندی کے اچھے عناصر کے ساتھ کلاسیکی ورثے
کا فیضان بھی شاملِ تخلیق ہے۔

اب چند جملے جدید تنقید اور افسانے کے متعلق۔۔۔۔

نئے افسانہ نگاروں کا ذکر پہلے ہی آ چکا ہے۔ چند نام جو
چھوٹ گئے ہیں وہ کچھ بعد ادب میں روشناس ہوئے۔ واجدہ تبسم،
اپنی شاعرانہ نثر کی روانی، برجستگی، بےباکی اور موضوعات پر براہِ راست
گرفت کے ساتھ شاید ایسا نام ہے جس نے بہت تھوڑی مدت
میں اپنے وجود کو بڑی شدت سے منوایا ہے، جنس ان کا محبوب
موضوع رہا ہے اور ان کے کامیاب افسانے نوجوان لڑکیوں کی
نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کی اچھی تصویریں ہیں۔ کبھی کبھی ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ واجدہ محض لکھنے کے لئے لکھ رہی ہیں اور ان کا موضوع
انہیں محدود سے محدود تر کئے دے رہا ہے۔ انہیں اب اپنے
مشاہدے، مطالعے اور زندگی کے تجربے کو زیادہ ہمہ گیر کر کے
افسانے کا موضوع بنانا چاہئے۔ جمیلہ ہاشمی ان گنے چنے افسانہ
نویسوں میں ہیں جنہوں نے ایک دو افسانوں ہی کے ذریعہ اپنی آمد
کا احساس کروا لیا ہے۔ ان کا ناولٹ "بن باس" ان کے فن کا
عمدہ نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ بانو قدسیہ، عبدالسلام، قادر لطیف،
مسعود مفتی، حمید کاشمیری، غیاث احمد گدی، رام لعل، عوض سعید
قاسم محمود، غلام الثقلین نقوی، نے بعض چونکا دینے والے افسانے
لکھے ہیں۔ ان سب سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ آئندہ بہت
کچھ کر سکتے ہیں۔ اقبال متین کے افسانوں کا مجموعہ "اجلی پرچھائیاں"

چکا ہے۔ اس افسانہ نگار کی حقیقت پسندی اور واقفیت نگاری میں بڑی جان ہے "گریپارڈ" ایسی خوبصورت اشاریتی کہانی لکھ کر انہوں نے اپنے افسانوں کے ایک اور پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ "گریپارڈ" کی اشاریت اور ان کے دوسرے اچھے افسانوں کی واقفیت ایک دوسرے کے ساتھ گھُل مل جائیں تو یہ ابھی بہت کچھ لکھ سکتے ہیں۔ ضمیرالدین احمد نے چند افسانے لکھے ہیں مگر ان میں زندگی اور توانائی کے ساتھ نئے مزاج کا بھرپور اظہار بھی ملتا ہے۔

نام گنوانا بہت مشکل کام ہے اور جتنی ذمّہ داری چاہتا ہے اتنے ہی غیر ذمّہ دارانہ فیصلوں کا خطرہ بھی لگا رہتا ہے۔ میں کسی شاعر یا افسانہ نگار کے متعلق یہ اصرار کیوں کروں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ صحیح ہے۔ آپ کو خود اپنی رائے بنانے کا حق ہے اور اگر ان فہرستوں میں بعض نام کم نظر آئیں تو آپ اسے میرے حافظے کی بھول یا نظر کی چوک سمجھ لیجئے ہو سکتا ہے کہ کچھ اہم نام نظرانداز ہو گئے ہوں۔ لیکن جو نام میں نے گنائے ہیں ان کی اہمیت پر مجھے اصرار کرنے کا بھی حق ملنا ہی چاہئے ——— پرانے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر نے ایک دو اچھے افسانے لکھے ہیں (مثلاً پرتو) لیکن ان کا انداز زیادہ صحافتی اور ان کی نثر زیادہ تر انشائیہ نما ہوتی جا رہی ہے۔ البتہ راجندر سنگھ بیدی نے "اپنے دکھ مجھے دے دو" لکھ کر اردو افسانوں کو ایک نیا سنگِ میل دیا ہے، ان کی نئی ناولٹ "ایک چادر میلی سی" ان کے فن کا ایک اور کامیاب نمونہ ہے۔ اگرچہ وہ بعض مقامات پر شاعرانہ نثر لکھنے کی کوشش میں اپنے اسلوب سے دُور ہٹتے نظر آتے ہیں۔ بلونت سنگھ، غلام عباس، حیات اللہ انصاری، قرۃ العین حیدر، عصمت اور ہاجرہ مسرور نے پے در پے اچھے افسانے لکھ کر اپنی زندگی کا ثبوت دیا۔ سہیل عظیم آبادی کے بھی ایک دو نئے افسانے ادھر رسالوں میں چھپے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے فن کو نئے موضوعات پر آزمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ [illegible] نے مختصر سی مدت میں اچھے افسانے لکھے ہیں تعداد کے لحاظ سے ہی کسی [illegible] ان میں بہت ہی نمایاں ترقی ہوئی ہے اور اب ان کا نام پہچانا

صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں لیا جا سکتا ہے۔

اس دَور کے ناولوں میں "آگ کا دریا" روشن ترین مینارہ ہے، جو اپنی تابناکی میں عظمت کے عناصر رکھتا ہے۔ اگر اسے اُردو کا سب سے بڑا ناول نہ مانا جائے تو بھی اسے "گئودان" کے برابر درجہ تو اپنا ہی ہوگا۔ وقت، زندگی اور موت کے مسائل ہندوستانی کلچر، فلسفے اور سیاست کی روشنی میں جس طرح جدید عہد کی رُوح کو پیش کرتے ہیں وہ کسی ناول میں "روحِ عصر" کو سمیٹنے کی چند کامیاب ترین کوششوں میں سے ایک ہے۔ "شکست"، "ٹیڑھی لکیر"، عزیز احمد کے ناول خود قرۃ العین حیدر کے پچھلے ناول اس نئے ناول کی راہ میں اہم سنگِ میل تو کہے جا سکتے ہیں مگر اس وقت تک اُردو ناول کی انتہائی منزل، جہاں تک اس کی رسائی ہو سکی ہے "آگ کا دریا" ہی ہے۔

ڈرامے میں اصغر بٹ، غلام جیلانی اور بعض افسانہ نگاروں کی کوششوں کے مختصر سے ہجوم میں سب سے نمایاں نام مرزا ادیب کا ہے جنہوں نے اُردو ڈرامے کو نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے، نئے تجربے کئے ہیں، میکانکی ڈرامے کی حد تک اس وقت ان کا نام اس صنف میں "حرفِ آخر" ہے ——— یورپ اور امریکہ کے اَدبی شہ پاروں کے تراجم کا سلسلہ بھی جاری ہے اور ہمیشہ کے مقابلے زیادہ تیزی سے یہ کام ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں بعض اچھے ڈراموں کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں مگر ابھی تک یہ کام قابلِ لحاظ نہیں ہے۔ طنز میں کئی نام ابھرے ہیں۔ یوسف فاطمہ، خالد اختر، افضل الرحمٰن، ممتاز اور احمد جمال پاشاہ۔ خالد اختر کا طنز سب سے زیادہ جاندار ہے اور ان کا ایک کردار "چچا عبدالباقی" اُردو کے ایسے کرداروں میں اس دور کا اہم نمائندہ ہے۔

اُردو تنقید نئی نسل کے ہاتھوں بعض نئے معیاروں سے آشنا ہوئی ہے۔ انتظار حسین، افسانوں کی طرح، تنقید میں بھی نمایاں انفرادیت کے حامل ہیں۔ ان کی تنقید کا بہت ہی اعلیٰ نمونہ ان کا مضمون "اجتماعی تہذیب اور افسانہ" ہے ان کی نثر کے اسلوب میں بڑی جان ہے اور توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ تنقید

کو تخلیقی ادب کے درجے تک پہونچانے میں نمایاں حصہ لے سکتے ہیں۔
خلیل الرحمٰن اعظمی نے کلاسیکی شاعروں پر بہت ہی بصیرت افروز مضامین لکھے ہیں، کلاسیکی سرمائے کی صحت مند اقدار کے عرفان میں ان کی فنی بصیرت کا جواب نئے ناقدین میں مشکل ہی سے ملے گا۔ خلیل صاحب نے نئی نسل اور ترقی پسند تحریک کے تعلق سے بعض بڑے اہم مسایل اٹھائے اور ان پر بڑے تیکھے انداز اور بے باکی سے اظہار خیال کیا ہے۔ نئی نسل کی بحثوں میں ان کے مضامین کو اولیت حاصل ہے۔ پاکستان کے نقادوں میں نئی نسل کی تنقیدی ترجمانی اور پشت پناہی کا حق انتظار حسین کے ساتھ مظفر علی سید بھی بڑی خوبی سے ادا کر رہے ہیں۔ ان کے اسلوب میں بھی بڑا تیکھا پن ہے، ان کے مضامین سے وسعت نظر اور ادب کے اس اعلیٰ ذوق کا اظہار ہوتا ہے جس کے بغیر تنقیدی تخلیقی ادب کے زمرے میں داخل نہیں ہو سکتی۔

نئی تنقید میں تین نام اور اہم ہیں۔ مجتبیٰ حسین، وزیر آغا اور ریاض احمد ــــ مجتبیٰ حسین نے کلاسیکی شاعری کے موضوعات پر بھی لکھا ہے اور ادب کے موجودہ مسائل پر بھی، بعض دوسرے پرانے نقادوں کے مقابلے میں جو معدوم مسائل پر غیر ضروری طوالت کے ساتھ مضامین کے انبار لگاتے رہتے ہیں مجتبیٰ حسین کی تنقید میں موجودہ مسائل کا زیادہ گہرا شعور اور اچھا درک ملتا ہے "ادبی اعتبار" ان کی تنقید کی اچھی نمایندگی کرتا ہے۔ احمد ریاض اور وزیر آغا دونوں مدتوں سے لکھ رہے ہیں، ان کے مضامین میں نفسیاتی تنقید کا طریقۂ کار ملتا ہے۔ اس طرح کی تنقید ابتدا میرا جی کے تجزیاتی مطالعوں سے ہوئی تھی۔ وزیر آغا نے نئی نسل کے مسایل پر زیادہ لکھا ہے، احمد ریاض تنقید اور ادب کے بنیادی اصولوں پر کئی اہم مضامین لکھ چکے ہیں ــــ محمود ایاز نے "سوغات" میں اپنے اداریوں کے ذریعہ موجودہ عہد کے بہت سے ادبی مسایل چھیڑے اور ان پر بحثیں کروائیں۔ اس زمانے میں ڈاکٹر خورشید الاسلام کے مضامین کا مجموعہ "تنقیدیں" شائع ہوا جو اپنے نقطۂ نظر کی وجہ سے اسی عہد کی تنقید کے زمرے میں [illegible]

ہے ــــ
نئی نسل کے مباحث میں ایک بحث وہ تھی جو "صبا" کے صفحات پر میری ایک "سخن گسترانہ بات" سے شروع ہوئی، جس کا جواب سجاد ظہیر نے لکھا۔ یہ بحث ایک دو برس تک جاری رہی اور اس میں نئی نسل، اردو ادب کے نئے مزاج اور فکر کے نئے پہلوؤں میں سے کئی پر روشنی پڑی اور ساتھ ہی پڑھنے والوں کو یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ لوگ جو زمانہ شناسی کے دعوے دار تھے۔ آج زمانے سے کتنے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس بحث میں ہنس راج رہبر کے علاوہ عالم خوندمیری نے بھی ایک اہم مضمون لکھا۔
آج کل تو قدیم و جدید کی یہ بحث عام ہو چکی ہے اور بعض نقادوں نے ان مسائل پر لکھنے کا فرض اپنے اوپر خود بخود عائد کر لیا ہے۔ شاید یہ سوچ کر کہ ہو نہ ہو کہ شہیدوں میں شامل ہونے کا کوئی موقع کیوں گنوایا جائے مگر ان مضامین میں سے اکثر متضاد باتوں کا شکار نظر آتے ہیں۔ دراصل ایسے ناقدین نے نئی شاعری اور ادب کے مزاج کے بنیادی عوامل و عناصر کا تجزیہ کرنے کی زحمت گوارا کئے بغیر کہیں اس ادب کی بے مایگی کا افسانہ لکھا، کہیں اس میں بڑے ادیب کے عناصر ڈھونڈے اور کہیں نئی نسل پر اپنے ذہنی تحفظات کا اطلاق کر دیا اگر عبادت بریلوی ایسے ناقدین کو اتنے بڑے تجربوں، تنقید، شعر، افسانے کی اصناف میں اتنے اہم افسانوں کے باوجود بہ مرگ کے آگے کوئی نام نظر نہیں آتا اور ادب جمود و انحطاط کا شکار نظر آتا ہے تو اس میں جدید ادب اور نئی نسل کا کیا قصور ہے اگر کسی کو نئی نسل میں ذہنی بے راہ روی، بے مایگی نظر آتی ہے تو یہ بات اس کے ذہنی افق کی تنگی کی دلیل ہے ــــ کسی عہد پر فیصلہ کرتے وقت اور کسی نسل پر حکم لگاتے وقت اس کی ادبی کاوشوں کا پچھلی نسلوں سے موازنہ کرنا بھی ضروری ہے، یہ دیکھنا بھی فرض ہے کہ اس نے اپنے ماضی قریب اور ماضی بعید کے ادبی ورثے اور تہذیبی اقدار سے کس حد تک فائدہ اٹھایا ہے، پھر سب سے اہم یہ بات ہے [illegible]

رہنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اس عہد میں، حالات کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہی ادب پیدا ہو سکتا تھا جو نئی نسل نے تخلیق کیا ہے۔ اگر نئی نسل تشکیک میں مبتلا ہے تو یہ اس کا قصور نہیں اس عہد کا قصور ہے جو اسے شب اقدار کا سہارا نہیں دے سکتی۔ اگر وہ اپنی دروں بینی، احساس تنہائی، جسمانی اور روحانی ناآسودگی کے باوجود انسانیت دوستی اور تہذیب کے ارتقا کی شعلیں جلائے ہوئے ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ادب کے اس قافلے کی شریک ہے جس میں بہت آگے دنیا کے عظیم ادیب، شاعر اور فن کار گذر چکے ہیں ـــــ نئی نسل اگر اپنی منزل متعین نہیں کر پائی ہے تو اس پر اصرار بھی نہیں کرنا چاہیئے، آج کی دنیا میں کون سی چیز متعین ہے، کون سے واقعہ کی پیش قیاسی قطعی طور پر کی جاسکتی ہے ـــــ اگر ان میں کوئی اجتماعی یا مشترکہ مقصد نہیں وہ انفرادی تجربوں اور غم ذات کی عینک سے غم دوراں اور غم جاناں کا احاطہ کرتے ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب میں تنوع پیدا ہونے کے امکانات بڑھ رہے ہیں، اب یکسانیت، یکائی اور اکتا دینے والی تکرار ختم ہو رہی ہے۔ نئی باتیں سوچی جارہی ہیں، ان کے کہنے کے نئے پیرایے اختیار کئے جارہے ہیں ـــــ نئی نسل کا جھگڑا نہ ترقی پسندوں سے ہے نہ اشاریت پسندوں کی تحریک سے۔ وہ دونوں کے جاندار عناصر کے وارث ہیں، وہ تو صرف اپنے زمانے اور اپنی زندگیوں سے انصاف کرنا چاہتے ہیں اگر کوئی شخص اپنا زمانہ پیچھے چھوڑ کر آج بھی زندہ ہے تو اسے اس نئے زمانے کو سمجھنا چاہیئے۔ اس سے اُلجھنا فضول ہوگا۔

"زمانے کو بُرا مت کہو ـــــ میں خود زمانہ ہوں"

آج کی پُرانی نسل، کل کی نئی نسل تھی اس لئے اسے سمجھنا چاہیئے کہ کل وہ جن مسائل سے دو چار ہوئی تھی کچھ ویسے ہی حالات و مسائل سے نئی نسل دو چار ہے، کل انہیں اپنے بوڑھوں کی مزاحمت روکرا پڑتی تھی آج نئی نسل ان کی مزاحمت کی پرواہ نہیں کر سکتی۔ نئی نسل اور پرانی نسل کا یہ تصادم ادب میں ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، یہاں ارنسٹ ٹولرز پر سبط حسن کے مضمون سے ایک اقتباس آج کی نئی نسل کی ترجمانی کا حق بھی اسی طرح ادا کر سکتا ہے۔ جس طرح ہی اس نے اپنے عہد کی ترجمانی کا حق ادا کیا تھا۔

"یہاں صرف میرے شباب کا نقشہ نہیں کھینچا گیا ہے
بلکہ پوری ایک نسل کے شباب کا ـــــ یہ نسل کئی
مختلف راستوں پر چلی۔ اس نے جھوٹے دیوتاؤں
کی پوجا کی اور جھوٹے پیغمبروں پر ایمان لائی ـــــ
لیکن ہمیشہ روشنی کی تلاش میں رہی اور عقل اور
سچائی کی آوازیں سننے کی کوشش کرتی رہی"

(نیا ادب اور کلیم۔ اگست دسمبر ۴۹ء)

بقیہ جگر صاحب صفحہ نمبر ۴۴

شادابی تھی۔ یاسیت اور قنوطیت سے انہیں دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ وہ زندگی کو بسر کرنا جانتے تھے۔ ان کی شاعری میں بھی انھیں خصوصیات کا پرتو نظر آتا ہے۔

جگر صاحب کی شخصیت بڑی ہی متنوع، رنگا رنگ اور پہلو دار تھی۔ لیکن اس میں مجموعی طور پر ایک شاعر اور ایک انسان کی خصوصیات نسبتاً زیادہ نمایاں تھیں۔ میں نے اکثر انسان اور شاعر کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور مجھے ہمیشہ اس شخصیت کے جلوۂ صد رنگ میں ایک ایسی یک رنگی نظر آتی ہے جو زندگی کے اس سفر میں قدم قدم پر جگمگاتی رہی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن فاروقی

مصنفین کی تنظیم

مصنفین کی تنظیم کا مسئلہ اس بیسویں صدی میں اور خاص طور پر پہلی جنگِ عظیم کے بعد اہم ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے بھی مصنفین اپنے کو منظم کرتے رہے ہیں مگر وہ کسی مخصوص تنظیم کے ماتحت نہیں آئے۔ قرونِ وسطیٰ میں شہنشاہ کا دربار ایک مرکز ہوتا تھا جس سے زیادہ تر مصنفین وابستہ ہو جایا کرتے تھے۔ مگر جوں جوں ادب بادشاہوں کے دربار سے نکل کر عوام کی ملکیت ہوتا گیا وہ تنظیم کے نئے طریقے ظہور میں آ گئے۔ عہدِ الزبیتھ میں اسپنسر گو ملکہ کے دربار ہی سے وابستہ نظر آتا ہے مگر شیکسپیئر اور دوسرے ڈرامہ نگار مرمیڈ سرائے کو اپنا مرکز بنائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ٹیورن یا سرائے ادیبوں کا مرکز ہوئی اور یہاں ادیبوں نے جمع ہو کر تبادلۂ خیالات کیا۔ ادب کی نئی قدریں مقرر ہوئیں اور ادیب ایک نئی تنظیم کے ماتحت آ گئے۔ آگے بڑھ کر فرانس میں "سیلون" اور انگلستان میں "کافی ہاؤسوں" نے اسی کام کو ترقی دی۔ ان کے ساتھ ساتھ درس گاہیں بھی ادب کے مرکز ہوتی گئیں اور انیسویں صدی کے آخر میں آکسفورڈ بھی ایک ادبی تحریک کا مبدا اور ادبی تنظیم کا مرکز نظر آیا۔ مگر بیسویں صدی میں یہ سب طریقے ناکافی ثابت ہوئے وجہ یہ تھی کہ زندگی بہت زیادہ پیچیدہ اور متنوع ہو گئی تھی۔ مصنفین بہت زیادہ منتشر ہو گئے تھے۔ ہر فرد کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ یکجا انتظام میں بھی نئے طریقۂ تنظیم کی ضرورت ہوئی اور یہ بہم پہنچائی گئی۔ حد ہو گئی کہ منطق تک کی نئی تنظیم ضروری ہوئی اور سوچنے کے طریقے کو بھی نئی تنظیم میں لایا گیا۔ ادب کو بادشاہوں یا امیروں کی سرپرستی سے تو ڈاکٹر جونسن ہی نے آزاد کرا لیا تھا مگر ہر ادیب کے پاس جانسن کی بیوی نہ تھی جو اپنی جان لڑا کر اپنے شوہر کے واہموں کو حقیقت بنانے کے لیے فرصت مہیا کرتی۔ جانسن نے پبلک کو ادیب کا مربی بنا دیا تھا مگر پبلک ہر شہنشاہ سے زیادہ متلون مزاج اور ہر مربی سے زیادہ سخت دل نظر آئی۔ اس کو مربی بنانے کے لیے بیشتر کو کوہکنی ہی کرنا پڑی۔ اور پبلک کا نمائندہ یعنی ناشر وہ معشوق پرفن نظر آیا کہ کوہکنی اور صحرا نوردی دونوں کا خاتمہ المیہ ہی ہوا۔ غرض تنظیم کی ضرورت معاشی مسائل کی بنا پر پیش آئی۔ مگر یہ واضح رہے کہ انسان کے ہر عمل میں مذہبی۔ سیاسی۔ معاشی۔ فکری۔ ادبی سب ہی پہلو ملے جلے ہیں یہ صرف ہماری حدِ نظر کی کمی ہے کہ ان میں سے ایک ہی پہلو کو ایک وقت میں دیکھتے ہیں اور دوسرے پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کہنا یوں چاہیے کہ ادب کے تحفظ کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ایک نئی تنظیم کی جائے۔ اس صدی میں ہر معاملے کے لیے تنظیم کا پیٹنٹ نسخہ انجمن کمپنی گلڈ کارپوریشن وغیرہ ہے چنانچہ ادب کی انجمنیں بنیں اور لاکھوں انجمنوں نے گوناگوں طریقوں پر ادیبوں کو مرکز پر لانے کی کوششیں کیں۔ ان میں سے کچھ انجمنیں چند احباب کا مجمع ہی ہو کر رہ گئیں اور کچھ نے قومی حیثیت حاصل کر لی۔ رسل و رسائل کی آسانی نے بین الاقوامی انجمنیں بھی ممکن بنا دیں اور PEN کی سی انجمنیں وجود میں آئیں۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند انجمن کی بنیاد رکھی گئی۔ اور اس کی شاخیں دنیا کے ہر ملک میں قائم ہوئیں۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ سیاست اور ایک مخصوص نظریہ سیاست کو اپنا کر اس انجمن نے کتنا فائدہ یا کیا نقصان پہنچایا۔ ہمیں صرف یہ جتانا ہے کہ تنظیم کے سلسلے میں اس انجمن کے قیام نے ادیبوں کی تنظیم کو اس حد تک پہنچایا جس حد تک وہ آج ہمیں پہنچی نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم اپنے ملک کی اہم ترین انجمن یعنی "رائٹرز گلڈ" کا بھی ذکر ضروری سمجھتے ہیں جس کو وجود میں آئے ہوئے قریب دو سال ہوئے ہیں اور جو ایک بڑی ہی جدید اور عجیب نوعیت رکھتی ہے۔

یہاں تنظیموں کی تاریخ لکھنا منظور نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کی کیا ضرورت ہے اور کس حد تک یہ مفید ہو سکتی ہیں! اقبال

نے ینگ اڈ نیشنز کے سلسلے میں کہا تھا

من از ایں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

اقبال کے ہر شعر کی طرح یہ شعر بھی ایک دائمی حقیقت کا ترجمان ہے۔ میری یہ رائے رہی کہ ہر انجمن کفن کھسوٹوں کا اڈا ہو جاتی ہے۔ انجمن ترقی پسند کو میں نے یہی پایا اور اس کی ممبری سے ہمیشہ انکار کیا۔ ہوتا یہ ہے کہ انجمن اپنے مقصد سے ہٹ کر اپنے ممبروں کے الگ الگ مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے کہنے کو انجمن ادبی ہوتی ہے مگر ممبر اپنے ذاتی فائدے کیلئے اسے سیاسی یا اقتصادی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ انجمن ترقی پسند کو میں نے اشتراکیت کے ایک محاذ کے علاوہ کچھ نہ پایا۔ یہ مقصد نہیں کہ ادیب کو یا ادبی انجمن کو سیاست سے سروکار نہ ہونا چاہئے۔ جدید دنیا میں ہر فرد کے لئے سیاسی طریقہ پر سوچنا ضروری ہے اور اشتراکیت اس دور کا سب سے اہم اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ نظریہ ہے۔ مگر ادبی انجمن بھی اشتراکیوں کا چلائے اور ان ہی کو سراہے یہ زیادتی ہے۔ شاعر کے لئے شاعر ہونے کے علاوہ اشتراکی شاعر ہونا لازمی ہو شاعری پس منظر میں آجاتی ہے اور اشتراکیت شرط اول قدم ہو جاتی ہے۔ ممبروں کا کام وہی کفن کھسوٹی ہو جاتا ہے۔ پھر ذاتی مقاصد بھی سیاسی مقاصد سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر ایسے صاحب ہوئے جو بڑے مصنف تھے ہی نہیں۔ کچھ چھوٹے درجے کے مصنف ان کی خوشامد میں لگے۔ ان پر اعلیٰ مصنفی کا ٹھپہ لگ گیا۔ انجمن ایسے ہی چھٹے مصنفین سے بھرتی چلی گئی۔ یہ لوگ کرسیاں حاصل کرنے کے بعد ان کرسیوں پر بیٹھے ہی نہیں بلکہ سو بھی گئے۔ ادب پر جمود ہو گیا۔ جمود، جمود کی آواز لگا دی گئی جو لوگ انجمن سے باہر تھے۔ ان کی تصانیف پر دھول جھونکی گئی۔ محسوس یہ ہوا کہ اگر اس انجمن کو فنا کر دیا جائے تو ترقی ادب بہتر طریقہ پر ہو گی۔

ان خرابیوں کے علاوہ سب سے اہم خرابی جو انجمنی تنظیم سے پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ انجمن کا ثبات خود ایک مقصد ہو جاتا ہے یعنی انجمن خود اپنی جگہ پر ایک دیوی ہو جاتی ہے اور اس کا پوجا سب میں پہلے فرض ٹھہرتا ہے۔ ترقی پسند ادب کے لئے میں نے کہا تھا کہ یہ ادب برائے زندگی نہیں بلکہ ادب برائے انجمن ہے۔ انجمن کا ثبات ممبروں کی تعداد پر ہوتا ہے۔ اور اس تعداد کو بڑھانا پہلا فرض ٹھہرتا ہے چنانچہ ہر نتھا خیرا کو ممبر بنا لیا جاتا ہے اس کی دلجوئی کی جاتی ہے اس کے کلام کو جوش سے بڑھایا جاتا ہے۔ انجمن کے ممبروں کی تعداد بڑھ جاتی ہے مگر ادب کا معیار بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ سیاسی جماعتیں بھی ایسا ہی کرتی آئی ہیں۔ کانگریس نے شروع میں جس مقصد سے اپنے تئیں بنایا تھا اسی مقصد سے وہ ہٹ کر ممبروں کی تعداد بڑھانے کے لئے مہاسبھا ذہنیت کے لوگوں کو بھی اپنے میں شامل کرنے لگی۔ کانگریس آخر کو مہاسبھا کی ہی ایک شکل ہو کر رہ گئی۔ مگر ثبات کے لئے یہ چال زیادہ نہیں چلتی اور تفرقے نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ مخالف جماعتیں بنتی ہیں جیسے کہ کانگریس کے خلاف مسلم لیگ اور پھر یہ جماعتیں بھی وہی حرکات کرتی ہیں اور اس طرح جماعتوں کی انجمن بنتی چلی جاتی ہیں جنہیں سے ہر ایک کا مقصد ظاہری کو اصلاح ہوتا ہے مگر حقیقی محض اپنا ثبات رہ جاتا ہے۔ مخلص ادیب کو ان سے فرار کے سوا اور کوئی چارہ نہیں نظر آتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انجمنیں بنائی ہی نہ جائیں ہر فرد کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہئے اور اپنے انفرادی زور پر ہر قسم کی کامیابی حاصل کرنا چاہئے ان وجوہات کی بنا پر انجمنوں کے ذریعہ ادیبوں کی تنظیم کا میں سخت مخالف رہا۔

مگر محض انفرادیت پر بھی بارہ برس کے بعد مجھے محض فریب ہی دکھائی دیتا ہے۔ اگر میں الگ ہو کر ہی لکھنا چاہتا ہوں تو مجھے اپنی تصانیف کو چھپوانا بھی نہ چاہئے بلکہ چھپا کر رکھ چھوڑنا چاہئے۔ ہم اس دور سے گزر رہے ہیں جو ایک اہم تنظیم کی تلاش میں ہے سب سے بڑی بات جو ہمیں مان لینا ضروری ہے وہ یہ کہ انسانیت تنظیم ہی کا نام ہے۔ انسان ہی وہ جانور ہے جو اپنے کو برابر منظم کرتا چلا آ رہا ہے۔ تنظیم کے طریقے فرسودہ ہو جاتے ہیں بدلے جاتے ہیں، اور پھر بدلے جاتے ہیں کوئی وقت ایسا نہیں آیا کہ یہ طریقے نہ چلے ہوں اس وقت فرد کو ایک نئی تنظیم میں آجانے کی سخت ضرورت ہے۔ ہر تنظیم کی بنیاد خلوص ہی ہو مگر زندگی اس قدر عظیم اور پیچیدہ چیز ہے کہ ہر تنظیم میں خرابیاں ضرور آتی گئیں۔ ہر کام میں اہرمن اپنا حصہ ضرور بٹا لیتا ہے اور یزداں نے بھی اسے حصہ لینے کیلئے بنا لیا ہے جدید تنظیمیں بنانے انجمنیں بہت جلد اپنے مقصد سے ہٹ جاتی رہیں۔ رائٹرس گلڈ کے بابت بھی میرے سامنے وہ اندیشے آئے ہیں جن کی بنا پر مجھے بھی اس طرح کی نفرت ہونے لگی ہے جیسی کہ ترقی پسند انجمن سے ہوئی تھی۔ میں ابھی تک اس کا باقاعدہ ممبر نہیں بنا ہوں۔ میں نے یہ سوچا کہ ممبری کی عرضی کو واپس منگا لوں۔ مگر ایسا کرنا فرار ہوگا۔ یہ گلڈ

ہوئی اور گلڈ بنانا یا بنی بنائی اور کسی گلڈ کا ممبر ہونا ضروری ہے تو پھر
ممبر کیوں نہ ہو رہا جائے۔ اس وقت مجھے ایک شہزادے کا قصہ یاد آجاتا ہے
ر بادشاہ کے مرنے کے بعد وزیر اعظم نے بادشاہت قبول کرنے کے لئے بلایا
رط یہ تھی کہ شہزادے کو پہلے ایک شیر سے لڑ کر اسے مارنا ہوگا۔ شہزادے کو
، ڈر لگا اور اس نے بادشاہت لینے سے انکار کر دیا۔ وہ محل چھوڑ کر چل دیا
ر جگہ قیام کرتا رہا۔ ہر جگہ اس نے یہی سنا کہ ایک شیر بہت لاگو ہے اور ہر جگہ
نے شیر کے ڈر کے مارے ہی چھوڑا۔ آخر کو عاجز آ کر اس نے سوچا کہ شیر سے چھٹکارا
اسی شیر سے کیوں نہ لڑا جائے جس کو مارنے پر بادشاہت مل جائے چنانچہ
ں واپس آیا اور وزیر سے کہا وہ شیر سے لڑنے کے لئے تیار تھا سو وزیر اسے
ہ پاس لے گیا۔ شیر کا کٹہرا کھولا گیا تو آ کر شہزادے کے پیر چاٹنے لگا۔ شیر پالو
ر شیر سے ہر نئے بادشاہ کا لڑنا اس ملک کی رسم تھی۔ یہی حال ہر تنظیم کا
ازل سے یہی ہوتا آیا ہے کسی تنظیم کو غلط کہہ کر اس سے بھاگنا شیر سے بھاگنا
ضرورت یہ ہے کہ شیر سے لڑنے کو تیار ہو جانا چاہیے، پھر یہ بھی معلوم ہو جائے
ہر محض پالو شیر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انجمن یا گلڈ کی سی چیزیں ادیبوں کی تنظیم
ۓ لازمی ہیں۔ مگر ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انجمن کا دستور بنتے ہی اس میں بہت
ں آجائیں گی۔ نہیں۔ انجمن بنتے ہی ہر خرابی اسے جھپٹ لینا چاہے گی۔
بیوں کی خرابیوں سے کشمکش اسی طرح جاری رہے گی جیسی کہ زندگی میں
طور پر جاری نظر آتی ہے۔ اگر خوبیوں کا تصور رکھنے والے لوگ ان میں
ہوں گے اور خرابیوں کو دباتے رہیں گے تو خوبیوں کا پلہ بھاری ہی رہے گا
ں سے زیادہ زندگی میں کسی تنظیم کا حاصل نہ نکل سکا لہٰذا ضرورت
کہ انجمن ضرور بنے اور مخلص لوگ اس کے ممبر ضرور ہوں، ممبروں میں زیادہ
ہ کے اہل نہ ہوں گے یہ بھی لازمی ہے مگر مخلصوں کے سامنے ان کی کچھ
گی، کشمکش ہوگی، ہوتی رہنا چاہیے کیونکہ کشمکش ہی زندگی کی دلیل ہے
ں کشمکش میں تعمیر کو تخریب پر ہمیشہ فتح حاصل رہنا بھی ضروری ہے۔ میں
ں کیا رائٹرز گلڈ کے شیر کو میں نے دیکھا اور اس سے ڈر کر بھاگنا چاہا مگر
میرا عزم یہ ہے کہ بھاگوں گا نہیں بلکہ اس شیر سے لڑوں گا۔ اس لئے جو لوگ
سے کہتے ہیں " یہ بھی فلاں فلاں کا ڈھونگ ہوتی جارہی ہے اور اس میں
لاں فلاں خرابیاں نمایاں ہوتی جارہی ہیں " ان سے میں یہ کہتا ہوں۔
[illegible] بالکل یہ کہہ سکتے ہیں مگر ہمیں [illegible] نہیں ہے بلکہ اس میں اصل
[illegible]

اس مضمون کا موضوع گلڈ نہیں ہے موضوع ادیبوں کی تنظیم ہے اور
گلڈ اس تنظیم کی ایک مثال سے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ پہلی بات جو
واضح کرنا ہے وہ یہ کہ تنظیمی صورت پیدا کئے بغیر چارہ نہیں ہے دوسری بات
یہ کہ ان تمام تنظیموں میں جو ازل سے اب تک وجود میں آئیں خرابیاں ضرور
ہوئیں۔ تیسری بات یہ کہ خرابیوں سے بھاگنا نہیں بلکہ جنگ کرتے رہنا ہی مقصد
حیات ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ گلڈ اپنی ایک نوعیت رکھتی ہے جو اب تک
کی کسی تنظیم کو حاصل نہ ہوئی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کو سرکاری
تعاون حاصل ہے پھر بھی سرکار اس سے اپنا قصیدہ نہیں پڑھوانا چاہتی۔
گلڈ پر ایک صاحب نے ایک شعر کہا جس کا مصرع مجھے یاد ہے ؎
حکومت شاعری فرما رہی ہے۔ میں نے اس مصرعے کو سن کر کہا، حکومت نے کب
شاعری نہیں کی؟ کسی حکومت کا مربی بن جانا بڑی مفید بات ہے اور ہمیشہ
مفید بات رہی۔ پھر گلڈ کی کنجی اس وقت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جسکے
خلوص اور جسکی انسانیت کا ہر ادیب کو قائل ہو جانا ضروری ہے تیسرے گلڈ
کی کوئی پالیسی نہیں ہے، ویسی پالیسی جیسی کہ ترقی پسند انجمن کی تھی اور گلڈ
مصنفین کے حقوق کے محافظ کے سلسلے میں وہ اقدام اٹھا چکی ہے جن تک پہنچتے
ہوئے ترقی پسند انجمن کے پر جلتے تھے۔ یعنی یہ کہ گلڈ مصنفین کو محض اجالا
دینے کے لئے نہیں ہے بلکہ ان کی اقتصادی حالت درست کرنے میں بھی
مدد کر رہی ہے اور کرے گی۔ اس میں داخل ہو کر ہر فرد جو تعمیری کام عزم کے
ساتھ کرنا چاہتا ہے اپنی بات منوا سکتا ہے اور گلڈ کو اپنے ساتھ لے کر آگے
بڑھ سکتا ہے۔ انجمنیں عموماً وہی چلتی ہیں جن میں کم از کم ایک آدمی ضرور زوردار
ہو جو باقی ممبروں پر قابو حاصل کر لیتا ہے اور اسی کی رائے پر تمام ممبر
آجاتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ انفرادیت بھی قائم رہ سکتی ہے جس کے
عدم سے پالیسی والی انجمنیں ہی ایک ڈھرے کی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ گلڈ کے
ذریعے سے یہ ممکن ہے کہ مصنف اپنی انفرادیت بھی قائم رکھے اور پھر ایک جماعت
اور ایک تنظیم کے ماتحت بھی آجائے۔ اس لئے میں اسے ایسی تنظیم سمجھتا ہوں
جس کا امتحان کرنا ضروری ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ عام اور خاص انجمنوں کی
خرابیوں سے ہم اسے کہاں تک پاک رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ہم ادیبوں کیلئے
ایک مرکز ضروری رہا۔ جدید دور میں کوئی انجمن ہمارا مرکز ہو سکتی ہے۔ گلڈ
ہمارے سامنے ایک بہترین انجمن بنانے کا مواد پیش کرتی ہے۔ میں اقبال کے اس
مصرعے کے ساتھ ختم کرتا ہوں ہے ۔ امتحان ہے ترے ایثار کا خودداری کا

مجتبیٰ حسین

حالی کی عشقیہ شاعری کا سرچشمہ

حالی کی ایک غزل کا مقطع ہے ۔۔

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جاکے حالی جادو بیاں سے ہم

اس مقطعے کو ایک رسمی مقطع بھی سمجھا جا سکتا ہے جس میں روایتی خودستائی اور تعلّی سے کام لیا گیا ہے اور اسے ہم غیر رسمی بھی قرار دے سکتے ہیں جس میں صداقت کا حسن ہے، جس میں شاعر خود اپنے کلام کی لذت سے آشنا ہے اور اپنی زبان کے جادو سے باخبر ــــــ سوال یہ ہے کہ ہم اسے کیا سمجھیں، صرف خودستائی یا ایک ایسا شعر جو اپنے دعوے کا ثبوت رکھتا ہے۔؟

حالی کی طبیعت کی سادگی، ان کی منکسر مزاجی، ان کی میانہ روی دیکھتے ہوئے ان سے بیجا مفاخرت کی امید کم جا سکتی ہے۔ اپنے قصیدے کے سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے ـــــ "اس قصیدے کی غرض یہ تمہید لکھی گئی تھی، مطلب یہ تھا اگر لوگ ہماری قدر نہیں کرتے ہم آپ ہی اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں .... لیکن جب تفاخر حد سے بڑھ گیا تو دفعتاً اپنی غلطی پر متنبہ ہوا ...." ممکن ہے اس مقطعے میں "تفاخر" حد سے نہ بڑھا ہو، اس لئے حالی نے اس پر کوئی "نوٹ" نہیں دیا یا پھر انھوں نے "مقطع گوئی" کے روایتی تقاضوں کو دیکھتے ہوئے یہاں تھوڑی بہت تعلّی گوارا کر لی ہو۔ حالانکہ اس نوع کے مقطعے حالی کی کئی اچھی غزلوں میں پائے جاتے ہیں ـــ

بزم سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالی جادو بیاں نہ تھا

نسخے ہم نے لگے دیکھیے ہیں اے حالی مگر
رنگ کچھ تیری اداؤں میں سوا پاتے ہیں ہم

حالی کی سُن لو اور صدائیں جگر خراش
دلکش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

یہاں تک کہ اپنی جدید رنگ کی غزلوں کے بارے میں بھی حالی کہتے ہیں ـــ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دوکان سب سے الگ

یہ اور ایسے بہت سے اشعار اور مقطعے حالی کی غزلوں میں مل جائیں گے، جن میں انھوں نے بار بار اپنے کلام کی تاثیر کے بارے میں کھل کر یا اشارتاً کہا ہے۔ یہ چیز اگر صرف ان کی قدیم رنگ کی غزلوں میں پائی جاتی تو شاید ہم اسے رسمی تعلّی سمجھ کر اہمیت نہ دیتے مگر اپنی غزلوں کی دلآویزی کا احساس انھیں اس وقت بھی تھا جب وہ عشقیہ شاعری سے منہ موڑ کر معاشرتی مسائل کو غزلوں میں راہ دے رہے تھے ـــ

ایسی غزلیں سنی نہ تھیں حالی
یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

متاع بے بہا ہے شعر حالی
مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

اس کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہئے کہ فارسی اور اردو شاعری میں فخریہ یا تعلّی آمیز شعر صرف روایتاً نہیں کہے گئے ہیں۔ ان کے ذریعے شاعر نے اپنا نقطۂ نظر، اپنی شاعرانہ قوت، اپنی نظموں کے ڈرامائی موڑ اور زندگی کی توانائی کو پیش کیا ہے، لہٰذا مذکورہ مقطعے کو صرف روایتی سمجھ کر نہیں ٹالا جا سکتا اور نہ اس موقع پر یہ کہا جا سکتا کہ اس قسم کے مقطعوں پر جو حالی کی غزلوں میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں ایسا "نوٹ" جیسا کہ انھوں نے اپنے قصیدے پر دیا ہے کیوں نہیں دیا جا سکتا تھا یہ یک سنی بلا حاصل ہوتی۔ یہ سب پرانے رنگ کی غزلیں تھیں،

جنھیں خود حالی نے بعد میں مجموعی طور پر مسترد کر دیا تھا، ملتا تو یہ قطعیاں صرف پرانی غزلوں میں نہیں بلکہ ان کی نئی غزلوں میں بھی ملتی ہیں جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ دوسرے یہ خیال کہ حالی نے اپنی قدیم غزلوں کو ایک سرے سے مسترد کر دیا تھا کچھ بہت زیادہ وزن نہیں رکھتا۔ حالی نے اس رومانی رجحان کو مسترد کیا تھا جو ہماری بیشتر قدیم غزلوں میں پایا جاتا تھا۔ اور رفتہ رفتہ ہمارے شعری ادب کا غالب اور ایک حد تک سستا رجحان بن گیا تھا۔ انھوں نے قدیم غزلوں کو یک قلم مسترد نہیں کیا تھا۔ تیسرے یہ کہ اگر واقعی حالی اپنی ان غزلوں کو اس قدر پوچ، رومانی، تقلیدی، بے رس اور فرسودہ اور بے لطف سمجھتے تھے تو ان کی صاف گوئی اور بے رحم حقیقت نگاری کو دیکھتے ہوئے ہم ان سے بجا طور پر یہ امید رکھ سکتے تھے کہ وہ انھیں اپنے دیوان میں شامل ہی نہ کرتے۔ ان میں اتنی اخلاقی اور ادبی جرأت ضرور ہونی چاہئے تھی کہ جس طرح انھوں نے بہت سے پرانے شاعروں کو ہدف ملامت بنایا تھا اور در خور اعتنا نہیں سمجھا تھا اسی طرح اپنی قدیم غزلوں کو تلف کر دیتے۔ مگر حالی نے ایسا نہ کیا۔ ان غزلوں کو حالی نے مرتب کیا۔ انھیں اپنے دیوان میں اس اہتمام کے ساتھ جگہ دی کہ ہر قدیم رنگ کی غزل پر "ق" لکھتے گئے۔ یقیناً انھوں نے یہ سب جتن صرف قارئین کو اپنی قدیم غزلوں سے نفرت اور عبرت دلانے کے لئے نہیں کیا ہوگا۔ حالی نے انھیں محفوظ رکھا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ غزلیں انھیں عزیز تھیں۔ اس کے بعد وہ ان سے منہ موڑ کر آگے بڑھ گئے جس کے اسباب و علل دوسرے ہیں۔ حالی کی قدیم اور جدید غزلیں ان کے فکری ارتقا کو سمجھنے میں رہنمائی دیتی ہیں۔ اور ممکن ہے کہ ایک یہ چیز بھی حالی کے پیش نظر رہی ہو جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے قدیم رنگ سخن کو بھی دیوان میں جگہ دی۔ ان تمام امور کے علاوہ یہ عذر بھی معقول نہیں ہو سکتا کہ حالی نے منکسر مزاجی کے باوجود اپنے مقطعوں میں تھوڑی بہت تعلّی گوارا کر لی ہے۔ ان کی منکسر مزاجی ان کی ادب دوستی اور ادب شناسی کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوئی، وہ ادب و شعر کے معاملے میں اتنے منکسر مزاج کبھی نہیں تھے کہ شعر کے حسن و قبح کے معاملے میں چشم پوشی کرتے۔ حالی کا تنقیدی شعور پختہ تھا اور انھوں نے شعر فہمی اور سخن رسی میں بہت کم لغزش دکھائی ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ جب ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں شاعر نے اپنے کلام کے بارے میں تعلّی سے کام لیا ہے تو سب سے پہلے ہمیں اس کے شعری مرتبے کو دیکھنا ہوتا ہے کہ آیا وہ اپنے دعوے میں حق بجانب ہے یا نہیں؟

حالی کی غزلوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاید ہم اس بات سے اتفاق کیا جا سکے کہ ان کے کلام میں لذت بھی ہے اور ان کی زبان میں جادو بھی۔ مگر یہ لذت کہاں سے آئی جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے؟ جب ہم اس طرح سوچنے لگتے ہیں تو ان کا یہ مقطع —

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جا کے حالیؔ جادو بیاں سے ہم

اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔ اس میں شاعر نے نہ صرف اپنے کلام کے حسن کی طرف اشارہ کیا ہے بلکہ "اس کی" طرف بھی جس نے اس کے کلام کو حسن عطا کیا ہے، جس کے فیض سے اس کی زبان میں جادو آ گیا — آخر وہ کون شخص تھا جس کے "تصور" سے حالی کے ہاں "رعنائی خیال" پائی جاتی ہے؟ یہ چیز ان کی غزلوں کی سطح، ان کی انفرادیت اور ان کے رنگ کو متعین کرنے میں خاصی اہم ثابت ہو سکتی ہے۔ ان کے زمانے میں غزل کی سب سے دلکش اور مقبول آواز داغ کی تھی۔ یہ آواز اس دور کی پوری غزل گوئی پر چھائی ہوئی ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کا البیلا پن، شوخی دلربائی اور لگاوٹ ہے۔ مگر یہ آواز اپنی تمام ہمہ گیری کے باوصف شاہد بازی سے آگے نہیں بڑھ سکی، یہ اپنے معاشرے میں ڈوب گئی — ابھر نہ سکی۔ حالی کی غزلیں داغ کی غزلوں کی گرم اور خیرہ کن روشنی کے سامنے بھی ماند نہیں پڑ سکیں، ان کا حسن اس روشنی میں بھی سنولایا نہیں بلکہ کچھ اور نکھر گیا۔ ان کی غزلوں کا رکھ رکھاؤ، ان کا گداز، ان کی نرم روی اور ان کی "آو زیر لبی" اس عہد کے عام رنگ تغزل سے بڑی حد تک ہٹی ہوئی ہے۔ ان کی غزلیں ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہیں جہاں ایک طرف کھنڈر ہیں، ویرانی ہے، خزاں ہے اور شام کا سناٹا۔ دوسری طرف نئی تعمیرات کے کچھ آثار نظر آ رہے ہیں۔ نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں۔ ان کی قدیم اور جدید غزلوں میں بھی حد درجہ مختلف ہیں لیکن ان کی غزلوں کا دبا دبا سا حزن صرف معاشرتی تغیرات کا آئینہ دار نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان تغیرات نے ان کی غزلوں پر اداسی کا سایہ سا ڈال دیا ہے۔ مشاہدہ اماعتی حالی کو بہت عزیز تھا، ان کی جدت طبع بھی جس میں مصلحت پسندی کا عنصر ہے ان کو پیچھے مڑ کر دیکھنے سے باز نہیں رکھ سکی۔ تنہائی، خزاں، زندگی اور ویرانی کا احساس ان کے یہاں معاشرتی بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے پیدا شدہ حزن

کا ہمارے عشقیہ نے جو تبدیل کر دیا ہو۔ لیکن بات اگر صرف یہی ہوتی تو ان کی غزلوں کی تعداد اتنی کچھ اور بڑھ جاتی، اور حالی کو ان غزلوں سے بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور نہ انھیں قدیم اور جدید میں تقسیم کرنے کا کوئی جواز باقی رہ جاتا ہے۔ ایسی غزلیں تقلیدی ہو ہی نہیں سکتیں۔ حالی کی غزلوں میں کچھ اور بھی ملتا ہے۔ اس میں عاشق کی زخم خوردگی ملتی ہے جو شاہد بازی اور معاملہ بندی سے الگ ہے۔ اسی لئے ان کی غزلوں کے اجزائے ترکیبی سے بحث کرتے وقت اس طرف توجہ ضروری ہے۔ ان کی اکثر و بیشتر غزلوں میں عشقیہ شاعری کی جو سطح ملتی وہ اردو کی بڑی عشقیہ شاعری کی سطح کو چھوتی نظر آتی ہے ؎

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غمِ ہجراں میں نہیں
چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں

ملتے ہی ان سے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

تم کو ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

ان غزلوں کے بہت سے اشعار میں وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جو اعلیٰ عشقیہ شاعری کی اساس بن سکتے ہیں۔ ان اشعار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ سوال بار بار ہمارے سامنے آتا ہے کہ حالی کی غزلوں پر کس کا پرتو ہے!

کیا یہ صرف سخن آرائی تھی جو اس واسطے تھی کہ

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

اگر ہم یہ مان بھی لیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سخن آرائی کے پردے میں کون ہے؟ اہلِ معنی اور اہلِ نظر کا کیا رشتہ ہے؟ اور ہم مولانا حالی کے تمام علم و فضل اور ان کی پاکیزہ شخصیت کا ادب ملحوظ رکھنے کے باوجود اس توجیہ سے مطمئن نہیں ہو پاتے۔ ہمارا دل بار بار یہ چاہتا ہے کہ مولانا سے پوچھیں ؎

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ؟

مولانا شبلی کے برعکس مولانا حالی کی زندگی میں ہمیں کسی معاشقے کا پتہ نہیں ملتا۔ جہاں تک ان کی زندگی کے بارے میں معلومات بہم پہنچی ہیں۔ ان میں ایسے شواہد نہیں پائے جاتے جس سے اس بات کی تصدیق ہو سکے کہ ؎

ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

بعض لوگوں نے ان کی عشقیہ شاعری کا جواز ان کی ازدواجی زندگی سے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلہ میں وہ حالی کی غزلوں میں جو متوازن کیفیت پائی جاتی ہے جو دبی دبی سی آنچ ملتی ہے اس کو ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں بے باک نہیں ہو سکیں اور ان میں ایک خاص قسم کا "صالح عشق" ملتا ہے۔ عشق کی صالح اور غیر صالح تقسیم سے قطع نظر یہ صرف قیاس آرائی ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ متوازن کیفیت ان کی تمام تخلیقات میں پائی جاتی ہے خواہ نثر کی ہوں یا نظم کی۔ یہ حالی کی شخصیت ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ دوسرے ایسے متعدد اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں، جو گھر کی چار دیواری سے آگے بھی اشارہ کرتے ہیں ؎

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

تعزیر جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

اور پھر نازک غزلوں کے یہ اشعار ہے

جس کو شیوے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے
آج دل لے گا اگر کل نہ لیا یاد رہے

پردے ہزار وصل میں بھی درمیاں رہے
شکوے وہ سب سنا گئے اور مہرباں رہے

لہذا یہ کہنا کہ ان کے اشعار میں "گھر کی چار دیواری" ملتی ہے صرف غلط فہمی اور اشعار کی حسب مراد تاویل ہے۔ یہاں اس سوانحی مضمون کی طرف بھی توجہ دینی لازم ہے جو خود حالی نے لکھا، "چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا، اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی" مجبور کرنے کا ذکر یقیناً ان کے "عشق منکوحہ" کی نفی کرتا ہے۔ پھر آگے چل کر وہ لکھتے ہیں — "......... مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکہ آسودہ حال۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا" مولانا حالی نے یہاں اپنی روپوشی کا جو سبب بیان کیا ہے اسے تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہم بلا تامل مان لیتے ہیں کہ مولانا حالی کی "روپوشی" کا سبب صرف "طلب علم" رہا ہوگا لیکن اس سے اس قدر یقیناً معلوم ہوتا ہے کہ ازدواجی رشتہ ایسے مضبوط عشقیہ رشتہ میں کم از کم اس وقت تک نہیں بدل سکا کہ مولانا کو روک لیتا — صالحہ عابد حسین نے "یادگار حالی" میں لکھا ہے "الطاف حسین کو اس وقت شادی کی ذرا بھی خواہش نہیں تھی" حالی کی ازدواجی زندگی سے بحث کرتے وقت جہاں انھوں نے یہ لکھا ہے کہ میاں بیوی میں "کبھی ان بن نہیں ہوئی" وہاں ان کی بیوی کے بارے میں ان کا ایک فقرہ یہ بھی ملتا ہے "البتہ وہ بڑے تیز مزاج کی تھیں اور جب غصہ آتا تھا تو آپے سے باہر ہو جاتی تھیں" ان تمام بیانات کے نقل کرنے کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ حالی کی ازدواجی زندگی ناخوشگوار تھی مگر ان سے کہیں بھی یہ مترشح نہیں ہوتا کہ یہ رشتہ کسی عاشقانہ کا نتیجہ تھا۔ گھر سے روپوشی کے بعد نوجوان حالی نے جو اس وقت اپنے مذہبی عقائد میں بہت کٹر تھا دلی میں کیسے گذر بسر کی اس زمانے کا حال صالحہ عابد حسین کے بقول "کہیں دستیاب نہیں تھا" صرف پروفیسر صفدر حسین نے ایک مضمون میں چند ایسے اشارے کئے ہیں جن سے گمان گذرتا ہے کہ شاید وہاں یہ سادہ دل مبتلا ہو گیا ہو۔ صفدر حسین صاحب لکھتے ہیں "جوانی کس پر نہیں آتی؟ ان پر بھی آئی تھی جس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا [illegible] عمر حالی کی [illegible] قیام یہاں کا [illegible] تھا ایک تازیانہ کہ جو تھا غربت کے حسین مشغلے [illegible] کھل رہا تھا خصوصاً کہ حالی کی زبان پر آ گئے" مگر پروفیسر صفدر حسین نے نہ "غربت کے حسین مشغلوں" کی وضاحت کی ہے۔ اور نہ اپنے قیاس کے وجوہ بیان کئے ہیں۔

ان کے بیان سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ یہ "حسین مشغلے" انھیں کب نصیب ہوئے۔ پہلی بار جب وہ گھر سے فرار ہو کر دلی گئے تھے یا دوسری بار؟ اس کے علاوہ صفدر حسین صاحب کے اس قیاس کے برخلاف حالی کے تمام سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ انھوں نے کبھی بھی مشاغل علمی کو ترک کر کے ان حسین مشغلوں کو نہیں اپنایا، یہ بھی یاد رہے کہ حالی پر اس زمانے میں اس درجہ مذہب کا غلبہ تھا کہ انھوں نے غالب ایسے شخص کو جس کے وہ بے انتہا عقیدت مند تھے —— شراب خواری اور تارک صوم و صلوۃ ہونے پر ٹوک دیا تھا، لہذا کسی واضح اور مدلل شہادت کی عدم موجودگی میں یہ بات بے وزن سی ہو جاتی ہے کہ حالی کہیں عشق کر بیٹھے تھے —— تو پھر کیا یہ تمام اشعار "برائے غزل" ہیں اور ان میں کوئی واقعیت، کوئی اصلیت کوئی خلوص نہیں ہے حالانکہ حالی نے اپنی تنقیدوں میں بار بار "اصلیت" پر زور دیا ہے۔ ان کے خیال میں شعر میں اس وقت تک تاثیر ممکن نہیں جب تک اس میں جذبے کی صداقت نہ پائی جائے۔ ایسی صورت میں ان کی عشقیہ غزلوں کی تاثیر کا راز کیا ہے؟! اس ضمن میں یہ بات بھی نہ بھولنی چاہئے کہ ایسی غزلیں انھوں نے بالعموم اس وقت کہی تھیں جب ان میں جوانی کا کس بل باقی تھا۔ اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ اس رنگ سے کنارہ کش ہو گئے —

ہوئی پیمانۂ جوانی کی میعاد آخر حیف
طبیعت رنگین تھی مے عشق کی جب متوالی

اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
گر غزل لکھئے تو کیا لکھئے غزل میں آخر
نہ رہی چیز وہ مضمون سمجھانے والی

اس کے معنی یہ ہوئے کہ حالی عشقیہ جذبے کو صرف جوانی کا تابع سمجھتے تھے، جب تک وہ جوان رہے عشقیہ غزلیں کہتے رہے، جیسے جیسے جوانی ڈھلتی گئی ان کا عشق افسردہ ہوتا گیا معلوم نہیں یہ حالی کا ایک ایسا نظریہ تھا جس کی روشنی میں وہ تمام شاعروں کا کلام پرکھتے تھے یا اس کا اطلاق صرف اپنی شاعری پر کرتے تھے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اسی کمزور عشقیہ تحریک کے باعث حالی "سایہ عشق بتاں سے بھاگنے لگے" اور ان کی "سلح سدھار" خواہش کو یہ موقع مل گیا کہ اس نے ان کی اس عشقیہ رنگ کو آسانی سے کچل کر رکھ دیا۔ معاملہ جو کچھ بھی ہو مگر یہ جوانی ان کو برابر یاد آتی رہی ؎

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

غزل کو جوانی سے تعبیر کرنے کے بعد ظاہری بات ہے کہ حالی کے قدم اس طرف زیادہ تیزی سے بڑھنے لگے جدھر انہیں عشق بازی میں قوموں کی تباہی نظر آنے لگی تھی ؎

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا

اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں "۔۔ مگر جب آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا .... جس شاعری پہ ناز تھا، اس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھا یا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے" چنانچہ عمر ڈھلنے کے بعد حالی نے عاشقانہ غزل گوئی تقریباً ترک دی۔ مگر اس سے قبل جو غزلیں کہی گئی تھیں ان کا محرک کیا تھا۔ اس کا پھر بھی کوئی پتہ نہیں چلتا ہے۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟

اسی دیباچے میں وہ لکھتے ہیں "۔ غرض ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا .... خصوصاً جب کبھی یہ سودا اچھلا آنکھیں بند کیں اور اسی شارع عام پر ہو لئے" یا مسدس کے دیباچے میں لکھتے ہیں "۔ البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشت جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا ......"

"شارع عام" اور "خیالی معشوق" لکھ کر حالی نے ایک اور الجھن پیدا کر دی۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی عاشقانہ شاعری صرف و محض ان کے زمانے کے غالب رنگ کی پیروی تھی اور بس۔ جیسا کہ صالحہ عابد حسین نے بھی لکھا ہے۔ "حالی اگر پاکباز بھی تھے مگر شعر گوئی کے لئے رند شاہد باز بننا ضروری تھا۔ شاعری کی محفل میں داخلے کی شرط یہی تھی، کہ وہی پرانا راگ الاپا جائے" گویا حالی کی عشقیہ غزلیں صرف داخلہ کا ٹکٹ تھیں۔ مولانا حالی اور صالحہ عابد حسین کے بیان کو غلط ماننے کی وجہ نہیں ہے البتہ حالی کے اس اعتراف سے سب سے بڑا صدمہ ان کی شاعری کو پہنچتا ہے اور ان کی غزلوں کی خوبصورت عمارت ایک دم سے زمین پر آ رہتی ہے۔ یہی نہیں حالی کی پوری سخن فہمی اور تنقیدی نظر شدید طور پر مشتبہ ہو جاتی ہے اور ہمیں یہ شک ہونے لگتا ہے کہ کہیں حالی ادب و شعر کی تخلیق کو صرف معاشرتی اصلاح کا ایک سیدھا سادا جذبہ اور وسیلہ تو نہیں سمجھ بیٹھے تھے۔ بہرحال اگر ہم حالی کے بیان کو صحیح مان لیں جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے تو پھر اس شعر کے کیا معنی ہوئے ؎

اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی

اور پھر دیوان حالی کے دیباچے سے اس شعر کی صداقت کو تقویت ملتی ہے "شاعر چونکہ برائیوں کی ہو بہو تصویر کھینچ کر دکھاتا ہے .... اس لئے سمجھنا چاہئے کہ وہ زیادہ تر اپنے ہی عیب اوروں پر دھر کر ظاہر کرتا ہے ...... پس اگر بدی یا گناہ کے متعلق کوئی سچے کی بات شاعر کے قلم سے مترشح ہو جاتی تو چاہئے کہ وہ اپنے نفس ہی کی چھپیلا ظاہر کرتا ہے"

بیں عاشقی کی گھاتیں معلوم اس کو ساری
حالیؔ سے بدگمانی بے جا نہیں ہماری۔

اس بیان کے بعد ہمیں حالیؔ کی غزلوں سے خوش گمانی جیسے وہ
انی کہتے ہیں پھر بڑھنے لگتی ہے۔ اور ہمیں ان کی غزلیں صرف عشقیہ
ت، جوانی کا ہیجان، موزونیٔ طبع اور عام رنگ سخن کا فیض نہیں
م ہوتیں بلکہ ان کے پیچھے عشقیہ صداقت اور عشقیہ زندگی کا گہرا تر ملتا
، حالانکہ حالیؔ نے ان کو قطعاً تقلیدی بتایا ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا
ے کہ ان غزلوں کا اثر جھٹلایا نہیں جا سکتا اور نہ ان کا لب ولہجہ
یدی کہا جا سکتا۔ اب پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس عشقیہ
اقت کا پتہ ان کی غزلوں ہی میں کیوں ملتا ہے۔ ان کی زندگی کے
ات میں کیوں اس کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ اس موقع پر مولانا حالیؔ
کے الفاظ ہیں "شاعر کی طرف سے" یہ عذر ہو سکتا ہے کہ
ہیں فطرت انسانی کے حقائق اور غوامض سمجھنے کا ایک خداداد
ہوتا جس کی مدد سے .... شاعر جس نے
ہیزگاروں اور پارساؤں کے حلقے سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا۔
.... رندو اوباش کی صحبتوں کا ایسا چربہ اتار دیتا ہے کہ گویا
ان میں سے ایک نے اپنی حالت کی تصویر کھینچی ہے"

حالیؔ نے شاعر کے "خداداد ملکہ" کی طرف توجہ دلا کر ہماری
طرح سے بڑی رہنمائی کی ہے اور ہم ان کی غزلوں کے عشقیہ
بات کو یقیناً صرف "خداداد ملکہ" تصور کر لیتے ـــــ اور ایک
ظ سے وہ خداداد ملکہ ہیں بھی ـــــ لیکن اسی کے بعد آگے چل
انھوں نے ایک فقرہ اور لکھا ہے۔ "اس عذر سے اگرچہ کسی
ر شاعر کی برأت ہو سکتی ہے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالیؔ
ا خداداد ملکہ کو کوئی بہت بڑی چیز نہیں سمجھتے تھے، اور اس سے
ا "عدم مطابقت کی صرف "کسی قدر برأت" کے قائل تھے جو
عر کی عملی اور فکری زندگی میں پائی جا سکتی ہے۔ حالیؔ کے اس خیال
گر ان کی غزلوں پر منطبق کیا جائے تو اس سے دو نتائج برآمد ہوتے
۔ ایک تو یہ کہ عشقیہ غزلوں کو لکھنے کا جس قدر "خداداد ملکہ" ان
ا تھا اسی قدر غزلیں انھوں نے لکھیں آگے چل کر یہ ملکہ بھی جواب
دے گیا اور ان کی غزلوں نے دم توڑ دیا۔ دوسرے یہ کہ نئے رنگ
سخن کو اختیار کرنے کا سبب محض معاشرتی تغیرات نہیں تھے بلکہ کچھ
یہ بھی تھا کہ حالیؔ اب عشقیہ غزلیں لکھنے کی صلاحیت ہی کھو چکے تھے
معاملہ جو بھی ہو مگر اس سے یہ بات پھر بھی تشنہ رہتی ہے کہ ان کی قدیم
غزلوں میں ـــ اگرچہ وہ تعداد میں زیادہ نہیں ہیں ـــــ عشقیہ
جذبہ کی اتنی تازگی، شگفتگی اور خلوص کیوں ہے؟ کیا خداداد ملکہ اتنا قوی
ہوتا ہے؟ اگر اتنا ہی قوی ہوتا ہے تو شاعر کی "کسی قدر برأت" ہو جانے
کی بات زیادہ وقیع نہیں رہتی اور مولانا کے اس بیان کے باوجود کہ
"اصل اور نقل میں آسمان اور زمین کا فرق ہے، جو کیفیت عشق میں ہے
وہ تعشق میں ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی ہے" ہمیں ان کی غزلوں میں "اصل اور
نقل" کا فرق نہیں نظر آتا۔ ممکن ہے ہم ان کی غزلوں کو شاعرانہ بصیرت
کسی انجانی داخلی تحریک، معاشرتی تغیرات یا فیضِ سخن کا نتیجہ قرار دیں۔
مگر اس سے انکار نہیں کر سکتے ان میں جیتا جاگتا عشق ملتا ہے، یہ ضرور
ہے کہ ان غزلوں میں دیوانگیٔ عشق نہیں ہے، ضبطِ عشق ہے یہی ان
کی کمزوری بھی ہے۔ حالیؔ نے ہماری عشقیہ شاعری کو ایک بہت لطیف
مستحمل ہوئی اور متوازن کیفیت سے دوچار کیا ہے۔ ان کی غزلیں ہماری
قدیم اور جدید غزل گوئی کی ایک بہت اہم اور مضبوط کڑی ہیں۔ ان
کی غزلوں کو کسی قسم کے "عذر" کی ضرورت ہے نہ "برأت" کی۔ اگرچہ
ان غزلوں کے لکھنے والے کی بھی زندگی میں دور دور عشق و عاشقی کا نشان
نہیں ملتا۔ مگر وہ اس کی دلی کیفیات کی غماز ہیں ـــ یہ کیفیات حالیؔ
میں کہاں سے آئیں؟ حالی کی ان غزلوں کا سرچشمہ کیا ہے؟ کیا یہ ایک
ایسے آدمی کی نفسیاتی کیفیت کی غماز ہیں جو جذبۂ عشق رکھنے کے باوجود
"جرأت عشق" نہیں رکھتا۔ جو بہت محتاط ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں
کوئی قدم غلط نہ پڑ جائے ع

کچھ دل سے ہیں ڈرتے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

کیا ان غزلوں کے پس منظر میں کوئی حقیقی واردات عشق نہیں ہے؟
کیا عشقیہ شاعری کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ شاعر نے خود عشق
کیا ہو؟ کیا شاعر اور ادیب میں کوئی ایسی دیدہ وری ہوتی ہے
جس کی مدد سے وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے، جان لیتا ہے؟

لوب احمد انصاری

نثر کا آہنگ
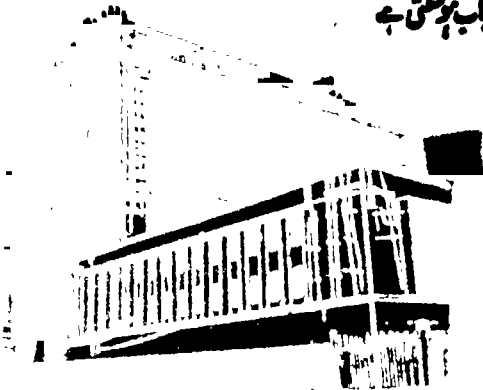
دنیا کے کم و بیش ہر ملک اور ہر زبان میں نثر کا وجود،
کے بعد عمل میں آیا۔ اس کے دو اسباب بادی النظر میں معلوم
نے ہیں۔ اوّل یہ کہ شاعری، شدید جذبہ کی زبان ہے اور
کا براہ راست تعلق ترنم سے ہے۔ وہ پڑھنے والے کے
ل میں اخذ کرنے اور متأثر ہونے کا وہ فطری جوش پیدا
ا ہے۔ جس کے ذریعے جذبات فن کار سے سامعین کی
، بآسانی منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تجربہ نے
ت کیا، کہ فنی مواد کا کچھ حصہ ایسا بھی ہوتا ہے، جو شاعری
سانچے میں احساس تکمیل کے ساتھ ادا نہیں کیا جا سکتا۔
ہم نثری مواد کہہ سکتے ہیں۔ یا احساسات اور جذبات کے
بل خیالات اور زندگی کے متعلق مفروضے اور تعمیمات۔
یس، ایلیٹ نے اپنے ایک مضمون میں شاعری کو مقامی
ر کو عمومی یا عالمگیر کردار سے متصف کیا ہے۔ جس سے مراد یہ
ر خیالات اور تعمیمات میں زیادہ سے زیادہ اور مختلف النوع
ور تمدنی گروہ شریک ہو سکتے ہیں۔ جذبات اور احساسات
سانچے مقامی اثرات اور نسلی مزاج سے مرکب ہونے کی بنا
س طرح کی انفرادیت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے شاعری کا ترجمہ
زبان سے دوسری زبان میں کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ نثر
بہ ممکن بھی ہے اور نسبتاً آسان بھی۔ اکثر یہ کہا گیا ہے، کہ
اظہار کا فرق کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے
ہیں کہ بعض اوقات شاعری کے بعض نمونے ارتکاز، قطعیت اور
معروضیت کے حامل ہوتے ہیں، اور یہ خصوصیات بیش از بیش
نثر سے مخصوص ہیں۔ اور دوسری طرف نثر میں شعری مواد یعنی
تخیل اور جذبہ، ترنم اور پیکر نگاری پائی جاتی ہیں۔ اس اعتراض
کے جواب میں یہ کہنا پڑے گا، کہ ایسی صورت میں وسیلۂ اظہار کا
انتخاب غلط ہے۔ اور اس میں عدم موزونیت پائی جاتی ہے۔

یہ امر تو تسلیم شدہ ہے کہ نثر کا ارتقا کافی مدت چاہتا ہے لیکن
اس کے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا، کہ بہت عرصہ تک نثر کے
خط و خال پر شاعری کا آب و رنگ جھلکتا رہتا ہے۔ برسوں کے
عمل صیقل کے بعد نثر، شاعری کے اس غلبہ سے آزاد ہوتی ہے،
اور اس کا مخصوص کردار سامنے آتا ہے۔ اس کردار کے تعین
میں بہت سے عناصر معاون ہوتے ہیں۔ مثلاً طباعت کی آسانی،
حلقہ تعلیم کی وسعت، محاورہ کا رچاؤ، جمہوری رُوح کا عام
ہونا، سائنٹیفک اور عقلی نقطۂ نظر کی مقبولیت، اور زبان کا
جذبہ اور خطابت کے علاوہ بحث و تمحیص، غور و فکر اور تحلیل و
تجزیہ کے مقاصد کے لئے استعمال کیا جانا۔ انشا پردازی کے
مختلف نمونوں کی موجودگی اور نثر کے عہد بہ عہد ارتقا میں
مختلف عناصر کی کارفرمائی کے باوجود بھی یہ کہنا شاید غلط نہ ہو،
کہ شاعری اور نثر، دو اسالیب بیان ہی نہیں، بلکہ دو انداز
فکر اور فنی مواد کی دو کیفیتوں کو فرض کرتے ہیں۔ اسالیب کی

حیثیت سے بھی ان کے عناصر ترکیبی اور فنی تقاضے مختلف ہیں
ہمیں پہلے ابھی پر غور کرنا ہے۔

اچھی اور معیاری نثر جو کچھ خیال کو پیش کرنے، ذہنی
اتفاق اور ہمراہی کو حاصل کرنے اور اعصاب پر چھا جانے کی
بجائے عقلی سطح پر ترغیب دلانے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔
اس لئے اس کے لئے ایک منطقی سانچہ کی ضرورت ہوتی ہے
جس میں اس کے مقدمات کامل ہم آہنگی کے ساتھ جگہ
پاسکیں۔ وہ سوچنے کے انداز میں وضاحت پیدا کرتی ہے،
اور بیان کے حدود کو واضح اور روشن طور پر سامنے لاتی
ہے اور اس لئے اس میں حشو و زوائد اور غیر ضروری
تفصیلات سے احتراز پایا جاتا ہے۔ مشہور انگریزی نقاد
کالرج نے نثر اور نظم کے فرق کو ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ
نثر الفاظ کی مناسب ترین ترتیب ہے اور شاعری بہترین
الفاظ کی بہترین ترتیب۔ اس تعریف میں ترتیب کا لفظ کسی قدر
غور طلب ہے۔ ترتیب سے ہمارا ذہن فوراً اس امر کی طرف
منتقل ہوتا ہے، کہ ہر فنی کارنامہ خواہ وہ نثر کا ہو، یا شاعری
کا، دراصل ایک (ARTEFACT) ہے۔ یوں تو ہر قسم کی
تخلیق شعوری اور غیر شعوری عناصر کے امتزاج باہمی سے
وجود میں آتی ہے، یعنی اس میں ایلیٹ کے بقول تجربہ کی شیرازہ
بندی کا وہ خاموش اور ناقابل فہم عمل بھی پایا جاتا ہے، جسے ہم
غیر شعوری عنصر سے متعلق کرسکتے ہیں، اور وہ فنی اہتمام و انصرام
بھی، جو شعوری اور پیہم توجہ اور کوشش چاہتا ہے۔ جس نقطہ
پر یہ دونوں عناصر مل جاتے ہیں وہیں فنی کارنامہ ظاہر ہو
جاتا ہے۔ عمومی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ شاعری تخلیقی جوہر
اور توانائی کا مظہر ہو جاتی ہے، اور نثر تعمیری صلاحیت اور
قدرت کا۔ یہاں یہ کہنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاعری اور
نثر میں دونوں عناصر کم و بیش موجود ہوتے ہیں، فرق صرف
ان کے تناسب میں ہوتا ہے۔ جس کی بنا پر ہم کسی ایک عنصر
کو ایک مخصوص اسلوب بیان سے متعلق کر دیتے ہیں۔ ساخت
اور در و بست کے اعتبار سے نظم اور نثر میں یہ فرق ہے کہ
اوّل الذکر میں علٰحدہ علٰحدہ مصرعے مل کر مختلف اکائیوں کو جنم
دیتے ہیں، اور نثر میں ہم ایک پیراگراف کا تصور کرتے ہیں
جو مشتمل ہوتا ہے مختلف جملوں پر۔ ان جملوں کی مزید تقسیم الفاظ
میں کی جاسکتی ہے۔ جن میں حروف کی مالا پرودی جاتی ہے
لیکن نظم اور نثر دونوں میں فنی سانچہ صرف الفاظ یا حروف
کی اکائیوں سے مرکب نہیں ہوتا۔ حروف صرف آواز رکھتے ہیں، الفاظ آوازیں بھی رکھتے ہیں اور مفہوم بھی۔ لیکن
ایک پورے پیراگراف کی معنی خیزی الفاظ اور جملوں کی ترتیب
سے اُبھرتی ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ
شاعری میں الفاظ کی اکائیوں اور مفہوم کی اکائیوں کے
درمیان مکمل مطابقت شرط نہیں۔ نثر میں اس کی غیر موجودگی
مواد کو گرفت میں لانے کے عمل میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔
نثر کی بساط پر خیال لمحہ بہ لمحہ اور منزل بہ منزل آگے بڑھتا
ہے۔ اس میں ایک نوع کا تسلسل، سبک روی اور ہمواری
پائی جاتی ہے۔ شاعری کی اعلیٰ شکلوں میں عدم تسلسل کا عنصر
پایا جاتا ہے۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ نثر میں تقلیل الفاظ کے ساتھ
صفائی پائی جاتی ہے۔ یعنی صرف اتنے اور ایسے الفاظ کا استعمال
مستحسن ہے، جو مفہوم کو جامعیت کے ساتھ پڑھنے والے تک
پہنچا دیں، اور کوئی ذہنی خلفشار اور اُلجھن پیدا نہ ہو تو اس
فنی کاوش اور تدبیر کو ہم (UNDER STATEMENT)
کی اصطلاح کا نام دے سکتے ہیں۔ شاعری میں مفہوم کی
بہت سی اکائیاں مفروضہ ہوتی ہیں۔ اور انھیں کھول کر بیان
کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ الفاظ، ذہن کو ایک خیال اور
کیفیت سے دوسرے متضاد خیالات و کیفیات تک منتقل
ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور ان کے اثرات میں ایک
آنی اور ہم وقتی (INSTANTANEOUS) کیفیت پائی
جاتی ہے۔ ذہن ایک سمت میں دلجمعی اور وثوق کے ساتھ
نہیں بڑھتا رہتا، بلکہ آگے بڑھنے اور پیچھے لوٹ آنے کا

ل جاری رہتا ہے! اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعری کی ہر ں صنف میں، جو محض بیانیہ نہیں ہے، منطقی خلا کی یہ صفت ئی جاتی ہے۔ اس لئے کالرج کی یہ رائے صحیح ہے، کہ شاعری مطالعہ مسلسل اور گہری توجہ چاہتا ہے۔ اس خلا کو الفاظ ے علائم اور ان سے چھپی ہوئی کیفیات کے اُجاگر کرنے سے کیا جا سکتا ہے۔ نثر میں راستہ اور منزل دونوں سامنے دتی ہیں، اور اس لئے بھٹک جانے کا اندیشہ کم ہوتا ہے۔

اس سے قبل یہ کہا گیا تھا، کہ ترنم اور پیکر نگاری شاعری لی سب سے بڑی پہچان ہیں۔ ترنم کی بنیاد جذبہ کی شدت پر۔ ڑھنے یا سنانے میں آواز کا بیرونی یا ذاتی ترنم، الفاظ کے اخلی ترنم کو باہر لے آتا ہے۔ آواز بیک وقت احساس کی رجمان بھی ہے اور ایک سماعی اظہاریت بھی رکھتی ہے۔ لفاظ کے آوازی پیکروں اور لہجہ کے اُتار چڑھاؤ سے وسیقی اور شاعری، دونوں میں کام لیا جاتا ہے۔ دراصل لفاظ اپنا کوئی ترنم نہیں رکھتے، بلکہ وہ آواز کی قوت اظہار کے لئے ایک موقع فراہم کرتے ہیں۔ شعری آہنگ کا بھانے ہیں جو چیزیں ممد ہوتی ہیں، وہ ہیں تکرار، ہم آواز الفاظ کا ستعمال، بحور، حروفِ علت (VOWELS) اور حروف ماصت (CONSONENTS) کا امتزاج اور تجنیس حرفی (ALLITERATION) وغیرہ۔ نثر کا آہنگ تکرار سے نہیں بلکہ تنوع سے پیدا ہوتا ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ اس میں ہم آواز الفاظ کے استعمال سے ایک ہموار لہر نہیں پیدا کی جاتی، بلکہ متنوع الفاظ کے آوازی پیکر مل کر ہلکی اور تیز لہریں پیدا کرتے ہیں۔ موسیقی میں صوت مجرد نامی عنصر ہے، شاعری میں اصوات کو معنی سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ تجرید اور تجسیم موسیقی اور شاعری کی ممتاز علامتیں ہیں۔ موسیقی سے شاعری کا تعلق سماعی اور حرکی پیکروں کی وجہ سے ہے۔ خوش آہنگی یا ترنم سے الفاظ کی پوشیدہ موسیقی ایک خارجی لباس پہن لیتی ہے۔ شاعری میں اوزان اور بحور

کے ضابطے، جذبات کی فراوانی کو اعتدال پر لگانے اور اصوات کی موسیقی کو منضبط کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ نثر میں ہم آواز الفاظ اور مترادفات کا بہت زیادہ استعمال پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا۔ ہاں مختلف آہنگ رکھنے والے الفاظ، جیسے خیال کے متوازی پہلو سامنے آئیں اور سماعی لہروں کا تنوع پیدا کریں، استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں شاعری گا کر پڑھی جاتی تھی، اور تحریر کی ضابطہ بندی سے پہلے زبانی شاعری کا عام رواج تھا۔ یہ اس لئے ممکن تھا کہ شاعری میں جن فنی تدابیر سے کام لیا جاتا ہے، مثلاً عروض، قافیئے، بحور، اوزان اور ٹیپ کے بند، وغیرہ، وہ سب حافظہ کی مدد کرتے ہیں۔ اور اسی لئے شاعری، نثر کی نسبت کہیں زیادہ اس کی صلاحیت رکھتی ہے، کہ بآسانی حافظہ میں اپنی جگہ پالے۔

اس سے پہلے یہ کہا گیا تھا، کہ الفاظ بذات خود کوئی مفہوم نہیں رکھتے۔ یہ مفہوم کیسے پیدا ہوتا ہے؟ زبان کو تمامتر سماجی مظہر سمجھنا صحیح نہیں۔ کیونکہ الفاظ صرف اشیا، یا کیفیات کا بدل اور ان کے اشارے نہیں ہیں، بلکہ خیالات اور تصورات کا بھی۔ اور تصورات تجربہ سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور آزاد وجود (INNATE EXISTENCE) بھی رکھتے ہیں۔ الفاظ کا مفہوم متعین کرنے میں برسوں کے تجربے، روایات اور ضروریات کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ فرانسیسی ناول نگار فلابیر کا خیال ہے، کہ ہر لفظ صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے۔ یہ قول زبان کے لغوی مفہوم پر صحیح اُترتا ہے۔ لیکن نظم اور نثر کی زبان میں یہ فرق ہے، کہ شاعری میں الفاظ متلازم (EVOCATORY) آوازیں رکھتے ہیں؛ اور ان کے درمیان لطیف اور نازک امتیازات سے جادو جگانے کا کام لیا جاتا ہے۔ نثر میں الفاظ اشیا کے مکانی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور ان کا مفہوم متعین اور

واضح ہوتا ہے۔ شاعری میں جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں
وہ اپنے (TENTACLES) رکھتے ہیں، جو ہمارے
ذہن کو دوسرے الفاظ، ان کے تلازمات اور ان کی رواں
دوا پرچھائیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ ان کے ذریعہ
ان کیفیات کو اجاگر کیا جا سکتا ہے، جو حافظے کے سازوسامان
سے چمٹی رہتی ہیں۔ .... نثر میں الفاظ ارتکاز
(SOLIDIFICATION) اور انجماد
( ) کی طرف میلان رکھتے ہیں۔
اور مختلف سمتوں میں کھلتے اور پھیلتے نہیں۔ ان کا مفہوم مقید
اور متعین ہوتا ہے۔ اس لئے پیکر نگاری نثر کے لئے ضروری
نہیں اور نثر کا تعلق حافظہ اور واہمہ کی گہرائیوں سے
نہیں ہوتا۔

وضاحت اور قطعیت پر جو زور نثر میں ملتا ہے اس
کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ نثر کی زبان اکتاہٹ
پیدا کرے اور سپاٹ ہو۔ نثر کے ترنم میں اسرار کی کیفیت
نہیں پائی جاتی۔ اس میں وضاحت کے ساتھ ہی ایک سہولت
بیان، سبک روی اور لوچ کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہ لوچ
زبان کی پختگی، الفاظ کے تناسب اور قرینہ اور ان کے صوتی
مطالبات کا لحاظ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے اچھی
اور معیاری نثر کی زبان برسوں کے لسانی ارتقار کا فیضان
ہوتی ہے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے، کہ زبان مختلف
اسالیب ادب مثلاً نثری ڈرامے، ناول اور کہانیوں میں
برابر استعمال کی جاتی رہے۔ تاکہ الفاظ مختلف سیاق وسباق
میں برتے جانے کے بعد ایک نوع کی بلوغت اور لوچ حاصل
کرلیں۔ الفاظ کی بنیادی ہیئت، چلن کی خراد پر چڑھ کر
سلاست اور خوش آہنگی پالیتی ہے۔ یونانی زبان میں نثر
کے لئے جو اصطلاح وضع کی گئی تھی، اس کا مفہوم تھا، برہنہ
الفاظ، یعنی جو الفاظ نثر میں استعمال ہوتے ہیں۔ وہ محدود
شفافیت (TRANSPARENLY) پائی جاتی ہے۔ ہم
ان کے آر پار جس طور سے دیکھ سکتے ہیں، وہ شاعری کے
سلسلہ میں ممکن نہیں۔

اس سے وابستہ یہ مسئلہ بھی ہے کہ شاعری میں شدید
اور ذاتی ردعمل اور تأثرات جگہ پاتے ہیں۔ اور اُن کا
اثر پڑھنے والے پر تیز اور سریع ہوتا ہے۔ اور نثر میں
ٹھنڈے دل سے کسی مسئلہ پر سوچنے اور غور کرنے کی دعوت
دی جاتی ہے؛ اور فکر و استدلال کی قوت سے تمام تر سروکار
ہوتا ہے۔ نثر میں جذبات سطح کے نیچے ہوتے ہیں اور ان
پر عقل کا سخت پہرہ رہتا ہے۔ اس سخت پہرہ کی وجہ سے
جذباتیت غالب نہیں آنے پاتی۔ نثر کا عمل محاکمہ اور
انضباط چاہتا ہے۔ شاعری میں جذبات کی حد بندی بحور
اور اوزان سے کی جاتی ہے۔ نثر میں تقلیل الفاظ، منطق کی
حکمرانی اور استعارہ کا فقدان، یہ سب عناصر روک تھام کا
کام کرتے ہیں۔ بے قید جذبات اور بے قید خیالات، دونوں
اچھے ادب میں جگہ پانے کے مستحق نہیں ہوتے۔ ان کی قطع و
برید بھی لازمی ہے۔ لیکن شاعری میں اس قطع و برید کے
باوجود اشاریت کا عنصر غالب عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔
نثر میں معروضیت، لاتعلقی اور منطقی انداز لازمی شرائط
ہیں۔ مڈلٹن مرے نے بہت صحیح بات کہی ہے، کہ نثر بنیادی
طور پر منصفانہ (JUDICIAL) ہوتی ہے۔

نثر کے لئے جس یونانی اصطلاح کی طرف ابھی اشارہ
کیا گیا، اس کی وجۂ تخلیق یہ معلوم ہوتی ہے کہ یونانی شاعری
میں موسیقیت کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ جب یونانیوں نے
نثر کی ضرورت محسوس کی۔ تو اس عنصر کو خارج کرنے کی
طرف میلان بڑھا۔ روم کی شاعری میں، یونانی شاعری
کے برعکس، سننے کی بجائے دیکھنے پر زور دیا گیا۔ انگریزی
شاعری میں بھی موسیقی کا عمل دخل کافی رہا ہے، خاص

ے نمونے کم ملتے ہیں اور وہ شاعری کے مقابلے میں کم حیثیت
ں۔ یہی حال درمیانی دور کی انگریزی نثر کا ہے۔ نثر کے
زد نمونے ہمیں الزبتھن دور میں ملنے شروع ہوتے ہیں۔
ل کی نثر میں سحرکارانہ سادگی اور دھیما پن ہے۔ لیکن یہ
ری معیاری خصوصیات کی حامل نہیں۔ سترھویں صدی
ں دو مشہور نثر نگار ملٹن اور سر ٹامس براؤن ہیں۔ لیکن یہ
لاطینی کے بوجھ سے گراں بار ہے، اور ابھی نثر نہیں بنی
ے۔ اس میں علمیت، خطابت اور شاعری، تینوں کی پرچھائیاں
ں ہیں۔ البتہ سترھویں صدی کے آخر میں ہم ایک منفرد نثر نگار
ائیڈن سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کی ہجویہ نظموں میں بے محابا
ن شکنی ہے اور اس کے وار ایسے گہرے اور بھرپور ہیں کہ ہر
ر کا سترہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اس کی نثر میں اعتدال،
ہم، بانکپن اور قطعیت ملتی ہے۔ یہاں لطیف نشتر زنی ہے،
ر مواد پورے طور پر عقلی گرفت میں رہتا ہے۔ ایک نمونہ
یے۔

"One of our late great poets is sunk in his reputation, because he could never forgive any conceit which came in his way; but swept like a dragnet, great and small. There was plenty enough, but the dishes were ill sorted; whole pay-ramids of sweet meets for boys and women, but little of solid meat for men. All this proceeded not from any want of know-ledge, but of judgment."

یزی نثر کا درخشاں دور دراصل اٹھارویں صدی میں
روع ہوتا ہے۔ اس دور میں ایڈیسن (ADDISON)
ر سوئفٹ (SWIFT) کا نام سرِفہرست ہے۔ سوئفٹ
[illegible]

ہمیشہ فریب کن ثابت ہوتی ہے۔ جملوں کی ساخت اور ترتیب
میں ایک نوع کی پیچیدگی پائی جاتی ہے، گو الگ الگ الفاظ
اپنی جگہ سادہ معلوم ہوتے ہیں۔ بیانیہ صداقت اور واقعیت
کہیں نظر انداز نہیں کی جاتی۔ اور خیال کا ارتقا صاف طور
پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ منطقی دروبست، عقلی محاکمہ، جذبات
پر پوری قدرت اور لہجہ کا توازن، اس کے اسٹائل کی نمایاں
خصوصیات ہیں۔ اس کے یہاں حشو و زوائد نام کو نہیں۔ الفاظ
اور مفہوم اس طور پر شیر و شکر ہو گئے ہیں، کہ اس کی مثال
تلاش کرنا آسان نہیں، ایک نمونہ دیکھیے:

"How fading and insipid do all objects accost us that are not conveyed in the vehicle of delusion! How shrunk—is everything as it appears in the glass of nature! So that, if it were not for the assistance of artificial mediums, false lights, refacted angles, varnish and tinsel, there would be a mighty level in the felicity and enjoyment of mortal men."

موجودہ دور میں معیاری نثر ہمیں آئرستانی مصنف برنارڈ شا
کے دیباچوں میں ملتی ہے۔ اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے تنقیدی
مضامین میں۔ ایلیٹ کے یہاں تحلیل و تنقیح کے ساتھ ہی استوار
اور گھٹی ہوئی عبارت ملتی ہے۔ الفاظ اس کے ہاتھ میں ایک
ایسا ہتھیار ہیں، جن کے ذریعہ وہ گہرے سے گہرے مفہوم کو
قابلِ فہم، مستحکم اور منضبط انداز میں ادا کرنے پر پوری قدرت
رکھتا ہے۔ ایلیٹ کے تنقیدی خیالات اور اختراعِ اصطلاحات
کے علاوہ بھی، نثر کی پختگی اور رچاؤ کے اعتبار سے اس دور
[illegible]

"When the great poet is also a great classic poet, he exhausts, not a form only, but the language of his time; and the language of his time, as used by him, will be the language in its perfection. So that it is not the poet alone of whom we have to take account, but the language in which he writes : it is not merely that a classic poet exhausts the language, but that an exhaustible language is the kind which may produce a classic poet."

اُردو چونکہ نسبتاً نووارد زبان ہے۔ اس لئے اس میں نثر کا رواج اور اس کے کسی قدر اچھے نمونوں کا زمانہ ماضیٔ قریب سے تعلق رکھتا ہے۔ اُردو کا خمیر جتنی ملکی اور غیر ملکی زبانوں سے اُٹھا ہے، اور اس میں ذخیرۂ الفاظ کے ماخذ جتنے متنوع ہیں، وہ شاید ہندوستان کی اور زبانوں کے نہیں۔ یہ کہنا سراسر گمراہ کن ہے، کہ اُردو ہندی کا ایک اسلوب ہے۔ اس میں شک نہیں، کہ ہندی کے بہت سے الفاظ اور محاورے اُردو میں رَچ بس گئے ہیں لیکن اس کے قواعد، عروض اور ادبی اسالیب سب عربی اور فارسی کی دین ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ یہ اہم ہے، کہ الفاظ اور دوسرے فنی وسائل نے زبان کے بنیادی سانچہ میں ضم ہوکر اپنا الگ رُوپ نکال لیا ہے۔ اُردو نثر کے بنیادی اسٹائل سے یہ مراد نہیں ہے، کہ اس میں صرف فارسی یا صرف ہندی الفاظ کی متناسب ترتیب کو کام میں لایا جائے، بلکہ یہ کہ مختلف اجزا کا ایسا تناسب اور توازن برقرار رکھا جائے، جو زبان کی فطانت سے میل کھائے۔ یوں تو اُردو نثر کے ابتدائی نمونے ہم [illegible] ملتے ہیں، لیکن دراصل باغ وبہار کو ہم نثر

میں ادبی رتبہ دے سکتے ہیں، لیکن یہ نثر کی تمام بنیادی خصوصیات کی حامل نہیں۔ یہ بات کچھ کم قابلِ غور نہیں ہے، کہ اُردو میں اچھی نثر کے نمونے کم ملتے ہیں، اور عام طور پر نثر میں شاعری اور جذباتیت کا رنگ غالب رہا ہے۔ یہی حال فارسی نثر کا ہے۔ جس سے اُردو براہِ راست متاثر ہوئی ہے۔ اُردو میں نثر کے عدمِ ارتقار کے دو اسباب ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے، کہ اُردو میں نثری ڈرامہ، اور ناول کا رواج بہت کم رہا ہے، اور اس لئے زبان میں لوچ اور توازن پیدا کرنے کے جو وسائل ہو سکتے ہیں، ان سے بالکل کام نہیں لیا گیا۔ دوسرا سبب جو اس سے زیادہ اہم ہے، یہ ہے، کہ نثر قصیدہ اور غزل کے غلبہ سے آزاد نہیں ہوسکی۔ شاعری میں مثنوی کا زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہنا اور بالآخر اس صنفِ سخن کا ترک کر دیا جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے، کہ مسلسل بیان کی اہمیت کو ہمارے ادب میں پوری طرح پہچانا نہیں گیا۔ غزل کی اپنی خصوصیات ہیں۔ لیکن غزل خیال کے مسلسل ارتقار کی حریف نہیں ہوسکتی۔ اس میں نادر خیالات اور احساسات کی پرچھائیوں اور خوردبینی مشاہدوں کے لئے جگہ نکل سکتی ہے، لیکن اس میں فکری ارتباط کی بجائے فکری انتشار پایا جاتا ہے۔ جواہر ریزے ایک سلکِ گہر میں منسلک نہیں ہو پاتے۔ اس سے ذہنی عمل کا مزاج ظاہر ہوتا ہے۔ ردیف اور قافیہ کی پابندی اور مصرعِ طرح پر غزلیں کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ غزل کا فارم میکانکی ہے، عضوی نہیں یعنی یہ اتفاقی بھی ہوتا ہے اور باہر سے عائد کیا ہوا بھی۔ خود غزل کے اندر سے حیاتیاتی عمل کی مانند نہیں پھوٹتا۔ اُردو نثر میں عام طور پر جذبہ اور پیکر نگاری، خطابت اور پینتروں کا جو زور رہا ہے، اس کی وجہ یہی ہے، کہ نثر کے اپنے حدود اور امتیازات کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔ اُردو میں نثر کا پہلا اچھا اور معتبر اسلوب سرسید کے یہاں ملتا ہے۔ سرسید نے نثر کو بحث و مباحثہ اور استدلال کے لئے سائنٹیفک بنا[illegible]

استعمال کیا۔ اسے تشبیہ و استعارہ کی بوجھل آرائش سے منزہ
کیا۔ اور نثر میں اس کی صلاحیت پیدا کی، کہ وہ علمی موضوعات
کے اظہار خیال کا ذریعہ بنائی جائے۔ سرسید کی تحریر کا ایک نمونہ
دیکھئے:۔

"پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے؛ انسان کے
افعالِ ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر
رکھنا، وقت کو عزیز سمجھنا، واقعات کے اسباب
کو ڈھونڈنا اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا، اخلاق
اور معاملات اور معاشرت اور طریق تمدن اور
علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور
فطرتی عمدگی پر پہنچانا اور ان سب کو خوش
اسلوبی سے برتنا اور اس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی
خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین اور حقیقی
وقار اور خود اپنی عزت کی عزت ہے"

لیکن ان خوبیوں کے باوجود سرسید کی نثر میں دو چیزوں کی
کمی ہے، اوّل یہ کہ عقل اور منطق کی سطح کے نیچے جذبات کا
دھارا محسوس نہیں ہوتا۔ اور دوسرے یہ کہ اس میں تنوع
اور لوچ کی کمی ہے۔ دراصل اس سے زیادہ کی توقع کرنا
بے سُود ہے، کیونکہ سرسید کا دورِ نثر کے ارتقا میں عبوری حیثیت
رکھتا ہے۔ سرسید کا یہ کارنامہ کیا کم اہم ہے کہ انھوں نے نثر
کے دامن کو بے جا تکلفات سے پاک کیا۔ اور اس میں ایک
نوع کی سادگی، متانت اور قطعیت پیدا کی۔ سرسید کی نثر کو
پڑھ کر انگریزی مصنف بیکن (BACON) کی نثر یاد آتی ہے۔
جو مغز رکھنے کے باوجود بے مزہ ہے۔ سرسید کے یہاں بھی
خوبیوں کے ساتھ یکسانیت اور اکتاہٹ کا احساس ہوتا ہے
بیکن کا مقابلہ فرانسیسی مصنف مانٹین سے کریں، تو بات واضح
ہو جائے گی۔ اس کے یہاں سلاست اور قطعیت کے ساتھ
جو لوچ (FLEXIBILITY) اور غیر رسمی پن پایا
جاتا ہے اس نے اس کی نثر کو دل فریب بنا دیا ہے۔

یہ لوچ اور غیر رسمی پن غالب کے خطوط کی بھی خصوصیت
ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ ایک نادر کارنامہ ہیں۔ سرسید کا
کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نثر کو شاعرانہ نثر ہونے سے
بچالیا۔ غالب اور سرسید نے اپنے اپنے طور پر نثر کا جو
آہنگ تیار کیا تھا۔ اس کا تکملہ ہمیں حالی کے یہاں ملتا ہے۔
حالی کے یہاں نثر کی بیشتر خوبیاں ملتی ہیں۔ ان کے یہاں
منطقی ساخت بھی ہے اور معروضیت بھی۔ سطح زیریں میں جذبہ
بھی ہے اور منصفانہ انداز بھی: الفاظ کے استعمال میں اعتدال
اور پرکھ بھی ہے اور ہمواری، سبک روی اور لوچ بھی۔ جو
بات انھیں سرسید سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہ کہ سرسید کی
تحریروں میں انفرادی جوہر کی کمی کا احساس ہوتا ہے، ان کا
نقطہ نظر اس حد تک عقلی ہے، کہ شخصیت کا آب و رنگ کہیں
بھی ظاہر نہیں ہونے پاتا۔ جذبہ اور تخیل کے بغیر ادب کا تصور
ممکن ہی نہیں، لیکن نثر میں یہ دونوں قوت فیصلہ کے اس حد
تک تابع رہنے چاہئیں، کہ جذباتیت، رنگینی یا جوش کہیں نہ
نمایاں نہ ہونے پائے۔ ادبی، غیر ادبی، اور شاعرانہ نثر میں انھیں
مختلف عناصر کی یکجائی ایک خاص تناسب کے ساتھ حد
فاصل قائم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ غیر ادبی نثر صرف معلومات
فراہم کرسکتی ہے، شاعرانہ نثر میں جذبہ اور تخیل اُبھر کر سطح پر آتے
ہیں، معیاری نثر معلومات کے ساتھ انفرادی نقطۂ نظر کو
بھی حامل ہوتی ہے، اور اس میں تاثرات پر عقل کی باگ
ڈور ڈھیلی نہیں ہونے پاتی۔ حالی کی نثر کا ایک نمونہ دیکھئے

"وہ زمانہ جب کہ دلی نے اپنے آخری وقت
میں تھوڑی دیر کے لئے سنبھالا لیا تھا، اگرچہ
اس وقت پرانے کمالات کی سوتیں آئندہ
کے لئے بالکل بند ہوگئیں تھیں مگر اگلے دانے
کے بچے کھچے اہل کمال سے شہر بھرا بھرا معلوم
ہوتا تھا۔ باغ میں خزاں کے آثار نمودار ہوگئے
تھے۔ لیکن مرغان خوش الحان خزاں کی آمدآمد

سے بے خبر بدستور ہر طرف چہکتے نظر آتے تھے۔
دلی کا یہ آخری جھگڑا جس کے تصور سے دل پر
سانپ سا لوٹ جاتا ہے، ہم نے اپنی آنکھ
سے دیکھا ہے؛ اور اس کے پس ماندہ قافلہ
کو ایک ایک کر کے اپنے سامنے رخصت کیا
ہے۔"

یہی حال عبدالحق کا ہے۔ ان کی تحریر میں الفاظ کے
اسب ترین استعمال، ہندی اور فارسی الفاظ کی متوازن
یزش اور تقلیل الفاظ (UNDER STATEMENT)
اعجاز ہیں۔ ان کی تحریر کے دروبست میں کو رکسر نکالنا
ن نہیں۔ وہ ذاتی ردعمل میں انتہا پسند ہیں، مگر تحریر میں
وہ اعتدال سے سرمو تجاوز نہیں کرتے۔ بظاہر ان کا انداز
ان اپنی لاتعلقی اور استدلال و محاکمہ کی وجہ سے سرسید
ے قریب تر معلوم ہوتا ہے، مگر دراصل وہ حالی کے پیچھے
نشین ہیں؛ ان کی نثر میں اردو نثر نے تنظیم اور قطعیت
ے میدان میں ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ بظاہر لاتعلقی
ر درشتی کے باوجود ان کی تحریروں میں جذبہ کی گرمی
اف محسوس کی جاسکتی ہے۔ لیکن جس عنصر کو ہم لوچ اور
یک روی سے تعبیر کر سکتے ہیں اس میں وہ حالی سے کسی
ر پیچھے ہیں۔ ان کی تحریر کا ایک نمونہ دیکھئے:

"سرسید نے مسلمانوں کو ذلت و تباہی کے بھنور
سے نکالنے کا ایک ہی علاج سوچا تھا، یعنی
مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج۔ ایک بار
فیصلہ کرنے کے بعد اسے عمل میں لانے کے
لئے طرح طرح کے جتن کئے۔۔ کیسی کیسی
مخالفتیں اور صعوبتیں برداشت کیں۔ طعن
تشنیع، لعنت ملامت سہی، اور کیسی کیسی
کھکھیڑیں نہ اُٹھائیں، لیکن نہایت استقلال
اور عالی حوصلگی سے اپنے خیال پر جمے رہے،
اور جو سوچا تھا اُسے کر کے چھوڑا۔"

یوں تو اس کم عمر زبان کے سرمایہ میں بھی ادبی اسالیب
کا ایک مینا بازار نظر آتا ہے، اور یہ انفرادی رنگ اپنی اپنی
جگہ دیدہ زیب اور سامعہ نواز ہیں، لیکن اس بات کے
ماننے میں کسی کو تامل نہ ہونا چاہئے، کہ ابھی تک نثر کے
آہنگ اور اس کے بنیادی مطالبات کا احساس کم پیدا ہوا
ہے۔ ہم ابھی تک زبان کے چٹخارہ اور الفاظ کی بازی گری
کے ایسے عادی رہے ہیں، کہ جامع اور منصفانہ نثر کی طرف،
جو کٹے ہوئے جذبات، بے جھجک مشاہدہ اور بے لاگ
فیصلہ کی زبان ہوتی ہے، ہماری توجہ کم رہی ہے۔ جب تک
ہم شاعری اور خطابت کے سحر سے پوری طرح آزاد ہو کر نثر
کی حدود کو نہ پہچانیں گے۔ سرسید، حالی اور عبدالحق کے
کارنامہ کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔ اچھی اور معیاری نثر، جس
کی خصوصیات کی نشان دہی سطور بالا میں کی گئی ہے، زبان
کے ارتقاء میں پختگی کی منزل کو ظاہر کرتی ہے، اور اسے
برتنے والے کو بھٹکنے یا اپنے عجز کی پردہ پوشی کی طرف مائل
نہیں ہونے دیتی۔ ہماری زبان پختگی کی اس منزل سے ابھی
بہت دور ہے۔ لیکن کسی حد تک مغربی زبانوں کے اعلیٰ نثری
نمونوں کے سامنے آنے سے اور کسی حد تک نثری اظہار بیان
کے شعور کے اُبھرنے سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے، کہ ہم اُردو
نثر کو نشوونما کی صحیح سمت میں لے جاسکیں گے۔

تمکین کاظمی

دیوانِ غالب کی اوّل شرح وثوقِ صراحت

مولوی محمد عبدالعلی والہ ایک فاضل بزرگ تھے جو نظام کالج حیدرآباد دکن کے پروفیسر تھے موصوف کے والد شاید مدراس سے تشریف لائے تھے مگر ان کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی تھی اور تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی قدیم مدرسہ دار العلوم کے فارغ التحصیل تھے، مدراس یونیورسٹی کے نصاب میں جب دیوان غالب شریک ہوا تو نظام کالج میں بھی اس کا درس شروع ہوا کیونکہ نظام کالج مدراس یونیورسٹی ہی سے ملحق تھا

حضرت والہ نے دیوان غالب کا درس دیتے ہوئے جو لغات حل کئے اور بعض اشعار کی توضیح اور تشریح کی انکو حاشیہ پر لکھنا شروع کر دیا اور یہ ایک مستقل شرح بن گئی تھی یہ شرح والہ نے ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء سنہ ۱۸۹۲ء میں ختم کی ہے جس کی تاریخ والہ کے بھتیجے اور شاگرد مولوی عبدالحی دمعنف مددگار پیمائش و بندوبست حیدرآباد نے کہی ہے

انشراحِ دل بود زیں شرحِ چہل

اتفاق سے اسی سال والہ کا انتقال ہو گیا اور ان کے بعد جناب عبدالواجد نے جو ان کے فرزند تھے اس شرح کو ۱۳۱۳ھ میں رائل سائز کے ۱۹۲ صفحات پر چھپوا دیا۔

وثوق صراحت نہایت ہی معمولی کاغذ پر (جو ان دنوں ڈھائی تین روپے ریم ملتا تھا اور آجکل کے نیوز پرنٹ سے زیادہ خراب تھا) چھپی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بہت ہی کم مقدار میں طبع ہوئی ہے کیونکہ کتاب عام نہ ہو سکی اور نہ اب کہیں نظر آتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ طلبا کے لئے چند سو نسخے چھپوائے گئے ہونگے جو بہت جلد ختم ہو گئے۔

عام طور پر یہ شرح غالب کی اولین شرح خیال کی جاتی ہے مگر مجھے اس کے شرح کہنے ہی میں تامل ہے، اس کو شرح کے بجائے غالب کا ایسا دیوان کہا جا سکتا ہے جس میں لغات حل کئے گئے ہیں، ایران اور ہندوستان سے بیشتر عربی اور فارسی دواوین اور دوسری علمی کتابیں اسی طرح حاشیہ پر حل لغت کر کے شائع کی جاتی تھیں، یہ بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔

اس کتاب پر عبدالواجد نے ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جو نقل کیا جاتا ہے

"ظاہر ہو کہ اس خاکسار کے والد مرحوم جب نظام کالج میں بی، اے، کلاس کو اردو دیوان مرزا غالب دہلوی کا پڑھاتے تھے تو اسکے ان مقامات پر جن کو شرح جانتے تھے اور ایسے مشکلات پر جن کو حل کے قابل سمجھتے تھے شرح اور حل کر دیئے تھے، چاہتے تھے کہ نظر ثانی کے بعد امیر ذی توقیر ارسطوئی زمن قدر دان علم و فن جامع امارت و فضیلت مستغنی عن الالقاب عالیجناب نواب عماد الملک بہادر ناظم تعلیمات ادام اللہ اقبالہ و اجلالہ کے جناب فیض مآب میں اس شرح کو پیش کریں لیکن قضا را مرضِ دق سے بیمار ہو کر اس جہانِ فانی سے عالم باقی کی طرف انتقال کر گئے لہٰذا یہ ارادہ پورا نہ ہوا، اگرچہ اس شرح پر نظر ثانی نہیں کی گئی لیکن نظر اول ہی میں جو کچھ لکھا ہے نہایت غنیمت ہے اور قابل قدر ہے کیونکہ ایک فردِ کامل، سخن گو سخن فہم اور مسلم الثبوت استاد کی تصنیف ہے، اختصار کے ساتھ دقائق کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ مقصود قابل فوت نہ ہو، کہیں تھوڑا کہیں کچھ توضیح ادا کی ہے طالب علم کے ذہن نشین ہو جائے۔ حضرت مرحوم کی یہ عادت تھی کہ شرح بے ضرورت ہرگز طول نہیں دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ شرح مختصر مفید ہونی چاہئے

اب مجھ کو جو مرحوم کے دیوان اور انشا کے چھپوانے سے فرصت ملی تو اس شرح کو بھی صاف لکھکر اور اس کا تاریخی نام وثوق صراحت رکھکر بغرض افادہ چھپوا دیا امید ہے کہ مقبول خاص و عام ہو گی"

علامہ علی حیدر طباطبائی نے جو شرح غالب لکھی ہے وہ اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے مگر علامہ ہمیشہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ شرح دیوان غالب سب سے پہلے میں نے کی ہے اب میں یہ نہیں بتا سکتا کہ علامہ کی شرح ۱۳۱۱ھ سے پہلے لکھی گئی ہے یا بعد مگر گمان غالب یہ ہے کہ ۱۳۱۱ھ کے بعد ہی علامہ نے شرح لکھی

ہوائے سیرِ گل = ہوئے گلگشت قاتل

آئینہ = نمائندہ

بخون غلتیدن = بخون غلتیدن سیرِ گل میں۔

بعض جگہ تو غالب کے شعر سے زیادہ لطف وآلہ کی شرح میں آتا ہے۔

وہاں ہر بت پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی

عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

حلقۂ وہاں ہر ایک بتِ طعنہ جو کا باہم مل کر زنجیرِ رسوائی ہوگیا، اس محاورہ کے موافق ہے۔

حلقہ بر حلقہ جو افزود ہمساں زنجیر ست

لفظ عدم مراعاتِ دہن ہے۔

شعر ۱۲۲ کی شرح ملاحظہ ہو ؎

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

صیقل سے جو خط آئینہ پر پڑتا ہے وہ ہو بہو الف کے مانند ہوتا ہے تو خط مذکور بھی الف ہی کی مشق کر رہا ہے' ہنوز روزِ اول ہے،

مگر چاک گریبان اپنا کہ وہ بھی بصورت الف تھا سینکڑوں شکلیں اس کی بدل گئیں تو معلوم ہوا کہ مشقِ گریباں دری میں آئینہ مبتدی ہے اور حضرت غالب کا گریبان منتہی۔

بعض جگہ وآلہ نے بڑے دور کی خبر لی ہے مثلاً شعر ۱۳۲ ؎

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی ؎ کیوں ترا راہ گذر یاد آیا

تیرا رہگذار جس پر میری زندگی کوئی دن بسر ہوئی تھی کیوں یاد آگیا جس کے یاد آنے سے اب زندگی کا گذرنا مجھ پر سخت دشوار ہوگیا ہے ورنہ زندگی کسی حال گذر ہی جاتی۔

غالب نے کس رہ گذار میں زندگی کے کوئی دن بسر کئے؟ یہ ایک اہم سوال پیدا ہو جاتا ہے مالک رام صاحب اور عرشی صاحب اب اس کے جواب دہ ہیں کہ غالب نے کس سڑک پر کس محلہ میں فٹ پاتھ پر یا بیچ سڑک پر بیٹھ کر زندگی بسر کی ہے!

بعض جگہ خود حضرت وآلہ شعر کو سمجھ نہ سکے چنانچہ ۱۴۱ واں شعر دیکھئے ؎

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

بجلی = یہ کنایہ چمک سے دانتوں کی ہے بات کرنے میں،

بجلی کو یاران لازم ہے یاران تراوش تقریر کو قرار دیا ہے جو پایۂ تشنگی ہے۔ معلوم نہیں شارحین غالب نے اس شعر کا مطلب کیا لیا ہے میں نے جو سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ محبوب نے مسکرا کر بجلی چمکا دی مگر منہ سے کچھ نہ اس پر غالب کہتے ہیں آنکھوں کے آگے بجلی تو کوند گئی مگر اس سے کیا ف کیونکہ اس نے بات نہیں کی اور میں لب تشنۂ تقریر ہی رہا۔ اس طرح غ نے اس شعر میں بات نہ کرنے کی شکایت کی ہے مگر وآلہ نے بجلی کو ایسا کنایہ جو چمکتے دانتوں کی ہے بات کرنے میں"

اس طرح وہ خود شعر سے دور ہو گئے ہیں کیونکہ اگر محبوب با دانت چمکا کر بجلی کوندا تا تو پھر غالب اپنے آپ کو لب تشنۂ تقریر کیوں

شعر ۱۴۹ کی شرح پورے چار سطروں تک پھیل گئی ہے جو وآلہ اختصار کے خلاف ہے ؎

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا

اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

حالانکہ وہ ظلم جو اوروں پر ہوا تھا مجھ پر ہو نہ پایا تھا، تو نے بجلیٔ دنیا وہ ظلم جو میں مطلوب میرا تھا مجھ پر کیا یہ محض دشمنی ٹھہری تو حقیقتاً تو دوست نہ تھا اگر میرا دوست ہوتا تو وہ ستم جو اوروں پر کر رہا ہے مجھ پر کرتا۔ خلاصہ محبوب کا ظلم زیادہ سے زیادہ بھی مرغوب عاشق

شعر ۲۲۹ کی توضیح و تشریح ذرا طویل ہے ؎

نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا

کہ پشتِ چشم سے جس کی نہ ہووے مہر عنواں پر

اقلیم الفت = اقلیم عاشقی طومار ناز = طومار ناز معشوقی۔ پشت کنایہ تغافل و اغماض و چشم پوشی سے ہے جو لازم ناز معشوقی ہے کی تشبیہ اس حالت میں مہر سے ظاہر ہے' دراصل یہ محاورہ فارسی ہیں پشت چشم دیدن یعنی بے توجہی دیکھنی بینش کشمیری ؎

غیر پشت چشم دیدن حاصلی بینش نداشت

ہمچو ابرو بر سر ہر دیدہ منزل داشتم

ہے اور جو طلبہ صرف [illegible] سمجھتے ہیں کہ [illegible]
کے ساتھ ایک دیوان سمجھتے ہیں ان کے لئے ان کا یہ ارشاد کافی ہے سب سے پہلے
غالب کی شرح کی ہے صحیح ہے اس سے مراد وثوق صراحت کی اہمیت کو
گھٹانا اور علامہ طباطبائی کی شرح کو بڑھانا نہیں ہے میں صرف واقعہ عرض
کر رہا ہوں اب وثوقِ صراحت سے متعلق صراحت پیش کرتا ہوں۔

ہر شعر پر سلسلہ نمبر لکھا گیا ہے اور کل ۱۱۳۲ اشعار اس کتاب میں
موجود ہیں، ان کے بعد بعض قصاید کے ۱۷، اشعار بھی لئے گئے ہیں اس طرح
۱۱۴۸ اشعار کامل اس کتاب میں ہے۔

مطلع دیوان یا پہلی غزل کے پہلے شعر کی شرح وآلہ نے یوں کی ہے

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

پیرہن کاغذی = فریادیوں کا لباس جو قدیم میں دستور تھا یہ کنایہ
ہے عجز و بیچارگی و تظلم و زاری سے

دوسرے شعر کی شرح خود قابل شرح ہے۔

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

شوق = شوقِ عاشق جو شایقِ قتل ہے۔

تیسرے شعر کی شرح نسبتاً ذرا وضاحت کے ساتھ ہے مگر پھر بھی ڈیڑھ
سطر ہی ہے ؎

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

پیچ و تاب دود غم داغ سویدا نقش پذیر ہوا ہے تو ظاہر ہوا کہ داغ
سوختہ کا سرمایہ دود تھا جیسے دودِ فتیلۂ چراغ۔

چوتھا شعر بھی یوں ہی شرح ہوا ہے ؎

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

یعنی فرہاد اگر خمارِ رسم و قیود کا سرگشتہ نہ ہوتا تو بغیر ضرب تیشہ کے مر جاتا
یہ لئے کے نقصان عشق کی علامت ہے۔

پانچویں شعر میں تو وآلہ نے اختصار کی حد کر دی ہے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

زیست = زندگی جاوید۔ درد کی دوا پائی = درد محرومی کی دوا
درد بے دوا پایا = عشق وہ درد ہے جس کی دوا نہیں۔

چھٹے ساتویں اور آٹھویں شعر کی شرح اشاروں میں کی گئی ہے

دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

رقیب = دشمن

گیارہویں شعر کی شرح البتہ پورے دو سطر تک کا تخمینہ ہے

ہے نو آموز فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ کام بھی آساں نکلا

یعنی اپنی ہمت دشوار پسند نے باآنکہ نو آموز فنا ہے آسانی سے مرحلہ
کو طے کیا۔ یہ کام آسانی سے سرانجام پانا بڑی مشکل کی بات ہے کہ ہرا
سے ہو نہیں سکتا۔

کہیں موڈ میں آتے ہیں تو کسی استاد کا شعر بھی شرح میں پڑھ دیتے تھا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

رہگذر مذکور میں جو پہلے نزاکت موقد کے سبب جلوۂ گل باعث گرد کھا
اب عاشقی میں اس دل و جگر کا یہ حال ہے، استاد فیضی ؎

پامال دو صد قافلہ خون است درین راہ
آن دیدہ کہ از سایۂ مژگان گلہ دارد

درین راہ = اے راہِ عشق،

سولہویں شعر کو تو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے ؎

ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

[illegible] پشت چشم [illegible] گردن و تنگ کردن نازو غمازہ
[illegible] آنکھ [illegible] نیز بے دماغی و رنجش ظاہر کرنی ناز و غرور
سے [illegible] طغرا ہے

چناں پشت چشمی تنگ کردہ است
کہ رطل گراں را سبک کردہ است

اب تک تو آپنے والہ کی شرح و تلمیح و تشریح ملاحظہ کی
اب انکی نقادی اور استادی بھی ملاحظہ کیجئے۔ چونکہ وہ خود بڑے
شاعر تھے اس لئے غالب کو اصلاح بھی دیدیتے ہیں۔
شعر ۲۵۵ نقل کرکے مصرع ثانی کو اصلاح یوں دی ہے ؎

ابرو سے کیا اس نگہ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر مگر اسکی ہے کماں اور

مصرع ثانی یوں ہو تو لاثانی ہوگا

مصرع پر اس سے یہ تیر ادا کی ہو کماں اور

اب یہ آپ غور کرلیں کہ والہ نے کیسی اصلاح دی ہے بہر حال جانے استاد غالبیت!
شعر ۲۶۳ جو بالکل فارسی ہی فارسی ہے صرف مصرع ثانی میں
دو لفظ باندھے ہے اور پر اردو آئے ہیں۔ اس کی شرح بھی اسی زبان میں
کی ہے بلکہ شعر سے شرح کی فارسیت کچھ بڑھا ہی دی ہے پڑھئے اور سر
دھنئے ؎

بر نگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بے تابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال اک تپیدن پر

نیرنگ یعنی شعبدۂ بیتابی بمقدار ہزار آئینۂ دل ہر رنگ کاغذ آتش
زدہ یک بال تپش پر باندھے ہے، بال تپش تمثیل کاغذ آتش زدہ اور
شرر افشانی کاغذ مذکور تمثیل ہزار آئینۂ دل ہے،
شعر ۲۴۴ کی تشریح میں مرحبا کی توضیح بھی کردی ہے ؎

جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

کہیں کو ۔ کسی طرف کو ۔ خیر باد خدا حافظ یہ کلمۂ رخصت ہے،
مرحبا کی اصل یہ ہے رحبت اللہ ارض مرحبا، دوست اپنے
گھر آئے تو کہتے ہیں یعنی ہمارا گھر کشادہ ہے تمہارے لئے۔

شعر ۲۲۲ نقل کرکے بجائے تشریح و توضیح کے مولوی جی نے [illegible]
گھبراہٹ سے نعوذ تحریر فرمادی ہے ؎

زندگی اپنی جب اس طور سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

نعوذ باللہ من ھفوات الشعراء،
والہ نے اکثر مصرعوں کو بدلنے کا مشورہ دیا ہے اور اپنی
میں اصلاح دی ہے۔ چنانچہ شعر ۸۲ ملاحظہ ہو ؎

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

سیہ خانہ = خیمۂ پلاس سیاہ جو مسکن لیلیٰ تھا۔ شمع سیہ خانہ لیلیٰ
یعنی رونق افروز خانہ لیلیٰ، پہلا مصرع ایسا ہوتا تو اچھا تھا [illegible]

قیس دلسوختہ ہے چشم و چراغ صحرا

بعض جگہ والہ نے دراز نفسی بھی کی ہے چنانچہ شعر ۸۶۶ کی شرح ایسی [illegible]

تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجئے تو جا میری بھی خالی ہے

اپنی عالی دماغی سے تغافل احباب کو بزم عشرت میں پسند کرتا ہوں
لوگ مجھ سے پہلو تہی کریں تو میری جائے بھی خالی ہے، پہلو تہی میں جائے
خالی ہونا ایک بدیہی نیا مضمون پر لطف ہے پس تغافل یاران اپنا
کا محل ٹھہرا ایسے تغافل کا کیا مضائقہ۔ جائے کسی کی بزم میں خالی ہونا کنا[یہ]
اس سے ہے کہ اہل بزم اس کے منتظر ہیں۔ جائے فلانی پیدا و سبز و خالی
ہر سہ مقام یاد شخصی گویند۔ بہار عجم،
والہ چونکہ مولوی اور بڑے متقی اور پارسا آدمی تھے اس [لئے]
شرح میں بھی اپنی مولویت اور اپنے تقوی سے کام لیا ہے شعر ۱۰۹۶ [اس کا]
اس کی گواہ ہے ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

باوجود گناہ کرنے کی حسرت کے ہم نے خوف الٰہی سے بہترے گناہ نہ
کئے اس کی بھی جزا ہمیں ملے،
یہ خوف الٰہی کا عکس اور والہ کا اپنا تخیل ہے حالانکہ غالب کے [illegible]

معلق نہ تھا مگر مولوی ... پرخود سرا یا بحث تھے ان کے
ن کا ذہن خوف الٰہی کی طرف رجوع ہو گیا ہے،
جگہ والہ بہت حد بڑھ گئے ہیں چنانچہ شعر ...

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری خوشامد سے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

جب اٹھا وہیں اٹھ کے میں نے قدم پاسباں کے پکڑے کہ
اہر کر
اس شعر میں والہ نے (مصرع اول میں) " خوشامد سے " لفظ
کو نہ صرف بدل دیا ہے بلکہ تشریح بھی عجیب و غریب کی ہے
ہوتا ہے کہ والہ کو دیوان غالب کا جو نسخہ ملا ہے وہ غلط
ائے شامت آئی کے " خوشامد سے " لکھا ہوا تھا اسی کے نتائج
ی نقل کر دیا اور پھر شرح میں بھی بہک گئے۔
آخر میں دو تین مصرعے بھی بدلے گئے ہیں اور بڑی دیدہ دلیری
ح دی ہے چنانچہ قصیدہ کے ایک شعر سے

غم شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگین

تبدیل مصرع ثانی از والہ غفرلہ۔ ؎

کہ رہیں صورت مقتل مری آنکھیں رنگین یا ؎
کہ رہیں صورت مشہد مری آنکھیں رنگین

خری شعر سے

ح کاہے دور مجکو نقد ... چرخ نیلی جب سے گردش دام
مصرع اول از والہ غفرلہ ؎ نقد ہے مجکو اس قدح کا دور
والہ نے بڑی مزے دار شرح لکھی ہے اور تبدیلیوں کو بڑی
ہم پہنچائی ہے۔
حیدرآباد میں ایک اور شرح ایسی ہی مولوی جمال الدین
نے لکھی تھی جو بالکل اسی ڈھب کی تھی مگر چھپ شائع نہ ہو سکی
کا کچھ حصہ رسالہ ترقی میں طبع ہوا تھا۔ معلوم نہیں اس کا
لیا ہوا۔
چند سال ہوئے ایک شرح نور اللہ محمد نوری نے بھی چھپوائی
ہے جو اس وقت میرے پیش نظر نہیں اور سال گزشتہ ایک صاحب نے
ایک ضخیم شرح غالب چھپوائی تھی جو میرے دیکھنے میں نہیں آئی مگر آجکل
حیدرآباد میں فروخت ہو رہی ہے اتفاق دیکھئے یہ چاروں شارحین محکمۂ
تعلیمات ہی سے متعلق تھے۔
مولوی عبدالعلی والہ اور مولوی جمال الدین نوری پروفیسر تھے
نور اللہ محمد نوری مدرس ہیں اور چوتھے شارح بھی کسی مدرسہ کے مدرس ہی تھے
اگر مولانا طباطبائی کی شرح کو بھی حیدرآباد کی پیداوار سمجھا جائے
تو وہ بھی شرح لکھتے وقت نظام کالج میں پروفیسر ہی تھے غرض ان اساتذہ
نے خوب داد تشریح و توضیح دی ہے، غالب ہوتے تو

شعر م بمدرسہ کے برد

پوچھتے، کیونکہ ہر شخص نے اپج دکھائی ہے
پروفیسر ضیاء بدایونی (علیگڈھ) نے اپنے ایک عنایت نامے میں
غالب کی شرحوں کی تعداد بتائی تھی جو اس وقت مجھے یاد نہیں رہی مگر ہے
خاصی تعداد، اب کوئی اللہ کا بندہ غالب کی شرحوں پر مستقل کام کرے
تو بہتر ہوگا! وثوق صراحت میں مستعار دینے کو تیار ہوں بلکہ حیدرآباد کی
دوسری شرحیں بھی فراہم کر سکوں گا۔
آجکل نثار احمد فاروقی صاحب غالب نامے بنے ہوئے ہیں اگر وہی
" غالب کی شرحوں " پر کام کریں تو بہتر ہوگا کیونکہ بقول رشید احمد
صاحب کے ؎ شامت اعمال ما صورت غالب گرفت!
والا معاملہ تو ہے ہی۔

بقیہ صفحہ ۱۸۳ (کھڑکی)

قریب آتا ہے)
باپ۔ ڈاکٹر صاحب کیا تم میری رضیہ کو واپس نہیں لا سکتے !!
ڈاکٹر۔ صبر کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔
باپ۔ نہیں تم واپس آ جاؤ رضیہ!! واپس آ جاؤ۔ میں یہ کھڑکی
کھولے دیتا ہوں۔ رضیہ میں کھڑکی کھول دیتا ہوں (زور کا
سے کھڑکی کا دروازہ کھول دیتا ہے ہوا کا زور کا جھونکا آتا
ہے۔ اور رضیہ کے باپ اسد اکبر کے بال ہوا میں اڑنے
لگتے ہیں۔۔۔ اور پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)
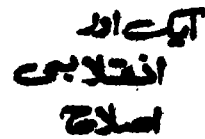
کاپی رائٹ

یوسف بخاری (تلخیص و ترجمہ)

ضیاء الدین احمد برنی

یہ بات کہی جاتی ہے کہ فرد کی انفرادیت یا شخص کی ذاتی ملکیت کی جو شدید ترین محسوس ہوتی ہے تو وہ اس کے دماغ کی اختراع یا تخلیق سے فکر کاپی رائٹ کے سلسلے میں۔ جو جدید ترین تصورات پیدا ہو چکے ہیں وہ زیادہ پرانے نہیں بلکہ حال ہی کے تقاضوں اور حالات کا نتیجہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کلاسیکی، یونانی و رومی تہذیبوں کے ادب میں کاپی رائٹ کے موجودہ تصورات کو تلاش کرنا بے سود ہوگا۔ اس زمانے میں (بلکہ یورپ کے عہد ما بعد میں بھی) مصنف کا سب سے بڑا صلہ داد و تحسین یا شہرت ہی تھا۔ مصنف اپنے کام کی دُھن میں لگا رہتا تھا۔ کسی رائلٹی (حق تصنیف) کی خاطر نہیں بلکہ محض علم دوست صاحب ثروت اصحاب کی قدردانی اور سرپرستی کے باعث اس میں شک نہیں کہ ادب کی بھی ایک مارکیٹ ضرور تھی۔ مثلاً یہ کہ شعری ادب کو نقل کرنے کا کام تھا اور یہ زیادہ تر غلام کیا کرتے تھے جو ناشرین کے ملازم ہوتے تھے مگر مصنف مسودہ بالکلیہ فروخت کر ڈالتا تھا۔ اسے نقول یا ان کی تعداد سے کوئی سروکار نہیں رہتا تھا اور نہ ان کی خرید و فروخت سے کچھ مطلب GAIUS جائس اور JUSTINIAN جسٹینین ادارات میں ہمیں کچھ ایسے حوالے بھی ملتے ہیں جن سے بادی النظر میں ہم یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ کاپی رائٹ کا کچھ کچھ آغاز ہو چکا تھا مگر جب بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ زیادہ تر کینوس کے نقش کے مسائل سے متعلق ہیں یعنی یہ کہ جب کینوس پر تصویر بنی ہوئی ہو تو اس کا حقیقی مالک کون تھا اور پھر کون ہو گیا وغیرہ یا پھر کسی لوح کی بابت جس پر کوئی رزمیہ رقم کی گئی تھی۔ بالفاظ دیگر ان حوالہ جات میں صرف کسی مادی املاک کا ذکر ہے۔ اسے نقل یا شائع کرنے یا تقسیم نقول وغیرہ کی کوئی تصویر مراد نہیں ہے۔ اغلب یہ ہے کہ بے اجازت، نقول کو بُری نظر سے دیکھا جاتا تھا مگر یہ بھی زیادہ تر محض ایک رسمی سی بات تھی یعنی یہ تکلف کہ اگر بلا اجازت کسی تاجر کتب نے نقول تیار کر لیں تو دوسرے بیوپاری اس کی اس حرکت کو بہت بُرا سمجھیں گے اور وہ کاروباری لحاظ سے نامعقول آدمی سمجھا جائے گا، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

عیسویت کے ابتدائی دور میں ادب کا بڑا حصہ سیدھا ان طبقوں تک پہنچ جاتا تھا جو علم و ادب سے کچھ ربط رکھتے تھے اور یہ طبقات زیادہ تر عیسائی خانقاہوں کے پڑھے لکھے علماء و فقرا کا گروہ تھا۔ اس کے علاوہ علم و ادب یا ان کے سماج کے کسی اور طبقے میں شاید ہی باریابی حاصل ہو۔ یہی وجہ تھی کہ بعض بعض (عیسائی) خانقاہوں کی لائبریریوں کی شہرت دور دور تک پہنچ جاتی تھی۔ اب جن خانقاہوں میں ذخیرۂ علم و ادب معقول نہ ہوتا تو وہ اپنی اس محرومی کو ختم کرنے کے لئے نقول کی جلد جلد کرنے لگتے۔ اور چونکہ خانقاہی فقرا اس کا ذوق رکھتے تھے اور انہیں کو نقول کتب کی جستجو ہوتی تھی۔ اس لئے دوسری خانقاہوں کے خزائن سے استفادے کی کوشش ہوتی رہتی تھی کچھ فیس کے یا بطریق تبادلہ غرض ایسی ہی کوئی سہولت پیدا کر کے بعض بعض رسائل و صحائف کے نقل کرنے کی اجازت حاصل کر لی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے بھی اس کا حق مصنف کے مسئلے سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ صرف مسودہ یا مخطوطے کی مادی و محسوس ملکیت کی بحث تھی اور جس کسی کے بھی پاس ہوتا تھا وہ اس سے نفع حاصل کرتا تھا۔ مگر اس عہد میں ہم کو اس اصول (حق تصنیف) کے سلسلے میں دائرہ کچھ وسیع ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ یعنی اگر کوئی کتاب ایسی لکھی گئی یا وضع ہوئی جس کا کسی اصل مخطوطے سے چنداں تعلق نہ ہو بلکہ اس سے ملتا جلتا مواد پا لینا اور ادارتی کام ہو، حواشی کا ذخیرہ ہو تو اس کی بحث جدا ہو جاتی تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ نقل نویسی میں کئی کئی اسلوب ملتے تھے اور اکثر اغلاط و اسقام ان مسودات میں در آتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کی تالیف و ترتیب اور حاشیہ نگاری وغیرہ کا کام بہت گنجلک یا غلط سلط ہو جایا کرتا تھا۔ اکثر مخطوطات میں صحت نادر ہوتی تھی۔ نقول کے ان

[illegible] سکتے تھے جو ملک [illegible]
[illegible] کے شخص جو کرانا چاہتا تھا اور اس کی کچھ فیس بھی ادا کرنی پڑتی
[illegible] کسی دوسرے رکن کے نام پر درج شدہ کوئی کتاب چھاپ
[illegible] پیچھا سی ڈیڑھ سال دیا جاتا تھا مطلب یہ کہ بڑا سخت کنٹرول تھا
اس طور ایک طویل مدت تک پبلشروں کو خطیر فائدہ پہنچتا رہا لیکن انجام کار
آزادیٔ طباعت کا مطالبہ بھی زور پکڑتا گیا اور یہ تقاضا بھی کہ یہ مراعات
اور اجارہ داریاں ختم ہونی چاہئیں۔ اسی طرح ساتھ یہ آواز بھی بلند ہوتی
رہی کہ اہل قلم کے حقوق کی بھی خاطر خواہ حفاظت ہونی چاہیئے۔ الغرض اس
طرح انگلستان میں سب سے پہلا کاپی رائٹ ایکٹ وجود میں آیا۔ اس میں
اہل قلم کے حقوق کو تسلیم کیا گیا اور طبع زاد تصانیف کو پبلشروں کے تجارتی
حق سے الگ ایک متفرق چیز کہ کر محسوس اور تسلیم کئے جانے لگا۔ اس
قانون کا عنوان تھا آئین ملک بعہد ملکہ این ANNE شمارہ (۸) سی (۱۹)
اس کے ابتدائیہ میں یہ الفاظ ملتے ہیں:۔

> "فروغ علم کی خاطر حق کاپی ("کاپی" سے مراد مسودہ تھا نہ کہ حق نقل
> مسودہ) محفوظ کرنے کے لئے ایک قانون تاکہ مطبوعہ کتب کے
> مصنفوں یا ایسی نقلوں (مسودہ) کے خریدنے والوں کا وہ حق
> محفوظ کیا جائے جس کی مدت یا میعادیں مذکور ہوئی ہوں۔"

دوسرے ممالک نے بھی اس وضع کے قوانین وضع کئے اور کاپی رائٹ
کے لئے قواعد بنائے جن میں جزئیات کا کتنا ہی فرق ہو یہ بات ضرور شامل ہوتی تھی
کہ مصنف کے اس حق کو مسلمہ مانا گیا کہ اس نے ابتداءً جو تخلیق بحالت مسودہ تیار
کی تھی اس کی نقول شائع کرنے کا حق اس کی ذات میں مرکوز ہے جس کی وہ بابت
خواہ بطور خود اور حسب منشا کے خود اجازت دے سکتا ہے۔ اولین تصور کہ
حق تصنیف ایسی چیز ہے جیسے جائداد منقولہ یا غیر منقولہ جس کا حق ملکیت دائمی
ہو سکتا ہے۔ یہ تصور آگے چل کر محدود ہوتا چلا گیا اور پہلے بنیادی تصور سے دور
جا پڑا۔ اب یہ تصور جنم لے رہا تھا کہ یہ حق علی الدوام نہیں ہوتا بلکہ اس کی
کوئی میعاد ہوتی ہے اور یہ مدت گزر جانے کے بعد یہ حق ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن
جن ممالک اور ریاستوں نے اس حق کو قانوناً تسلیم کیا بدقسمتی سے یہ حالات
ایک دوسرے پہلو سے اس بات کا موجب بنے کہ حق تصنیف کو اس وقت
محدود کر دیا جائے اور یہ نتیجہ ہے اپنی [illegible] کا (یعنی مراعات اور اجارہ داری)

کاپی رائٹ کے تحفظ کے [illegible]

بین الاقوامی کاپی رائٹ:۔

ادب اور فنون کی اصناف قدرتاً بڑی حد تک بین الاقوامی
اپیل کی حامل ہوتی ہیں۔ مگر ہر ملک کے قوانین اپنے باشندوں کے حقوق
زیادہ اور ترجیحاً متعلق رہتے ہیں اور ایسا ہوتا آ رہا ہے۔ بین الاقوا[illegible]
مانگ کے باعث اشاعتی قزاقی بھی عام ہو رہی ہے خاص طور پر ایسے
ملکوں کے مابین جن کی کوئی زبان مشترک ہو جیسے بلجیم اور فرانس لیکن [illegible]
خیال حکومتوں نے اس قزاقی کو روکنے کے لئے قوانین بھی بنائے ہیں [illegible]
ایسا کیا جانا بالکل فطری امر تھا۔ اس تحفظ کے لئے متعلقہ ممالک کے
مابین معاہدات کا سلسلہ شروع کیا گیا مگر ۱۸۸۵ء سے قبل کوئی بڑ[ا]
بین الاقوامی اجتماع ان باتوں کو باقاعدہ جانچنے کے لئے منعقد نہ ہوا
بالآخر ۱۸۸۵ میں یورپ میں بڑا اجتماع ہوا جس میں اکثر ممالک شریک
ہوئے اور ایک انٹرنیشنل کاپی رائٹ یونین وجود میں آگئی۔ اس
اشتراک میں قریب قریب یورپ کے تمام ممالک شامل ہیں (سوائے
سوویٹ روس اور اس کے حواری ملکوں کے)۔ برن کنونشن "(معاہدہ
برن) کے وضع کنندگان کو ایک بڑی دقت یہ پیش آئی کہ حقوق تصنیف
سے متعلق ایک کے قوانین تحفظ دوسرے ملک کے ایسے قوانین سے کلی
مختلف ہوتے تھے اور کوئی بین الاقوامی یونین اس وقت تک کامیاب
نتائج پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ قوانین میں کچھ نہ کچھ یکسانیت اور
ہم آہنگی موجود نہ ہو۔ مگر اسے بھی ایک امر واقعہ سمجھئے کہ اگر مصنفین
پبلشرز بین الاقوامی وکلاء ہوتے تو یہ یونین کام نہیں کر سکتی تھی۔
معاہدہ برن ۱۸۸۶ء کا بنیادی اصول یہ تھا کہ کسی رکن ملک کا
اہل قلم ہوں گے انکو دوسرے ملک میں بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو وہ ملک
اپنی رعایا کو دیتا ہوگا اور یہ کہ حقوق بلا رسمی تکلفات عطا ہوں گے۔ اسوا
رسمی باتوں کے جو اشاعت اول والے ملک میں کسی مصنف پر قانوناً عائد ہوتی [illegible]
ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ کسی ملک میں کاپی رائٹ کی اس مقررہ میعاد [illegible]
نہیں کیا جا سکتا تھا جو مدت اصل ملک میں طے پا چکی ہے۔ یہ شرط لازم تھی [illegible]
ممالک دوسروں کی بہ نسبت اس باب میں زیادہ فیاض ثابت ہوئے
اسکے علاوہ اور بھی کچھ اصول طے کئے گئے جو بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوئے [illegible]

مد ایک بین الاقوامی ضابطہ کا رستہ کرتا تھا بعد ازاں ترمیمات اور اضافہ
ن ضروری سمجھا گیا چنانچہ وہ ہوتا رہا اور اب تک عمل میں آرہا ہے۔ اس میثاق
ی بار نظر ثانی کی گئی۔ ایک اضافی قانون پیرس ۱۸۹۶ء، میثاق برلن ۱۹۰۸ء،
اق روم ۱۹۲۸ء اور آخر کار میثاق برسلز ۱۹۴۸ء (اس میں نئے نئے ممالک اس
اق کے رکن بنتے جاتے ہیں اور یہ بھی ہوا ہے کہ بہت سے نئے اور پرانے رکن
لک نے بعض ترمیم (تجاویز) کو تسلیم بھی نہیں کیا ہے بایں ہمہ وہ میثاق کے دستخط
رہ ہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں اگر تفصیل مطلوب ہو تو یہ جاننا انتہائی ضروری ہے کہ ان
ف قوانین کی کن کن دفعات کو کن کن ملکوں نے تسلیم کر رکھا ہے اور کن کن
ں نے نہیں کر رکھا ہے۔ اس کا معلوم کرنا زیادہ دشوار بات نہیں ہے جیسا کہ
ی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ کیونکہ LE DROIT D'AUTEUR (بین الاقوامی
ن کا سرکاری ماہوار ترجمان) کے ہر سال جنوری کے شمارے میں اس بات کی
ی تفصیل نہایت عمدگی کے ساتھ جدول وار چھاپ دی جاتی ہے اور اسے ایک
دیکھنے سے پوری کیفیت کا علم ہو جاتا ہے اہل قلم کے لئے یہ چیز کچھ بہت زیادہ
مفاد کی نہیں ہوتی ماسوا مخصوص دائرہ کار کے جس میں تراجم سب سے اہم
ہ ہیں۔

میثاق برن میں یہ طے کیا گیا تھا کہ یونین کے ممالک میں حقوق
ہ صرف دس سال تک جاری رہیں گے اور یہ مدت اس وقت سے شمار ہوگی
تاریخ سے کہ اشاعت کے اصل ملک میں کوئی چیز شائع ہو۔ اس میں
افی قانون پیرس کے ذریعے ترمیم کر دی گئی۔ ترمیم یہ کی گئی کہ اگر کسی دوسرے
میں کوئی مصنف اپنی تخلیق کے حق ترجمہ کی حفاظت چاہتا ہے اور وہاں کوئی
ہ اصل زبان میں اشاعت کے دس سال کے اندر اندر چھپ گیا ہو تو حق ترجمہ
رائٹ کی پوری مدت کے لئے جائز اور جاری سمجھا جائے گا اور جن ملکوں میں
جمہ شائع نہ ہوا ہو اور مذکورہ دس سال کی مدت ختم ہو چکی ہو تو یہ حق ساقط
ہو جائے گا۔

آخر الامر میثاق روم میں یہ طے کیا گیا کہ حق ترجمہ بھی کاپی رائٹ کی پوری
مدت پر محیط اور جاری سمجھا جائے گا خواہ اس کا استعمال کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو
اگر کوئی مصنف یہ چاہتا ہے کہ یونین کے کسی مخصوص ملک میں اس کے حقوق تراجم
ہیں اور کیا نہیں تو اسے چاہیے کہ وہ پہلے اس بات کی تصدیق و توثیق کر لے کہ اس ملک
نے ان تینوں قوانین میں سے کس قانون کو تسلیم و منظور کر رکھا ہے اور کس کو نہیں۔
بین الاقوامی [illegible]

مگر تمام ممالک اس کے لئے کوشاں ضرور ہیں۔ روس تو اس سلسلے میں کوئی تعاون
کا رجحان ظاہر ہی نہیں کرتا مگر یونین تک کے باہر دوسرا بڑا ملک امریکہ ہے لیکن
واشنگٹن میں یونیسکو کی جو کانفرنس ۱۹۵۰ء میں منعقد ہوئی تھی ایک ریزولیشن
منظور کر چکی ہے۔ اگر امریکی کانگریس نے اس سلسلے میں ضروری قانون پاس کر دیا
تو ایک نئی بین الاقوامی یونین وجود میں آجائے گی جس کے اصول کافی سادہ ہوں
گے اور قریب قریب ساری مہذب دنیا اس دائرے میں سمٹ آئے گی۔

برطانیہ — یہاں ۱۹۱۱ء میں کاپی رائٹ ایکٹ منظور کیا گیا (اور اس پر نظر
ثانی زیر غور ہے) اس میں برطانیہ کے لئے ضابطہ حقوق مصنفین درج ہے۔ اس
کی دفعہ نمبر (۱) میں صاف لکھا گیا ہے کہ اس مملکت میں اور کسی نوع کا
کاپی رائٹ نہیں پایا جاتا۔ دفعہ نمبر ۱ کی عبارت یوں ہے۔

"اس ایکٹ کے ضوابط کے تحت کاپی رائٹ کا اطلاق ملک
معظم کی جملہ مستعمرات پر ہوگا اور یہ قانون ان سب پر حاوی سمجھا
جائے گا۔ اور ان شرائط کے مطابق جو یہاں مندرج ہیں اس کا
اطلاق اچھی تخلیق، تخلیق ادب، ڈرامہ موسیقی یا آرٹ کے نمونے پر
ہوگا۔ اگر

(۱) مطبوعہ تخلیق پہلی مرتبہ ملک معظم کی مستعمرات میں چھپی ہو۔
(۲) غیر مطبوعہ تخلیق کی صورت میں مصنف ملک معظم کی رعایا ہو
مذکورہ مستعمرات میں سے کسی میں رہتا بستا ہو جب کہ تخلیق
زیر تیاری تھی۔ اس کا اطلاق مذکورہ بالا قواعد کے ماتحت
ہی ہوگا۔ اس کے سوا اور تخلیقات پر نہیں۔ ماسوا اس کے
کہ اس ایکٹ کا نفاذ ان کو بھی حاوی کر لے اور قانون تحفظ
مہیا کر دے جس کے لئے احکام۔ بہ اجلاس کونسل جاری
ہونے ضروری ہیں۔ یعنی خود مختار مستعمرات اور ممالک غیر میں
اس قانون کا نفاذ نہیں ہوگا۔"

تو بات یہ طے ہوئی کہ کسی تخلیق کا طبع زاد ہونا ضروری ہے
اور اسے یہاں یوں سمجھئے کہ برطانوی سلطنت کے دائرے میں شائع
ہونا چاہیئے۔ اور اگر غیر مطبوعہ ہو تو اسے برطانوی رعایا کے کسی فرد
نے بنایا ہو یا اگر وہ برطانوی رعایا نہیں ہے تو بناتے وقت وہ علاقہ
سلطنت برطانیہ میں مقیم ضرور ہو۔ لفظ "بنانا" کا استعمال کچھ عجیب سا ہے

شکل میں نے آتا" مراد ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ امر مسلمہ ہے کہ محض خیالات و تصورات کو کاپی رائٹ کے لئے ضروری و کافی مواد نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب تک یہ تخیلات و تصورات ضبط تحریر میں نہ لائے جائیں یا کسی اور مستقل شکل میں انھیں پیش نہ کیا جائے۔ اس وقت تک کاپی رائٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور پھر بھی قانونی تحفظ خیالات کو نہیں دیا جاتا بلکہ ان مخصوص اور معین الفاظ اور اسلوب یا "فارم" کو دیا جاتا ہے۔ جس میں ان خیالات و اسلوب نے شرح کا "قالب پایا ہے

کاپی رائٹ کے لئے کسی خاص ادبی و فنی صلاحیت کا پایا جانا بھی ضروری نہیں۔ بس شرط یہی ہے کہ تخلیق اچھی یعنی طبع زاد ہو۔ برطانیہ میں برخلاف دیگر یورپی ممالک کے بے جوڑ رسمی تکلفات قواعد کی یہاں رائج نہیں ہاں کاپی رائٹ کا اطلاق ٹھیک اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کوئی تخلیق بن جائے۔

چوں کہ اسٹیج، سینما، گراموفون اور نشریات کی ترقی نے کاپی رائٹ کے دائرے کو وسیع تر بنانا لازم کر دیا تھا۔ اس لئے قانون کی دفعہ ۱ شق (۲) میں یہ توسیع مفہوم اس طرح شامل کی گئی ہے کہ کاپی رائٹ سے مراد وہ حق بھی ہے جو کسی تخلیق کو کلیتہً یا جزواً کسی مادی شکل میں خواہ وہ کیسی بھی ہو پیش کیا جاتا ہے۔ یا بکرار اشاعت و اظہار ہو یا اسے سامعین یا ناظرین کے سننے یا دیکھنے یا دونوں کے لئے پیش کیا جائے یا اگر لیکچر ہو تو اسے کلیتہً یا جزواً مجمع عام میں ادا کیا جائے۔

اس ضمن میں اور اس مفہوم میں ترجمہ کا حق بھی شامل کیا گیا ہے ناول کو ڈرامہ کی شکل دینا یا ان دونوں کی مابدل صورت اختیار کرنا۔ ریکارڈ بنانا یا فلم بنانا، یا کسی اور مشینی و آلاتی وسیلے سے ان تخلیق کو پیش کرنا ادا کرنا بھی اس دفعہ کے دائرے میں تسلیم کیا جا چکا ہے۔

لیکن ریسرچ یعنی علمی و فنی تحقیق اور جستجوئے فکر و خیال کی خاطر عالمانہ تحقیق و تدقیق کی راہوں کو کاپی رائٹ کے ذریعہ مسدود نہیں کیا گیا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص بموجب دفعہ ۲ (۱) اپنے تخلیقی کام میں کسی اور تخلیقی کام سے کچھ حصہ شامل کرے تو اس کو قابل درگذر سمجھا جائے گا بشرطیکہ صاحب تخلیق اس بات کو واضح کرے کہ اس نے کیا اور کس غرض سے کیا ہے اور یہ اس کی نیت صاف ہے یعنی شخصی مطالعہ و تحقیق، ریسرچ، تبصرہ و نقد جائزہ یا اخباری خلاصہ نویسی کی خاطر کیا گیا ہے بعض اور مستثنیات بھی ہیں جیسا کہ ذیل میں درج ہے اور دفعہ ۲ (۴) میں اس کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

"کسی مجموعہ میں کسی تخلیق کا شامل کر کے شائع کیا جانا جس میں زیادہ تر غیر کاپی شدہ مواد ہو اور جائز طور پر محض مدرسوں میں استعمال کے لئے اسے مرتب کیا گیا ہو۔۔۔ یا مختصر ٹکڑے، بند، پیرے وغیرہ ایسی تخلیقات سے جو چھپ چکی ہیں مگر مدرسوں کے لئے فی الحقیقت شائع نہیں کی گئی تھیں مگر شرط یہ ہے کہ پانچ سال کی مدت میں کوئی ایک ناشر کسی ایک مصنف کی تخلیقات سے صرف دو پارے ہی اخذ کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں اور یہ کہ ہر پارے کا جو شامل کیا گیا ہے۔ اصل ماخذ بتایا جائیگا اور اس کا حوالہ ضبط تحریر میں لایا جائے گا۔"

برطانیہ میں اور یورپ کے اکثر ملکوں میں، کاپی رائٹ کی مدت مصنف کی عمر مع پچاس سال بعد وفات تسلیم کی گئی ہے لیکن اگر مصنف کو متوفی ہوئے ۲۵ سال گذر چکے ہوں تو اس کی تخلیق کو کوئی بھی شخص، فروخت کے لئے شائع کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ قانون کی بعض پابندیوں کو پورا کرے (دفعہ ۳) اور کاپی رائٹ کے مالک کو دس فیصد رائیلٹی بھی ادا کر دے۔ (یہ لازمی لائسنس یا اجازت صرف اس تخلیق کے لئے ہے۔ جس کو فروخت کے لئے دوبارہ منظر عام پر لایا جانا تسلیم کیا گیا ہے یہ اداکاری کی کسی بھی شکل یا پیش کش یا اسی طرح کی کسی فروخت کے لئے نہیں مانا گیا ہے۔ اگر کوئی تخلیق مشترکہ کام کی حیثیت رکھتی تو کاپی رائٹ کا حق اس مصنف کی مدت حیات اور پچاس سال بعد وفات مانی جائیگی جس کا پہلے انتقال ہوا ہوگا یا اس مصنف کی جو آخر میں فوت ہوا ہوگا نیز ان میں سے جو بھی مدت طویل تر ہو۔ (دفعہ ۱۶) جو تخلیق کسی کی وفات کے بعد شائع ہو تو حق تصنیف کا شمار پہلی اشاعت گویا کہ مصنف کا اس وقت انتقال ہوا تھا جب کہ اس کی یہ پہلی تخلیق پہلی بار طبع ہوئی (دفعہ ۱۷)

قانون میں کاپی رائٹ کا اصل مالک خود مصنف کو سمجھا جاتا ہے۔ ماسوا ان مخصوص مستثنیات کے جن کی تفصیل دفعہ (۵) میں شامل کی گئی ہے

بن اسے بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ اس حق کو جیسا بھی چاہے اس طرح
ستعمال کرے۔ کیوں کہ دفعہ ۵ (۲) میں یہ بات رکھی گئی ہے۔ کہ کاپی رائٹ
ہ کوئی تفویض یا اس کے مفاد کو جو وہ کسی کے حق میں جاری کرنا چاہے
س کی مدت العمر اور ۲۵ سال مابعد کی مدت سے زیادہ کے لئے جائز
ہیں مانا جائے گا۔ بشرطیکہ اس نے اپنی وصیت میں اس کو شامل کر لیا
ہ۔ لہٰذا اس مدت کے آخری ۲۵ برس اس کے ترکے کی طرف منتقل
ہو جائیں گے۔ یہ عجیب شرط شاید اس لئے وضع کی گئی ہوگی کہ کسی
مصنف کے انتقال کے بعد اس کے کنبے کے لوگ بالکل مفلس اور
قلاش نہ ہو جائیں۔ مگر اس شرط کی عملی کامیابی کچھ مشکوک ہی ہے

امریکی مصنفین برطانیہ میں کس طرح کاپی رائٹ کا حق حاصل
کر سکتے ہیں۔ اس کا ذکر دفعہ ۳۲ (۲) میں کر دیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے
کسی تصنیف (وغیرہ کا) برطانوی علاقہ میں پہلی بار شائع ہونا اس
حالت میں مراد لیا جا سکتا ہے۔ جب کہ اس کی اشاعت کہیں اور ہوئی
ہو مگر برطانیہ میں اس تاریخ اشاعت کے ۱۴ دن کے اندر اندر شائع
کر دیا گیا ہو۔ لہٰذا اگر کوئی امریکی مصنف نیویارک میں کوئی کتاب
چھپواتا ہے۔ اور مثلاً لندن میں بھی اس کتاب کی اشاعت امریکی
اشاعت کے ۱۴ دن کے اندر اندر ہو جاتی ہے تو یہ تسلیم کر لیا جائے گا
کہ برطانیہ میں بھی اس کتاب کی اشاعت بیک وقت رونما ہوئی ہے
اور اس طرح اسے برطانوی قانون کے تحت حق تصنیف کے فوائد حاصل
ہو جاتے ہیں۔

امریکہ، یہاں کا قانون تو سالہا سال تک انگریز مصنفوں
کے لئے کچھ مفید ہی ثابت نہیں ہوا۔ کیوں کہ تخلیقات کے ضمن میں —
"ساختہ امریکہ" ہونے کی شرط لگی ہوتی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ انگریزی
تخلیق کا ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں "ٹائپ سٹ اپ" سے ساختہ
ہونا چاہئے۔ ورنہ کاپی رائٹ منظور نہیں ہوگا۔

امریکہ کا قاعدہ یہ ہے کہ کاپی رائٹ کے حصول کے لئے واشنگٹن
ایک جلد نسخہ کتاب کی حسب قواعد رجسٹری کرائی جائے۔ اگر یہ رجسٹری
نہ کرائی گئی تو کاپی رائٹ نافذ العمل نہیں ہوگا۔ ۱۸۹۱ سے قبل تک
اگر کسی برطانوی مصنف کو امریکہ میں حق تصنیف کی حفاظت کرانی مقصود
ہوتی تھی تو پہلے اسے ایک عارضی تحفظ کے لئے عرضی دینی پڑتی تھی۔
اس کے واسطے تاریخ اشاعت سے ۶۰ دن کے اندر ایک نسخہ کتاب
واشنگٹن میں داخل اور رجسٹر کرانا پڑتا تھا اور یہ درخواست کرنی پڑتی
تھی کہ مجھے حق تصنیف کا تحفظ عنایت کیا جائے۔ کتاب کے داخل ہونے کی
تاریخ سے صرف چار ماہ کے لئے یہ عارضی کاپی رائٹ ملا کرتا تھا۔ اس
دوران میں کتاب کی انگلستانی ایڈیشن کی کوئی کاپی امریکہ میں فروخت
نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ عارضی مدت کاپی رائٹ [illegible]
"ٹائپ سٹ اپ" کے طریقہ طباعت سے اس کا تیار ہونا اور حدود
ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تیار ہونا، یا کسی۔ اور طریقہ طباعت
اس کا تیار ہونا مگر اس طریقہ کا تمام و کمال حصہ امریکہ ہی میں تیار
و مرتب و مکمل ہونا۔

اگر کتاب اس طرح اندرون میعاد "ساخت" ہو گئی تو پھر اس
دوران ہی میں عارضی کاپی رائٹ کو بڑھا کر اسے پوری مدت حق
تصنیف تک محیط کر دینے کی علیحدہ درخواست داخل کرنی پڑتی تھی
اگر ایسا نہ کیا گیا تو کاپی رائٹ ساقط و کالعدم ہو جاتا تھا۔

۱۹۴۹ء میں امریکہ میں جو ایکٹ پاس کیا گیا۔ اس نے اس
صورت حال کی بہت کچھ اصلاح کر دی ہے اب مذکورہ طریقہ پر حاصل
شدہ کاپی رائٹ کی رو سے برطانوی مصنف کو پہلی اشاعت کے بعد ۵
سال تک کے لئے تحفظ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور ان پانچ سال میں مجموعی
صرف پندرہ سو کاپیاں فروخت کی جا سکتی ہیں۔ (مگر اس پر کاپی رائٹ
کے الفاظ اور اس کے بعد مالک کاپی رائٹ کا نام اور تاریخ رجسٹری
کا درج ہونا ضروری ہے۔) لیکن اگر اس مدت کے بعد ساختہ امریکہ
کتاب نہیں چھاپی گئی تو یہ مکمل کاپی رائٹ بھی کالعدم قرار دیدیا جائیگا

یہاں حق تصنیف کی مدت ۲۸ سال مقرر ہے اس کے بعد مزید
۲۸ سال کے لئے یہ حق مل سکتا ہے اور اس مدت کو مدت تجدید کہا
گیا ہے۔ مگر دراصل یہ تجدید ہوتی ہی نہیں۔ بلکہ ایک بالکل نئے
حق تصنیف کی منظوری ہوتی ہے اگر پہلے ۲۸ سال کے اختتام پر مصنف
حیات ہے تو وہ نئی مدت کے اجراء کے لئے درخواست دے سکتا ہے
لیکن اس ۲۸ سال کے اندر اندر اگر مصنف نے دوسری مدت کے
کے واسطے حق تصنیف کا فائدہ اٹھانا چاہا تو وہ ناجائز تصور [illegible]
وہ اس مدت سے قبل انتقال کر گیا تو اس حق کا پہلا وارث [illegible]

بچہ کو سمجھا جائے گا اگر وہ فوت ہو چکی ہو تو مصنف کے بچوں کی طرف یہ حق منتقل ہو جائے گا۔ اور اگر وہ بھی فوت ہو گئے ہوں تو مصنف نے جن کے نام حق ہبہ کر دیا (یعنی اس کے ادبی وصی کو) تو وہ اس سے مستفید ہوں گے اور اگر وہ بھی موجود نہ ہوں تو پھر اس مصنف کے قریب ترین رشتہ داروں کو یہ حق تفویض ہو جائے گا۔

خاتمہ کلام اس تذکرے سے یہ علم ہو گیا ہو گا کہ حق تصنیف کے ضمن میں تین مرحلے پیدا ہوئے ہیں پہلی منزل تو وہ تھی کہ کسی تخلیق کی محسوس مادی ملکیت کو جیسے کسی لوح، یا تصویر کے کینواس وغیرہ کو ہی کاپی رائٹ" مانا جاتا تھا اور اس میں مصنف تحریر یا مصور تصویر کا کہیں سوال ہی نہ تھا جس کے پاس وہ شے ہوتی تھی وہی اس تحریر یا تصویر کا اصل مالک گردانا جاتا تھا اگرچہ دماغی و فنی تخلیق کسی کی بھی ہو۔ دوسری منزل وہ آئی۔ جب طباعت کا فن رائج ہوا اس عہد میں فی الجملہ کیفیت یہ رہی کہ حق تصنیف کتب فروشوں اور ناشروں کی ملکیت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کیوں کہ کسی شے کو چھاپنے کی اجارہ داریاں اور مراعات طباعت انھیں دونوں کو ملا کرتی تھیں اور کسی کو نہیں پھر آخر میں یہ دور آیا کہ.... اجارہ داریوں اور مراعات کے خلاف سخت آواز اٹھی اور مصنفوں کے حق کا بھی چرچا ہوا اور ساری مہذب دنیا نے یہ اصول طے اور تسلیم کر لیا کہ مصنف کو بھی اپنی دماغی کاوش کے نتیجے میں شیریں پھل کھانے کا حق حاصل ہے۔

اگرچہ یہ تمام مراحل ہر ہر ملک میں بیک وقت پیدا نہیں ہوئے۔ مگر اکثر ممالک کی تاریخ میں ان کی نمود ضرور ملتی چلی جائیگی لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ حقوق پہلے قومی و ملکی بنیاد پر ہی تسلیم ہوئے۔ بین الاقوامی طور پر نہیں۔ "کاپی رائٹ یونین کے قیام نے صورت حال کی اصلاح یورپ اور دولت متحدہ برطانیہ میں بڑی حد تک کر دی ہے۔ اور یونیسکو کانفرنس نے بھی بڑی حد تک ایسی بنیاد رکھ دی ہے کہ بہتر توقعات کی جا سکتی ہیں۔ کہ کسی نہ کسی وقت میں ایک" عالمی کاپی رائٹ یونین" بھی ضرور وجود میں آجائے گی۔ اگر یہ امید بر آئی تو یہ نہایت مہتم بالشان کارنامہ ہوگا کہ عملاً "ایک حد تک یا بڑی حد تک کل گیر ضابطہ بین الاقوامی قانون وجود میں آجائے گا۔ اور وہ آرٹ و ادب کی دنیا کا ہوگا... وہ دنیا جو اِ بین الاقوامی حد بندیوں کو پار کرتی رہی ہے۔

(۱) ایف۔ ای، سکون جیمز، کوپنگر آن دی لا آف کاپی رائٹ ۳۸

(۲) ایس۔ پی۔ لاڈاز۔ دی انٹرنیشنل پروٹیکشن آف لٹریری اینڈ آرٹسٹک کاپی رائٹ ۱۹۳۸ء

(۳) ایم نکلسن اے مینول آف امریکن کاپی رائٹ پریکٹس ۱۹۴۶ء

(۴) آر۔ آر۔ باؤکر کاپی رائٹ اٹس ہسٹری اینڈ لاء ۱۹۱۲ء

کتابوں کا حق تصنیف

کاپی رائٹ کا ابتدائی اور اہم ترین مقصد یہ ہے کہ مصنف کی قلمی یا فنی تخلیق کا تحفظ ہو اس سے قطع نظر کاپی رائٹ سے انسان کے دماغی کارناموں کا حقہ تشہیر بھی ہوتی ہے۔ اور اس طرح یہ وسیلہ کتابوں کی بین الاقوامی پیمانے پر نشر و اشاعت میں نہایت سود مند ثابت ہوتا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں کاپی رائٹ کا مقصد یہ ہے کہ اہل قلم اور دیگر فن کاروں کو قانونی طور پر یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے تخلیقی شاہکاروں کو متعدد بار چھاپ کر فروخت یا مشتہر کریں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کاپی رائٹ کی پذیرائی کس انداز میں ہوتی ہے۔ اس کو ہم طرح سمجھ لیں۔ اور ہوشیاری اور سلیقے کے ساتھ استعمال کیا جائے تو یہ بیک وقت نہ صرف تخلیقی کارناموں کی افزائش کا ایک موثر ذریعہ ہوگا۔ بلکہ اس سے افکار اور معلومات عامہ میں بھی بے پناہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اس کے' کاپی رائٹ کے مفہوم کو سمجھنے میں لغزش ہوئی اور اس کے بنیادی تصور اور مقصد کو نظر انداز کر دیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ یہی قانون دماغی ایجاد و اختراع کے دائرۂ کار کو تنگ اور خیالات و افکار کی عالمگیر نشر و اشاعت کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ ثابت ہو۔

کاپی رائٹ کی آخری کسوٹی یہ ہے کہ اس سے عوام بالعموم مستفید ہوتے ہیں یا نہیں۔ کاپی رائٹ کے اصل مقصد اور منشا کو ماضی قریب کی بین الاقوامی کانفرنس اور بالخصوص عالمی کنونشن میں واضح کیا جا چکا ہے۔ جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے۔ ان کانفرنسوں کے قوانین کی رو سے مصنفوں کو ایک معقول معاوضہ ملنے کا ایک یقینی بندوبست اس نہج پر کیا گیا ہے۔ کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق اپنے ملک کے علاوہ اپنی تخلیقات کا اپنی قومی زبان یا کسی دوسری

ا ترجمہ کرکے اور ملکوں میں بھی شائع کر سکتے ہیں۔ انسانی حقوق
عالمی قرار داد جسے جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو پاس کیا تھا۔
دفعہ ۲۷ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہر شخص اس بات کا مجاز اور مختار ہے
روحانی اور مادی فوائد کا تحفظ کرے جنہیں وہ سائنسی، علمی،
کوششوں اور کاوشوں کے بعد حاصل کرتا ہے۔ ہر شخص کو یہ حق بھی
ہے کہ پوری آزادی کے ساتھ سماجی، اور ادبی زندگی حاصل کرتا ہے
لطیفہ سے مستفید ہو اور سائنس کی ترقی میں اقدام کرے۔ اور اس
ومند ہو۔ ان دونوں حقوق کے باہمی توازن سے اس قانون کا اصل
ومنشا معلوم ہو سکتا ہے۔ جس کے تحت کاپی رائٹ کے ذریعے اہلِ علم
ن کو حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

چونکہ ان حقوق کا تعلق دو مختلف فریقوں سے ہے اس لئے ظاہر ہے
کا آزادانہ استعمال نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر طرفین میں کسی معاہدے کے
باقاعدہ مصالحت ہو جائے تو دونوں فائدے میں رہیں گے۔ فی الحقیقت
ٹ کا تصور نسبتاً حالیہ ہے۔ اور اس کے تاریخی ارتقاء میں مصنف کے
ارثین کے مفاد کے درمیان سمجھوتے کا امکان نظر آتا ہے۔ بلا شبہ ناجائز
اعت یعنی کاپی رائٹ کی ڈاکہ زنی کو روکنا قطعاً محال ہے۔ تاوقتیکہ
ت منظر عام پر نہ آجائیں۔ یہی وجہ ہے کہ چھاپے کی مشینوں کے ظہور میں
پہلے کاپی رائٹ کا کوئی عدم اور وجود نہ تھا۔ زمانہ ماضی میں جب
پے کا فن ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اور حکما یا فرمانکشا ایک ہی مخطوطے (مثلاً
توریت مقدس) کو ہزاروں آدمی اپنے ہاتھ سے تحریر کرتے تھے۔
ں کرنا دشوار تھا کہ یہ نقل مصنف (یا عام طور پر وہ مرتب جسے یہ
تصنیف کیا جاتا تھا۔) کی باضابطہ اجازت سے نقل کیا گیا ہے یا راقم نے
طور پر تحریر کیا ہے۔ بہر نوع اصل واقعہ خواہ کچھ بھی ہو۔ حقیقت
اس زمانے میں اہلِ علم اپنی تخلیقات کی نشر و اشاعت کو مادی
ترجیح دیتے تھے۔

اطالوی اور یونانی تاریخ میں کوئی قانونی نقطہ کسی مصنف کی اثر تحریر
کرنے کے خلاف نہیں ملتا۔ حالانکہ اس قسم کے علمی سرقہ کو اس زمانے
عام نہایت ہی معیوب خیال کرتی تھی۔ اس وقت کے عوام کا یہ نظریہ
مستند مصنف کے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک اخلاقی محاسبہ
تھا۔ جس کی اہمیت قانون سے بھی بڑھ کر تھی۔

۱۵۰۰ عیسوی کے لگ بھگ مشینی طباعت میں وجود میں آئی۔
جس کی بدولت کتابوں کا زیادہ تعداد میں چھپنا اور نفع حاصل کرنا ممکن
ہو گیا۔ اور یوں کاپی رائٹ کا تصور پیدا ہوا۔ مصنف کی بجائے ناشر اور
تاجر کو خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ناشر مصنف
کو پہلے ہی اس کا حق تصنیف یکمشت ادا کر دیتا تھا۔ اور اس طرح ناشر
یا کتب فروش کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ کہ وہ کتاب کی نشر و اشاعت
میں اپنا ایک معقول سرمایہ لگائے۔ اندریں حالات بغیر کاپی رائٹ کے
تحفظ کے ناشر کو اس کاروبار میں لگائی ہوئی رقم کا عوض یا منافع ملنا،
ممکن نہ تھا۔

۱۴۶۹ عیسوی میں سب سے پہلے جس شخص کو کلیتاً یہ حق اشاعت
حاصل ہوا۔ وہ جمہوریہ وینس (REPUBLIC OF VENICE)
کا ایک ناشر تھا۔ اس جمہوریہ کی جانب سے اس کو یہ حق صرف پانچ سال
کے لئے مرحمت ہوا تھا۔ بعد ازاں مختلف اوقات میں اسی قسم کی مراعات
اور ناشران کو دوسرے ملکوں میں دی گئیں۔

ان مراعات کو کاپی رائٹ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کہ ہم آج تصور
کرتے ہیں بلکہ اس کو اگر تجارتی اجارہ داری کہا جائے تو زیادہ موزوں
ہوگا۔ دور حاضر کے کاپی رائٹ کے مفہوم سے ملتی جلتی مراعات ۱۴۸۶ عیسوی
میں جمہوریہ وینس میں ایک شخص مسمی انٹونیو سیبلیکو۔
(ANTONIO SABEELICO) کو اس کی تصنیف کردہ تاریخ
موسومہ DECADES RARUM VENTORIUM پر عطا
کی گئیں۔ حق تصنیف کا کسی مصنف کے حق میں محفوظ ہونا بلا شبہ ایک مخصوص
اعزاز تھا۔ کیونکہ مصنفوں کو عام طور پر دو سو سال تک اس درجہ قدر دانی کا
مستحق نہیں سمجھا گیا۔

اس قسم کا پہلا قانون حکومت برطانیہ میں ۱۷۰۹ء میں اپنے
ایکٹ نمبر ۸ دفعہ ۱۹ کے ماتحت منظور کیا گیا۔ جو عرف عام میں اسٹ
ٹیوٹ آف این (STATUTE OF ANNE) کہلاتا ہے
اس قانون کی رو سے مصنفوں کو اپنی علمی تخلیقات کی اشاعت کا حق
حاصل ہوا۔ اس قانون کا اصل مقصد یہ تھا۔ کہ اہلِ قلم ناشروں اور

کتابوں کے ناجائز بٹوارے اور لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہیں۔ یہ ۱۷۰۹ء
میں مہذب ممالک میں سب سے پہلی کاپی رائٹ کا قانون رائج ہوا۔ اور اس کے بعد
۱۷۹۰ء میں نو آزاد ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں نافذ ہوا۔ ۱۷۸۹ء کے
انقلاب کے فوراً بعد فرانس میں بھی مصنفوں کو کاپی رائٹ کا حق دیا گیا۔
رفتہ رفتہ کم و بیش ۶۰ سال کی مدت میں یورپ کے دوسرے ملکوں میں
بھی اسی قسم کے قانون وضع کئے گئے۔

جوں جوں بین الاقوامی تعلقات میں اضافہ ہوا مختلف ممالک میں
بھی کاپی رائٹ کی تحفظ کا اہمیت کا احساس بڑھتا گیا۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء
میں پہلے فرانس، برطانیہ، اور پرتگال کے مابین کاپی رائٹ کے متعلق
اہم معاہدات ہوئے۔ پھر ان کی تقلید میں دوسرے معاہدے بھی جلد از
جلد ظہور میں آئے۔ یہاں تک مغربی ممالک میں روز افزوں علمی ڈاکہ زنی
کے نتیجے میں کوشش کی گئی۔ فرانس، برطانیہ، اور پرتگال کے مابین
ایک مشترکہ معاہدہ ہو جائے۔ یہ کنونیشن انٹرنیشنل لٹریری آرٹسٹک
ایسوسی ایشن کی سربراہی میں منعقد ہوا۔ جس کی داغ بیل وکٹر ہیگو،
(VICTOR HUGO) نے ڈالی تھی۔ رفتہ رفتہ مختلف حکومتوں کو
بھی اس ضرورت کا شدت کے ساتھ احساس ہونے لگا۔ انجام کار اس شدتِ
احساس کی بنا پر ۱۸۸۶ء میں ایک معاہدہ ہوا جو برن یا انٹرنیشنل کنونیشن
برائے تحفظ حقوق تخلیقات علم و فن کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ برن کنونیشن
جس پر تین مرتبہ نظر ثانی اور دو مرتبہ عدالتی سربراہ ہے۔ اس میں تکملہ اور
اضافہ کیا بین الاقوامی کاپی رائٹ کے تحفظ کے لئے بہت ہی موثر آلہ کار
ثابت ہوا۔

اس کے علاوہ گزشتہ ۶۰ سال میں متعدد بین الاقوامی کنونیشن
منعقد ہو چکے ہیں۔ ان میں پہلا کنونیشن جس پر ۱۸۸۹ء میں مونٹی ویڈو،
(MONTEVIDEO) میں دستخط ہوئے اسی برن کنونیشن کی
بدولت عمل میں آیا تھا اور اسی کی بنیاد پر بیشتر امریکی ممالک کے لئے بھی اس کا
دروازہ کھلا رہا۔ چنانچہ حالیہ آخری کنونیشن ۱۹۴۶ء میں واشنگٹن میں ہوا
تھا۔ اور ابھی ماضی قریب میں یعنی ۱۹۵۲ء میں یونیسکو کنونیشن نے
اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ ماضی قریب و بعید میں برن کنونیشن کے علاوہ
مختلف بین الامریکی کانفرنسیں جو ہیں کاپی رائٹ کے تحفظ کے لئے جو
قانون منظور ہوئے تھے وہ سب ایک عالمگیر کاپی رائٹ قانو
تابع ہو جائیں۔ اس قانون کا احترام ان ممالک پر بھی لازم آتا ہے
ان گزشتہ معاہدوں پر دستخط کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

ان تمام کانفرنسوں کا دائرہ کار ایک دوسرے سے بالکا
ہے۔ لہٰذا اس سے قبل کہ ہم مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں کے فیصلو
صورتِ حال پر غور کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ملکی یا داخ
کے بنیادی اصولوں کا جائزہ لیں جس سے کاپی رائٹ کے تحفظ کو تقویت

کاپی رائٹ چند غیر ملکی قوانین کی نظر میں

مختلف ممالک میں مصنف اور قارئین کے مفادات میں جو ت
پایا جاتا ہے۔ اس میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی وجہ سے کاپی رائٹ کی مد
کو محدود کر دیا گیا ہے۔ مجلس مقننہ کے قانون کی روشنی میں کہ فریقین
کس فریق کو ترجیح دی جائے۔ اس مدت کا معیار جدا جدا ہے۔

تمام ممالک میں کاپی رائٹ کی مدت یکساں نہیں ہے۔ مثلاً
ہائے متحدہ میں یہ مدت تاریخ اشاعت سے ۲۸ سال ہے۔ اس کی تو
اتنی ہی مدت کے لئے اور ہو سکتی ہے۔

روس میں اس کی میعاد مصنف کے زمانۂ حیات کے ۱۵ سا
بعد ختم ہوتی ہے۔ ارجنٹینا میں ۲۰ سال، فرانس میں، جرمنی،
برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک میں ۵۰ سال۔ کولمبیا،
کیوبا، اور اسپین میں ۸۰ سال، پرتگال میں یہ مدت غیر
معینہ یا لامحدود ہے۔

ملکی قانون کاپی رائٹ کا تحفظ از خود کرتا ہے یا مصنف کو
دستوری لوازمات کی پابندی کرنی پڑتی ہے؟ اس سوال کا جواب ہر
کی اپنی صواب دید کے مطابق ہو سکتا ہے۔ کہ اس کی نگاہ میں مراعات
مستحق مصنف زیادہ ہیں یا قارئین۔ کھلم کھلا کہا جا سکتا ہے کہ
شمالی اور جنوبی امریکہ اور اسپین ہی ایسے ملک ہیں جہاں کاپی رائٹ
محفوظ کرنے کے لئے چند قانونی شرائط اور ضابطوں کو پورا کرنا
جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے ان کے کاپی رائٹ کا حق غیر مشروط
پر تمام یورپی ممالک کے علاوہ ان ایشیائی ملکوں میں بھی محفوظ ہے

آبادیاتی حکومتوں کا ایک علاقہ کہلاتے تھے۔

ان قواعد و ضوابط میں تین شرطیں نہایت ضروری ہیں۔ اوّل
، کا ایک یا چند نسخے حکومت کے نامزد کردہ افسر کے پاس
دوم اپنے کاپی رائٹ کی رجسٹری کرانا۔ اور سوم کتاب کی
پی رائٹ کا حق محفوظ ہو جانے کا اعلان چھپوانا۔ قانونی طور
ٹ کا حق ان شرائط کی انجام دہی کے بعد ہی محفوظ ہو سکتا
مریکہ میں ان تمام شرطوں کا پورا کرنا لازم ہے اس لئے مناسب
ہے کہ اس ملک کے اس حصہ دستور کو قدرے تفصیل کے
کیا جائے۔

ست ہائے متحدہ امریکہ میں جو شخص کاپی رائٹ کا تحفظ چاہتا
ب سے پہلے ایک بہت پیچیدہ اور مشکل فارم بھرنا پڑتا ہے
ہمراہ اس کو کتاب کی دو جلدیں اور چار ڈالر کی رقم رجسٹرار
کے نام' کانگریس لائبریری، واشنگٹن کے پتے پر بھیجنی
اب کی ہر کاپی پر "کاپی رائٹ" حوالہ سنہ اور منجانب فلاں
علان ہونا چاہیئے۔ جب تک ان تمام شرائط کی تکمیل نہ ہو
کے متعلق کوئی مقدمہ کسی امریکی عدالت میں دائر نہیں
۔ اگر رجسٹرار کاپی رائٹ کے نوٹس کے تین ماہ کے اندر اندر ان
، نہ کیا گیا تو کاپی رائٹ کا حق ضبط ہو کر عوام کی ملکیت
۔

قسم کی شرائط ان ممالک کی نظر میں جو برن کنونیشن کو تسلیم
ایت ہی معیوب ہیں۔ لیکن بایں ہمہ بیرن کانفرنس کے
ایک یا دو کتابیں جن کا دفتر متعلقہ میں داخل کرانا ضروری
۔ حالانکہ یہ عمل ان کی شرائط کا کوئی لازمی جزو نہیں ہے۔
یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کارروائی قطعاً غیر مناسب ہے۔
عدہ اس امریکی قانون کا آئینہ دار ہے۔ جس کی بناء پر
ی حقوق کے تحفظ کے لئے کوشش کی گئی ہے۔ اکثر اوقات
مادشوار ہو جاتا ہے کہ فلاں کتاب کے کاپی رائٹ کا مالک
ینی بغیر مصنف کے نام کی کتاب کا، یا فرضی مصنف کے
کا، اور یا اس کتاب کا جو مصنف کی وفات کے بعد ہی

شائع ہوئی تھی۔ لہٰذا ایک مرکزی ادارۂ رجسٹری کا ہونا چاہیئے۔ جہاں سے
یہ پتا چلے کہ فلاں کتاب کا مالک کون ہے۔ انتہائی ضروری ہے۔ اسی کے
ساتھ ساتھ ہر کتاب کی رجسٹری کے متعلق اس قسم کے اعلان کا مشتہر ہونا
جس میں یہ اطلاع موجود ہو کہ کاپی رائٹ کا اندراج کس سال ہوا۔
(امریکہ میں اوّل مرتبہ کس سال میں طبع ہوئی) کاپی رائٹ کی رجسٹری کو
تلاش کرنے میں آسانی ہوگی۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ
فلاں کتاب کی کاپی رائٹ کی مدت کب ختم ہوگی۔

المختصر ان شرائط کے جواز کے خلاف متعدد ٹھوس اور
سنجیدہ اعتراضات موجود ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اعتراض کہ تاریخ
اعلان سے کاپی رائٹ کی میعاد کا شمار اور اس کی صحت مشتبہ رہتی ہے
کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ دوسرے ایڈیشن کے لئے اس کے کاپی رائٹ
کی پہلے ہی سے تجدید ہو گئی ہو۔ تاوقتیکہ کسی خواہش مند کو اس کی اشاعت
ثانی کا پہلے سے علم نہ ہو۔ اس تجدید کا علم میں آنا مشکل ہے یہ سچ ہے
کہ کاپی رائٹ کا محکمہ نہایت آسانی کے ساتھ اپنے ریکارڈ کو دیکھ
کر نئی اشاعت کے متعلق آگاہ کر سکتا ہے۔ لیکن معینہ وقت گزر
جانے کے بعد اس ریکارڈ کی دیدہ ریزی مطالعے کے حق میں قطعاً
بے سود ثابت ہوگی۔

ایک اندازے کے مطابق امریکہ میں صرف گیارہ فیصد کاپی رائٹ کی
رجسٹریاں ایسی نکلتی ہیں جن کی تجدید کرائی جاتی ہے، گویا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ
اکثر و بیشتر کاپی رائٹ کو طویل مدت کے لئے محفوظ کرانا چنداں ضروری نہیں یعنی
بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کے کاپی رائٹ کو محض اس لئے دوبارہ محفوظ نہیں
کرایا جاتا کہ یعنی حسب قانون مزید ۲۸ سال کے لئے کہ مصنف کے ورثاء یا ان کے
مختاران کو بار دیگر رجسٹر کرانا بے سود خیال کرتے ہیں۔ لیکن اگر مصنف کی کوئی
تصنیف یکایک مقبول ہو جائے کیونکہ بعد کی طبع شدہ کوئی اور تصنیف کامیاب
تر ثابت ہوئی ہے تو وہ لوگ جنہیں مالی طور پر ان تصانیف سے نفع پہنچ سکتا تھا
قبول عام کے ان فوائد سے قطعی محروم ہو جائیں گے۔

مذکورہ بالا شرائط کی تکمیل کا بار یا ذمہ داری مصنف یا اس کے
نمائندوں پر ڈالی جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ قانون اپنی نگاہ میں قوم کے مفاد
کو مقدم اور ضروری سمجھ کر مصنف کے علمی یا صنعتی کارناموں سے

مستفید ہو نا چاہئے مصنف سے اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ وہ حق تصنیف کو محفوظ کرنے کے لئے ضروری اقدامات کرے اور اگر وہ اپنے اس فرض کو بجا لانے میں متامل رہا ہے عمل نظر آتا ہے ایسے حالات میں حکومت بھی اس کے حق کو محفوظ رکھنا لاحاصل سمجھتی ہے۔

حکومتوں کی جانب سے یہ کارروائی دیدہ و دانستہ کی جاتی ہے، اس لئے کہ اس باب میں سرکاری نظریہ یہ ہوتا ہے کہ مصنف کی یہ تصنیف قارئین کے لئے تعلیمی، اصلاحی یا تفریحی نقطۂ نظر سے واقعی ایک قابل قدر پیشکش ہے۔ حکومتیں اپنے اس یقین کامل کی بنیاد پر کہ مصنف کو بصیرت فن حاصل ہے اس کے حقوق کو قابل تحفظ قرار دیتی ہیں حکومتوں کے دونوں گروپ جو ان شرائط کی حمایت یا مخالفت میں آواز اٹھاتے ہیں اس بات میں متحد الخیال ہیں کہ مصنفوں کے حقوق کی حفاظت ضروری ہے کیونکہ حکومتیں اس بات سے آگاہ ہیں کہ اہل قلم کی دماغی اختراعات کے اس تحفظ ہی کی بدولت مصنف مالی منفعت حاصل کر سکتے ہیں اور یہی وہ دماغی عمل ہے جو ان کو عوام (ناشران) کی دست برد سے محفوظ رکھ سکتا ہے جس کے لئے خود اہل قلم اس کے طلب گار ہوتے ہیں۔

وہ حکومتیں جن کو قارئین کا مفاد زیادہ عزیز ہوتا ہے فن کاروں کو زیادہ سے زیادہ صرف اتنی مراعات عطا کرتی ہیں جن کی بدولت ایک خوش فکر فن کار کی ہمت افزائی ہو جائے اور اس کو اس قابل بنا دے کہ وہ اپنی تخلیق کی عوام میں نشر و اشاعت کر سکے۔

الفاظ "اور اس قابل بنا دے" کو اہمیت یوں دی گئی ہے کہ اس حقیقت کی طرف نظر رہے کہ اگر مصنف کو ایک مدت معقول کے لئے حق تفویض یا ہبہ و اجرا حاصل رہا تو یہ اشاعت کا سہ جاری نقطۂ نظر سے خسارے کا سودا تو نہیں ہوتی۔ اگر کسی ناشر کو نسبتاً کمی مختصر عرصہ کے لئے حق اشاعت دیا جائے تو وہ اس کی اشاعت کا خرچ برداشت کرنا زیادہ سود مند محسوس نہیں کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ اس تصنیف سے ہی محروم ہو جائیں گے۔ لہذا جب اصلاح کاپی رائٹ پر غور کیا جائے تو معاملے کے اس پہلو کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے۔

حق ترجمہ کے ضمن میں مصنف کے حقوق تحفظ کا معاملہ یوں بھی پیچیدہ سمجھا جاتا ہے کہ مصنف اور قارئین کے مفاد متضاد تر ہوتے ہیں۔ جن ممالک میں اپنی ادب کی مقدار کافی نہ ہوتا ہو ہے ایسے ادب کی طرف زیادہ راغب رہیں گے جو غیر زبانوں میں پیدا ہو رہا ہے بہ نسبت ان ممالک کے جہاں مقامی ادب کی تخلیق کافی کچھ ہو

ان تمام مختلف تصورات کے باعث کاپی رائٹ کا مسئلہ اور اس کے تحفظ کی بات بین الاقوامی معاہدات کے ضمن میں چند در چند مشکلات کا سبب بن جاتا ہے میثاق برن اور دیگر بین الاقوامی مواثیق کے تسلیم کنندگان نے جتنا کچھ بھی باہم طے کر لیا ہے، وہ کافی ہے۔ اپنی جگہ قابل قدر اور لائق ستائش ہے۔

مصنفوں۔ فن کاروں اور دیگر ہم پیشہ اشخاص کے حقوق کی حفاظت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ پہلے ان وجوہات کا جائزہ لیا جائے جن کی بنا پر مغربی ممالک میں کاپی رائٹ (حق طبع یا اشاعت) کا قانون نافذ ہوا۔

اٹھارویں بلکہ انیسویں صدی عیسوی تک بلجیم میں فرانسیسی کتب کی ناجائز اشاعت ایک عام بات تھی۔ بلجیم میں اکثر و بیشتر ایسی کتابیں شائع ہوتی تھیں جن کا فرانسیسی سنسر کے فیصلے کے مطابق چھاپنا خلاف قانون تھا۔ تصانیف کی اس ڈاکہ زنی کو بے ایمان اور نفع خور ناشروں نے ایک باقاعدہ تجارت بنا رکھا تھا۔ اس کا اندازہ بآسانی اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ فرانسیسی لٹریچر فرانس میں طبع ہونے سے قبل ہی بلجیم میں شائع ہو جاتا تھا۔ طریقہ کار یہ تھا کہ بلجین پبلشرز اکثر اوقات کتابوں کے مطبوعہ پروف چھاپے خانوں سے اڑوا لیتے تھے اور بعض اوقات نقل نویسوں کو فرانس بھیجا جاتا تھا تاکہ وہ مختلف ڈراموں کو اسٹیج ہونے کے دوران میں لکھ کر بلجیم بھیج دیں جہاں ان کو باقاعدہ کتابوں کی صورت میں شائع کیا جاتا تھا۔ اس طرح بلجیم ایک مدت دراز تک اس ناجائز تجارت کا گہوارہ بنا رہا۔

اسی طرح ریاست ہائے متحدہ میں بھی اس بدعنوانی اور بددیانتی کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب یورپ کے مختلف گوشوں سے اہل یورپ گروہ در گروہ ترک وطن کر کے امریکہ میں آباد ہو رہے تھے اور اپنے ہمراہ یورپ کی مختلف زبانوں کی کتابیں لا رہے تھے۔ ریاست ہائے متحدہ کے ۱۷۹۰ء کے قانون کاپی رائٹ کی رو سے صرف ریاست ہائے متحدہ کے ساکن شہریوں کے حقوق کا تحفظ ہوتا تھا۔ اس ایکٹ میں کوئی دفعہ ایسی نہ تھی جو غیر امریکی باشندوں کی تالیفات اور تصنیفات کو چوری یا غصب سے محفوظ رکھ سکتی ہو۔ اس قانونی نقص کی وجہ سے امریکہ میں غیر ملکی کتابوں پر ہاتھ صاف کرنے کا جرم علی الاعلان ہونے لگا۔ انگلینڈ کو اس لحاظ سے بہت ہی زیادہ نقصان پہنچا کیونکہ اس وقت امریکہ میں انگریزی لٹریچر کی زبردست مانگ تھی۔ چنانچہ امریکہ میں انگریزی تصنیف

نہایت آزادی کے ساتھ چھپنے اور کثیر تعداد میں فروخت ہونے لگیں۔ کاپی رائٹ رکھنے والے ہمیشہ اپنے معاوضے سے کلیتاً محروم رہتے۔

انگلینڈ میں کاپی رائٹ کا سب سے پہلا قانون ۱۷۰۹ء میں پاس ہوا جس کے دیباچے سے ایکٹ کے اغراض و مقاصد پر روشنی پڑتی ہے۔

ہر گاہ کہ طابع اور تاجر کتب اور دیگر افراد نے آج کل
آزادانہ طور پر کتابوں کی طباعت، نقل اور اشاعت
کا سلسلہ بلا حصول اجازت مصنفین یا مالکان کتب
جاری کر رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کو کافی نقصان
اٹھانا پڑتا ہے۔ اور اس نقصان کے نتیجے میں وہ
اور ان کے اہل و عیال تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔
لہٰذا اس بد دیانتی کا سدِ باب کرنے کے لئے قانون
نافذ کیا جاتا ہے کہ ۱۰ اپریل ۱۷۱۰ء سے ۲۱ سال
تک ہر مصنف کو اپنی کوئی کتاب یا تمام کتابوں کے
چھاپنے کا کلیتاً حق حاصل ہوگا۔"

اس قانون کے پاس ہوتے ہی دوسرے ممالک نے بھی مصنفوں اور فن کاروں کی تخلیقات کو ناجائز طباعت و اشاعت سے محفوظ رکھنے کے لئے اسی قسم کے قانون نافذ کئے۔ انگلینڈ کے بعد ڈنمارک وہ پہلا ملک تھا جس نے مصنفوں کے حقوق کی حفاظت کو حکومت کے فرائض منصبی میں شامل کیا۔

۱۸۸۶ء میں برن (BERNE) میں کاپی رائٹ کنونشن ہوا جس میں مصنفوں کو ان کے اپنے ملک کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اپنے حقوق کی حفاظت کا حق دیا گیا۔ برن کنونشن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا اجتماعی اور بین الاقوامی قانون کاپی رائٹ کے متعلق پاس کیا جائے جس کے دائرہ اقتدار و عمل میں تمام دنیا کے ممالک آجائیں۔ برن کنونشن کے علاوہ ممالک امریکہ کا بھی ایک کنونشن ہوا۔ ان دونوں کانفرنسوں کے فیصلوں کو ایک اجتماعی اور متفقہ شکل دینے کی غرض سے یونیسکو نے جنیوا میں ایک کنونشن منعقد کیا جس پر ۶ ستمبر ۱۹۵۲ء کو دستخط ثبت کئے گئے۔ اب تک دنیا کے ۴۹ ممالک اس جنیوا کانفرنس کے مقاصد کی تصدیق اور توثیق کر چکے ہیں جن میں برصغیر ہند و پاک بھی شامل ہیں۔ اس

اس معاہدہ میں شریک ہونے والا ہر ملک غیر ملکی مصنف کے حق تصنیف کو وہی درجہ دیگا جو وہ اپنے ملک کے اہل قلم کو دیتا ہے۔

موجودہ کاپی رائٹ کا قانون فی الاصل انہیں قوانین کا نتیجہ ہے جو کو گذشتہ دو صدیوں کے دوران میں یورپ اور امریکہ کے ممالک نے منظور کیا تھا۔

ہر چند کہ پاکستان اور انڈیا دونوں اس بین الاقوامی کاپی رائٹ کنونشن کے رکن ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں ملکوں میں کاپی رائٹ کے قانون کا احترام کم اور خلاف ورزی بہت زیادہ مشاہدہ میں آتی ہے۔ پاکستانی کتابیں ہندوستان میں بکثرت چھپتی ہیں کیونکہ وہاں کے ناشروں کو ان کتابوں کے مصنفوں کو کسی قسم کا کوئی حق تصنیف دینا نہیں پڑتا۔ اور یوں ان کو یہ کتابیں بہت ہی سستی پڑتی ہیں۔ بالکل اسی طرح پاکستان میں بھی اس قانون کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ یہاں بھی ان مشہور مصنفین کی کتابیں جن کی یہاں بہت زیادہ مانگ ہے مصنفوں یا ان کے پبلشروں کی اجازت کے بغیر چھپتی اور فروخت ہوتی ہیں۔

لطف یہ ہے کہ اسی پر اکتفا نہیں کی جاتی بلکہ ہندوستانی مطبوعات کو پاکستان میں شائع کرتے وقت ان پر ہندوستان ہی کی پرنٹ لائن درج کی جاتی ہے تاکہ خریدنے والے اس خیال خام میں رہیں کہ ان کتابوں کو ہندوستان سے پاکستان میں درآمد کیا گیا ہے۔ اسی مصلحت کے پیش نظر بعض اوقات ہندوستانی کتابوں کے اصل متن کو فوٹو بلاک کے ذریعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعض کتابوں کی اصل عبارت کو تھوڑا بہت گھٹا بڑھا کر انہیں مشہور اہل قلم کے فرضی ناموں کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ ان غیر قانونی اور اخلاق سوز حرکات کے نتیجے میں ان اہل قلم اور ان کے ناشرین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے جن کے بسر اوقات کا واحد ذریعہ کتابوں کی تصنیف یا تجارت ہے۔

مشاہدے اور تجربے میں بعض ایسے واقعات بھی آئے ہیں کہ پاکستانی ناشروں نے بعض کتابوں کو مکمل یا نامکمل صورت میں مصنفین کی رضامندی یا ان ناشروں کی اجازت کے بغیر چھاپ ڈالا ہے جنہیں ان کا حق اشاعت حاصل ہے۔ ان حالات اور واقعات کو دیکھ کر بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے گویا برصغیر ہند و پاک میں کاپی رائٹ کے قانون کا سرے سے کوئی وجود

کاپی رائٹ

حکومت سے گلڈ کے چند مطالبات

یونیسکو کے ایک ماہر جنوری میں کاپی رائٹ قانون کا دوسرا مسودہ تیار کرنے آ رہے ہیں گلڈ انھیں قانونی مشورے اور دیگر خدمات پیش کر چکا ہے لیکن اس سلسلے میں ہم اپنے چند بنیادی مطالبے پھر پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ ناشرین کی انجمن ہم سے اتفاق کرے گی ہم ملکی صحافت اور ادبی رسائل سے بھی کھلے تعاون کی اپیل کرتے ہیں۔

(۱) مصنفین کی تصنیفات پر ان کے ورثاء کا حق مصنف کے انتقال کے سو برس بعد تک قائم رہے۔

(۲) کاپی رائٹ قانون کو فوجداری قانون کی حیثیت دی جائے تاکہ جرائم کا ارتکاب کم سے کم ہو جائے۔

(۳) ہر تصنیف کے لئے اشاعت سے پہلے مصنف اور ناشر کے مابین تحریری معاہدہ لازمی قرار دیا جائے جو رجسٹرار ضلع کی عدالت میں رجسٹرڈ ہو جائے۔ (گلڈ اپنے اراکین کی حد تک پورے پاکستان میں ہر معاہدے کی رجسٹریشن فیس ادا کرنے پر تیار رہے)

(۴) ناشرین کا رجسٹریشن لازمی قرار دیا جائے تاکہ بدعہدی اور بد دیانتی کی صورت میں دیگر قانونی کارروائی کے علاوہ ان پر ایک مستقل گرفت رہ سکے۔ اس سے فحش اور مخرب اخلاق ادب کی اشاعت پر بھی گرفت زیادہ ہو جائے گی۔

(۵) مصنف کی اجازت کے بغیر اس کی تخلیقات کا انتخاب غیر قانونی قرار دے دیا جائے۔ خلاف ورزی کی سزا جرمانے کے علاوہ سزائے قید کی شکل میں بھی ہو۔

(۶) کاپی رائٹ کی خلاف ورزی مصنف کی رپورٹ قابل دخل اندازی پولیس قرار دے کر تعزیرات پاکستان اور ضابطہ فوجداری میں ضروری اضافے کئے جائیں تاکہ مصنف کے کاپی رائٹ پر ڈاکہ عام چوریوں کی ذیل میں آ سکے۔ اور مصنف کو دیوانی کارروائیوں میں سرگردانی نہ کرنی پڑے۔ قانون خود مجرم کی گرفت کرے۔

یہ ہمارا سب سے اہم مطالبہ ہے

(۷) کاپی رائٹ قانون کی خلاف ورزی کی دیگر سزائیں مناسب حد تک بڑھائی جائیں۔ اس وقت یہ سزائیں مضحکہ خیز حد تک کم ہیں۔

(۸) اس قانون کے معاملے میں ہندوستانی ادیبوں کو پاکستانی ادیبوں کی طرح سمجھا جائے یعنی خاص طور پر اس قانون میں ہندوستانی ادیبوں کے حق تصنیف کی حفاظت پاکستانی ادیبوں کے حقوق کی حفاظت کی طرح کی جائے۔

یوسف ظفر

منزلِ جاں

ایک وہ منزلِ جاں تھی کہ کہستانوں میں
سر پٹکتی ہوئی اک جوئے رواں، نعرہ زناں
کوہ کے پارۂ گراں بار سے آنکھیں ملتی
راہ کے سنگِ سیہ فام کی جھالر بنتی
اپنی پلکوں سے ہر اک پیڑ کے پتے چنتی
گیت گاتی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی چلتی تھی —
اُس کا سینہ تھا کہ آئینہ تھا کہساروں کا
اُس کا نغمہ تھا کہ آویزۂ گوشِ کہسار

اور یوں جوئے رواں، غیروں کے دربار سے
اپنے کشکول میں سرمایۂ جاں لے کے چلی،
راہ کے سنگِ تُنک ساتھ لئے آگے بڑھی
جنہیں دھویا کبھی، رولا کبھی، سہلایا کبھی
کبھی آغوش میں لے کر اُنہیں ہموار کیا
موج در موج چلی جوئے تُنک سیرِ تو بہی
اپنے دامن میں لئے کوہ کے پروردۂ جاں
کوہ اس لطف و مروت پہ بہ حیرت نگراں

ایک وہ منزلِ جاں آئی کہستانوں میں
ندیاں بڑھ کے گلے ملنے لگیں دریا سے
جوق در جوق چلا قافلۂ آبِ رواں
شور برپا ہوا، برہم ہوا پربت کا سکوت —
اپنے سایوں کی طرح پیڑ گرے، بہنے لگے
موجیں ٹکرانے لگیں، چور ہوئے سنگِ گراں
سنگِ رہ ٹوٹ کے پسنے لگے بے آہ و فغاں

ایک وہ منزلِ جاں آئی، کہ میدانوں میں
سنگریزے بھی نہ تھے، ریگ تھی مخمل کی طرح
موج کے ریشمیں دامن کا یہ سرا یہ بھی
رفتہ رفتہ دلِ مُردہ کی طرح بیٹھ گیا
بسترِ ریگ پہ بہنے لگا دریا خاموش
اپنے اس کارِ نمایاں پہ سراپا خاموش

پھر یہ تھی منزلِ جاں، ریگ تھی ریگِ ساحل
موج آتی تھی تو سینے سے لپٹ جاتی تھی،
چُوم کر پھر لبِ ساحل کو بہ اُمیدِ وصال
اس کی آغوش میں تصویرِ تلاطُم بن کر
اُس کے قدموں میں بچھی جاتی تھی ریگِ بیتاں —
حسرتِ عہدِ گزشتہ تھی کہ اُس کا پہلو!
دیدۂ تر تھا کہ تر دامنِ ریگِ ساحل!!
اب یہی اس کی تمنا تھی، یہی تھی منزل

آج یہ منزلِ جاں ہے کہ ہوا سے رل کر
ریگِ آوارہ درو بام تک آ پہنچی ہے
چیختی آتی ہے یوں کالی گھٹا کی صورت
جیسے پھر کوہ کہسار پہ جا نکلے گی
جیسے پھر سنگِ سیہ خام بنے گی لیکن
میری آنکھوں میں در آئی ہے، تو کتنے کنکر
میری آنکھوں سے نکل آئے ہیں آنسو بن کر!

منظور حسین شور (علیگ)

الجزائر کی سرزمین

کپکپاتا حرم تھرتھراتے امام
پشت پر تازیانے وہ کھاتے غلام
نوحہ گر غیرتِ مصر و شام و عجم
پا بہ زنجیر دوشیزگانِ حرم
مِٹتے سر، عفتیں، چاکِ داماں شباب
خون چہرے پہ ملتا ہوا آفتاب
خاک اُڑاتی ہوئی عصمتوں کی برات
ٹوٹتا اپنے زخمہ سے سازِ حیات

وہ نقابوں کے شعلے، وہ برقعوں کی آگ
شوہروں کے وہ لاشوں سے لپٹے سہاگ
روتی مائیں سسکتے ہوئے شیرخوار
نالہ کش بیٹیاں صرفِ ماتم مزار
مائیں ڈرتی ہوئی اپنے سائے سے آپ
طوقِ آہن میں جکڑے ہوئے بوڑھے باپ

وہ دہکتے لحد، وہ سُلگتے کفن،
وہ نہاتے ہوئے آگ میں مرد و زن

وہ پگھلتا سا لاوا، وہ پھٹتی زمین
وہ قیامت اُلٹتی ہوئی آستین

ظلمتیں بال شانوں پہ کھولے ہوئے
اہرمن پر خلاؤں میں تولے ہوئے

رات صبحوں کے سورج پہ سایہ فگن
ابنِ آدم کا خوں چاٹتی ہر کرن

گنگناتی قضا، کھلکھلاتا عذاب
بھوکے بچے چباتا ہوا انقلاب

سالِ نو دیکھ! جشنِ شہیداں بھی دیکھ!!
لاشِ انساں پہ انساں کو رقصاں بھی دیکھ!!

قلبِ آدم میں ناسورِ دوراں بھی دیکھ
اپنا نشتر قریبِ رگِ جاں بھی دیکھ

کتنی ماؤں کے منہ ہیں طمانچوں سے لال
کتنے معصوم لاشے ہیں یاں پائمال

اے زمانے کے عفریت کروٹ بدل
اے حوادث کی آندھی ذرا تیز چل!!

اے ہلاکت کے سیلاب بیدار ہو
اے زمیں غسلِ خونیں کو تیار ہو!

اے بغاوت اُٹھ اپنا پرچم اُٹھا
خاکِ زنداں سے پھر شورِ ماتم اُٹھا

وہ اندھیرے کو سورج کی مشعل ملی
وہ گرے چھت وہ دیوارِ زنداں ہلی!!

وہ کھُلے آہنی قید خانوں کے در
وہ اُفق کے دریچوں سے جھانکی سحر!!

اے ہلاکانِ رنج و محن زندہ باد
اے غریبانِ خونیں کفن زندہ باد!!

کھلکھلا اے شہیدوں کے معصوم خوں!
رقص کر اے اسیروں کے جوشِ جنوں!

بیڑیاں الجزائر کی کھلنے کو ہیں!
ایشیا کے سلاسل پگھلنے کو ہیں!!

فارغ بخاری

ردِ عمل

جواں امنگوں سے کس درجہ شرمسار ہوں میں
قدم قدم انھیں کھل کھیلنے سے روکا ہے
بچا بچا کے گنہ کی حسین جنت سے
روایتوں سے جہنم میں ہم نے جھونکا ہے
شباب جلتا رہا نیکیوں کے ایندھن میں
حدیث زہد و تقدس عجیب دھوکا ہے

خلاء دشت و دمن کو جگانے کے لئے
ہزار حیف کہ ہم آفتاب ہو نہ سکے
خود اپنی راہ میں سنگ گراں بنے ہم لوگ
یہ تجربے بھی مگر کامیاب ہو نہ سکے
قدم قدم پہ برہنہ حقیقتیں تھیں مگر
بقدرِ ذوق طلب فیض یاب ہو نہ سکے

رشید الاسلام

سرِ راہے

رباب کا سا تموج، ستار کی سی لے
کہیں کہیں وہ چھلکتا ہوا پیالۂ مے
کوئی ڈھلی ہوئی دھوپ اور کھنچی ہوئی تلوار
کوئی تلاطمِ دریا، کوئی نسیمِ بہار
کوئی حجابِ درونِ حجاب و پردۂ ساز
کوئی تمام تکلّم، کوئی فقط اک راز
کوئی وہ لہجہ جو داؤد کی زبور میں ہے
کوئی وہ تلخیٔ احساس جو شعور میں ہے
کوئی وہ فکر جو آواز میں بدل جائے
کوئی وہ خندہ جو برپا نہ ہو پگھل جائے
کوئی وہ موسمِ سرما کی چاندنی کم کم
کوئی وہ رقصِ جواں، ناتمام اور پیہم
کوئی خیال کی جولانیوں میں خود سے فرار
کوئی ہزار کنایوں میں ایک ہی اظہار
کوئی وہ موجِ رمیدہ جسے خمار کہیں
کوئی وہ سروِ خمیدہ جسے بہار کہیں
کوئی وہ میر کی افسردگی میں تازہ نہال
کوئی تغزلِ خسرو میں آریوں کا جمال
کوئی وہ حرف جو کرنوں کے انتظار میں ہے
کوئی وہ بات جو بجھتے ہوئے شرار میں ہے
کوئی وہ قصہ جو اکثر دراز ہو جائے
کوئی وہ لے جو بڑھے اور ساز ہو جائے
یہ رنگ روپ، یہ سائے، یہ دھوپ چھاؤں، یہ جال
تمہیں شریکِ دو عالم، کہیں خیالِ محال

مصطفیٰ زیدی

ایک بے نام سپاہی کی قبر پر

تیری محراب پہ اے عصرِ کہن کی تاریخ
صرف گوتم کے حسیں بُت کا تبسّم کیوں ہے
کس لئے کیل سے لٹکی ہے فقط ایک صلیب
ایک زنجیر کے حلقے کا ترنّم کیوں ہے
اک ارسطو سے ہی کیوں گوشۂ دانش پُر نور
ایک سُقراط کے سینے کا تلاطم کیوں ہے

تجھ سے ممکن ہو تو اے تاریخِ ایامِ کہن
اپنے گمنام خزانوں کو بچا کر رکھ لے
رات بے نام شہیدوں کیلئے روتی ہے
اِن شہیدوں کا لہو دل سے لگا کر رکھ لے
ماؤں کے میلے دوپٹوں میں ہیں جو آنسو جذب
اُن کو آنکھوں کے چراغوں میں سجا کر رکھ لے

اِسی محراب کے سائے میں کئی ابنِ علی
کئی خونخوار یزیدوں سے ہوئے گرم ستیز
تیرے مسلک میں رہی نام و نسب کی توقیر
تیرا ہیرو کوئی خسرو ہے تو کوئی پرویز
تُو نے اقوام کے انبوہ میں وہ لوگ چُنے
جن میں سے کوئی جہانگیر ہے کوئی چنگیز

ہو گئے راکھ جو پرچمِ انہیں خاکستر سے
سُرخیٔ جرأتِ پروانہ بنے یا نہ بنے
عام شکلوں میں بھی ہے عارضِ سلمیٰ کا جمال
اِن کو بھی دیکھ، صنم خانہ بنے یا نہ بنے
زیست کے جوہرِ نایاب کی تشہیر تو کر
اِس کی تشہیر سے افسانہ بنے یا نہ بنے

(پال ایلوار)
عزیز حامد مدنی

میں نے تیرا نام لکھا ہے۔ اے آزادی

مکتب کی کاپی - پٹّے پر
سادہ کاغذ کے دستے پر
میں نے تیرا نام لکھا ہے

دن کی نانِ سفید کے اوپر
رات کے جادو گھر کے اندر
میں نے تیرا نام لکھا ہے

پیڑوں کی باہوں — پتھر پر
برف کی بجلی سی چادر پر
میں نے تیرا نام لکھا ہے

بیداری میں خوابوں میں بھی
موسم کی محرابوں میں بھی
میں نے تیرا نام لکھا ہے

بادامی کاغذ کے تن پر
راہ کی ست رنگی توڑن پر
میں نے تیرا نام لکھا ہے

نیلے ریشم کے گردوں پر
سورج کی اس جلتے خوں - پر
میں نے تیرا نام لکھا ہے

جانبازوں کے تیغ و سپر پر
سلطانوں کے تاج و کمر پر
میں نے تیرا نام لکھا ہے

اڑتی چڑیوں کے پنکھوں پر
سایوں کی چکّی - چرخوں پر
میں نے تیرا نام لکھا ہے

گرد دشت و بیاباں پر بھی
شاخِ نشیمن داماں پر بھی
میں نے تیرا نام لکھا ہے

کشتی، قلزم، طوفانوں میں
گشت لگا کر سیاحوں میں
میں نے تیرا نام لکھا ہے

طوفانوں کی گرجن پر بھی
کالے بادل کے تن پر بھی
میں نے تیرا نام لکھا ہے

خط و خال کی تکراروں میں
وصل و فراق کی پیکاروں میں
میں نے تیرا نام لکھا ہے

شمع کشتہ پر گھبرا کر
جلتے دیپ کی کور پہ جا کر
میں نے تیرا نام لکھا ہے

ہاتھ میں ہاتھ دیئے جو گھر ہیں
وہ بھی مرے شاہد اکثر ہیں
میں نے تیرا نام لکھا ہے

کمرے کے آئینے پر بھی
ایسے نازک سینے پر بھی
میں نے تیرا نام لکھا ہے

کنول کے میٹھی بند پھلوں کی
اور ہتیلی میں پھانکوں کی
میں نے تیرا نام لکھا ہے

موتی جیسی چندر کرن پر
دھیرے دھیرے اُسکے بدن پر
میں نے تیرا نام لکھا ہے

گرم انگیٹھی کی آنچوں میں
آگ کی چنچل سانسوں میں
میں نے تیرا نام لکھا ہے

یک قالب دو جاں سایوں پر
سایوں میں پنہاں سایوں پر
میں نے تیرا نام لکھا ہے

خوابوں کی کھلتی کلیوں میں
شہرِ تعجب کی گلیوں میں
میں نے تیرا نام لکھا ہے

سادہ و پرکار لبوں پر
خاموشی کی نرم شبوں پر
میں نے تیرا نام لکھا ہے

آبادی میں ویرانی میں
بیم و رجا کی حیرانی میں
میں نے تیرا نام لکھا ہے

ساری فضا کی پیشانی پر
کافوریاں تنہائی پر
میں نے تیرا نام لکھا ہے

تجدیدِ پیماں کی رُت میں
اور مرگِ انساں کی رُت میں
میں نے تیرا نام لکھا ہے

اک بے یاد سفر کی رَو میں
ناامیدی کے پرتو میں
میں نے تیرا نام لکھا ہے

اے جاں اے وجہِ آبادی
گھوم گھوم کر وادی وادی
میں نے تیرا نام لکھا ہے

میں تو کچھ پیدا ہی ہوا تھا
تیری خاطر تیری گلی میں
تیرے نام کی چاہت لے کر
وقت کی محرابِ روشن میں
آخر تیرے نام سے تجھ کو
میں نے پکارا اے آزادی
اے جاں اے وجہِ آبادی،
گھوم گھوم کر وادی وادی،
میں نے تیرا نام لکھا ہے

شہریار

قبرستان

زمیں کا وہ حصّہ
زمیں کا وہ محدود و تاریک حصّہ
زمیں کا وہ حصّہ منوّر ہے دیکھو

جہاں ہے اَزل سے اَبد ہی کا پہرہ
طلسمی چراغوں میں لپٹی ہوئی
عُود و عنبر کی خوشبُو جہاں خیمہ زن ہے
زمانوں کی صدیوں کی لمحوں کی
غمخواریاں جس نے کی ہیں
جہاں ساری تہذیبیں شرمائی سی
سَر برہنہ کھڑی ہیں
جہاں ہم سے خلوت گزیدہ گنہگار بندوں کی
اک انجمن ہے

زمیں کا وہ حصّہ حقیقت ہے اَرض و سما کی
خدا کی خدائی کی
زمیں کا وہ حصّہ کبھی جا کے دیکھو

وصال کی خواہش

کہہ بھی دے اب وہ سب باتیں
جو دل میں پوشیدہ ہیں
سارے رُوپ دِکھا دے مجھ کو
جو اَب تک نادِیدہ ہیں

ایک ہی رات کے تارے ہیں
ہم دونوں اس کو جانتے ہیں
دُوری اور مجبُوری کیا ہے
اس کو بھی پہچانتے ہیں

کیوں پھر دونوں مِل نہیں سکتے
کیوں یہ بندھن ٹُوٹا ہے
یا کوئی کھوٹ ہے تیرے دل میں
یا میرا غم جھُوٹا ہے

تابش دہلوی

ایک جن — ایک آدمی

سُنا ہے یہ پریاں یہ جنّات ہیں قاف کے رہنے والے
جہاں کی زمیں ہے زمرّدکی، نیلم کے ہفت آسماں ہیں
جہاں کی فضاؤں میں ہیں لعل و مرجاں کے طائر پرافشاں
جہاں کی ہوائیں ترنم فروش اور نغمہ زباں ہیں
جہاں دُور تک سیم و زر کے پہاڑوں کا اک سلسلہ ہے
جہاں کے بیاباں ہیں کندن کے، پکھراج کی وادیاں ہیں
جہاں کے درختوں میں لگتے ہیں ہر روز زرّیں خوشے
جہاں انگبیں اور مئے ارغوانی کے چشمے رواں ہیں
جہاں پھول کھلتے ہیں دن رات شاداب چہروں کی صورت
جہاں سرو و شمشاد و آزاد کی شکل میں نوجواں ہیں
جہاں شہر در شہر بستے ہیں زرّیں قبا و سمن رُو
جہاں کو بکو خوش جمالوں کی گنجان آبادیاں ہیں
جہاں صحرا صحرا نجوم و مہ و مہر بکھرے پڑے ہیں
جہاں دریا دریا، گہرہائے نایاب سیلِ رواں ہیں
جہاں موت کوئی تصور نہیں شعبۂ زندگی کا
جہاں عمر کے ملے، عیشِ ابد، راحتِ جاوداں ہیں

مگر اس طلسم طرب تک پہنچنا کچھ آساں نہیں ہے
کہ ان رہگزاروں میں دہشت کے سو دشت و در درمیاں ہیں
یہ سارا علاقہ ہے زیرِ نگیں ایک سردار جن کا
اور ایک ایک قدم پر ہزاروں طلسم و فسوں پاسباں ہیں
مگر ایک تر ترین طوطے میں اس جن کی جاں ہے مقید
یہ طوطا ہے سُولی محل میں کہ ایوان جہاں کے جناں ہیں
اور اس راستے میں ہیں آگ اور خوں کے بہت کوہ و دریا
کہیں کھیت لاشوں کے حائل، کہیں موت کی گھاٹیاں ہیں
مگر آدمی نے تدبر کے ہاتھوں اُسے مار ڈالا
کہاں ہیں وہ پریاں، وہ جن، وہ طلسم و فسوں اب کہاں ہیں
جنوں سے یہ انسان کمزور انسان کتنا بڑا ہے!!
مگر اس زمیں پر جہاں زندگی ہے کہ بکھری پڑی ہے
ہزاروں طلسمات ایک ایک قدم پر عیاں و نہاں ہیں
کہیں عمرِ دو سالی میں تقدیسِ عُمرِ اَبد ہے نمایاں
کہیں سال خوردہ زمان و مکاں آفرینش نشاں ہیں
کہیں ہے نظر، غرب ماہ مبیں، مشرقِ مہرِ منوّر
کہیں چرخِ افکار، و عرشِ تصور، یہی قلب و جاں ہیں
کہیں دیکھتی ہے خرد، قطرہ قطرہ میں نارفتہ طوفاں
کہیں پھول ہیں ناشگفتہ، جنوں کے لئے گلستاں ہیں

کہیں دسترس میں ہیں خوابوں کے لاکھوں طلسمی جزیرے
کہیں دُور آباد رنگیں خیالات کی بستیاں ہیں
کہیں اک گلِ نغمہ سے باز ملتا ہے فردوسِ راحت
کہیں حرفِ شیریں کی سو لذتیں دولتِ دو جہاں ہیں
کہیں اک تبسم میں ہیں زعفران زار پیہم شگفتہ
کہیں اک ترنم سے پیدا فرابات کی وادیاں ہیں
کہیں مہوشوں کے خط و خال میں دیر مستی ہیں پنہاں
کہیں خوش جمالوں کے عشوؤں میں سو کعبۂ جاں عیاں ہیں
کہیں اک نظارہ پہ ہے منحصر حسن جلوہ گری کا
کہیں اک تجلی کے لاکھوں مناظر جہاں در جہاں ہیں
غرض سارے آفاق کی وسعتیں گم ہیں اس آدمی میں
بہت بیکراں روح و جسم و دل و جاں کی پہنائیاں ہیں
نہ معلوم کس کس میں اس آدمی کا دم اٹکا ہوا ہے
حقیقت میں اک ناتواں جان ہے اور دونوں جہاں ہیں
مگر اس کو جن کی طرح مار دینا کچھ آساں نہیں ہے
یہاں تک رسائی ہے مشکل، دو عالم یہاں درمیاں ہیں

جنوں سے یہ انسان کمزور انسان کتنا بڑا ہے!!

محبوب خزاں

دل سے باتیں

یہ جنوں ہے مری ہی خطا . . . . . میں ہی سمجھا نہیں
بن کہے کوئی سُنتا نہیں . . . . . کوئی سنتا نہیں
اُس طرف اُسے بہارِ کرم . . . . . میں نے دیکھا نہیں
رہگزر کہکشاں جائے گی
کہکشاں جائے گی
یہ محبت کہاں جائے گی؟

یہ بُلائے پری چہرگاں . . . . . بیکسی کے لئے
دامنِ حسرتِ جاوداں . . . . . آگہی کے لئے
ہر طرف جوئے مے ہے رواں . . . . . تشنگی کے لئے
تشنگی رائگاں جائے گی
رائگاں جائے گی
یہ محبت کہاں جائے گی؟

حسن احمد اشک

تم آ گئے

اندھیری شب میں کوئلوں کی کوک بن کے آ گئے
اک آگ سی لگا گئے
خیال کو تپا گئے
دلوں کی سونی بستیوں میں کھلبلی مچا گئے
تم آ گئے، تم آ گئے

فضا میں رنگ گھول کر زمیں کی مانگ بھر گئے
اشوک لہلہا اُٹھے
پلاس تمتما اُٹھے
بنوں کے سر پہ شعلہ رنگ اوڑھنی اُڑھا گئے
تم آ گئے، تم آ گئے

ہرے ہرے لباس میں ہزاروں دل دھڑک اُٹھے
کلی کلی کو چومتے
گلوں کے گرد گھومتے
نظر فریب تتلیوں کا خواب بن کے چھا گئے
تم آ گئے، تم آ گئے

نگاہ لوٹنے لگی خوشی بکھرنے لگی
گھروندے دھوپ چھاؤں کے
بنا کے اپسراؤں کے
ہزار دلربا مقام سے چمن چمن بنا گئے
تم آ گئے، تم آ گئے

جمیل ملک

کہی، اَن کہی

(۱)

تو وہ جلوہ ہے کہ جو بھی تجھے دیکھے، وہ کہے
عرش کی چیز سرِ فرش اُتر آئی ہے
تیری خلوت! کہ خداؤں کے قدم جم نہ سکیں
تیری جلوت! کہ قیامت بھی ٹھٹھک کر گزرے
تیری آنکھوں کی چمک ڈولتی جھیلوں کا سکوں
تیرے ہونٹوں کی مہک بولتے رنگوں کی پھوار
جیسے فطرت کے مصوّر نے نکھارا ہو تجھے
جیسے فنکارِ ازل تیری محبّت چاہے
اپنی جنت کو بھلا کر تری جنت چاہے
جیسے تو ایک مسرّت ہو، مگر لافانی
کسی انجان فرشتے کی حسیں نادانی

○

(۲)

سب نے دیکھا ہے مگر کس نے تجھے دیکھا ہے!
کس نے جھانکا ہے تری رُوح کی پہنائی میں!
کس نے چھانے ہیں ترے جسم کے تپتے صحرا!
کون آیا ہے تری چیختی تنہائی میں!
کس نے چھیڑا ہے ترا تارِ نظر بر بطِ دل!
تیری تسکین کے لئے زخمہ و مضراب کہاں!
خود ہی محفل سے الگ، خود ہی شریکِ محفل
تیرے شایانِ ادب وقت کے آداب کہاں!
کاش دُنیا بھی تجھے میری نظر سے دیکھے
اپنے سینے میں چھپائے ہوئے طوفان بھی ہے
تو فقط خواب نہیں زیست کا عنوان بھی ہے

○

شعرِ جلال[1]

(عالی جی کے دوہوں کے جواب میں)

عالی جی کیوں شرماتے ہیں شرمائے ڈیگال
جو راہوں میں سولی گاڑے، بھرے لہو کے تال
بھرے لہو کے تال کہ ان میں ڈوبیں زخمی بیر
بیر جو روسو کی گلیوں میں چھنکائیں زنجیر
چھنکائے زنجیر الجیریا کی اک گھائل نار
گھائل نار کے نرت پہ جھومیں پیرس کے بازار
پیرس کے بازار کہ جس میں پی پی کر شمپین
پی پی کر شمپین بجاتا جائے امن کی بین
امن کی بین بجائے منہ پر رکھ کر گن کی نال
شرمائے ڈیگال ہیں جس کے ہاتھ لہو میں لال
ہاتھ لہو میں لال کہ ان سے بدلے ایسے بھیس
ایسے بھیس کہ روئیں ناریں کھولے اپنے کیس
روئیں کھولے اپنے کیس کہ لٹ گئی ان کی لاج
لٹ گئی ان کی لاج کہ مانگ رہی ہیں اپنا راج

[1] عالی صاحب کے مذکورہ دوہے گزشتہ شمارے میں شائع ہوئے تھے: سب بین بے ہتھیاروں نے بھیجا ہے پیغام
جو نہ لکھے الجیریا عالی اس پہ شعر حرام

اپنا راج کہ جس سے اپنا دیس اُجیارا ہوئے
اُجیاری گلیوں میں آنکھ جھکا کر چلے نہ کوئے
چلے نہ ایسی راہ جو لے جائے الجیریا پار
پار، جہاں سے آکر سولی گاڑے گی بجار
گلی بجار میں بھیروں ناچ پہ دیجے تال پہ تال
مالی جی کیوں شرماتے ہیں شرمائے ڈیگال
شرمائے ڈیگال کہ بھونے کوڑوں سے کنیائیں
کوڑوں سے کنیائیں بھونی جائیں ہنسی اُڑائیں
ہنسی اُڑائیں ہنتوں پر ساونت چلائیں تیر
ہنسی اُڑائیں روسو کے بیٹے ڈھالیں زنجیر
ہنسی اُڑائیں کنیاؤں کے جسموں پر یہ نیل
ہنسی اُڑائیں ہاتھ میں سولی، ہونٹوں پر انجیل
ہنسی اُڑائیں والٹیر کے جیالوں کی سجے ہو
ہنسی اُڑائیں جھوٹا تھا بالکل جھوٹا روسو
ہنسی اُڑائیں امن کی مٹی بین زمانے سن
ہنسی اُڑائیں پی پی کر شمپین زمانے سن
ہنسی اُڑائیں بیڑی توڑتے ہیں اب زخمی شیر
ہنسی اُڑائیں یو۔این۔او کو تکتے ہو گئی دیر
ہنسی اُڑائیں ہونے لگے الجیریا کو نو سال
مالی جی کیوں شرماتے ہیں شرمائے ڈیگال

انجم اعظمی

شریکِ حیات

سخت حالات میں، غم کی برسات میں
زندگی کی اندھیری کٹھن رات میں
کون ہمدرد میرا ہے تیرے سوا
کون جلتا ہے مثلِ چراغِ وفا

رنج و آلام نے جب بھی گھیرا مجھے
غمگساروں نے چھوڑا ہے تنہا مجھے
تیری باہوں میں لیکن سکوں مل گیا
تیری زلفوں کے سائے میں نیند آگئی

گھر میں فاقوں کی نوبت بھی آتی رہی
ہونٹ تیرے سدا مسکراتے رہے
جو سہ وصال میں رنگ بھرتا رہا
زندگی کا وہ افسوں جگاتے رہے

گھر کے ہر فرد کو ایک راحت ملی
میرے بچوں کو ماں کی یہ چاہت ملی
جس نے بخشا ہے جینے کا یہ حوصلہ
عمر بھر کی مجھے وہ رفاقت ملی

زندگی کی اندھیری کٹھن رات ہے
تو ہی تو ہمجاں مرے ساتھ ہے
جس طرف دیکھئے پُر ظلمات ہے
ہاں ترے ہاتھ میں یہ مرا ہاتھ ہے

پاؤں میں اک زنجیر پڑی رہے
میں ہراساں نہیں، میرا سر خم نہیں
راہ دشوار ہے پُر خطر ہے مگر
تو اگر ساتھ ہے تو کوئی غم نہیں

لیکن اک بات کا غم ہے مجھ کو ابھی
اس رفاقت کے باوصف اے جانِ جاں
تجھ کو رکھا ہے مجبور ہر دور نے
بند ہر گھر میں ہے تیرے دل کی فغاں

تیری چاہت جو وجہِ سکوں بن گئی
ہے ابھی تیرے حق میں وہ زنجیرِ پا
توڑ کر ہم کو زنجیرِ رسمِ کہن
آج کرنی ہے تجدیدِ عہدِ وفا

اینٹونیو میکاڈو
ترجمہ :- نظیر صدیقی

اسپین کے لوک گیت

امیر کو اپنا پیٹ بھرنے دو
غریب کو بھوکوں مرنے دو
اور جس کے پاس بستر نہیں ہے
اسے چاندنی میں سونے دو

اگر سمندر ایک بڑی دوات ہوتا
اور آسمان کاغذ کا بنا ہوتا
تو بھی عورت میں جو برائی ہے
اسے پورے طور پر بیان کرنا ممکن نہ

اگر سمندر ایک بڑی دوات ہوتا
اور سارا آسمان کاغذ کا بنا ہوتا
تو بھی یہ بتایا نہ جا سکتا
کہ مرد کی ذات میں کس قدر جھوٹ ہے

بغیر صلے کے محبت کرنا
ایک افسوس ناک بات ہے
لیکن کسی سے محبت کئے بغیر مر جانا
اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے

ڈرامے

نظم

دکان شیشہ گراں — عبدالعزیز خالد
زیب النساء — سلام مچھلی شہری

نثر

دعوت نامہ — حجاب امتیاز علی
کھڑکی — سید احمد رفعت

عبدالعزیز خالد

دکانِ شیشہ گر

(ڈرامائی نظم)

کردار

پنڈورا	....	ہیفاسطس
پروے تھیس	....	ایپی مے تھیس
ہرمس	....	زیئس

بیدلؔ از کلفت شکست منال
بزمِ ہستی دکانِ شیشہ گر است

پروے تھیس نسلِ انسانی کا اولین معلم و محسن۔ طیطان، یوری میدون یا آئے پطس اور پری کلائمینا یا ایشیا کا بیٹا تھا۔ ایپی مے تھیس، اطلس اور مینو طیئس اس کے بھائی تھے۔ طیطان (سورج جنسی) وہ دیو پیکر مخلوق تھی جو تخلیق آدم سے پہلے دنیا میں بستی تھی۔ گروہ قادر اطلس سب سے بڑا۔ سمندروں کے نشیب و فراز کا واقف اور سرزمین اطلانطس کا فرمانروا تھا۔ مغلوب الغضب اور متلون مزاج دیوتاؤں نے ایک حادثہ تنگ میں آکر، طوفان بھیج کر پورے علاقے کو تباہ و برباد کر دیا۔ اطلس اور مینو طیئس بچ نکلے۔ اور گروہ طیطان اور سورج بنسیوں کے ہمرکاب خدایگانِ اولمپس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ زیوس نے مینو طیئس کو تو رعد سے ہلاک کر دیا۔ اور اطلس (حمال سلاہ محیل کرۃ الارضیۃ) کو ابدالآباد کے لئے آسمان برداری کی خدمت پر مامور کر دیا۔

پروے تھیس، اطلس سے زیادہ معاملہ فہم اور عاقبت اندیش تھا۔ اس نے اس گیرودار میں زیوس کا ساتھ دیا۔ اور ایپی مے تھیس کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ دونوں کو اس کارگزاری کے صلے میں یہ منصب جلیل سپرد ہوا کہ وہ انسان اور دیگر حیوانات کو وہ آلات و ملکات عطا کریں جو تحفظ ذات اور تنازع للبقا کے لئے ضروری ہیں۔

پروے تھیس سورج جنسی خاندان کا فرزانہ ترین اسوہ تھا۔ اس نے خود پروہ اشینا سے معماری، ستارہ شناسی، جہازرانی اور علم طب و ہندسہ سیکھ کر ظلوم و جہول انسان کو ان سے روشناس کرایا۔ لیکن زیوس جو بوجوہ نوعِ انسانی کا قلع قمع کر دینے پر تلا بیٹھا تھا۔ اور اب تک محض پروے تھیس کی کہ وفاداری کی وجہ سے خاموش تھا۔ انسان کی روز افزوں علمی و عملی فتوحات کو دیکھ کر غضبناک ہو گیا۔

اور اس نے صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس عطیۂ خاکی کو یکسر آگ سے محروم رکھنے کا فیصلہ کیا۔
پرومے تھیس یہ اطلاع پاتے ہی اتھینا کے پاس پہنچا۔ اور عقبی سیڑھیوں سے اولمپس پر داخلے کی اجازت چاہی۔ اتھینا کو بھلا کیا عذر ہوتا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے سورج دیوتا کی اگنی رتھ سے مشعل روشن کی۔ اور دہکتے ہوئے کوئلے کے ایک ٹکڑے کو سویا کے ڈنٹھل (ساق بادیان) کے گودے دار جوف میں چھپا لیا۔ اور مشعل کو گل کر کے چوری چوری وہاں سے کھسک آیا۔ اور آتے ہی وہ آگ حضرت انسان کے حوالے کر دی۔
زیوس نے آگ بگولا ہو کر انتقام لینے کی ٹھانی۔ اور جوش غضب میں ہیفاسٹس کو بجتی ہوئی خشک مٹی (من صلصال کالفخار) کی ایک عورت بنانے، ریاح اربع کو اس میں جان ڈالنے اور حوران اولمپس کو اسے عروسانہ ناز و ادا بخشنے کا حکم دیا۔
یہ بت ساختہ پرداختہ جس کا نام پنڈورا رکھا گیا۔ حسن و جمال میں اپنی نظیر آپ تھا۔ زیوس نے ہرمس کے ہمراہ اسے اپی مے تھیس کے پاس بطور تحفہ روانہ کیا۔ لیکن اپی مے تھیس نے اپنے بھائی کی تہدید و ترغیب کے زیر اثر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر تو زیوس کی آتش غضب اور بھی بھڑک اٹھی۔ اور اس نے کوہ کاکیشیا کے ایک مینار سے پرومے تھیس کو ننگے بدن زنجیروں سے جکڑوا دیا۔ جہاں ایک مرگھٹا عقاب سارا دن لگاتار اس کے جگر کو نوچتا کھسوٹتا۔ یہ دردناک عذاب کبھی کم نہ ہوتا۔ کیونکہ رات کو جگر پھر صحیح و سالم بن جاتا۔ زیوس نے چہ میگوئیوں کو روکنے اور اس منتقمانہ کارروائی پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ مشہور کر دیا کہ پرومے تھیس اتھینا پر مائل تھا۔ اور کامجوئی کے لئے اولمپس پر دزدیدہ داخل ہوا تھا۔ بر وقت پکڑا گیا اور اب اسے شوق فضول اور جرأت رندانہ کی سزا مل رہی ہے تاکہ وہ دوسرے عشق بازوں کو عبرت ہو۔
اپی مے تھیس اپنے دھرما تما بھائی کا یہ المناک انجام دیکھ کر فوراً پنڈورا سے مناکحت پر رضامند ہو گیا۔ پنڈورا جتنی بدیع الجمال تھی اتنی ہی بدمزاج، خود پسند، بے وقوف اور لذت پرست تھی۔ اس نے آتے ہی اس مرتبان کا ڈھکنا کھول دیا جسے پرومے تھیس نے اس تاکید کے ساتھ اپی مے تھیس کے حوالے کیا تھا کہ زنہار زنہار اس کا منہ نہ کھولنا۔ جہیں تو دنیا میں قیامت برپا ہو جائے گی جلسانی مرتبان میں بڑھاپا، بیماری، محنت مشقت، دیوانگی، فسق و فجور —— یعنی سب دنیوی آلام و مصائب مقید تھے۔ ڈھکنا کھلتے ہی ذل کا ذل مرتبان سے اٹھا اور چاروں اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ بدبلاؤں نے اپی مے تھیس اور پنڈورا کے روئیں روئیں میں کاٹ کھایا۔ اور پھر بے رحم قزاقوں کی طرح بنی آدم کے درپے ہو گئیں۔
فریب آرزو —— افسون انتظار تمنا کہیں جسے، پرومے تھیس نے دوسری آفات کے ساتھ ہی بند کر رکھا تھا بچی رہی۔ تاکہ وہ مایوس و غمزدہ انسان کی سنہرے خوابوں اور طلوع صبح فردا کی خوشنما امیدوں سے مسلسل ڈھارس بندھاتی رہے اور زندگی کے بوجھ کو ناقابل برداشت نہ بننے دے۔
مظلوم پرومے تھیس شاعروں کا محبوب موضوع رہا ہے وہ خلوص و ایثار کا ایسا جلیل و جمیل مظہر ہے جس نے اذیت ناک سزا کے باوجود ابشر کو تہذیب و تمدن کی برکت، علوم و فنون کی سعادت اور خود شناسی کا نسخۂ کیمیا عطا کیا۔ وہ کسی وقت بھی اس قہار و جبار دیوِ استبداد کے سامنے خم ہو کر رستگاری حاصل کر سکتا تھا۔ کیونکہ اسے وہ اسم اعظم معلوم تھا جس سے زیوس کے تخت کا استحکام واستمرار وابستہ تھا۔ وہ اس کے انکشاف سے زیوس کی ابدی خوشنودی حاصل کر سکتا تھا۔ اور اس کا مقرب و محبوب بن سکتا تھا۔ لیکن اس کی ناصبوری اور غیوری نے اس بزدلانہ مصالحت کو جائز نہ رکھا۔ اس استقامت نے اسے عظمت عطا کی اور حلم و برداشت صبر و عزیمت اور ظلم و تشدد کے خلاف سرفروشانہ نبرد آرائی کا عظیم الشان سمبل بنایا۔

(۱)

ہیفاسطس کی کارگاہ

ہیفاسطس :- (پنڈورا کے مجسمے کے سامنے)

حُسنِ تخلیق کا اعجاز ہے یہ پیکرِ گل!
مرے افکار کا آہو کہ تھا آوارہ خرام
تہِ گرداب کہیں قلزمِ مینائی میں
کتنی مشکل سے ہوا دامِ نظارہ میں اسیر
سالہاسال کی مہجور و حزیں جاں کا ہی
آج نیرنگیٔ قدرت سے مجسم ہو کر
دلرُبا یانہ مرے سامنے استادہ ہے
علمِ لازب کا یہ رفتار، دلکشا پیکر
میری تصویرگری، میری قلمکاری ہے!
نہ یہ سونے سے بنا تختِ حرا کی مانند
نہ ہی رعدِ شرر افشاں کی طرح آہن سے
نرم مٹی سے جو چھونے سے لچک جاتی ہے
میرے ہاتھوں نے ابھارا ہے محبت کا وہ نقش
خوب تر حسن کی دیوی بھی نہ ہو گی جس سے
نیلگوں بحر سے جس وقت اُٹھا کر لائیں
مورچھل جھلتی ہوئی بسترِ برگِ گل پر
پئے عرض اس کو اولمپس پہ ریاح ارنج
پیرہن آبِ رواں کا صفتِ لکۂ ابر
جگمگاتے ہوئے رخ پر اثرِ بحر و شعاع
شرمسار اس کے تنِ نازک و بلوریں سے
ریشم و پنبہ و سنجاب و سمور و قاقم
ایسا جادو تو کبھی سانچے میں ڈھالا نہ گیا
کیسا جادو ہے کہ مسحور ہے جادوگر بھی!

زیوس :- کیا ترے کام کی تکمیل ہوئی؟

ہیفاسطس :- ایزدِ پاک!

زیوس :- ہے ترا ساز مگر تشنۂ آہنگ ابھی
رُوح کا سرِ نہاں تجھ پہ عیاں ہو نہ سکا
ساز منت کشِ اظہار و بیاں ہو نہ سکا
کس طرح کُن کی پُراَسرار صدا کرتی ہے
ایک قطرے کو گہر، ایک لطیفے کو بشر
میں نہ چاہوں تو یہ پتھر کے نگارین پیکر
آشنا ہو نہ سکیں لذتِ پیدائی سے
چمنِ دہر کے آئینِ خود آرائی سے
مسلکِ یوسفی و وضعِ زلیخائی سے
جب تلک اس کو میں شناسائے تکلم نہ کروں
اس کو ایام کی بے تابیٔ جاوید نہ دوں
نامکمل ہی رہے گا یہ نقش
ترے گلکارِ خیالات کا عکس

ہیفاسطس :- یہ بھی پائے گا حیاتِ ابدی؟

زیوس :- جسم فانی ہے کہ ہے مظہرِ خاک
مرے انفاس سے وابستہ ہے سررشتۂ روح
اپنے خالق کی طرح رُوح بھی لافانی ہے
رازِ سربستہ کے عرفان سے غمناک نہ ہو
اس کے انداز کو بخشیں گے وہ سرمستیٔ ناز
جب اُٹھے زمزمہ پرداز و فسوں ساز لئے
غیرتِ ماہِ دو ہفتہ یہ عروس شنگول
ہنس کی چال چلے مور کو شرمندہ کرے
نرگسی آنکھ مروڑوں سے لڑے جب یہ پٹے سحر کرے
دمِ گفتار و تبسم کھلیں کچنار پہ پھول

(ہوا کا تیز جھونکا)

ہیفاسطس :- معجزہ تھا کہ ہوا کا جھونکا

در و دیوار نوا سنج ہوئے
نیم وا ہونٹ ہلے ہولے سے
کتنا دلکش ہے بم و زیر نفس
لب جُنبے کوئی لپکے جیسے
ہونٹ گلنار، گلابی چہرہ
قامتِ نازکو جُنبش دے کر
آس پاس اُس نے نظر دوڑائی
اس کی آنکھوں میں ہے دنیائے متحیر آباد
چشم و لب ہیں کہ ایاغ حیرت
موجِ خوں سے لب و رخسار پہ سرخی دوڑی
رگِ افسردہ سے احساس کے شعلے پھوٹے
رُوح کے جوہرِ خوابیدہ نے لی انگڑائی
اور یہ پیکرِ گِل زندہ و بیدار ہوا!
سعی مشکور ہوئی جہدِ ثمر لے آئی!
(پنڈورا پائدان سے نیچے اتر آتی ہے)

(۲)

اولمپس

ل:- (اپنے نعل' پہنتے ہوئے)
غمِ ایّام سے یک لحظہ فراغت نہ ملی
ایک آزار ہے واقع میں جہاں گردی بھی
کوئی پل چین نہیں، جان عجب ضیق میں ہے
آج جس کام کی تکمیل کو میں نکلا ہوں
وہ مگر ہے طرب انگیز خلافِ معمول
طارمِ عرش سے پیغام ملا ہے مجھ کو
جس جگہ رہتا ہے مظلوم پرومے تھی اس
ایک دوشیزۂ نورس کو وہاں لے جاؤں
تاکہ وہ حسنِ جواں سال کی رعنائی سے
اس کے اُجڑے ہوئے گلزار کو آباد کرے
اور افکارِ کم و بیش سے کرکے آزاد
اسے مرہون خمارِ مئے دوشینہ کرے
خلوتِ شب میں بچھائے گل و لالہ کی بساط
صبحدم پیش کرے طشتِ طلائی میں صبوح
غمِ ایّام کو دونوں یونہی بہلاتے رہیں
یونہی منظرگہِ آفاق کو مہکاتے رہیں
آج میں دوشِ صبا پر رقصاں
ایک مظلوم کی دلداری کو
برق وَش نغمہ سرا عطر فشاں جاتا ہوں!

(۳)

(کوہ قاف پر مینارۂ پرومےتھیس)

پرومےتھیس:- نیلگوں بحرِ شفق پوش کی پہنائی میں
چھلکی مینائے سحر، کشتیٔ مہ ڈوب گئی
کہکشاں ماند ہوئی۔ قرمزی موجیں اُبھریں
رات بھر ذہن میں افکارِ پریشاں کا ہجوم
کسی آئندہ مصیبت کی خبر دیتا تھا
مطلعِ خوُر سے اُبھرتے ہوئے خمدار خطوط
آج شاید نئے آلام کا مژدہ لائیں
قہرمانانِ فلک کی ستم آرائی سے
کب تلک مورِدِ آلام رہے گا احساس!

(ہرمس اور پنڈورا دہلیز پر)

پنڈورا:- غیر مرئی کوئی شے ہے۔ جو مجھے روکتی ہے
ایک محبوس فغاں، ایک گلوگیر نوا
ایک ناشاد، پراسرار، حزیں خاموشی
در و دیوار سے ٹکرا کے پلٹ آتی ہے
اور یہ روحِ وفا۔ خستہ۔ شکستہ۔ دلگیر

حوّا بن مجبور کی اک ساکت و جامد تصویر
کتنی ویران ہے یہ انجمنِ تنہائی!
میں تو اس کلبۂ احزاں میں نہیں جا سکتی

ہرمس :- آؤ۔ تسلیم پرومے تھی اس

پرومے تھی اس :- کون؟

ہرمس :- میں ہوں مجھے کیا بھول گئے

پرومے تھیس: تو جو چوروں کا ہے سرخیل سفیرِ فلکی
میرے مسکن میں تجھے کونسی حاجت لائی
کیا کوئی چیز چرانے کے لئے آئے ہو

ہرمس :- تیرا دامن بھی تو آلودہ ہے
تُو نے بھی آگ کی چوری کی تھی

پرومے تھیس: مُنہ اندھیرے ہوئی کیا ایسی ضرورت لاحق

ہرمس :- خالق وقت اسیر سحر و شام نہیں
رب الارباب نے بھیجا ہے مجھے تیری طرف

پرومے تھیس :- کس لئے؟

ہرمس :- عیش و طرب کا سر و ساماں دے کر

پرومے تھیس: دیوتاؤں سے نہیں کوئی عقیدت مجھ کو
اُن کے تحفوں سے مجھے خون کی بُو آتی ہے

ہرمس :- تو مگر عاشقِ حبس و گھٹن و تبعیدی!
دائماً کسوتِ ماتم میں، حزیں جاویداں
سوچ یہ مرمرۂ مرجاں کا حریری پیکر
صبحدم اوس میں بھیگا ہوا برگِ گلِ تر
رنگ و بُو میں سمن و سنبل و ریحاں سے دوچند
کبھی دے سکتا ہے تجھکو کوئی آسیب و گزند

: دیوتاؤں سے مرا جب کوئی یارانہ نہیں
کس تعلق سے قبول ان کے تحائف کر لوں
لاکھ الطاف گرانمایہ ہوں دامن کشِ دل
فقر خوددار نہیں خوگرِ تسلیم و رضا
کون ہے تو؟

پنڈورا :- میں تجھے جانتی ہوں تو گرچہ
مجھ سے ناواقف و آزردہ و برگشتہ ہے

پرومے تھیس :- کس طرح تو ہے شناسا میری!

پنڈورا :- تو ہی تھا محفلِ آفاق کا مشعل بردار
روشنی بخش ولایات و دیار و امصار

پرومے تھیس :- میرا طالع تو خلاؤں میں کہیں ڈوب گیا
وہ بھی احسان فراموش ہی نکلے آخر
دیوتاؤں سے تو پہلے کوئی امید نہ تھی
جب گھٹا ٹوپ اندھیروں نے طرب گاہ ہو گئے
رقص کو آہنی حلقوں میں جکڑ رکھا تھا
میں نے ہی حضرتِ انساں پہ ضیا پاشی کی
اس کے ظلمت کدۂ غم میں بکھیرے انوار
دشت و صحرا کے حسینوں کی حنا بندی کی

وادی و کوہ میں مہتاب بچھیرے ہم نے
لیکن اس سعی سے آخر مرا بنتا کیا تھا
یہ گلوگیر خموشی یہ عذاب جاوید
نہ تلطف، نہ مدارا، نہ نوازش، نہ نوید!

ر :- اُن کا پیمانِ وفا، اُن کا خلوصِ نیت
صفتِ جوہرِ آئینہ ہے آپ اپنی دلیل
اور یہ شاہدِ گل چہرہ ضمانت اس کی
اس پری وش کی طرحداریٔ یعانِ شباب
صحنِ گلشن میں سہی سروِ خراماں جیسے
ترے تاریک نواخانے کو مہکائے گی
چھب تجھے حسنِ گلوسوز کی دکھلائے گی
نت نئی عشوہ گری سے تجھے بہلائے گی

تھیس : دیوتاؤں کی عنایات سے مستغنی ہوں
مجھے حاجت نہیں اس نکہت و ضوپاشی کی
دلِ پُرخوں نہیں پہلو میں جو الاؤ سا ہے
جس سے میں کسبِ ضیا کرتا ہوں
مرے خلاقِ تخیل کی فسوں کاری سے
خود مرے ذہن کا کاشانہ پری خانہ ہے
مرے افکار مرے عزم مرے اندیشے
ہیں مرے گوشۂ عزلت کے رفیق و دمساز

رس :- میری مانو تو نہ بیکار جھمیلوں میں پڑو
روپ رس نوش کرو، غم کو فراموش کرو!
بلم نکالو نہ کوئی فیصلہ کرو اس میں تلاش
سوچ لو پھر کفِ افسوس نہ ملتے رہ جاؤ
کہ خداوندوں کے انعام کو ٹھکراتے ہو
التجائیں نہیں کرتے کبھی اور نگ نشیں

ان کے الطاف فراواں تو عطا کرتے ہیں
اور جو انکار کرے کور نصیبی اس کی

پرومے تھیس :- دیوتاؤں کی کوئی شے کسی صورت میں بھی ہو
موجۂ رنگ کہ نا ظورۂ رعنائے بہار
بے تکلف اسے ٹھکرا دوں گا
جاؤ!

پنڈورا : میں اس جگہ اک لحظہ بھی
اب کسی طور نہیں رک سکتی

ہرمس :- تم کو یہ خواب مبارک ہوں ہیولوں کے غبار
نامرادانہ خیالات کے سنسان دیار
نہ کہیں لحنِ مغنی نہ کہیں صوتِ ہزار
نفرۂ حسن کی بُو باس سے بے گانہ مشام
لذتِ حرف و حکایات سے محروم ایام!

(۴)

فضا

(اولمپس کو لوٹتے ہوئے)

ہرمس :- اپنے مینار کے مانند خموش و تنہا
سرد مضبوط چٹانوں کی صلابت کی طرح
کافرانہ شکن ہے یہ مردِ بے باک
جس کو اب حق کی حمایت ہی بلا سکتی ہے
بطنِ ایتھر سے گزرتا ہوا مانندِ سنال
میں سوئے چرخِ بریں بال فشاں جاتا ہوں
اے خوشا عید تماشا! زہے طغیانِ نشاط!
یہ طراوت گل و غنچہ کی یہ امواجِ نسیم

یہ خلا تاب و شبک سیر شعاع خورشید
مجھ سے ہی زیرِ تصرف ہے یہ اقلیم فضا
جس جگہ آنکھ پھر سرگرم سفر رہتا ہوں!

(۵)

اپی میتھیس کا مکان

اپی میتھیس: آدمی ہے کہ پری زاد کہ بنت مہتاب
ہونٹ شہرت کہ بجا دہ کہ گلنار و گلاب
جتنی جتنی ہیں بھویں، نین کٹیلے کجرار
اوہ کھلے اوہ مندسے رس ریت بھرے نیند آر
انگ میں انگ ہے یا میان سے باہر تلوار
بجنوی گات سنا برق، کچیں کا فوری
کیسے کچن میں بھرا اپنج کے کٹ کا کنچن
شاخِ زریں ہے ترا تام کہ انگور کی بیل
لے سکو چیلی للت، دہ بھری البیلی نار!
تجھے ریجانہ پکاروں کہ کہوں مرجانہ
قدِ رعنا پہ ترے ذوقِ نظر ناز کرے
سرو و شمشاد و سمن کو نظر انداز کرے
حیرت و حسرت و امید کا در باز کرے
کیوں فضاؤں میں ہو آوارہ یہیں رہ جائے

پنڈورا: میں تو اک پیکرِ آب و گل ہوں
اپی میتھیس: تیرے بیساختہ جلوؤں میں طلسمات شہود
ایک مدہوش لطافت ترا سرجوش وجود
بوسے خوبانِ جہاں گوشۂ ملاحت کہ ربود؟

پنڈورا: سب ترے حسنِ نظر کا پرتو
تو مرے حسن سے پہلی ہی نظر میں بے کل

صفت دانۂ اسپند ہوا
اور معلوم نہیں تجھ کو مرا نام و نسب

اپی میتھیس: میں تو پہچانتا ہوں تجھ ازل سے تجھ کو
اور ویرانۂ ایام میں سرگرداں تھا
تیرے انوارِ گریزاں کو پکڑنے کے لئے
میری کاوش نے تجھے پا ہی لیا آخر کار
کتنی مدت سے میں آشفتہ تھا

پنڈورا: یہ مکاں کس قدر آسودہ و خوش منظر ہے
دے رہے ہیں در و دیوار سکوں کا پیغام

اپی میتھیس: یہ در و بام تجھے کہتے ہیں اہلاً سہلاً
یہ شبستاں بھی ترا اس کا مکیں بھی دونوں

پنڈورا: جی میں آتا ہے یہیں عمرِ رواں کٹ جائے
کوئی جادو ہے کیا جس نے مجھے بےخود و مست

اپی میتھیس: اے پدم لوچنی گج گامنی متوالی!
وہی افسوں جو خراماں ہیں ترے جوبن میں
ان کی مستی سے ہیں مخمور یہ کاخ و ایوان
اے بتِ نادرہ فن! اے صنم شعلہ جمال
تیری زلفوں میں ہیں سرگشتہ غزالانِ خیال

پنڈورا: یہ دلآویزی منظر یہ سوادِ دلکش
اسی فردوس میں تا عمر مجھے رہنے دو
آئنہ کار در و بام کی مینا کاری
کیا کسی گنجِ گراں مایہ کی ہے محرم راز
دور کونے میں جو افروزاں ہے
وہ طلا کار منقش صندوق

اس میں کیا تم نے چھپا رکھا ہے
دفن ہیں نیلم و الماس و گہر
یا نہاں اور کوئی قیمتی راز؟

اپی میتھیس:۔ اس میں مدفون ہے کیا خود مجھے معلوم نہیں

پنڈورا:۔ کبھی دیکھا نہیں سرپوش اُٹھا کر تم نے

اپی میتھیس:۔ اس سے مانع ہے مجھے ہاتف غیب
دیوتاؤں کے ہیں وہ راز مقفل اس میں
چشم انساں سے رہیں گے جو ہمیشہ پنہاں
تم ان اسرار کے کیوں درپے ہو
دیوتاؤں نے رکھے ہیں مصلحتاً جو مخفی
جب بھی منظور مشیت ہو اُٹھا دینگے نقاب
چھوڑو اس راز کو آؤ کہیں گلگشت کریں
ناز فرما کمر و کوہ میں ہے شاہد گل
اور نغمات سے لبریز ہے لحن بلبل
کیوں نہ ہم بھی غم اُلفت کے فسانے چھیڑیں
نشہ برساتی ہے مینا کی صدائے قلقل
اور متوار بتاتی ہے بہار سنبل
اسی مدہوش طربناک فضا میں ہم بھی
کیوں نہ پھر حسن و محبت کے ترانے چھیڑیں
ہم بھی گائیں، لب رخسار بھی سرگوشی کریں
آؤ رندانہ خرابات میں مے نوشی کریں

پرومیتھیس:۔ (باہر سے)
ارے کمبخت! کہاں ہو بولو

اپی میتھیس:۔ میرے بھائی نے پکارا مجھ کو
ہائے بیدرد کو کس وقت مری یاد آئی

پنڈورا:۔ دیکھ کر مجھ کو یہاں ہو نہ تکدر اس کو
(درختوں میں چھپ جاتی ہے)

پرومیتھیس:۔ (داخل ہوتے ہوئے)
کس سے تم محو تکلم تھے ابھی؟
دوڑ کر کون درختوں میں چھپا

اپی میتھیس:۔ مری خلوت کی امیں پنڈورا

پرومیتھیس:۔ رائیگاں ہی گئے سب پند و نصائح میرے
حسن کے پردہ میں ہے یہ وہ فسوں کار بلا
جس کے کاٹے کا جہاں میں کوئی منتر ہی نہیں
ہے ابھی وقت سنبھل جانے کا

اپی میتھیس:۔ دیوتاؤں سے عقیدت ہو جنہیں
اُنکے تحفوں کی کیونکر نہ وہ تکریم کریں

پرومیتھیس: دیوتاؤں کا غضب ہو جن پر
پہلے ہوتے ہیں وہ احساس زیاں سے محروم

اپی میتھیس: ان کے اس تحفے کو میں ٹھکرا دوں!

پرومیتھیس: جب کوئی تحفہ بھی آئے ملاء اعلیٰ سے
پائے ہمت سے اُسے ٹھکرا دو۔

اپی میتھیس:۔ کون ٹھکرائے بھلا ایسے حسیں تحفے کو

پرومے تھیس:۔ بنتِ حوا کی فسوں کاری ہے وہ شیشہ گری
جس میں اُلجھے تو نکلنا معلوم!
کہ یہ افیون ہے تریاق نہیں
غالیہ ساخمِ گیسو کی کمند مشکیں
آہوئے دل کیلئے حلقۂ فتراک بھی ہے
آؤ اٹھو مرے ہمراہ وہاں دُور چلو
جس جگہ قاف کے مینار پہ ہے برف کا تاج
نوعِ انساں کے لئے میری نگاہ پہ دیکھو
اس شفقت کو مسرت کا خزینہ سمجھو
تم بھی بن جاؤ زباں دانِ نجوم
کشتیاں کھیتے ہوئے رات کی تنہائی میں
ایک گنجینۂ اسرار ہیں شب زندہ دار
یہ ثوابت یہ بروجِ فلکی یہ سیار
تم بھی باتیں کرو ان افلاک کے دریاؤں سے
اور میتیں سنو شب گیر حدی خوانوں سے

اپی میتھیس:۔ آپ میں جذب ہوا باپ کا زور و قوت
ملا ورثے میں مجھے ماں کا گداز و شفقت

پرومے تھیس:۔ اپنے منصب کو پس پشت نہ ڈالو، اُٹھو
صنفِ نازک کے خیالوں کو مٹا دو دل سے
عیش کوشی سے تن آسانی سے
دلِ ناداں کی غلامی سے نکل کر دیکھو
کلۂ ابر کی عظمت سرِ کہسار بلند
ترے خوابیدہ ارادوں کو بلاتی ہے سُن
ترا قد بھی کلۂ ابر کو چھو سکتا ہے

اپی میتھیس:۔ آبشاروں کی پُر اسرار سبک رَو لہریں
جنگلی پھولوں کی خوشبو سے گراں بار ہوا
کسی انجان سمن پوش جزیرے کا پیام
دیدۂ دل کو سناتی ہیں بصد ناز و ادا

پرومیتھیس:۔ ان کے پیغام پہ لبیک کہو

اپی میتھیس:۔ آپ کے سامنے اک طفلکِ ناداں ہوں میں
آج سے آپ کو پھر راہ نما مان لیا

(۶)
اپی میتھیس کا مکان

پنڈورا:۔ میں یہاں موجِ صبا کی طرح آوارہ ہوا
اس شبستاں سے کہیں بڑھ کے بھی ایواں ہے؟
لطف یہ ہے کہ یہاں میری جہانگیری ہے
لیکن اس کمرے میں کیا جادو ہے
در و دیوار مرصع ہیں چھتیں مینا کا
اور اس کونے میں وہ ایک منقش صندوق
اس میں کیا راز ہے کھلتا ہی نہیں
جی میں آتا ہے اسے کھول ہی ڈالوں
لیکن احکامِ سروشِ غیب
کیا کروں قلب و نظر مضطر ہیں
کتنے چہرے در و دیوار کے آئینوں سے
غمگسارانہ مجھے تکتے ہیں
جی میں آتا تو ہے لیکن پھر بھی
کوئی رہ رہ کے مجھے روکتا ہے
آہ یہ راز کہ جو کھل نہ سکے
چلنے پھرنے سے مرے پاؤں میں ٹیسیں اُٹھیں
شوق واماندہ ہوا۔ چوٹ سی دل میں اُٹھی
سارے اعضائے بدن چور ہیں

کیوں نہ دم بھر کو ذرا سستا لوں
تا کہ جب لوٹے دل آرام مرا
تازہ دم ہو کے اسے پیار سے بہلا بھی سکوں
(سو جاتی ہے)

(چونکتے ہوئے)
کس کی آواز نے خوابوں سے جگایا مجھ کو
دیر مت کر اڑے جاتے ہیں سنہری لمحے
گرچہ سربند کیا ہاتفِ غیبی نے اسے
تجھ کو لیکن نہیں روکا اُس نے
لب کشائی میں زیاں بھی کیا ہے
جب کوئی دیکھنے والا ہی نہیں
اور خداوند اگر دیکھتے ہیں
ان کے ہاتھوں ہی نے تخلیق کیا
تیرے اس پیکرِ خیر و شر کو
اور پھر خود ہی اسے ذوقِ تجسس بخشا!
(صندوق کے پاس جاتی ہے)
اب پس و پیش سے کیا حاصل ہے
زندگی، موت، طرب، رنج و محن کچھ بھی ہو
دل بیتاب سے اب صبر نہیں ہو سکتا!
(ڈھکنا اٹھاتی ہے۔ صندوق سے ایک
کثیف دھواں نکلتا ہے اور کمرے میں پھیل جاتا
ہے پنڈورا بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑتی ہے
— باہر باد و باراں کا طوفان)

(۷)

باغ میں

اپی میتھیس:۔ تھم گیا بارشِ آلام کا طوفانِ مہیب
لیکن اس کی یہ خرابی یہ ہلاکت خیزی
پھول حیراں ہیں پراگندہ ہے بزمِ گلشن
اور سہمے ہوئے بیٹھے ہیں نگارانِ چمن
ہر طرف ایک پُراسرار حزیں سناٹا
عالم آشوب تباہی کی خبر دیتا ہے
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
ترکتازانِ حوادث کی جہاں
آج کل دعوتِ یغمائی ہے
اب تو آثارِ جہاں مٹنے کو ہیں
قہرمانوں سے کہو رحم کریں!

پنڈورا:۔ (مکان سے آتے ہوئے)
میری لغزش سے ہوا حسنِ خیاباں برباد
عندلیبوں کے نشیمن اُجڑے
جل بجھی شمعِ شبستانِ طرب
اور ویراں ہوا کاشانۂ گل

اپی میتھیس:۔ کیا کیا اے بتِ رعنا تو نے؟

پنڈورا:۔ نہیں یارائے تکلم مجھ کو

اپی میتھیس:۔ تری بکھری ہوئی زلفیں ترا اڑتا ہوا رنگ
ہیں کس اندوہِ نہاں کے غماز؟
کیوں مجھے ورطۂ حیرت میں ڈبو رکھا ہے
صاف الفاظ میں کہہ دو آخر
کس لئے بات کو الجھاتی ہو؟

پنڈورا:۔ یہ ہلاکت یہ تباہی مری آوردہ ہے
مری فطرت نے تری حکم عدولی کر کے
فتنۂ خفتہ کو بیدار کیا

ضیا جب ہو نہ سکا میں نے جسارت کر کے
راز سربستہ کا منہ کھول دیا

اپی میتیس:۔ اور اس عالمِ ایجاد کو برباد کیا

پنڈورا:۔ اپنی لغزش کی سزا چاہتی ہوں
میں نہیں عفو و اماں کی طالب

اپی میتیس:۔ تو پریشان ہے ناکردہ گناہ
اصل میں ساری خطا میری ہے
بے خیالی میں ترے حسن سے بے خود ہو کر
کر دیئے فاش وہ اسرارِ نہاں
صبحِ اوّل سے جو سربستہ چلے آتے تھے
اپنے منصب کے بجا لانے میں غفلت برتی
میں نے کیوں تجھ کو اکیلا چھوڑا

پنڈورا:۔ اور چھوڑا تھا جو اک بار تو رہتے رُوپوش
تاکہ بنتا مرے اندیشۂ جولاں کے لئے
مژدۂ مرگِ مفاجات ترا ہجرِ دوام
اور مجھ کو بھی تعزیرِ جنوں کافی تھی
قہر ہا تو مری نا عاقبت اندیشی نے
دین و دُنیا میں کیا مجھ کو ذلیل و رُسوا
کتنا سنگین ہے تجسّس کا فریب
مری تقصیر کی دو مجھ کو سزا

اپی میتیس:۔ مجھ کو بھی
مرے جذبات محبت میں کوئی فرق نہیں
مرا احساس منور ہے ترے جلوؤں سے
تری لغزش بھی ہے اک حُسنِ ادا

اس خطا سے تو بڑھی اور تری محبوبی
تری کمزوری تری سب سے بڑی قوت ہے
جذبِ الفت کو کیا جس نے ترحم آمیز

پنڈورا:۔ مجھے درکار نہیں تیرے ترحم کی زکاۃ
کہ منافی ہے مرے جذبۂ خودداری کے
عشق کی دولت سرمستی و رعنائی کو
اَبلہانہ ہوسِ زیست کی خاطر کھو دوں!

اپی میتیس:۔ کتنا دلکش ہے ترا حُسن مری زہرہ جمال
کنچکی لال انوراگ سے نین انجن سار
سانولی گات ہے مکھ جوت بھی چٹکیلی ہے
اے سلوچن سکمار
تو زمیں زاد نہیں دیوی ہے

پنڈورا:۔ میں تو کمزور سی اک اَبلا ہوں
زندگی جس کی اسیرِ خم و پیچِ تقدیر
لذّت و غم کے عناصر سے اُٹھا جس کا خمیر
سرزنش حرفِ ندامت پہ کرے جس کا ضمیر
ناشکیبائی و پندار و جنوں جس کے مشیر
نہ نشہ ہے۔ نہ خمارِ نگہِ ساقی ہے
بزمِ آفاق میں میرے لئے کیا باقی ہے!

اپی میتیس:۔ نکہتِ لالہ و گُل، حسُن، محبت، تدبیر!
جوشِ کردار سے ہر لحظہ بدلتی تقدیر
اپنے کاخوں کی سُلگتی ہوئی خاکستر سے
آؤ مل جل کے کریں تازہ نشیمن تعمیر
اور پیشانیٔ ایام پہ پھر ثبت کریں
سعیٔ پیہم کے نشاں، عزمِ جواں کی تحریر

پھر سے کاشانۂ دل میں چراغاں کر دیں
اور چھلکائیں بطِ شام و سحر سے تنویر
شوقِ تجدید سے صحرا کو گلستاں کر دیں
ذوقِ تخلیق سے کریں نئی دنیا تعمیر

جذبۂ عشق سے سرگرمیٔ بازارِ حیات
تیرے جلووں سے صباحت یہ جہانِ دلگیر
بزمِ کہنہ کہ خدا ساز تھی برباد ہوئی
محفلِ نو کو کریں خلدِ بریں کی تصویر!

پاکستان رائٹرز گلڈ (حلقہ کراچی) کی پندرہ روزہ

ادبی نشستیں

۱۔ ۳ فروری ۱۹۶۱ء (جمعہ)

صدر	ن۔ م۔ راشد
مقالہ	نثار عزیز
غزل	سلیم احمد
نظم	ساقی فاروقی

نثار عزیز کے مقالہ کا موضوع: مغربی ادب کا اثر ہمارے ادب پر

۱۷ فروری ۱۹۶۱ء (جمعہ)

صدر	شاہد احمد دہلوی
افسانہ	انور
غزل	صادق مدہوش
نظم	انجم اعظمی

۳۔ ۳ مارچ ۱۹۶۱ء (جمعہ)

صدر	حفیظ ہوشیارپوری
ڈرامہ	آغا ناصر
نظم	قمر جمیل
افسانہ	ضیاء الحسن موسوی

نشستوں میں شرکت کی عام اجازت ہے۔ مقام ہوٹل ایکسلسیر۔ صدر۔ ساڑھے ۴ بجے شام۔ ۱۷، ۳ اور ۱۷، ۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء کے پرو
ہم قلم کے اگلے شمارے میں شائع کئے جائیں گے۔

سلام مچھلی شہری

زیب النساء

اوپرا

پہلی کڑی

(پس منظر سے ایک شعر پر وقار، پرسوز اور گہری آواز میں
ابھرتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ پس منظر ہی میں ڈوب جاتا ہے)

شعر بر مزارِ ما غریباں نے چراغِ نے گُلے
نے پرِ پروانہ سوزد، نے صدائے بُلبلے

(ہلکی اور افسردہ موسیقی اور اس کے بعد فوراً
ہی ایک فقیرنی کی آواز ابھرتی ہے)

جوگن (یعنی فقیرنی پرسوز انداز سے گاکر اسی شعر کا خلاصہ پیش کرتی ہے)

اُجڑی ہوئی تُربت پہ پھول نہیں کھلتے
شمع نہیں جلتی
پروانے بھونرے کے پاس نہیں آتے
پنچھی نہیں گاتے
پودے بھی آس پاس کبھی نہیں ہلتے
ہوا نہیں چلتی
اجڑی ہوئی تُربت پہ پھول نہیں کھلتے
شمع نہیں جلتی

(ایک افسردہ ساز اور پھر جوگن یعنی فقیرنی
کی آواز ختم ہو جاتی ہے)

(ساز اچانک بدلتا ہے افسردگی تدریجاً خوشگوار ہو کر
پُروقار بن جاتی ہے۔)

ایک شاعرہ نہیں، اس قبر میں خود ایک حسیں پھول ہے دفن
اور اس پھول کی خوشبو ہے امَر، رنگ امر
جسم خاموش ہے پر روح ابھی زندہ ہے
اور اس روح کی ہے آج کی دنیا پہ نظر
"دورِ جمہور میں" اب دل کا بھی چمکے گا نصیب
"دورِ شاہی میں" محبت تھی کفن پوش اکثر
قبر ویران ہے، پر روح کی آواز ہے یہ
گیت سن، ٹوٹے ہوئے ساز کا افسوس نہ کر!
وہی پھول اور وہی روح، وہی شہزادی
پہلے شبنم کا تبسم تھی تو ہے آج شرر!

(شاعر کی آواز پس منظر میں ڈوب جاتی
اور فقیرنی کی آواز ابھرتی ہے)

جوگن اے شاعر! یہ بات تو سچ ہے پر میں بھی گئی ہوں مان
"نئے کوٹ" کی سُندر بگیا، پھر کاہے ویران
پریم کی جوت کہاں کھوئی ہے، کہاں گئے وہ گیت
کہاں گئی وہ "راجکماری" کہاں گئی وہ شان
کوی! میرا بھی کہنا مانو، سب ہے "مایا جال"
اپنی بھاشا کی یہ "میرا" اب ہے ایک خیال!!

شاعر (حوصلہ اور شان کے ساتھ)

"شاعرہ" زندہ ہے، شہزادی ابھی زندہ ہے
ساتھ ہی یوں کے ذرا دیکھو یہ رقصندہ ہے!

(فضا بدلتی ہے۔ اچانک پریوں کا ایک کورس
اُبھرتا ہے)

پریوں کا کورس

—— زیب النساء ، زیب النساء
—— زیب النساء ، زیب النساء
پریوں کے سنگ چلی زیب النساء !
—— زیب النساء ، زیب النساء
من کی بہار لئے ،
پائل جھنکار لئے ،
اِک جانی پہچانی میٹھی پکار لئے
ٹھہر ٹھہر ، ڈول ذرا تو بھی ہوا !
پریوں کے سنگ چلی زیب النساء ،
زیب النساء ، زیب النساء — !
شبنم کا گیت لئے ،
پیا ملن سنگیت لئے ،
سندر شہزادی کی جلتی ہوئی پریت لئے

جھوم مگر سنبھل سنبھل جھوم اے گھٹا !
پریوں کے سنگ چلی زیب النساء
زیب النساء ، زیب النساء — !!
(کورس پس منظر میں ڈوب جاتا ہے۔ شاعر کی
آواز پھر ابھرتی ہے)
شاعر :۔ (گو بات جاری رکھتے ہوئے)
اور اب جوش میں پھر " لال قلعہ " کہتا ہے
مغلیہ دور کی کچھ بوندکلی ! آجاؤ
شاہزادی کی کنیزوں کی صدا بھی سن لو
ایک کنیز :۔ (محل کے پائیں باغ میں دوسری کنیزوں کے ساتھ ۔
شوخی سے شہزادی کو مخاطب کرتے ہوئے) :۔
اے نگاہوں کی چمک لب کی ہنسی آجاؤ — !

دوسری کنیز :— (شہزادی سے)
آپ خاموش ہیں ، کچھ سوچ رہی ہیں شاید
تیسری کنیز :— (قدرے شوخی سے)
دل کے طوفان میں سکون ڈھونڈ رہی ہیں شاید
شہزادی (کھوئے ہوئے عالم میں ایک پھول کی طرف دیکھ کر)
اے امانی ! گلِ صد برگ چرا می خندد
خاص کنیز :۔ (یعنی امانی)
بر بقائے خود و بر غفلتِ ما می خندد
شہزادی (خوش ہو کر گلے لگاتے ہوئے) :۔
مرحبا ! کیا جواب تم نے دیا
آؤ لگ جاؤ اب گلے بھی ذرا
(یہ کہہ کر دوسری روش کی طرف آجاتی ہے)
ایک کنیز :۔ (دوسری کنیز سے جب کہ شہزادی ذرا
فاصلے پر ہے ، اس مکالمہ میں فارسی کا خلاصہ
پیش کیا گیا ہے) :۔ " شہزادی یہ پوچھ رہی ہیں —
دوسری کنیز :۔ (جلدی سے)
ہرے ہرے پتوں میں سندر پھول بتاؤ کیوں مسکائے !
پہلی کنیز :۔ اور " امانی " بوجھ رہی ہیں —
دوسری کنیز :۔ پھول ہمارے ڈھلتے جیون اور غفلت کا راز بتائے !
(دونوں اب اس روش تک آجاتی ہیں ، جہاں
شہزادی نرگس کا پھول دیکھ رہی ہے)
شہزادی :۔ (پھول توڑ کر اپنی کلغی میں لگاتے ہوئے) :۔
کیسا لگتا ہے ، یہ نرگس کا حسیں پھول تمہیں ؟
ایک کنیز یعنی امانی :۔ (جواب دیتے ہوئے)
نرگس زدہ بر سر داز شوق تو نرگس
خم کردہ رُخِ خویش کہ رخسارِ تو بیند
(دوسری سہیلی ادب کے ساتھ ہنستی ہے)
شہزادی (جواب میں)
این نہ نرگس کہ تو دیدی بسرم دلبر من
تماشائے تو بر دل شدہ چشم از سر من

(یہ کہہ کر آگے دوسری روش کی طرف چلی جاتی ہے)

ایک کنیز:۔ (دوسری کنیز سے گویا شعر کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے)

دیکھ کر کلغی پہ نرگس کے سہانے پھول کو
خواصؔ نے شہزادیٔ عالم سے ہنس کر یہ کہا

دوسری کنیز:۔ (شوخی سے) کیا کہا ——— !

پہلی کنیز (شوخی سے)

سج کے کلغی پر حسیں نرگس کی ہے یہ آرزو
اس بہانے آپ کا رخسار زیبا دیکھ لے !

(پھر ذرا رک کر)

شعر سن کر شاہزادی کی طبیعت خوش ہوئی
اور برجستہ جواب اس شعر کا پھر یہ ملا —!

دوسری:۔ —— کیا ملا —— ؟

پہلی:۔ (شوخی سے)

نہیں، نرگس تو نہیں۔ یہ ہے مری چشم امید
راہ تکتی ہے جو اس طرح کسی دلبر کا —!

(شہزادیٔ اماں کے ساتھ ذرا اور بھی آگے بڑھ جاتی ہے اور پھر فضا دیکھ کر اچانک بہ آواز بلند یہ شعر پڑھنے لگتی ہے)

شہزادی:۔ چہار چیز ز دلِ غم برد، کدام چہار
شراب و سبزہ و آب رواں و روئے نگار

(اسی وقت ذرا فاصلے پر پُر وقار قدموں کی آہٹ ہوتی ہے)

ایک کنیز:۔ (جو ذرا فاصلے پر ہے سہم کر کہتی ہے) اے عالم پناہ آتے ہیں !

دوسری کنیز:۔ میرے تو ہوش اُڑے جاتے ہیں۔

(اسی وقت شہنشاہ سامنے آجاتا ہے)

بادشاہ:۔ (قدرے ترشی سے)

ذرا ہم بھی تو سنیں باغ میں نغمہ کیا تھا

شہزادی:۔ لب پہ یہ شعر ابھی آیا حضور! آیا تھا

(پھر شعر پڑھتی ہے)

چہار چیز، ز دلِ غم بَرد، کدام چہار
نماز و روزہ و تسبیح و توبہ استغفار —!

بادشاہ:۔ بدولت جواب سے خوش ہیں ——— !

(ذرا رک کر)

شعر و نغمہ کی اب اجازت ہے
کوئی پابندی اب نہیں ہوگی
شعراء سے بھی خوش حکومت ہے

(اب شہنشاہ پر وقار انداز میں آہستہ آہستہ جاتا ہے۔ ادھر کنیزوں میں پہلے تو ہیبت طاری رہتی ہے پھر ایک شوخ سہیلی بول پڑا)

ایک کنیز:۔ (شوخی سے) آفریں شہزادیٔ عالی تبار

دوسری:۔ (شوخی سے) آگئی پھر شعر و نغمہ کی بہار

پہلی کنیز:۔ (کچھ سوچتے ہوئے)

ایک دن گانا بھی شاید جرم تھا

دوسری:۔ جب ہوا تھا حکم شاہنشاہ کا!!

(ایک ہجوم آہ و نالہ اور ہائے ہائے کرتا ہوا گزرتا)

بادشاہ:۔ کر رہا ہے یہ ہجوم سرنگوں کیوں آہ آہ؟

وزیر:۔ علم موسیقی کا نکلا ہے جنازہ عالی جاہ!

بادشاہ:۔ (ہنس کر)

خوب، پھر دفن کر دو یوں کہ ابتک کھو جائے

(ذرا رک کر) دیکھنا پھر کہیں دوبارہ نہ زندہ ہو جائے

(ہجوم اسی طرح ہائے ہائے کرتا ہوا گزر جاتا ہے)

پہلی کنیز:۔ آفریں، شہزادیٔ عالی تبار

دوسری کنیز:۔ آگئی پھر شعر و نغمہ کی بہار

شہزادی:۔ (خوشی کے لہجے میں)

چھیڑ لے ناہید! اب اپنا ستار

دوسری کنیز (جس کا نام ناہید ہے)

لیجئے حاضر ہے سازِ اللہ یار

(وہ ستار پر ایک بہاریہ دھن چھیڑتی ہے جو پھر شہزادی پر بعید منظر ختم ہے)

دوسری کڑی

(محل میں چہل پہل ہے۔ کنیزیں خوش ہیں۔)

پہلی کنیز:۔ (دوسری سے جس کا نام کلثوم ہے)
اتنی کیوں شاد نظر آتی ہے میری کلثوم!

دوسری کنیز:۔ بڑی بھولی ہو، تمہیں یہ بھی نہیں ہے معلوم!

پہلی:۔ کچھ تو بتلاؤ، چلو تم تو نہیں ہو معصوم!

دوسری:۔ آج ایران کا شہزادہ ہے آنے والا

تیسری:۔ وہ بھی سنتی ہوں کہ شہزادی کا ہے متوالا

پہلی:۔ جبھی پُر نور فضا ہے تو ہوا ہے گلبار

دوسری:۔ خیر مقدم کے لئے خود ہی شہنشہ تیار

تیسری:۔ کہیں ارگن، کہیں شہنائی، کہیں یادِ بہار

(اسی وقت کچھ سازوں کے نغمے ابھرتے ہیں)

(اب وہ ساز الگ پھر بجنے لگتے ہیں)

(ذرا دیر بجکر یہ ساز اب پس منظر میں ڈوب جاتے ہیں)

دوسرے دن صبح

(ایک کنیز مہمان شہزادہ کے لئے صبح کا بربط
چھیڑتے ہوئے کہ اچانک دھن بگڑ جاتی ہے، اور ایک
تار ٹوٹ جاتا ہے)

شہزادہ ایران:۔ (کنیز سے)
شاہزادی کی کنیز خاص "کس عالم میں ہے؟

کنیز:۔ (ذہانت سے گھبراہٹ پر قابو پا کر)
ایک وہ عالم کہ جو بربط کے زیر و بم میں ہے!

شہزادہ ایران:۔ شاباش۔ تم ذہین ہو میں تم سے خوش ہوا
(ذرا رک کر) اک شعر کہہ رہا ہوں سنا دو "انہیں" ذرا

کنیز:۔ خم ہے سر کنیز کا، ہے حکم آپ کا

شہزادہ ایران (ایک پرچہ دیتے ہوئے)
[illegible] دیکھنا

کنیز (سلام کر کے) [illegible] کا

(کنیز [illegible] جاتی ہے)

شہزادی:۔ تیری شوخی سے کہتا ہے کہ تجھے؟

کنیز:۔ (شوخی سے) پڑھتے ہیں ایک شعر کے دینا ہے وہ مجھے

شہزادی:۔ "بس" تو دل کے پھر سے یہ پردہ اب اٹھے

کنیز:۔ (پرچہ کھول کر شعر پڑھتی ہے)

تراے مہ جبیں بے پردہ دیدن آرزو دارم
جمالِ عالمِ حسنت را رسیدن آرزو دارم

دوسری کنیز (ہنس کر گویا شعر کا خلاصہ پیش کرتی ہے)

بے پردہ دیکھنے کی انھیں آرزو ہے، خوب
جو مل نہ پائے اس کی انھیں جستجو ہے، خوب!

شہزادی:۔ میری طرف سے شعر ہے اک یہ جواب!

(پھر شعر پڑھتے ہوئے)

بلبل از گل بگزرد گر در چمن بیند مرا
بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا
در سخن پنہاں شدم چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

کنیز (شوخی سے) "واللہ کیا جواب ہے، قربان جائیے!"

(پھر گویا شعر کا خلاصہ پیش کرتی ہے)

بلبل جو مجھ کو دیکھے گل کی طرف نہ آئے
دیکھے جو برہمن تو پرستش کو بھول جائے
پنہاں ہوں یوں کلام میں جیسے گلوں میں
میرا سخن جو دیکھے وہی مجھ کو دیکھ پائے

(ادب سے جھکتی ہے)

دوسری کنیز (شوخی سے):۔
چونک جائے گا محبت کا حسین طوفان اب

تیسری کنیز (شوخی سے):۔
چھوڑ دیں گے شاعری شہزادۂ ایران اب

(سب کنیزیں ہنستی ہیں اور پردہ
ختم ہو جاتا ہے)

کوئی جیسے ہو خوابوں کی صہبا میں چور
کہیے کہیے حضور
بھلا اتنا بھی ہوتا ہے کوئی مسرور
ہائے اللہ غرور ــــــ !
اب نہ رکھیے بھرم
کیوں چھپاتی ہیں
پہلے سے واقف ہیں ہم
رخِ سیمیں ؟
نہیں !
لبِ لعلیں ؟
نہیں !
چشمِ رنگیں ؟
نہیں !
یہ چھلکتی نظر ــــــ یہ بہکتے قدم
ان سے واقف ہیں ہم
کہیے کہیے حضور
بھلا اتنا بھی ہوتا ہے کوئی مسرور
ہائے اللہ غرور ــــــ !!
(کنیزوں کی ہنسی کے ساتھ نغمہ آہستہ آہستہ پس منظر میں ڈوب جاتا ہے)
شہزادی (ذرا رکنے کے بعد) :-
مجھے یاد آگیا گزرا زمانہ
ذرا آئینہ تو چینی کا لانا !
ایک کنیز (شوخی سے) :-
ابھی لائی سمجھتی ہوں بہانا
(جاتی ہے اور پھر جلدی ہی واپس آتی ہے کہ آئینہ ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جاتا ہے)
شہزادی (کنیز کو پریشان دیکھ کر)
کیا ہوا آئینہ لائیں یا نہیں؟

کنیز (ڈرتے ڈرتے) :-
از قضا آئینۂ چینی شکست !
شہزادی :- (پیار سے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی)
خوب شد، اسبابِ خود بینی شکست !
شہزادی :- (ذرا دیر رک کر)
جاؤ، اب تم غمزدہ ہونا نہیں
کنیز :- (ادب سے جاتے ہوئے)
شکریہ، صد مرحبا، صد آفریں !
(جاتی ہے)
خاص کنیز :- (یعنی اماں، شہزادی کو تنہا پا کر)
یوں خطا پر بخش دیتے ہیں کہیں !
مستحق تھی یہ سزا کی بالیقیں
شہزادی :- نہیں، یہ بھول تھی اور بھول نہیں ہوتی خطا
کیا ہوا جو کہ اگر ٹوٹ گیا آئینہ
آئینہ حسن کو مغرور بنا دیتا ہے
اور مجھ کو تو یہ رنجور بنا دیتا ہے
(پھر ذرا افسردہ لہجے میں)
جو خوشی میرے لئے چاہتے ہیں ابا حضور
تم کو معلوم ہے وہ مجھ کو نہیں ہے منظور
اب تو ہٹنے کا نہیں دل سے یہ ابرِ اندوہ
جان ہی لے گی مری یادِ "سلیمان شکوہ"
(کچھ یاد کرتے ہوئے)
کس طرح ان کو کیا زعمِ حکومت نے اسیر
کس طرح پاؤں میں ڈالی گئی ان کے زنجیر
کس طرح باپ نے بیٹے کی امیدوں کو ڈسا
زہر کس طرح سے شہزادے نے ہنس ہنس کے پیا
تم ہی بتلاؤ اماں! ایسے میں جیوں کیسے
مجھ کو جینے کی تمنا [illegible] ہے!

گیت گُم، ساز بھی ٹوٹا ہے، میں گاؤں کیسے
کاغذی پھولوں سے زُلفوں کو سجاؤں کیسے
خودکشی کرنے کی سوچوں تو بہادر نہ بنوں
کیا کروں، ایسے میں بتلاؤ مجھے، کیا نہ کروں
(افسردہ سانس لیتی ہے)

کنیز (بیٹی آتی) :-
چاند سے روشنی کی بات کروں — میری مجال!
پھول سے دلکشی کی بات کروں — میری مجال!
(ذرا رک کر)
غم مسرت میں بدل دوں —— یہ کہاں ممکن ہے
درد عشرت میں بدل دوں —— یہ کہاں ممکن ہے
(ذرا رک کر)
اک کنیز ہونے کے ناطے، یہ تمنا ہے ضرور
جب بہار آئے تو مسکرائیں نہ خود اس کو حضور

شہزادی :- (سانس بھر کر) :-
تم شہنشاہ کی ہر بات سمجھ سکتی ہو
وہ اگر صبح کہیں رات سمجھ سکتی ہو
(پھر ذرا رک کر اپنی ہی غزل کا ایک مصرع دہراتی ہے)
:- گرچہ من لیلیٰ اساسم دل چو مجنوں در ہواست
سر بصحرا می زنم لیکن حیا زنجیر پاست
(سانس بھرتی ہے)

کنیز :- (آتی) :-
یہ غزل مجھ سے بھی سن لیجئے زبانِ فکر سے!
(بعد پھر اسی غزل کے چند شعر اردو میں پیش کرتی ہے)

تمنائے صحرا نوردی ہے لیکن حیا جیسے زنجیرِ پا ہو گئی ہے
میں لیلیٰ ہوں لیکن [illegible] ہو گئی ہے
[illegible]
[illegible]

میں اگرچہ بیٹی شہنشاہ کی مگر طبیعت فقیری پہ مائل
اسی زیبِ فقر سے سج سجا کر [illegible]
(غزل ختم ہوتی ہے)

شہزادی :- (سانس بھر کر) :-
اُف! یہ آواز ہے یا رقص میں محوِ گُلِ تر
خیر اب آؤ کریں سیرِ چمن ہی چل کر
(شہزادی اماں کو لے کر بائیں باغ کی طرف جاتی ہے)
(ذرا سا وقفہ جسے مناسب ساز سے پورا کیا جائے :)
ایک کنیز دوڑتی ہوئی آتی ہے)
شہزادی (آتی ہوئی کنیز سے)
یہ اُفتاد کیا ہے جو گھبرا گئیں؟
کنیز :- (خوشی کے جذبے میں)
مبارک ہو تصویریں سب آ گئیں
دوسری کنیز :- (جو اس کے ساتھ آتی ہے)
شہنشہ کو بھی ان میں کچھ بھا گئیں
پہلی کنیز :- ان ہی میں ہے "عاقل" کی تصویر بھی
دوسری کنیز :- (چھیڑ کر) :-
ستاروں میں سورج کی تنویر بھی!
پہلی کنیز :- (خاص انداز سے)
گیا ہے یہ "عاقل" کو فرمان بھی
کہ آ جائیں وہ سوئے بزمِ شہی
(ایک کنیز گویا خوشی سے بے اختیار ہو جاتی ہے اور رقص کے ساتھ یہ نغمہ شروع کرتی ہے۔ اسے کورس کا روپ بھی دیا جا سکتا ہے)
نغمہ :- (رقص کے ساتھ)
دیکھو تیر لگا ہے نشانے پہ
ذرا مسکاؤ، مسکاؤ، مسکاؤ نا!
چل گیا ہے جادو زمانے پہ
دیکھو چھنکاؤ، چھنکاؤ، چھنکاؤ نا

چھٹا منظر

(محل کی ایک جانب ـــ کنیزیں ذرا فاصلے پر ہیں شہزادی
ایک جانب ٹہلتی ہے ۔ اسی وقت چھپ کر عاقل خاں آجاتا ہے
قدموں کی آہٹ)

شہزادی:۔ کون آیا قدم کی آہٹ میں ہے میری پہچانی؟

عاقل:۔ (ادب سے)
غلامِ شاہزادی، کشتۂ الطافِ سلطانی!

شہزادی:۔ (وہی مصرعہ دہراتے ہوئے)
شنیدم ترکِ خدمت کرد عاقل خاں بہ نادانی!

عاقل:۔ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی!

(اسی وقت ذرا فاصلے پر بادشاہ کے آنے کی آہٹ
ہوتی ہے اور ایک کنیز شہزادی کو ہوشیار کرنے کے لئے بہانے
کے طور پر اچانک گانے لگتی ہے۔)

کنیز:۔ (گاتے ہوئے)
سازِ دل ٹھہر ذرا ـــــ!
یوں نہ اب جوش میں آ
کوئی تجھ سے ہے خفا
ٹھہر ذرا۔ ٹھہر ذرا
سازِ دل ٹھہر ذرا ـــــ!!

(بھاری قدموں کے ساتھ بادشاہ اچانک آجاتا ہے)

بادشاہ:۔ (پُروقار انداز میں قدرے غصے کے ساتھ)
کون تھا، کون بتا
ہم نے سُنی کس کی صدا؟

شہزادی:۔ (سہمی ہوئی آواز میں)
جی، یہاں کوئی نہ تھا

بادشاہ:۔ (اور بھی غصے میں)
[illegible]
[illegible]
[illegible]

کنیز:۔ (وہی کلام سہمی ہوئی آواز میں شہزادی کو دیکھ کر)
ہو نہ کر کوئی خفا!

بادشاہ:۔ (اور بھی غصے میں)
حکم ہے ـــ سر کو جھکا
ٹھیک بتا، ٹھیک بتا

" (پھر قہقہہ لگا کر)
ہاں، پتہ چل ہی گیا!
دیگ؟
پھر اس میں ہے کیا ـــ؟

شہزادی:۔ (ڈرتے ڈرتے)
یہ ہے پانی سے بھرا
غسل کرنا تھا ذرا!

بادشاہ:۔ (اسی عالم میں)
آگ گلفام! جلا
خوب جلا، خوب جلا
آج ہے سرد ہوا
گرم پانی ہو ذرا
غسل کا تب آئے مزا
آگ گلفام! جلا
خوب جلا۔ خوب جلا

(قہقہہ لگاتا ہے ـــ آگ جل رہی ہے)

بادشاہ:۔ (اسی عالم میں)
آگ پانی میں ہے جل جائے گا
خیر، تم غسل کرو، لطف بھی آجائے گا!

(بادشاہ قہقہہ لگاتا ہوا۔ چلا جاتا ہے)

ساتواں منظر

(محل کا ایک حصہ۔
بادشاہ، [illegible] عاقل خاں [illegible]
دیکھ کر ہنستا ہے)

[illegible]:- اب تو ہر شے ہی بجا آپ سے خفا لگتی ہے؟
روشن آرا:- (طنزیہ لہجے میں)-
اعلیٰحضرت کو کنیزوں سے دعا ملتی ہے!
بادشاہ:- یہ دعا ہے کہ دعا جانئے کیا ملتی ہے
روشن آرا (طنزیہ لہجے میں)
خیر اب ہجیے سکون بخش فضا ملتی ہے!
بادشاہ:- (شاہانہ انداز میں)
زندگی بن کے ہیں روز قضا ملتی ہے!
روشن آرا (اسی عالم میں)
زرعِ عاقل سے بھی شاید کہ دعا ملتی ہے!
بادشاہ:- حد سے بڑھ جائے جو کوئی تو سزا ملتی ہے
روشن آرا:- (اداس لہجے میں)
سوچئے یہ بھی کہ اب "زیب" کی حالت کیا ہے؟
بادشاہ:- (اسی عالم میں)
اک شہنشاہ نے جو کچھ بھی کیا اچھا ہے!
روشن آرا:- (طنز اور غصے اور اداسی کے ساتھ)
مغلیہ دور کا سورج بھی لرز اٹھتا ہے!
" (پھر ذرا رک کر)
اک شہنشاہ کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے
"زیب" دل رکھتی تھی، عاقل بھی تو دل والا تھا
آپ کے دورِ حکومت نے اُسے پالا تھا
موجِ گل "زیب" کے سینے میں بھی لہر آجاتی
کیا برائی تھی جو اس بار بہار آجاتی
گیت بن جاتی ذرا شوق کی، ارمان کی یاد
اس کے سینے میں نہ رہ جاتی "سلیمان" کی یاد
عمر کی ایسی منازل میں تو خواہش ہو لیتی
کیا برا تھا جو نئے گیت سب وہ کھولتی
بادشاہ:- (اور بھی تلخی کے ساتھ)
ناہدولت کو سناؤ نہ فسانہ دل کا!
ہے خرد ساتھ تو کیا ہوگا بیاد دل کا؟

بادشاہ (ذرا رک کر):-
شعلہ شعلہ ہے سلوک آپ کا بھی ایمان سے
تم کو معلوم ہے "اکبر" بھی ملا دشمن سے
مخبروں نے یہ بتایا ہے کہ "اکبر" کے لئے
ایک خط لکھا ہے خوش ہو کے مری بیٹی نے
(پھر غصے میں)
شاہزادی کو سزا جو بھی ملے وہ ہے کم
گر نے والے ہیں گرفتاری کا اعلان کریں ہم
(اچانک بھاری قدموں کے ساتھ غصے میں چلا جا
آٹھویں کڑی
(محل کا ایک حصہ، پائیں باغ کے قریب — کنیزیں
سرگوشی کے عالم میں بڑی اداسی کا باہم باتیں کر رہی ہیں)
پہلی کنیز:- کتنا ویراں ہے محل، کتنا چمن ہے دل گیر
دوسری کنیز:- (سانس بھر کر)
شاہزادی بھی ہوئیں ہائے حکومت کی اسیر
تیسری:- "سلیم گڑھ" کا قلعہ قید خانہ ہے ان کا
پہلی:- ہر اک زبان پہ لیکن فسانہ ہے اُن کا
دوسری:- خبر نہیں دلِ نازک پہ کیا گزرتی ہے؟
تیسری:- ہماری حور تو تنہائی سے بھی ڈرتی ہے؟
دوسری:- (بے خیالی میں اداسی کے ساتھ پھر کہتی ہے)
خبر نہیں دلِ نازک پہ کیا گزرتی ہے؟
(اسی وقت دور، پس منظر سے فارسی کا ایک شعر
ہے، مانو قید خانہ سے خود شہزادی کہہ رہی ہے)
فارسی شعر:- مخفی! امید رہائی [illegible] حشر نیست
خاکِ غربت ہر کہ را [illegible] گیر شد
(شعر پھر اسی طرح پس منظر میں ڈوب جاتا ہے)
(کنیزوں کی گفتگو جاری ہے)
پہلی کنیز:- (اسی عالم میں [illegible])
وہ اپنے [illegible] میں [illegible]
کہ قید و بند [illegible]

لے گی قید سے سب کو نجات حشر کے دن
اُمید چھینے نہ رکھ اس جہانِ فانی سے!

دوسری کنیز:- یہ ٹھیک ہے کہ آج وہ قیدی ضرور ہیں

تیسری کنیز:- (جلدی سے)
لیکن خدا گواہ کہ وہ بے قصور ہیں

پہلی کنیز:- (تیور سے)
جو پردہ ہے نگاہِ شاہ پر وہ اُٹھ بھی جائے گا

دوسری کنیز:- (تیور سے)
میں کہتی ہوں کہ اب وقتِ رہائی جلد آئے گا

(کنیزیں پھر دوسری جانب چلی جاتی ہیں، اور
کسی دوسرے شغل میں لگ جاتی ہیں)

(کچھ دنوں کا وقفہ جسے مناسب ساز سے پیدا کیا جائے)

(محل میں ایک جانب۔ کنیزیں قدرے سرخوش دکھائی پڑتی ہیں)

پہلی کنیز:- (خوشی کے لہجے میں)
مری شاہزادی رہا ہو گئیں

پہلی کنیز:- (خوشی کے لہجے میں دہرا کر)
مری شاہزادی رہا ہو گئیں

دوسری کنیز:- وہ پھر زیبِ حسن و فضا ہو گئیں

تیسری کنیز:- (تشویش کے لہجے میں)
خوشی پھر الم بن نہ جائے کہیں
شگون اس رہائی کی بہتر نہیں
(ذرا رک کر)
تپِ غم سے افسردہ رخسار ہیں
رہا ہوتے ہی سخت بیمار ہیں
یہاں سب پریشان و رنجور ہیں

پہلی کنیز:- غضب ہے شہنشاہ بھی دور ہیں!

دوسری کنیز:- شہنشہ تو بس تخت کے ہو گئے

پہلی کنیز:- دکن کی فتوحات میں کھو گئے

تیسری کنیز:- یہی سوچ کر آہ بھرتے ہیں ہم

دوسری کنیز:- انھیں کچھ نہ ہو جائے ڈرتے ہیں ہم

تیسری کنیز:- (دکھی آواز میں)
دوا ہو چکی، اب تو یہ ہے دعا

تیسری کنیز:- خدا شاہزادی کو دے دے شفا

پہلی کنیز:- (آگے بڑھ کر)
طبیبِ شہی سے بھی پوچھیں ذرا

دوسری کنیز:- (آگے بڑھ کر)
چلو شاہزادی کو دیکھیں ذرا

(سب اس کمرے میں جاتی ہیں جہاں شاہزادی علیل ہیں
ذرا دیر بعد سسکیوں اور رونے کی آوازیں)

(اسی وقت پس منظر سے خود شاہزادی کے فارسی کے دو شعر
ابھرتے ہیں، یہاں جان کر ان دو شعر کا اردو ترجمہ نہیں پیش کیا
دو شعر (کوئی پڑھ دے)

آہ زیب النساء بہ حکمِ قضا
ناگہاں از نگاہ مخفی شد
منبعِ علم و فضل و حسن و جمال
ہمچو یوسف بہ چاہ مخفی شد

(ایک انتہائی افسردہ موسیقی)

(دو دن کا وقفہ جسے انتہائی افسردہ ساز سے پیدا کیا جائے
محل کا ایک حصہ۔ کنیزیں بہت اداس ہیں)

پہلی کنیز:- (اداسی سے)
وہ غم ہے کہ آکاش تھرا گیا

دوسری ":- خیال اک عجب دل میں لہرا گیا

تیسری ":- "شالا کوٹ" کا باغ یاد آ گیا

پہلی ":- وہ میت اگر سب کو یاد آئے گی

دوسری ":- تو میت بھی لاہور کو جائے گی

(اداس ساز:- جو کہ تو جنازہ جانے کے
EFFECTS دیئے جائیں)

(اب یہ منظر ختم ہوتا ہے)

شاعر :- (سانس بھر کر پُر وقار انداز سے)

اب تم ہی غور کرو اور مجھے بتلاؤ
ایسی شہزادی کسی طرح بھی مر سکتی ہے
غیر فانی ہے محبت تو امر اس کا کلام
وہ بہر رنگ، بہر دور ابھر سکتی ہے

جوگن :- ٹھیک ہے شاعر! یہ بھی ہے ایک جیون کا آغاز
گونج رہی ہے کان میں اب بھی پریوں کی آواز

(فوراً ہی پریوں کا کورس ابھرتا ہے جو شروع میں آ چکا ہے)

پریوں کا کورس

زیب النساء زیب النساء
پریوں کے سنگ چلی زیب النساء
زیب النساء، زیب النساء
من کی بہار لئے
پائل جھنکار لئے
ان جانے پیا کی میٹھی پکار لئے
ٹھہر ٹھہر ڈول ذرا تو بھی ہوا!
پریوں کے سنگ چلی زیب النساء
زیب النساء، زیب النساء ——!
شبنم کا گیت لئے
بیاکل سنگیت لئے
سندر شہزادی کی جلتی ہوئی پریت لئے
جھوم جھوم سنبھل سنبھل جھوم اے گھٹا!
پریوں کے سنگ چلی زیب النساء
زیب النساء، زیب النساء ——!

(کورس آہستہ آہستہ پس منظر میں ڈوب جاتا ہے اور یہیں ڈرامہ ختم ہو جاتا ہے)

حجاب امتیاز علی

دعوت نامہ

افراد

ریحانی ۔	عمر بیس سال ۔ تینوں لڑکیوں کا چچا زاد بھائی ۔ شیخی خور ۔ شوخ لڑکا ۔
صوفی	اٹھارہ سال کی خوبصورت لڑکی ۔
روحی	سترہ سال کی خوبصورت لڑکی
نازی	گیارہ بارہ سال کی پیاری سی موٹی لڑکی ۔ سست ۔ کام چور ۔
پھوپی زیتون	دبلی پتلی اونچی کنجوس بڑھیا
چند ملازم	خانساماں ۔ مالی وغیرہ
مختلف	مہمان لڑکے لڑکیوں کی آوازیں

[بہار کی چمکیلی دوپہر ۔ ڈرائنگ روم ۔ سامنے دیوار میں باغ کا لمبا وسیع دریچہ کھلا ہوا ہے ۔ اس کے دائیں بائیں دروازے ہیں ۔ ایک باغ میں جاتا ہے ۔ دوسرا اندر گھر میں ۔ صوفے ۔ کرسیاں ۔ پیانو ۔ ٹیلی فون ۔ در و دیوار شگفتہ گلابی رنگ کے ہیں دونوں دروازوں پر شگفتہ ۔ زہرہ جبیں رنگ کے پردے آویزاں ہیں ۔ درمیانی کھڑکی پر بہت باریک سفید رنگ کی جالی کا پردہ ہے جو پیچھے کی طرف ہے اور باغ کا منظر نظر آ رہا ہے ۔ درخت پھول ۔ نیلا آسمان]

پردہ اٹھتا ہے تو نازی ایک صوفے سے پیٹھ لگائے قالین پر بیٹھی بڑے اہتمام سے مونگ پھلیاں کھا رہی ہے ۔

نازی (مونگ پھلی کھاتے کھاتے منہ بنا کر) "توبہ بعض مونگ پھلیاں ایسی ہوتی ہیں چھیلو تو ان میں مٹی سی آتی ہے جو بھی کر دو ی ۔"

(ریحانی باغ کی کھڑکی پر سے گزرتا ہوا بائیں طرف کے دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے ۔ اس نے ہلکے بادامی رنگ کا سوٹ اور شوخ رنگ کی ٹائی لگا رکھی ہے)

نازی (ایک مونگ پھلی منہ میں ڈالتی ہے) "بھیا ریحانی تا مے آپ نے بھجوا دئے ؟"

ریحانی (فخر کے لہجے میں) "کبھی کے ! —— میں تم لوگوں جیسا سست نہیں ہوں کہ آج کا کام کل پر ڈالوں ۔ تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو نازی ؟"

نازی - (مونگ پھلی کھاتے ہوئے اطمینان سے) مونگ پھلیاں کھا رہی ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔ نظر نہیں آتا آپکو؟

ریحانی (جل کر، پیٹو کہیں کی (جھک کر دو ایک خود اٹھا لیتا اور کھاتا ہے) "اور یہ صوفی اور روحی کہاں ہیں؟ کل کی پارٹی کا کچھ کام کرتی نظر کیوں نہیں آتیں؟"

نازی (چباتے چباتے) "میں کیا جانوں — ؟"

ریحانی :- آخر یہ پارٹی صرف میرے لئے تو نہیں ہو رہی صوفی اور روحی بھی امتحانوں میں کامیاب ہوئی ہیں۔ جب ہم تینوں کی کامیابی کے سلسلے میں پارٹی ہو رہی ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ساری محنت میں کروں؟"

نازی :- "آپ نے کیا کیا؟"

ریحانی :- (سٹیج کے درمیان کھڑا ہوا ہے) "دعوت نامے ایسے شاندار چھپوائے ہیں نے — کہ جو دیکھے گا عش عش کہہ اٹھے گا۔"

نازی (پلکیں جھپکتے ہوئے تعجب سے) "اچھا بھیا؟"

ریحانی (فخریہ) "ہاں آنکھیں کھل جائیں گی تم سب کی۔"
(ٹہلنے لگتا ہے)

نازی "اچھا بھیا؟ مگر چھپوائے کس نے ہیں بھیا ریحانی؟"

ریحانی (شیخی کا لہجہ۔ چہرے پر مسکراہٹ اور غرور۔ سر اونچا اٹھا ہوا) "ہم نے۔ اور کس نے! اور چھپوا کون سکتا ہے! ایسے دعوت نامے؟"

نازی (مونگ پھلیاں کھاتے کھاتے) "اچھا بھیا؟"

ریحانی "ارے کب تک کھاتی جاؤ گی مونگ پھلیاں نازی اب بھاگو اور میرے لئے شربت کا ایک گلاس لے آؤ" (سر پکڑ کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) "تھک کے چور ہو گیا ہوں۔"

نازی (کھاتے کھاتے ذرا ہنس کر) "تھک کے چور ہونے سے یاد آیا — ایک دفعہ۔"

ریحانی (ایک کشن اٹھا کر اس کی طرف پھینکتا، اور ڈانٹ کر کہتا ہے) "باتیں نہ بنا۔ بھاگ کے کچھ لے آ۔"
(سر دونوں ہاتھوں میں لیکر جھک کر بیٹھ جاتا ہے جیسے تھک گیا ہو)

نازی (سست لہجہ) "توبہ بھیا ریحانی۔ آپ میں یہ بڑی بری عادت ہے۔ ہر وقت کسی کام پر بھگاتے رہتے ہیں۔ یہ لاؤ۔ وہ لاؤ۔"

ریحانی (سر اٹھا کر۔ غصہ کا لہجہ) "کیوں نہ بھگاؤں؟ بھاگنے سے چربی تو پگھلے گی تری۔ گاؤ تکیہ کی طرح پھول رہی ہے۔"

نازی (غصہ اور طنز سے) "اب تو ضرور کروں گی آپ کا کام۔ گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ خود کیسے چٹورے ہیں۔ اور مجھے کہتے ہیں گاؤ تکیہ اور پیٹو۔"

ریحانی "ہر بات پر کیوں کیوں کئے جاتی ہے۔ اری دیکھتی نہیں — صبح سے پھرکی کی طرح گھوم رہا ہوں دعوت کے انتظام میں؟"

(فقرے کے دوران میں غصے سے اٹھ کر بیٹھتا اور پھر نیم دراز ہو جاتا ہے)

نازی۔ (پھلی کھاتے کھاتے رک کر سست لہجے میں) "جہاں پھرکی کی طرح اتنا گھومتے رہے ہو وہاں ذرا فریجیڈیر سے فرنی کا پیالہ اور شربت کا گلاس خود ہی نکال لاتے!"

ریحانی (غصے سے) "کام چور کہیں کی —"

نازی "کام چور —؟" (ہنستی ہے) "ہی ہی ہی۔ اس پر مجھے ایک مزے کی بات یاد آ گئی۔ بتادوں؟"

ریحانی (جمائی لیتے ہوئے بے پروائی سے) "کیا؟"

نازی (ہنستی ہے) "ہی ہی ہی — آپا صوفی کہہ رہی تھیں (ایک مونگ پھلی دانت سے چھیل کر کھاتے ہوئے) کہ تم کام چور اور نوالہ حاضر ہو۔"

ریحانی (غصے سے سر نازی کی طرف پھیر کر) "ایں؟ یہ صوفی کہہ رہی تھیں؟"

نازی (ہنستی ہے) "ہی ہی! اور آپا روحی کہہ رہی تھیں کہ تم

شیخی خور ہو۔ ہر وقت شیخیاں بگھارتے رہتے ہو۔ ہی
ہی ہی —— (ہنستی اور مونگ پھلی کھاتی ہے)
انی۔[غصہ کے مارے اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے] "اچھا؟ —— تو
پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے؟"
ی۔ (ہنستی ہے) "ہی ہی ہی —— پہلے بتاتی تو کیا کر لیتے؟"
انی۔ "کیا کر لیتا؟ —— بس —— (اِدھر اُدھر ہاتھ ہلاتا ہے جیسے
سمجھ میں کچھ نہ آرہا ہو کہ کیا کر لیتا) "تم دیکھتیں کہ میں کیا
کرتا —— چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ان دونوں صاحبزادیوں
کو۔ سر پھر گیا ہے ان لڑکیوں کا (غصہ سے کھڑا ہو جاتا
پھر اِدھر اُدھر بڑبڑاتا ہوا ٹہلتا ہے) "ہوں —— کام چور
اور نِوالہ حاضر —— ہوں —— (حقارت سے ہوں
ہوں کرتا ہے)
زی۔ (یاد دلاتی ہے) "اور شیخی خور ——"
انی۔ (غصے میں ٹہلتے ہوئے) — "ہوں —— ان دونوں نے
مجھے بھی اپنے جیسا کاہل اور بیکار سمجھ رکھا ہے۔ جب دیکھو
سہیلیوں کو فون ہو رہا ہے یا بیٹھی ہا ہا ہا ہا۔ ہی ہی ہی ہی
کر رہی ہیں فضول لڑکیاں ۔ نہ جانے ان دونوں سے
کل کی ضیافت کا اہتمام کیسے ہوگا۔ میں تو اب کسی
کام کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"
زی۔ "کیوں بھیّا؟"
انی۔ (بے چینی سے اِدھر اُدھر پھرتے پھرتے)۔ "کیونکہ میں
نے اپنا فرض نہایت حسن و خوبی سے ادا کر دیا ہے۔ دعوت
نامے چھپوا دیئے اور وہ بھی ایسے کہ جو دیکھے گا واہ واہ کرے گا۔
آنکھیں کھل جائیں گی تم سب کی۔"
(دُور سے صوفی اور روحی کے ہنسنے اور بولنے کی آوازیں آنے
لگتی ہیں)
زی (گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھتی اور پھر رازدارانہ لہجہ
میں کہتی ہے) "بھیّا ریحانی بھیّا ریحانی"
یحانی۔ (چڑ کر) "کیا ہے؟"

نازی۔ "وہ آرہی ہیں آپا صوفی اور آپا روحی —— بھیّا میرا
نام نہ لینا کہ میں نے کچھ کہا"
صوفی۔ (دور سے آواز) "نازی او نازی —— ؟"
نازی۔ "جی آپا صوفی ——؟"
(ریحانی ایک صوفے پر لیٹ جاتا ہے اور چہرے پر کشن رکھ
لیتا ہے۔ گھر کی طرف کے دروازے سے صوفی پہلے داخل
ہوتی ہے۔ ہاتھ میں ناخنوں کو پالش کرنے کا برش ہے اس
کے پیچھے روحی داخل ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں پھول
کی ٹوکری۔ ٹہنیاں اور پتے کاٹنے کی چھوٹی سی قینچی ہے۔
دونوں لڑکیاں جدید وضع کے لباس میں ہیں۔ ایک نے
کاسنی رنگ کا لباس پہن رکھا ہے دوسری نے آسمانی
رنگ کا)
صوفی۔ "ارے —— یہاں بھی نہیں؟"
نازی۔ "کون؟"
صوفی۔ "ریحانی بھیّا صبح سے کہاں غائب ہیں؟ کل دعوت ہے
اور آج یہ حضرت......"
روحی۔ (پھول کی ٹوکری ایک تپائی پر رکھتے ہوئے) "پھر رہے ہوں گے
کہیں بیکار مارے مارے"
صوفی۔ (ایک صوفے پر بیٹھتی اور ناخنوں کو پالش کرنے لگتی ہے)
"ہاں ۔ اور کیا ۔ یا دوستوں میں بیٹھے شیخیاں بگھار رہے
ہوں گے کہ میں نے یہ کر دیا ۔ میں نے وہ کر دیا"
روحی۔ "معلوم ہے گزشتہ ہفتے ان حضرت نے اپنے ایک
دوست سے کیا گپ چھوڑی؟"
صوفی۔ "کیا؟"
روحی۔ (ہنستی ہے) "ہی ہی ہی —— اپنے دوست سے
کہا کہ اس سال آل پاکستان سائنس کانفرنس نے مجھے
اپنا صدر منتخب کیا تھا۔ مگر میں نے معذرت چاہ لی کہ کون
جائے اتنی دُور ڈھاکہ ——"
(دونوں لڑکیاں قہقہہ لگاتی ہیں)

صوفی۔ (ہنسی ختم کر کے آنکھیں پونچھتے ہوئے) "آخر ان کی غلطی کس طرح تمہاری دوست پر۔؟"

روحی۔ "ہوا یہ کہ ان کے دوست نے فون کر کے پوچھا کہ ریحان ڈھاکہ کب جا رہے ہیں۔

—— اس پر مجھے یہ ساری بات معلوم ہوئی پھر میں نے دوست صاحب کو اچھی طرح سمجھا دیا"

(دونوں لڑکیاں زور زور سے ہنستی ہیں)

صوفی۔ "عجیب ہوتی ہیں یہ بھیا ریحان کی شیخیاں بھی —— (پھر ہنستی ہے) تو یہ ہزار دفعہ ہٹے گئے پھر بھی! وہی رفتار بے ڈھنگی"

روحی۔ "مگر صبح سے یہ آل پاکستان سائنس کانفرنس کے صدر صاحب غائب کہاں ہیں؟"

صوفی۔ (ہنستی ہوئی) "گئے ہوں گے ڈھاکہ۔ صدارت فرمانے کے لئے"

نازی۔ (زور سے ہنستی ہے) "ہی ہی ہی ہی —— ادھر دیکھئے آپا صوفی —— ادھر —— وہ"

صوفی۔ "کیا —— ؟"

روحی۔ "کیا رکھا ہے وہاں —— ؟" (یکایک خلاف توقع ریحانی کو وہاں موجود پا کر گھبرا جاتی ہے)

روحی۔ "ہائیں —— ارے بھیا ریحانی۔ کہاں غائب تھے صبح سے ؟"

صوفی۔ (ناخنوں پر پالش کرتے کرتے کن انکھیوں سے ریحانی کو دیکھ کر) "میں تو سمجھی تھی کہ جناب ڈھاکہ تشریف لے گئے ہیں ——"

(ریحانی کشن پھینک کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ غصہ اور شرمندگی کے ملے جلے اثرات کی وجہ سے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں)

ریحانی۔ (طنز) "جی سڑک پر بچوں کے ساتھ گولیاں کھیل رہا تھا۔ (پھر یک لخت کھڑا ہو جاتا اور آواز اونچی کر کے کہتا ہے) "تم دونوں نے آخر سمجھ کیا رکھا ہے مجھے ؟"

روحی۔ (ہنس کر) "دیکھا جو تم ہو —— کھا ہی ہی" (ہنستی ہے)

ریحانی۔ "یعنی! اپنے ہی جیسا نکما اور کام چور ؟"

روحی۔ "ارے —— غصہ تھوک دو۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتی ہیں دعوت کا دن سر پر آ گیا۔ وقت کم ہے۔ کام زیادہ"

ریحانی۔ "کام ؟ میرا جو کام تھا وہ میں کر چکا۔ اب تم جانو یا تم —— دعوت نامے میں چھپوا کر لا چکا ہوں"

روحی۔ (گلدستہ گلدان میں ٹھیک کرتے ہوئے) "ہی ہی ہی —— (ہنستی ہے) تمہاری معرفت جو دعوت نامے ہیں یہی سب بر وقت مل جائیں تو بڑی بات ہے۔ سارے انتظامات تو میں اور صوفی کر ہی لیں گی"

ریحانی۔ "دعوت کی جان تو دعوت نامہ ہوتا ہے۔ بیٹھ کر بنا لینا یا (ہاتھ سے چھپوانے کا اشارہ کرتے ہوئے) اگلے جلسے میں چھپوانا کمال نہیں"

نازی۔ (بیٹھے بیٹھے ہنستی ہے) "ہی ہی ہی ہی ——"

ریحانی۔ (غصے سے) "ارے جاؤ نازی تم۔ فرج کا پیالہ نکال لاؤ فریج کے پیڑے سے"

نازی۔ (دونوں ہاتھ انگڑائی لینے کے انداز میں پیچھے کر کے ہونٹ چباتے ہوئے سست لہجہ میں) "ہائے بھیا فریج بڑی دور ہے کسی نوکر کو آواز دیجئے"

ریحانی۔ (غصے سے) "بھول کر گیا ہو رہی ہے سست کہیں —— اتنا بھی خیال نہیں کرتی کہ دعوت کے لئے کتنا بڑا احسان کر چکا ہوں تم سب پر!"

صوفی۔ (ناخن کا برش روک کر) "ایسا کون سا تیر مار لیا جناب نے۔ ہر وقت احسان احسان کرتے رہتے"

ریحانی۔ (جوش کے مارے کھڑا ہو جاتا ہے) —— "تم کھل جائیں گی دعوت نامے دیکھ کر۔ دعوت ناموں کی عبارت مختصر اور دلنشین۔ چھپائی جیسے نگینے جڑ دئے ہوں۔ کارڈ کا سائز —— ہاہا —— جیسے کنول رسو نے پیتا گیں۔ [illegible] کر ماتھے پہ

سنہری لکیر بھی کھنچوا دی ـــــ"

(ہاتھ میں پتوں کی قینچی پکڑ رکھی ہے کام بند کر کے) ہوں ہوں ہوں ہوں ـــــ سنہری لکیر بھی۔ گھٹیا سی بات "

"بالکل تھرڈ کلاس بات!" (پالش کی شیشی میں برش چھوڑتے ہوئے) "مجھے خود سادہ کارڈ ہی پسند ہیں۔ ان میں ایک قسم کا وقار ہوتا ہے"۔

(بے حد گرم ہو کر) :- "سب تم جیسے زاہد خشک اور کوڑھ مغز نہیں ہوتے"۔

(ہنستی ہے) "ہی ہی ہی۔ کوڑھ مغز۔ آپا صوفی، بھائی بھیا کہتے ہیں آپ کوڑھ مغز ہیں۔ ہی ہی ہی ـــــ"

(چڑ کر) "اب تمہارے دہرانے کی کیا ضرورت ہے بیہودہ لفظ؟ چپ رہو"۔

"نعمت خانے میں سے ایک لڈو تو نکال لاؤ نازی"

"کیا کہا لڈو۔ وہ تو نعمت خانے میں ہیں۔ ہائے بھیا ریحانی! نعمت خانہ دور باورچی خانے میں رکھا ہے۔ کسی نوکر سے کہئے وہ لے آئیگا وہی فیرنی کا پیالہ بھی لیتا آئیگا"

"کب سے بک رہا ہوں کہ تھک کر چور ہو گیا ہوں" (چیخ کر آگے بڑھ کر ڈراتا ہے) "جا کر لاتی بھی ہے لڈو اور فیرنی کا پیالہ ـــــ یا نہیں؟"

(دوسری میز کے پاس پھولوں کو گلدان میں لگا رہی ہے ریحانی کی بات سن کر کہتی ہے) "ہی ہی ـــ تھک کے چور ہونے کی کوئی وجہ بھی ـــ!"

(نازی اچانک ڈر کر کھڑی ہو جاتی ہے اور مونگ پھلیاں قالین پر گر پڑتی ہیں)

(روٹھنے اور رونے کی آواز میں ایک ہاتھ سے ایک آنکھ ملتی ہوئی) "اوں۔ اوں۔ مری ساری مونگ پھلیاں گرا دیں ـــ" (بھاگ جاتی ہے)

(ہنستی ہے) "ایسے ملے فرش تو صاف کرتی جاؤ ... ہر طرف مونگ پھلیاں بکھیر دیں"

(جھک کر دو چار چن لیتا ہے اور چھیل چھیل کر کھاتے ہوئے اپنا جملہ مکمل کرتا ہے) اں تو ـــ میں نے ابھی پوچھا نہیں کیا (چھیل کر پھلی کھاتے

ہوئے) "ان دعوت ناموں میں جدت کیا ہے ـــ (جھک کر پھلیاں اٹھاتا ہے) کہ بائیں کونے پر باریک حروف میں ضرور ضرور تشریف لائیے لکھوا دیا" (فخر سے ہنستا ہے) :- "ہی ہی ہی۔ بتاؤ تم دونوں کو سوجھے ایسے نسخے؟"

[مونگ پھلی جلد جلد کھاتا ہے]

روحی۔ (پھولوں کو ہاتھ میں لے کر ایک سے دوسری میز پر جاتے جاتے رک کر) "کس قدر گھٹیا بات ہے ریحانی۔ اب تمہیں اتنا خیال نہیں آیا کہ اس طرح اپنی دعوت پر کسی کو اصرار کر کے اور ہاتھ (اشارہ کرتی ہوئی) اس طرح جوڑ جوڑ کے بلانا ـــــ کہ حضور ضرور ضرور تشریف لائیے۔ اپنی کمتری کو مشتہر کرنا ہے"

[تیزی سے میز کے پاس پہنچی اور قینچی سے پتے کاٹنے لگتی ہے]

صوفی۔ (ناخنوں میں کیوٹکس کرنے میں لگی ہے۔ ذرا ہنس کر پھر بولتی ہے) ہی ہی۔ تمہارا جو کام ہے وہ الٹا ہے"

[نازی ایک ہاتھ میں فیرنی کا پیالہ اور دوسرے میں شربت کا گلاس لئے غصے سے اندر داخل ہوتی ہے]

نازی۔ [روٹھے ہوئے ناراض انداز میں] :- "لیجئے شربت کا گلاس اور فیرنی کا پیالہ"۔

ریحانی۔ (خوش ہو کر) :- "واہ واہ ـــ (گھبرا کر) :- "ارے۔ اور لڈو نہیں لائیں؟"

نازی۔ (جل کر) :- "وہ رکھا تو ہے لڈو۔ فیرنی کے پیالے پر ـــــ لیجئے ٹھونسیے"۔

[دونوں چیزیں ریحانی کی ناک کو لگاتی ہے]

صوفی :- ہائیں ہائیں زبان سنبھال کر نازی ـــــ یہ لڑکی تو گئی ہاتھ سے"

ریحانی۔ (چیخ کر) :- "رکھ دو ساری چیزیں میز پر ـــــ ٹھونسنے کیا۔ نوش فرمائیے کہو"

نازی۔ (طنز سے) "جی ہاں ـــــ" [پھر جھک کر قالین پر دیکھتی ہے] ہائے۔ مری مونگ پھلیاں ـــ آنکھ بچا کے سب

نے ختم کرلیں ریحانی بیٹا "

ریحانی۔ (شتی ان سنی کرجاتا ہے۔ جھک کر لڈو اٹھاتا اور جلدی جلدی کھاتے ہوئے کہتا ہے) :۔ "کل ختم پارٹی میں کچھ لینا مہمان دعوت ناموں کی خوبصورتی کا ذکر نہ کریں، تو جو سزا چور کی ـــــ" [لڈو چباتا ہے]

صوفی۔ [اپنا ایک پاؤں سامنے کی کرسی پر رکھ کر پاؤں کے ناخن کو پالش لگاتے ہوئے ہنس کر] "کہاں ہیں آخر وہ عجیب غریب دعوت نامے جس سے تم ساری دنیا کو حیرت کے سمندر میں ڈبو رہے ہو ؟ ہم بھی ذرا زیارت کرلیں ان کی "

ریحانی۔ [شربت پیتے پیتے] :۔ "اب تو شاید دو ایک ہی رہ گئے ہیں۔ ہفتے کے روز جاوید کے ہاں بیٹھ کر تمام لفافوں کے اوپر پتے اس سے ٹائپ کرائے اور اُسی وقت سب ڈاک میں ڈال دیئے "

روحی :۔ "چند ایک تو رکھ لئے ہوتے احتیاطاً۔ کئی بار عین وقت پر کسی دور کے رشتہ دار کا خیال آجاتا ہے "

صوفی :۔ "خیال کیا آجاتا ہے۔ عین پارٹی کے دوران میں خود رشتہ دار آ ٹپکتا ہے اور ایسے لوگوں کو عین وقت پر مدعو کرنے کے لئے ضرور ایک آدھ کارڈ رکھ لینا چاہیئے"

روحی (یکایک خیال آجاتا ہے) ارے ریحانی۔ تم نے دعوت ناموں میں یہ بات بھی واضح کردی تھی کہ یہ پارٹی ہم تینوں کی طرف سے اپنے اپنے امتحانوں کی کامیابی کے سلسلے میں ہے ؟"

ریحانی۔ [لڈو چبا کر شربت کا ایک گھونٹ لیتا ہے۔ فخریہ لہجے میں] :۔ "میں تم لوگوں جیسا نہیں کہ ضروری باتیں بھولتا رہوں ـــــ" [گلاس میز پر رکھ کر فیرنی کا پیالہ اُٹھا لیتا ہے] :۔ "سب باتوں کا خیال کرلیا تھا۔ [نازی کی طرف پلٹ کر جو زمین پر بیٹھی مونگ پھلیاں چُن رہی ہے] ارے تجھ تو دو نازی۔ اپنی اُنگلی سے

کھاؤں گا یہ فیرنی ؟" [بے چینی سے ایک انگلی پر مارتا اور پھر چکھتا ہے]

نازی۔ (سست لہجہ) :۔ "تو یہ بھیا ریحانی۔ بہت ہیں آپ۔ اتنی دور پھر جاؤں چمچہ لانے ؟ میری شل ہوگئیں۔ آپ خود کیوں نہیں لاتے چمچہ ؟ اسی لئے آپا روحی نے آپ کو کام چور کہا تھا !"

روحی۔ [ڈر کر ریحانی کی طرف دیکھتی ہے] ارے واہ۔ میں نے کب کہا تھا ؟ [بات ٹالنے کے لئے] یہ وقت بے وقت ناشتے کیوں ہو رہے ہیں

نازی [ستم رسیدہ آواز] :۔ "دیکھئے نا آپا روحی۔ کہتے ہیں دعوت نامے چھپوا کر بہت بڑا احسان کرچکے ہیں۔ جیسے پہاڑ کھود کر دعوت نامے نکا

ریحانی :۔ "زیتون پھپھو نے اس لڑکی کو بہت سر چڑھا ہے۔ [فیرنی انگلی سے کھاتے ہوئے] :۔ "محنت تو دیکھو نا ـــــ احسان کچھ کم ہے ! کارڈ خریدنا۔ چھاپے خانے کے چکر۔ پھر پتے ٹائپ کرانا۔ لفافے میں ڈالنا ـــــ"

نازی (طنز) پھر لفافہ بند کرنا ـــــ"

ریحانی۔ (چیخ کر) :۔ "چل بھاگ یہاں سے "

[نازی بھاگ جاتی ہے]

ریحانی :۔ "اور پھر سارے لفافے میں نے خود اپنے ڈاک میں ڈالے ـــــ مٹھاس کچھ کم ڈالی ہے خانساماں نے۔ [مزہ لیتا ہے] غرض تو یہ دعوت ناموں کا کام بھی ـــــ" [فیرنی کھاتا ہے]

صوفی۔ [یکایک یاد کرکے] ارے روحی۔ کرایہ کے لئے ٹیلیفون کردیا تھا تم نے ؟"

روحی :۔ تنگ کرتی ٹیلیفون۔ زیتون پھپھو کی کنجوسی بڑھتی جاتی ہے۔ کہتی ہیں تینوں کو کرانے کے

رکھنا فضول خرچی ہے"

ی :۔ "ارے واہ ——" [قینچی کھاتا ہے]

ن ۔ "تو گھر میں دو درجن گلدان کہاں سے نکل آئیں گے ؟"

ی :۔ "شاید پھوپی زیتون کا خیال ہے" (قینچی کا مزہ لیتے ہوئے) غسل خانے کے لوٹے میں پھول سجائے جائیں گے [تمکی سے ہنستا ہے] —— حد ہو گئی حد ——" [اسٹیج کے آخر میں جاکر دیوار کی طرف منہ کر کے قینچی کھاتا ہے]

ی :۔ "قریب ہی تمہیں پانی پینے کے ٹوٹے گلاسوں سے کام چل جائے گا"

ی ۔ [بے اختیار ہنس پڑتی ہے] :۔ "ٹوٹے گلاس —— پانی نہ نکل آئے گا ان میں سے ؟"

ن پھوپی [دور سے موٹی آواز] :۔ "اے روحی بٹیا ۔ اے صوفی بٹیا ۔ کدھر ہو تم سب ؟"

[دروازہ کھلتا ہے ۔ پھوپی زیتون داخل ہوتی ہیں ۔ دبلی پتلی بوڑھی عورت ہاتھ میں ایک بہت ہی پرانا موزہ رفو کرنے کے لئے پکڑ رکھا ہے ۔ کپڑوں سے اور کپڑوں کے بے جوڑ رنگ سے کنجوسی ظاہر ہوتی ہے ۔ اس کے پیچھے نازی ہے]

نی :۔ "پھوپی زیتون آپ نے نازی کو بہت سر چڑھا رکھا ہے ۔ کہتی ہے میں کام چور اور نِکھٹو ہوں" [حقارت سے] "ہوں ——" [قینچی کھاتا ہے]

ی ۔ (روتے ہوئے) "اوں اوں —— میں نے کب کہا تھا یہ ؟ روحی آپا نے کہا تھا کہ آپ کام چور اور نِکھٹو ہیں ——"

ی ۔ (ڈر کے ریحانی کو دیکھتے ہوئے) :۔ "نکل گیا بھیا میرے منہ سے ۔ اب دہرانے کی کیا ضرورت تھی ؟"

زیتون [صوفے کے ایک سرے پر بیٹھ کر رفو کرتے ہوئے] "ریحانی بیٹے ۔ ایک کام نہیں کرتے ۔ روحی بٹیا کی ضد ہے کہ کل چار کی میزوں پہ پھول ضرور ہونے چاہئیں ۔ مگر دو درجن گلدان کہاں سے آئیں گے ——"

ریحانی :۔ "گلدان سے آئیں گے اور کہاں سے آئیں گے"

پھوپی :۔ "لے ہے ۔ دو درجن گلدانوں کا کرایہ تو بہت زیادہ ہو جائے گا ۔ اور پھر پھولوں کو دیکھتا کون ہے جب کھانے کی چیزیں سامنے ہوں ————"

روحی :۔ "کوئی دیکھے یا نہ دیکھے کل ضرور ہوں گے پھول اور پھولدان میزوں پر ——"

پھوپی زیتون ۔ "میں کہتی ہوں یہ سب خواہ مخواہ کے خرچ ہیں ۔ اس لئے تم کسی کباڑیے سے کیوں نہیں لے آتے ذرا ۔ ان کے ہاں بعض وقت ایسی چیزیں کوڑیوں کے مول مل جاتی ہیں ——"

نازی ۔ (کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے) :۔ "ہائے ہائے کباڑیا" (پھر ہنستی ہے) "عشقی پور روحی آپا ! کباڑیے کے ہاں سے آپ کی پارٹی کے گلدان آئیں گے —— ہی ہی ہی" (ہنستی ہے)

ریحانی ۔ [غصے سے] :۔ "اس قسم کے کام آپ ان لڑکیوں کے سپرد کیجئے زیتون پھوپی ۔ میرا کام دعوت نامے چھپوانا تھا وہ میں کر چکا ہوں"

زیتون :۔ "دعوت نامے ! غضب خدا کا —— ان کے چھپوانے کی آخر کیا ضرورت تھی ؟ شادی بیاہ کا موقع تھوڑا ہی تھا کوئی یہ خواہ مخواہ کے خرچ ہیں"

روحی ۔ (غصے سے) :۔ "تو پھر دعوت کی اطلاع کیسے ہو جاتی ٹیلیفون تو آپ کرنے نہ دیتیں ۔ کہ خواہ مخواہ کے خرچ ہیں ——"

[غصے سے پھولوں کا ایک گلدستہ قالین پر پھینک کر دوسرے گلدان کی طرف جاتی ہے]

زیتون :۔ "ریحانی اپنی سائیکل پر جا کر سب سے زبانی کہہ آتے ۔ آخر بھیا چھاپے خانے اور خرچ سے بھی بچ جاتے"

ریحانی ۔ (بے حد گرم ہو کر) :۔ "بس اب رہنے دیجئے زیتون پھوپی ۔ ہر وقت آپ کو روپے کی پڑی رہتی ہے ۔ دو دن سے اتنی دوڑ دھوپ اور محنت کر رہا ہوں —— کسی کو کیا معلوم ——" [غصے سے سٹیج کے آخر میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے]

صوفی :۔ "تم نے دعوت ناموں کا کام کیا ہے تو میں بھی کچھ بے کار

نہیں بیٹھی رہی۔ میں فون کر کے "باپ بیٹا" کمپنی کو شامیانہ

اور قناتوں کے لئے کہہ دیا ہے۔ دونوں چیزیں آج دوپہر

چھکڑے پر لد کر پہنچ جائیں گی۔ تاکہ کل صبح صبح لگ جائیں۔"

زیتون :- "ارے ہے شامیانے کے نیچے تو دم گھٹ جائے گا۔

اس کی ضرورت نہیں۔ منع کر دو فوراً۔"

روحی :- "اور میں نے کرسیوں اور میزوں کے لئے بھی "باپ بیٹا"

کو تاکید کر دی ہے کہ بہت اچھی رنگین کرسیاں ہوں اور

آج شام پہنچ جائیں۔"

ریحانی :- "گلدان بھی "باپ بیٹا" سے منگوا لیتیں ——"

زیتون :- "اب خدا کے لئے چھوڑ دیجیے ان باپ بیٹوں کو۔ کرسیوں

کی آخر ضرورت کیا تھی روحی بیٹیا؟ خواہ مخواہ کے خرچ ہیں۔

——"

ریحانی۔ (غصے سے) :- "تو کیا مہمانوں کو درختوں پر بٹھایا جائے؟

یا باغ کی دیوار پہ؟"

زیتون پھوپی :- "ارے ناراض نہ ہو جاؤ ریحانی بیٹے۔ میں کہہ رہی

تھی آجکل کھانا ٹہل ٹہل کر کے کھلا دیا جاتا ہے۔ یہ تو چائے

ہے۔ بغیر کرسیوں کے کام بآسانی چل سکتا تھا۔ علاوہ ازیں

میزوں کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔"

ریحانی :- "تو دسترخوان میں اپنے سر پہ بچھاؤں گا؟"

نازی۔ [زور سے ہنس پڑتی ہے] :- "ہی ہی ہی ہی —— کھانے

کی پلیٹیں آپ کے سر پہ چنی جائیں گی اور مہمان درختوں

پہ بیٹھیں گے۔ ہی ہی ہی ہی ——"

ریحانی۔ (غصے سے) :- "چپ رہو نازی تم ——"

پھوپی زیتون :- "بیٹے جب چیز گھر میں موجود ہے تو پھر باہر سے

کیوں منگوائی جائے؟ خواہ مخواہ کے خرچ ہیں۔ کھانے

کے کمرے سے ایک میز باہر نکال لی جاتی، دوسری

میز پینٹری میں پڑی ہے۔ ایک باورچی خانے میں ہے۔"

روحی۔ (ہنستی ہے) :- "توبہ توبہ۔ پینٹری کی وہ گندی کالی میز؟"

پھوپی زیتون :- "اس پہ سفید چادر بچھا دو ——"

نازی۔ (ہنستے ہوئے) :- "ہی ہی ہی تاکہ اس کا میل چھپ

جائے۔"

زیتون :- "تم دخل نہ دیا کرو بڑوں کے معاملوں میں" (رکا

ارے ہاں —— تم لوگوں میں سے کسی نے [illegible]

کے لئے بھی کہہ دیا ہے؟"

صوفی :- "کیس کا"

ریحانی :- "شاباش!"

زیتون پھوپی :- "ارے نہیں نہیں۔ بیروں کی کیا ضرورت

—— خواہ مخواہ کا خرچ ——"

ریحانی :- "تو پھر پلیٹیں کون پیش کرے گا۔ بوتلیں کون کھول

دے گا؟ مالی اور مہتر؟"

زیتون پھوپی :- "تم تو یونہی ناراض ہو جاتے ہو ریحانی بیٹے۔

نازی پلیٹیں تقسیم کر دے گی۔ صوفی مہمانوں [illegible]

مٹھائی وغیرہ پیش کرتی رہے گی۔ روحی ایک [illegible]

ہو کر سب کے لئے چائے بنا دے گی۔ تم ایک درخت [illegible]

کھڑے ہو کر کوکا کولا کی بوتلیں کھولو گے۔"

ریحانی۔ [ریحانی خشمگیں نظروں سے لمحہ بھر کو پھوپی کو دیکھتا

"ہوں" "ہوں —— ایک درخت کے پیچھے

ہو کر!"

روحی :- "خیر میں نے "گول گپا" اسٹور والوں کو فون کرنے

کے لئے کہہ دیا ہے جو کل دوپہر ڈیڑھ دار پگڑی اور بڑا

سفید اچکنیں پہنے یہاں پہنچ جائیں گے۔"

زیتون (شدید غصے کی آواز) :- "میں کہتی ہوں گھر لٹا دو گی

مہمانوں کی خاطر؟ "گول گپا" کا ایک ایک بیرہ [illegible]

سے کیا کم لے گا؟

صوفی :- "پانچ لے خواہ دس۔ میں بلا سکے رہوں گی بیروں کو

پر زیتون پھوپی نے [illegible]

زیتون :- "ارے تم لوگوں کی یہ بات ہے [illegible] اور [illegible]

ہے۔ یہ بیرے لوگ ایک تو [illegible] پھر [illegible]

نازی ۔ (سست لہجہ) ہائے بجیا ۔ بڑی دور ۔ آپ کے
کوٹ کی جیب میں ہو گا قلم ۔ آپ خود جا کر لے آیئے نا "
ریحانی :۔ " تمہیں کبھی بھی کل تمہیں جام کی میز پر آنے کی اجازت
ہرگز نہ ملے گی ۔ سن لیا ؟ "
نازی ۔ (روٹھ کر) :۔ " اوں اوں اوں اوں ——— میں ضرور
آؤں گی جام کی میز پر ۔
(صوفی ناخنوں پہ پالش کرتی ہوئی آتی ہے)
ریحانی ۔ (میز پر سے پنسل اٹھاتا ہے) :۔ اچھا روحی اب بیٹھو یہاں
آ کر ——— میں لکھواتا ہوں فہرست ۔ تم بھی تو کچھ سوچنا صوفی
ناخنوں پر پالش پھر کر لینا "
صوفی ۔ (غور سے اپنے ناخنوں کو دیکھتی ہے) :۔ " ناخنوں پر پالش
کہاں کر رہی ہوں ۔ دیکھ رہی ہوں جو رنگ اس وقت میں
نے لگایا ہے وہ کل کے لباس کے ساتھ چل بھی جائے گا "
پھوپی زیتون :۔ " نہ چلا تو کیا ستم آ جائے گا ! اب مجھے دیکھو ۔ جس
رنگ کا کپڑا مل گیا پہن لیا ۔ ورنہ خواہ مخواہ کے خرچ ! "
[ریحان صوفے پر بیٹھا ہے ۔ دائیں بائیں روحی اور صوفی
ہیں ۔ نازی قالین پر بیٹھی غور سے سن رہی ہے]
صوفی :۔ " اچھا اب لکھو فہرست "
پھوپی زیتون :۔ " اے ایسی لمبی چوڑی فہرست کی کیا ضرورت ہے ۔
دو چار چیزوں پر مہمان کمبختوں کو ٹرخا دو ۔ تین چیزیں کافی ہیں
بلکہ کافی سے زیادہ "
صوفی ۔ (حیران) :۔ " تین چیزیں ؟ "
روحی :۔ " فقط ؟ "
زیتون پھوپی :۔ " لکھو بیٹے ریحانی تم ۔ امرودوں کا کچالو ۔ بیسن
کے پکوڑے ۔ اور میٹھے میں سوجی کا حلوہ "
نازی ۔ (بے اختیار ہنس پڑتی ہے) :۔ " ہی ہی ہی ہی ——— آپا
صوفی آپا روحی ۔ سنتی ہو ؟ آپ لوگوں کے امتحان
کی کامیابی پر بیسن کے پکوڑے ہی ہی ہی "
زیتون ۔ (چڑ کر) :۔ " اے ساتھ امرودوں کا کچالو اور سوجی کا حلوہ
بھی تو ہو گا "
صوفی (ہنستی ہے) :۔ " کمال کرتی ہیں پھوپی زیتون آپ بھی "
روحی :۔ " میں تو شرم کے مارے گڑ جاؤں گی مہمانوں کے سامنے "
ریحانی :۔ " تم سب خاموش رہو ۔ میں لکھتا ہوں فہرست ۔ ہمیں کچھ
اپنی عزت کا بھی خیال رکھنا چاہیے زیتون پھوپی کہ نہیں "
[حقارت سے] :۔ ہوں ! امرودوں کے پکوڑے ۔ اور بیسن
کا کچالو ۔ اور حلوے کا سوجی ۔ ہوں ——— "
[تینوں لڑکیاں زور سے ہنس پڑتی ہیں]
روحی :۔ " خوب کہا ریحانی تم نے بھی امرودوں کے پکوڑے
——— ہی ہی ہی "
صوفی :۔ " اور بیسن کا کچالو ——— ہی ہی ہی "
نازی :۔ " اور حلوے کا سوجی ہی ہی ہی ہی ——— "
ریحانی ۔ [خود بھی ہنس پڑتا ہے] :۔ " پھر کیا کروں زیتون پھوپی کی باتیں
ہی کچھ ایسی ہوتی ہیں ——— "
پھوپی زیتون ۔ [ناراض ۔ جلدی جلدی رفو کرتی ہے] تم لوگوں کا
جی چاہے وہ لکھو فہرست میں ۔ میں دخل نہ دوں گی "
ریحانی ۔ (خوش ہو کر شگفتگی سے) :۔ " شکریہ پھوپی ۔ شکریہ "
نازی :۔ " اور کچھ ہو یا نہ ہو بجیا ریحانی ۔ انڈوں کا حلوہ ضرور
لکھئے فہرست میں "
ریحانی :۔ " کیوں لکھوں انڈوں کا حلوہ ؟ قلم تھوڑا ہی لا کر دیا تم
نے ؟ چلو بھاگو یہاں سے "
روحی :۔ " اچھا ریحانی ۔ سب سے پہلے لکھو ۔ مشروبات سے
ہوا بڑا سا کیک ! "
زیتون پھوپی ۔ (بے اختیار ہو کر) :۔ " تو پھر بہت بڑا بھی !
علاوہ بدنما معلوم ہونے کے ——— "
ریحانی :۔ " خواہ مخواہ کے خرچے ہیں ۔ یہی ہے نا آپ کا مطلب
زیتون پھوپی ؟ " [ہنستا ہے]
نازی :۔ " آپ نے کہا تھا کہ آپ دخل نہ دیں گی ؟ " (!
کی طرف دیکھتی ہے)

ی :- اچھا کیک کے بعد لکھو پیٹیز "

ں زیتون :- " پیٹیز ؟ وہ کیا بلا ہوتی ہیں ؟ "

ی :- " ولایتی سموسے "

ں زیتون :- " سبزی کے نا ؟ "

ی :- جی نہیں قیمے کے "

ی :- کیا ضرورت ہے ۔ انھیں فہرست سے خارج کردو "

ں :- " پیٹیز ہوں تو پھر مرغ کی ہوں "

ی :- اس کے ساتھ پنیر بھی ضرور شامل ہو "

ں زیتون ۔ (جل کر) :- " چٹوری کہیں کی "

ی ۔ [روٹھی ہوئی ضدی آواز میں] " اوں اوں جیسے میں ہی ہوں ایک چٹوری ــــ "

ی ۔ (بیزار) :- " اچھا اب لکھوا بھی ــــ "

ی :- " اس کے بعد لکھو سینڈوچ "

ن پھوپی :- " انھیں خارج کردو فہرست سے ۔ اس کی بجائے پکوڑے ٹھیک رہیں گے "

ی :- مگر شام کی چاء پر سینڈوچ نہ ہونا معیوب سی بات معلوم ہوگی "

ن پھوپی :- " ہونے دو معیوب بات ۔ ارے ڈر کس کا ہے آخر ؟ "

ی :- " سینڈوچ ہوں گے اور ضرور ہوں گے "

پی زیتون ۔ (مایوس ہوکر) :- " تو پھر کھیرے کے بنوا دوں گی ۔ باغ میں بہت سے لگے ہیں "

انی :- کیوں مرغ کے بنوانے میں کیا مضائقہ ہے ؟ "

حی ۔ (ہنس کر) کیونکہ وہ باغ میں نہیں ہیں ! "

ی :- " خالہ نجمہ کی دعوت میں تو آپ نے سبزی کے سینڈوچ چھوئے بھی نہ تھے ۔ بیچن چوں کے مرغ کے لئے تھے ۔ زیتون پھوپی "

ون :- " تم دخل نہ دو نازی "

حی :- " اچھا ۔ تم لکھو ریحانی ۔ بالائی کے لڈو "

صوفی :- " بالائی کے لڈو اور سوہن حلوہ "

زیتون پھوپی :- " کیوں مہمانوں کی بدہضمی کا سامان کرتی ہو ؟ "

ریحانی :- " ہونے دیجئے بدہضمی " (لکھتا ہے ساتھ ہی دہراتا ہے)
" بالائی کے لڈو اور سوہن حلوہ "

روحی :- " سوہن حلوہ اور مچھلی کے کباب ریحانی "

ریحانی ۔ (لکھتا ہے) سوہن حلوہ اور مچھلی کے ــــ "

پھوپی زیتون :- " ان کا بھی کوئی جوڑ ہے ۔ دونوں چیزوں کو خارج کردو فہرست سے "

ریحانی ۔ (جل کر) :- " آخر کیا کیا چیزیں خارج کی جائیں ؟ "

نازی :- " جو کچھ کیجے ۔ مگر انڈوں کا حلوہ تو ضرور رکھئے بھیا ۔ کیوں آپا روحی ؟ "

روحی :- " مجھ سے کیا پوچھتی ہو ۔ پوچھو زیتون پھوپی سے "

زیتون :- " تم بڑوں کے معاملات میں دخل نہ دیا کرو نازی "

ریحانی :- " مگر ایک آدھ گھر کا حلوہ تو ضرور ہونا چاہئے زیتون پھوپی "

زیتون :- " وہ کیوں ؟ "

ریحانی :- " کیونکہ میں فہرست میں سے بیسن کے پکوڑے اور سوجی کے حلوے کو خارج کر رہا ہوں "

صوفی :- " آپ کو انڈوں کے حلوے کی ترکیب معلوم ہے زیتون پھوپی ؟ "

پھوپی زیتون :- " جانتی بھی ہو آج کل ایک ایک انڈا تین تین آنے کا ملتا ہے "

ریحانی :- " تین آنے کا ہو یا تین روپے کا حلوہ ہوگا ضرور "
[لکھتا ہے] " انڈے یا گاجر کا حلوہ "

پھوپی زیتون :- " حلوہ رکھنا ہی ہے تو پھر سوجی کا حلوہ ہو "

روحی ۔ (منہ بناکر) :- " سوجی کا حلوہ بھی کوئی حلوہ ہوتا ہے ! "

صوفی ۔ [حقارت سے] :- " ہوں ــــ پکوڑوں پہ باندھنے کی پالیسی معلوم ہوتی ہے "

نازی ۔ (زور سے چیخ کر) :- " مجھے معلوم ہے ۔ مجھے معلوم ہے ۔ زیتون پھوپی کو سوجی کا حلوہ کیوں اتنا پسند ہے "

صوفی :۔ "کیوں بھلا ؟"

نازی :۔ "کیوں ـــــ کیونکہ اس میں زعفران نہیں پڑتی۔ اور زعفران مہنگی ہے"

[سب کو ہنسی آجاتی ہے۔ صرف زیتون پھوپی نازی کو ڈانٹتی ہیں]

زیتون ۔(ڈانٹ کر) :۔ "پھر دخل درمعقولات نازی !"

نازی ۔ (بڑبڑاتی ہے) :۔ "یہ بھی خوب ہے ۔ دخل درمعقولات بھیا ریحانی۔ انڈوں کا حلوہ ضرور رکھئے"

ریحانی ۔[ہنستا ہے] :۔ "یہ تیرے مشاہرے کے لئے ٹھیک نہیں نازی"

[باغ کی طرف سے چھکڑے کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے]

روحی ۔(گھبرا کر) :۔ "اوئی اللہ ـــــ یہ کیسی آواز ہے ؟" [ڈر کے دو چار قدم آگے کو بھاگتی ہے]

صوفی :۔ "اتنے ڈرنے کی کیا بات ہے روحی۔ "باپ بیٹا" کمپنی سے سامان آیا ہوگا چھکڑے میں لد کر ـــــ"

[باغ کا دریچہ کھول کر باہر جھانکتی ہے]

ملازم ۔[داخل ہوتا ہے] :۔ "باپ بیٹا سے شامیانے والے آگئے ہیں حضور"

پھوپی زیتون :۔ "ابھی سے ؟ بھئی دعوت تو کل ہے۔ آج شام تو نہیں ہے۔ خواہ مخواہ کا کرایہ وصول کریں گے یہ لوگ۔ کہو واپس لے جائیں"

(جلدی جلدی رفو کرتی ہے)

صوفی :۔ "آج ہی لگا کر چلے جائیں تو کیا مضائقہ ہے؟ ڈھیر سارے کام پڑے ہیں۔ اس ایک طرف سے تو اطمینان رہے گا"

ریحانی :۔ "ہاں ہاں۔ کہہ دو شامیانے لگا دیں"

ملازم ۔ "بہت اچھا حضور" [باہر چلا جاتا ہے]

نازی ۔(دریچے میں سے باغ کی طرف جھانک کر) :۔ "ہائے ہائے کیسے رنگین شامیانے ہیں۔ ان کے لگنے کے بعد باغ کتنا خوب صورت معلوم ہوگا ـــــ" [خوشی سے ناچتی ہے]

روحی ۔ "تمہیں شعور نہ کہو"

پھوپی ۔(بڑبڑاتی ہیں) :۔ "خواہ مخواہ کے خرچے ہیں ۔ ذرا سی پارٹی کے لئے یہ شامیانے"

[ملازم پھر داخل ہوتا ہے]

ملازم :۔ "وہ جگہ کا پوچھ رہے ہیں حضور کہ باغ میں کدھر لگائے جائیں"

ریحانی ۔[فہرست میز پر رکھ کر سوچتے ہوئے] کدھر لگائے جائیں؟

ملازم :۔ "میں کہہ دوں حضور کہ باغ کے کنوئیں کے پاس لگا دیں"

ریحانی :۔ "احمق احمق عقل ماری گئی ہے تمہاری ؟"

نازی ۔[زور سے ہنس پڑتی ہے]۔ "تاکہ مہمان آتے ہی کنوئیں میں گر پڑیں ـــ ہی ہی ہی [ہنستی ہے] کیوں آپا روحی ؟"

روحی :۔ "ایسی منحوس باتیں نہیں کیا کرتے"

ملازم :۔ "تو پھر بتائیے حضور"

روحی :۔ "میرا خیال ہے مولسری کے درخت کے قریب لگائے جانے چاہئیں تاکہ مہمانوں کو بھینی بھینی خوشبوئیں آتی رہیں"

صوفی :۔ "ارے واہ ۔ وہ کیا جگہ ہوئی ـــ درخت کے نیچے تمام وقت پتے گرتے رہتے ہیں"

ملازم :۔ "تو حضور امرودوں کے درختوں کے آگے جگہ صاف کروا کے نہ لگوا دئے جائیں ؟"

ریحانی :۔ وہاں تو درختوں پہ طوطوں کا وہ شور مچا رہتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی"

صوفی :۔ "طوطوں کے شور کے علاوہ گلی کے بچے درختوں پر غلیلیں چلاتے رہتے ہیں"

نازی ۔(ہنس کر) :۔ "ہی ہی ـــــ اگر کوئی غلیل کسی مہمان کی آنکھ میں جا لگی تو مہمان کا کانا ہو جائے گا۔ کیوں آپا روحی !"

روحی ۔(بگڑ کر) :۔ "مت کیا کرو ایسی منحوس باتیں"

ملازم :۔ "حضور پہلے آپ سب مل کر سوچ لیں۔ پھر مجھے آواز دیں۔ کام بہت ہے"

[جاتا ہے]

ریحانی :۔ (خوش ہو کر) :۔ "ہاں خوب خیال آیا۔ شامیانے باغ ـــ

فوارے کے عین سامنے لگانے چاہئیں تاکہ مہمانوں کو افلاطون کا بُت نظر آتا رہے"

…ا زیتون ۔[ناخوش سی ہیں] :۔" اسے دفع کرو افلاطون کو کسی ایسی کھلی جگہ لگاؤ جہاں بیروں کی چوری پکڑی جا سکے ۔ دعوت کے بعد یہ بہت لوٹ مار مچاتے ہیں ۔ تم جاؤ نا بیٹے ریحانی ذرا باغ میں ۔ اپنی نگرانی میں برآمدے کے قریب لگواؤ شامیانے ۔ تاکہ بیروں کی ایک ایک حرکت پر نظر پڑ سکے "

…ن ۔(کھڑا ہو کر) :۔" میں کیا کیا کروں زیتون پھوپی ۔ دعوت نامے چھپواؤں ۔ شامیانے لگواؤں "

…ا زیتون :۔" ایسے کام تو خود ہی کرنے پڑتے ہیں "

…ا :" میں اپنے سر پر تھوڑا ہی اُٹھاؤں گا شامیانہ ؟ ——— "باپ بیٹا والے آپ لگا لیں گے"

… ۔" مگر جگہ تو ہمیں ہی بتانی پڑے گی "

…ن :۔" تو تم چلی جاؤ نا ——— "

… ۔" چلی جاتی ۔ پر کیا کروں ۔ سارے سر میں پنیں لگی ہوئی ہیں "

… :۔" میں جا کر بتا دوں جگہ ؟ "

…ا :۔" نہیں ۔ تم نہیں ۔ تم چپکی بیٹھی رہو "

[باغ کے دروازے سے مالی داخل ہوتا ہے ۔] ہاتھ میں کھرپا ہے

…ی :۔" کیا ہے مالی ؟ "

…ا زیتون :۔" یہ ہاتھ میں کھرپا کیوں اُٹھائے پھر رہے ہو ؟ میری بغیر اجازت گاجریں نہ اُکھیڑنا ——— "

…ا :۔(ذرا برا مان کر) :۔" نہیں حضور ۔ میں کیوں اُکھیڑوں گا آپ کی گاجریں ۔ کوئی چور ہوں ——— ؟ "

…ی :۔" آئے کیوں ہو ؟ "

… :۔" بجلی والا آیا ہے حضور ——— کہتا ہے ہنڈے کتنے چاہئیں ؟ "

…ا پھوپی :۔" ہنڈے ؟ پھر لیمپوں کے نہ منگواؤ ۔ بیچ کے زندو ان سے کام چل جائے گا سستے پڑتے ہیں "

… ۔(ہنس پڑتا ہے) :۔" ہنڈے نہیں حضور ۔ ہنڈے ۔ ہنڈے ۔

بجلی کے بلب " [پھر ہنس پڑتا ہے]

پھوپی زیتون ۔(شرمندہ ہو کر غصے سے) :۔" پھر یوں کیوں نہیں کہتا احمق کہیں کا ——— پر ریحانی بیٹے ۔ شام کی پارٹی میں بجلی کے بلبوں کی آخر ضرورت ہی کیا ہے ؟

ریحانی ۔(بے پروائی سے) :۔" ہوتی ہے ضرورت "

پھوپی زیتون :۔" آجکل سورج دیر میں غروب ہوتا ہے "

صوفی :۔" مگر سہیلیاں اس سے بھی دیر میں رخصت ہوتی ہیں "

روحی :۔" ہاں ہاں اور کیا ۔ اس کے علاوہ روشنیوں سے رونق بھی رہے گی "

مالی :۔" حضور پہلے آپ سب مل کر سوچ لیں ۔ پھر مجھے آواز دیں کام بہت ہے " [کھرپا لے کر چلا جاتا ہے ۔]

نازی :۔" آپا روحی ! آپا صوفی ۔ سارے کے سارے لال بلب لگوائیے "

روحی :۔" عقل ماری گئی ہے نازی ؟ لال بلبوں سے یوں معلوم ہوگا جیسے آگ لگی ہے ۔ ریحانی بھیا ۔ آخر کیا سوچ رہے ہو ؟ باہر باغ میں ہو آئیے نا جتنا کام آج ہو جائے مناسب ہے "

ریحانی :۔" باغ میں گرد اُڑ رہی ہوگی ۔ میرا سوٹ خراب ہو جائے گا "

روحی ۔(حقارت اور طنز سے) :۔" ہوں ۔ سوٹ خراب ہو جائے گا "

ریحانی :۔" تو تم خود چلی جاؤ نا ۔ دوسروں پر حکم چلانا کہاں کا دستور ہے ؟ "

روحی :۔" دعوت نامے کیا چھپوائے ہیں کہ اب کسی کام کو ہاتھ ہی نہیں لگاتے ۔ میں کیسے چلی جاؤں ۔ ابھی تو مجھے دوسرے کمروں میں بھی پھول لگانے ہیں ۔ صبح سے اسی کام میں لگی ہوئی ہوں "

صوفی :۔" میں خود چلی جاتی باغ میں ۔ پر کیا کروں ۔ سارے سر میں پنیں لگی ہوئی ہیں کہ کل فرصت ملے نہ ملے "

پھوپی زیتون ۔[اُٹھتی اور باغ کے دریچے سے باہر جھانکتی ہے] " مجھے تو یہ ڈر ہے کہ کمبخت شامیانے والے باغ میں سے

کوئی گملا وملا نہ اُٹھا لے جائیں - ریحانی بیٹے - تم باغ میں
بنیان پہن کر چلے جاؤ"

صوفی :- "اور بجلی والے سے کہو کہ سبز اور سُرخ روشنیاں لگائیں"

روحی :- سبز اور سُرخ روشنی تو ریلوے گارڈ کی لالٹین کی ہوتی
ہے - یوں معلوم ہوگا جیسے باغ میں سے ریل گزرنے
والی ہو - نیلی اور بنفشئی رنگ کی لگاؤ"

پھوپی زیتون :- ارے نہیں لڑکیو - تم کو تو ہر چیز نقصان کی سوجھتی
ہے - تیز روشنی کے سادہ بلب لگواؤ تاکہ ملازموں کے
کھانے پینے کی چیزوں کی چوری پکڑی جا سکے

روحی - (ذرا ہنس کر) :- "توبہ - آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں گویا
ڈاکوؤں اور اُچکّوں سے واسطہ پڑا ہے"

پھوپی زیتون :- "تو کوئی شبہ ہے تمہیں اس میں ؟ "گول گپّا"
ہوٹل کے بیروں کی بے ایمانیاں تو مشہور ہیں - یاد ہے
تجمل کی شادی میں کوکا کولا کی بوتلوں کا کیسا قحط پڑ گیا
تھا ؟ یہ نہیں کہ منگوائی کم تھیں - بیرے پی گئے"

[باغ کے دروازے سے پھر مالی داخل ہوتا ہے]

مالی :- "حضور وہ بجلی والے"

[باغ کے رستے ملازم داخل ہوتا ہے]

ملازم :- "حضور وہ شامیانے والے"

ریحانی - (جھلا کر) :- "خدا کے لئے جاؤ تم لوگ - دماغ نہ چاٹو
میرا - کیا کیا کروں - دعوت نامے چھپواؤں - بجلی لگواؤں
شامیانے کھڑا کر دوں ——

[غصّہ سے ٹہلتا ہے]

روحی :- "تم جاؤ مالی - ابھی آتے ہیں ریحانی میاں"

دونوں :- "اچھا حضور"

[دونوں باغ کے رستے باہر چلے جاتے ہیں]

پھوپی زیتون :- "ہاں میاں - اب تم ہی کو جانا پڑے گا بنیان
پہن کر"

ریحانی :- "میں ہی جاؤں گا اور کون جا سکتا ہے - جب ان تو پہن
لوں —— "

[گھر کی طرف کے دروازے سے اندر چلا جاتا ہے]

روحی :- "صرف ایک دن رہ گیا ہے بیچ میں - اور کام کچھ ہوا ہی
نہیں"

پھوپی زیتون - "تم سب کے سب سُست ہو"

[دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے]

روحی - (پھولوں کو کچھ کرتے ہوئے، بیزار لہجہ) :- "اوں —— توبہ
اب ٹیلی فون بج رہا ہے - یہ بھی ایک مصیبت ہے عین
کام کے وقت ٹیلی فون کی گھنٹیاں"

صوفی :- "تم اُٹھاؤ نا نازی - بیکار بیٹھی ہو"

(نازی بھاگتی ہوئی اُٹھاتی ہے)

نازی - (ٹیلی فون میں) ہیلو ؟ ہیلو ؟ کون بول رہا —— ؟ گول گپا ؟

نازی :- "وہ لوگ پوچھ رہے ہیں کل شام سینڈوچ کتنے درجن چاہئیں"

[گھر کی طرف کے دروازے سے ریحانی بنیان پہن کر اسٹیج پر آتا ہے]

ریحانی - "کس کا فون ہے ؟"

نازی :- "گول گپا والے ہیں - پوچھ رہے ہیں کل سینڈوچ کتنے
چاہئیں ؟"

ریحانی :- "کہہ دو چھ درجن"

صوفی :- "نہیں نہیں آٹھ درجن"

روحی :- "ارے نہیں دس درجن"

نازی - "پہلے ٹیلی فون پر بات تو کیجئے نا - کب سے پکڑے کھڑی ہوں"

پھوپی زیتون - (غصّے سے) :- "ارے کیا غضب کر رہے ہو ؟
تم لوگوں کو کسی چیز کا بھی اندازہ ہے ؟ دو درجن کافی ہیں بلکہ
کافی سے زیادہ"

نازی - "تو کہہ دوں دو درجن ؟"

ریحانی :- "ارے نہیں - مہمان دل میں کیا کہیں گے ؟"

پھوپی زیتون :- "جو جی چاہے کہنے دو کمبختوں کو - آخر دوسری دھیم
ساری چیزیں بھی تو ہیں - کچھ سینہ منہ تھوڑا ہی ہوں گے
ان منحوسوں کے لئے ؟"

ریحانی :۔ "اب [illegible] ہمیں کے [illegible]
ٹیلیفون [[illegible] جا [illegible] ہے]
"ہلو ہلو ! کون گپتا اسٹورز ؟ آٹھ درجن پیالی آٹھ درجن" [ٹیلیفون
رکھ کے واپس آتا ہے] "تو یہ دماغ خالی ہو گیا ——"
پھوپی زیتون :۔ "ایک دماغ کیا۔ ٹکاروں کا خزانہ بھی خالی ہو جائے
ایسی دعوت میں —— اب خیال کرو سینڈوچ گپتا
سے منگوانے کی آخر ضرورت کیا تھی ؟ خواہ مخواہ کے خرچ۔
کل دوپہر کے کھانے کے بعد میں لڑکیوں کو ساتھ لے کر خود
بنا دیتی"
ریحانی :۔ "گھر کے سینڈوچ ؟ توبہ توبہ۔ ایک طرف سے اُٹھے
ہوئے۔ دوسری طرف سے دبے ہوئے !"
وحی۔ (ہنستی ہے) :۔ "سچی بات ہے انہیں تو کسی کے آگے
پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے"
موفی۔ (ہنس پڑتی ہے) :۔ "ہی ہی۔ کل سلیمہ کہہ رہی تھی وہ رضیہ
کی سالگرہ کی چاء پر گئی تو وہاں سینڈوچ دیکھ کر اس کے
پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے"
وحی۔ (ذرا سا ہنس کر۔ پھر قینچی سے پھولوں کو کاٹتے ہوئے)
"ہی ہی۔ کیوں ؟ خانہ ساز سینڈوچ تھے کیا ؟"
موفی :۔ "ہاں کہتی تھی مری نانی نے بنائے ہیں۔ سینڈوچ کیا
تھے۔ چوہے معلوم ہوتے تھے۔ تیسرا سرا ہی غائب تھا
(سب ہنس پڑتے ہیں۔ مگر پھوپی خاموش رہیں)!
ریحانی :۔ "سنتی ہو پھوپی زیتون۔ خانہ ساز سینڈوچ ایسے ہوتے
ہیں !"
پھوپی زیتون :۔ "اسی لئے تو کہتی ہوں ان خرافات کی ضرورت ہی
نہیں۔ صرف مٹھائی نمکین سے کام چل جائے گا !"
[باغ کی طرف کے دروازے سے مالی داخل ہوتا ہے]
مالی :۔ "ریحانی میاں بنیان پہن لی آپ نے ؟"
ریحانی۔ (چیخ کر) :۔ "کیوں ؟"
مالی :۔ "وہ بجلی والے حضور"

ریحانی :۔ "اے [illegible] سے بڑی [illegible] ہوں ——"
مالی۔ "بہت اچھا حضور ——"
(چلا جاتا ہے)
ریحانی۔ "دیکھو۔ یہ کھانوں کی فہرست یہاں چھوڑے جا رہا ہوں [illegible]
پر۔ اڑ نہ جائے پھر کہیں ——"
پھوپی زیتون :۔ "ذرا دینا بھی ریحانی۔ ایک نظر میں بھی ڈال لوں ——"
[عینک لگاتی ہے]
ریحانی :۔ "یہ لیجئے۔ مگر خبردار پھوپی زیتون جو آپ نے فہرست میں
سے کوئی چیز خارج کی"
پھوپی زیتون :۔ "اے میں کیوں کروں گی کوئی چیز خارج۔ جی بھر کے
لٹاؤ گھر کو۔ مجھے کیا !"
[عینک لگا کے فہرست بڑے غور سے پڑھنے لگتی ہے۔ کبھی
چونک پڑتی ہے۔ کبھی آہ کھینچتی ہے]
[دروازہ کھلتا ہے اور باغ کی طرف سے ملازم اندر آتا ہے]
ملازم :۔ "ریحانی میاں بنیان پہن لی آپ نے ؟"
ریحانی۔ (چیخ کر) :۔ "کیوں ؟ ابھی مالی آیا تھا اب تم سر پر سوار
ہو گئے !"
ملازم۔ (ذرا ہنس کر) :۔ "اے میاں وہ شامیانے والے دق
کر رہے ہیں چل کر بتا ہی دیجئے جگہ"
ریحانی۔ "تم چلو میں آتا ہوں ——"
ملازم۔ "اچھا میاں ——"
(باغ کے دروازے سے باہر چلا جاتا ہے)
ریحانی :۔ "اچھا۔ میں جاتا ہوں پیچھے باغ میں۔ تازی۔ کوئی ملنے
والے آئے تو کہہ دینا ریحانی بھیا گھر پر نہیں ہیں۔ بھلا بنیان
پہن کر کیسے مل سکتا ہوں کسی سے ؟"
تازی :۔ "تو گویا میں جھوٹ بولوں ؟ بُری عادتیں آپ ہی سکھاتے
ہیں مجھے"
روحی۔ "تمہیں معلوم بھی ہے تین بج رہے ہیں۔ آٹھ بجے جلدی [illegible]
چاہیے۔ کام بہت ہے۔ ابھی [illegible] کریں گی"

[illegible]

صوفی :- "ہاں بیٹا ریحانی اب تم یہاں بیٹھی ہی بیٹھے ہو تو پھر یہ پیاز چھیلنے کے لئے برآمدے میں رکھوا دو۔"

نازی ۔ (چلتی ہے) :- "پیاز آپا صوفی؟ ہاں بیٹا ریحانی ۔ اسے باہر برآمدے میں رکھوا دیجئے۔ کل دعوت کے آخیر میں ۔ میں مہمانوں کے آگے "پاک سرزمین شاد باد" گاؤں گی"

روحی :- "اس پر مجھے خیال آیا ۔ کل اگر مہمانوں میں سے کوئی خوش مذاق مجھ سے گانے کی فرمائش کر بیٹھا تو کیا ہوگا؟ پریکٹس تو میں نے کی ہی نہیں"

صوفی :- "کہہ دینا گلا خراب ہے"

روحی :- "جھوٹ مجھ سے نہ بولا جائے گا"

ریحانی ۔ (ہنس کر) :- "ہی ہی ہی ۔ جی ہاں ۔ جیسے ساری عمر سچ بولتے گزر گئی جناب کی"

صوفی ۔ (ہنس کر) :- "ہی ہی ارے گا کر سنانے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر گاؤ روحی ۔ منع کون کرتا ہے؟"

ریحانی :- "مگر خدا کے لئے کہیں ابھی سے نہ شروع کر دینا اپنی ٹیں ٹیں"

نازی ۔ (کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہے) :- "ہی ہی ہی ۔ ہو ہو ہو ۔ ٹیں ٹیں سیٹی ہو آپا روحی؟ ہمارے گانے کا نام کب رکھا ہے ریحانی بیٹا نے؟ ٹیں ٹیں ۔ ہی ہی ہی ۔" (ہنستی ہے)

روحی ۔ (بے حد بُرا مان کر غصے سے) :- "آگ لگتی ہے تم لوگوں کی ایسی باتوں سے ۔ مذاق سلیم چھو کر نہیں گیا ۔ تم لوگ کیا جانو موسیقی!"

[گھر کی طرف کا دروازہ کھلتا اور خانساماں اندر داخل ہوتا ہے ۔ سفید بہت کا سا لباس ۔ خانساماؤں کا ایپرن پہن رکھا ہے اور سر پر خانساماؤں کی اونچی سفید ٹوپی رکھی ہے ۔ مونچھیں بے حد لمبی لمبی اور سیدھی لکڑی کی طرح ناک کے نیچے رکھی ہیں ۔ آنکھیں مسکراتی ہوئی ۔ قد

[پھوپا چپ ہے ہو جاتا]

خانساماں ۔ [بہت اونچی آواز] السلام علیکم۔

[سب چونک پڑتے ہیں اور اسے دیکھتے ہیں]

پھوپی زیتون ۔ (فہرست پڑھتے پڑھتے مڑ کر) "ائے کیا ہے خانساماں تم کیوں نازل ہوگئے؟"

خانساماں ۔ (اونچی آواز) کل سموسوں کے ساتھ چٹنی کس چیز کی حضور؟

روحی :- "املی کی ۔ خوب تیز چٹ پٹی ۔ سنتے ہو؟"

خانساماں :- "سنتا ہوں حضور"

ریحانی :- "نہیں ہری مرچوں کی ۔ خوب چٹ پٹی سی ہو ۔ سنتے ہو"

خانساماں :- "سنتا ہوں حضور"

صوفی :- "نہ املی ۔ نہ ہری مرچیں ۔ لیموں کی بناؤ اور تم ۔ سن لو"

خانساماں :- "سن لیا حضور"

نازی ۔ (ضدی آواز میں) :- "ہائے آپا ۔ مجھے تو انچور کی پسند چٹنی ۔ تم انچور کی چٹنی بنانا خانساماں ۔ اچھا؟"

خانساماں :- "اچھا حضور"

ریحانی :- "جب سن لیا تو اب جاؤ"

خانساماں :- "سن تو سب کچھ لیا حضور ۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہ آئی املی کی ۔ مرچوں کی ۔ لیموں کی یا انچور کی ۔ آخر کس چیز کی بناؤں چٹنی؟"

پھوپی زیتون ۔ [فہرست سے نظر اٹھا کر ۔ عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے] :- "خواہ مخواہ کے خرچ ہیں یہ سب! ارے کی ذرا سی چٹنی پر یام میں لگی رہ گئی ہے ۔ اس میں تھوڑی سی پیاز کچل کر ملا دو خانساماں! اسی سے کام چل جائے گا۔"

خانساماں ۔ [منہ پر ہاتھ رکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے] آپ بھی کرتی ہیں حضور ۔ [دروازے سے ہنستا ہوا باہر نکل جاتا ہے]

ریحانی :- "ہا ہا تم سب لڑتے رہو ۔ میں جاتا ہوں باغ میں سامان رکھوانے کے لئے ۔ [پلٹ کر جاتے جاتے] پھوپی زیتون کوئی چیز خارج نہ کرنا فہرست میں سے"

...) - [ریحانی کو معک کر جو دروازے پر کھڑا ہے] :- " ابھی
یہاں سے پیانو نہ اٹھوانا ریحانی - میں دو ایک غزلوں کی
مشق کر لینا چاہتی ہوں احتیاطاً - کل کے لئے "

...ن - (جل کر) " اتنے بہت تو کام پڑے ہیں اور بیگم صاحبہ
جا رہی ہیں پیانو پر مشق کرنے کے لئے "

...) - (چڑ کر) :- " کیوں نہ کروں مشق ؟ اگر کسی نے فرمائش
کر دی - تب ؟ "

[پھول ایک طرف رکھ کر گنگناتی ہوئی پیانو کی طرف
جاتی اور آہستہ آہستہ اس کے پردوں کو چھیڑتی
ہے]

...) - [تھوڑی دیر گنگناتے رہنے کے بعد گانے لگتی ہے] :-
" نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم - نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے
نہ اِدھر کے رہے - نہ اُدھر کے رہے - نہ اِدھر کے رہے - نہ
اُدھر کے رہے "

...ن پھوپی - [فہرست تہہ کرتے ہوئے روحی کی طرف دیکھ کر] :-
" اے ہے روحی بٹیا - یہ کیا غزل لے بیٹھیں - اُدھر کے -
اِدھر کے - فلک کے اوپر - زمیں کے نیچے ـــــ "

...ی - (دروازے میں جانے کو تیار کھڑا ہے ذرا ہنس کر) :-
" نہیں نہیں - وہ سُنا نا روحی تم -
(گا کر) مرے مولا بلا لو مدینے مجھے
ذرا ہمارا بھی اطمینان رہے گا کہ تم یہاں سے کوچ کرنے کا
ارادہ رکھتی ہو "

...ی - (مسکرا کر) :- " اب چھوڑو اس مسخرے پن کو - جا کر باغ میں
سامان رکھواؤ ریحانی "

...ی - (نفرت سے) :- " بنیان پہنے یوں کھڑے ہو جیسے بڑی محنت
کر رہے ہو - تمام دن بے کار کھو دیا "

...انی :- " اچھا بابا اچھا - ناراض نہ ہو - میں گیا ـــــ "

[باغ کے دروازے سے باہر چلا جاتا ہے]

...ی - [پیانو پر بیٹھی ہے - چہرے سے ناامیدی ظاہر ہو رہی ہے] :-
" توبہ توبہ تم لوگوں کو موسیقی کا مذاق چھو کر نہیں گیا - عجیب
بد مذاق لوگوں سے سابقہ پڑا ہے "

صوفی - (چڑ کر طنز سے) :- " تو تم اپنی خوش مذاقی کا ثبوت دو نا -
مہمانوں کے آگے گلا پھاڑ پھاڑ کر "

نازی :- " آپ ذرا اُٹھئے تو باجی - میں بھی مشق کر لوں ایک ترانہ
کی "

روحی :- " توبہ توبہ - ایسی گڑبڑ میں میں کیا خاک مشق کر سکتی ہوں !
اب تو شام ہی کو کروں گی "

[اُٹھ کھڑی ہوتی ہے]

نازی - [اس کے کھڑے ہوتے ہی خود پیانو پر بیٹھتی اور زور زور
زور سے گاتی ہے]

پاک سرزمین شاد باد کشورِ حسین شاد باد

[اندر کی طرف سے بڑے زور کے دھماکے کی آواز
آتی ہے]

زیتون پھوپی :- " ہے ہے کیسے بل گیا - یہ کیسا دھماکہ ہے ؟ "

نازی [پیانو چھوڑ کر اٹھتی اور یکایک دروازے کی طرف بھاگتی ہے]
" معلوم ہوتا ہے زلزلہ آرہا ہے - اوئی ـــــ "

صوفی - " ارے نہیں - باہر کوئی ٹرک آکر رکا ہے "

[پھر آواز شروع ہو جاتی ہے جو رہ رہ کر مسلسل آتی ہے]
روحی باغ کے دریچے میں سے باہر جھانکتی ہے

روحی :- " نہیں نہیں - نہ زلزلہ نہ ٹرک - یہ تو بھیا ریحانی صوفہ
گھسیٹ رہے ہیں ہال سے "

پھوپی زیتون - [بے چین ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے] :- " صوفہ ! "
[بھاگ کر باغ کے دریچے میں جاتی اور جھانکتی ہے] :-
" ہائے ہائے " (اونچی آواز سے) " چھوڑ دو ریحانی بیٹے
ارے خدا کے لئے چھوڑ دو صوفہ - جہاں ہے وہیں پڑا
رہنے دو - میں کہتی ہوں ریزہ ریزہ ہو جائے گا - اب
کمرے سے باہر نہ نکالنا "

[اس دوران میں صوفہ گھسیٹنے کی زور دار آواز آتی رہتی ہے]

روحی :۔ "مہمان کہاں بیٹھیں گے کہاں زیتون پھوپی؟"

زیتون ۔ (ہنستے ہوئے) :۔ "بھاڑ میں جائیں مہمان ۔ ان کا کیا جائے گا نقصان اپنا ہوگا !"

[صوفی گانے کی آواز بند ہو جاتی ہے ۔ اور ریحانی باغ کے دریچے میں نمودار ہوتا ہے]

ریحانی :۔ [باہر باغ میں کھڑا ہے ۔ دریچے سے جھانک کر اندر دیکھتا ہے] "بابا چار بج رہے ہیں چائے بھی نصیب ہوگی آج ؟ یا نہیں ؟ سارا بدن ٹوٹ رہا ہے [روحی با آواز بلند جمائی لیتا ہے] چائے کب ملے گی ؟"

صوفی :۔ "چلّانا بند کرو ریحانی ۔ کان کے پردے پھاڑ ڈالے تم نے ۔ ذرا اطمینان ہولے تو پی لیں گے چائے"

زیتون :۔ "صوفہ سلامت بھی ہے ؟"

(ریحانی غائب ہو جاتا ہے)

نازی :۔ "اے زیتون پھوپی ۔ درزی مرا فراک اب تک نہیں لایا"

زیتون ۔ (چڑچڑی آواز) :۔ "تو پھر میں کیا کروں ؟ کیوں سلوایا تھا نیا فراک ؟ خواہ مخواہ کا خرچ !"

نازی :۔ "ذرا خانساماں کو درزی کی دکان تک بھیج دوں ؟"

روحی :۔ "عقل ماری گئی ہے نازی ؟ ایسے وقت میں خانساماں کو درزی کی دکان پر بھیجو گی ! چائے تک تو ابھی پی نہیں ۔"

زیتون :۔ "روحی بٹیا ۔ خانساماں سے کہہ دو پہلے ہمیں چائے دیدے سب ایک ایک پیالی سادہ چائے پی لیں گے ۔ ساتھ کچھ کھانے کی ضرورت نہیں"

نازی :۔ "کیوں کھانے کی ضرورت کیوں نہیں ؟ کیا خواہ مخواہ کے خرچ ؟" (ہنستی ہے)

زیتون :۔ "فضول باتیں نہ کرو جاکر خانساماں سے کہو چائے لائے"

نازی :۔ "اور اس کے ساتھ کیک بھی ۔ کیوں پھوپی ؟"

[اندر چلی جاتی ہے]

روحی [ذوق و شوق سے بے خود ہو کر یکایک کھڑی ہو جاتی اور انگڑائی لینے کے انداز میں ہاتھ اٹھاتی ہے] :۔ "بس ! کل ٹھیک اسی وقت مہمانوں کی کاریں آکر ٹھہریں اور چائے شروع ہو جائے گی ۔ ہائے ۔ بڑا مزہ آئے گا ۔ کیوں صوفی ؟"

صوفی ۔ (بے ساختہ ہنس کر) "بڑا ـــــــــ"

روحی ۔ "ٹھیک چھ بجے میں گھنٹے میں !"

ریحانی (دور سے چیختا ہوا پھر کھڑکی کے باہر آکر کھڑا ہو جاتا ہے) "زیتون پھوپی ۔ او پھوپی ۔ چائے منگوائیے نا ۔ جان نکلی جا رہی ہے ـــــــ آ آ آ ـــــــ [جمائی پر بات ختم ہوتی ہے]

صوفی ۔ [دریچے میں ریحانی کو دیکھ کر] "اس لباس میں بار بار یہاں آگے آتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی ؟" (ریحانی جا چکا ہے)

روحی :۔ "جب تک چائے آئے میں اپنے مشق کرتی ہوں ایک غزل کی ۔"

[پیانو پر جا بیٹھتی اور ہلکے ہلکے گاتی ہے]

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے"

[گانا بند کر کے آہستہ آہستہ بجانے لگتی ہے]

پھوپی زیتون :۔ "اے ہے روحی بٹیا ۔ یہ آگے کیا تماشہ کر رکھا ہے تم نے ؟"

صوفی ۔ (بے ساختہ ہنس پڑتی ہے) :۔ "کیا خوب ۔ کیا خوب ۔ پیچھے ؟"

[روحی بجانے میں اس قدر منہمک ہے کہ ان کی باتیں سنتی ہی نہیں ۔ آہستہ آہستہ بجا رہی ہے ۔ پھر دو لمحے بعد گانے لگتی ہے ۔ شعر کے معنی کے مطابق اشارے بھی کرتی جاتی ہے]

روحی ۔ (گاتے اور اشارے کرتے ہوئے) :۔
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے"

[ہاتھ سے ساغر و مینا کے اشارے کرتی ہے]

دروازہ کھلتا ہے اور خانساماں چائے کی ٹرے لیکر داخل ہوتا ہے

بھی تھا۔ بھاگ آیا اندر ـــــــ"

[ریحانی شدید پریشانی میں پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہے۔ باہر ایک اور ہارن زور سے بجتا ہے]

ایک ردی والا۔ (دریچے کے پاس آکر زور سے):۔ "ردی والا۔ پرانا اخبار۔ ٹوٹی جوتی۔ ردی والا حضور ـــــ"

ریحانی۔ (غصے سے چیخ کر) "مردوڑدوں گا تجھ کا۔ یہ وقت ہے ردی نکالنے کا۔ بھاگو یہاں سے"

ردی والا۔ (اونچی آواز):۔ "بیگم صاحبہ نے آج شام کا وقت دیا تھا حضور۔[بازاری آواز نکالتا ہے]۔ ردی والا۔ پرانا جوتی ـــــ"

ریحانی۔ (شدید غصہ):۔ "جاتا ہے کہ نہیں؟"

پھوپی زیتون:۔ "ہے ہے۔ یہ کمبخت اس وقت آیا۔ کل آجانا ردی والے"

ردی والا۔ "محض آپ کی خاطر دور سے آیا ہوں حضور ـــــ"

(باہر زور سے کار کا ہارن بجتا ہے)

ریحانی۔ "آج میں اسے مرغی کی طرح ذبح کردوں گا"

[غصے سے آگے کو بڑھتا ہے ردی والا بھاگ جاتا ہے۔ ایک ملازم باغ کی طرف کے دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے۔]

ملازم۔ (داخل ہوکر) "حضور باہر چلئے۔ مہمان پر مہمان چلے آرہے ہیں ـــــ"

[باغ کی طرف کا دروازہ کھلتا اور خانساماں داخل ہوتا ہے]

خانساماں:۔ "اے حضور مہمانوں کو بڑی مشکل سے باہر روک رکھا ہے۔ وہ یہاں اندر آرہے تھے"

[دونوں نوکر باہر چلے جاتے ہیں۔ روحی اور صوفی دبک کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ ریحانی بنیان پہنے دریچے کے پیچھے چھپا ہوا کھڑا ہے۔ نازی کبھی باہر جھانکتی کبھی گھبرا کر سر اندر کر لیتی ہے۔ پھوپی پریشان ہے۔ باہر باغ میں مہمانوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آتی ہیں]

پھوپی زیتون:۔ "بات کیا ہے آخر"

ریحانی۔ [حواس باختہ]:۔ "میں ابھی آیا ـــــ" (اندر کی طرف بھاگ جاتا ہے)

صوفی:۔ "ہائے اللہ۔ کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی؟"

ریحانی۔ (حواس باختہ اندر داخل ہوکر):۔ "روحی۔ روحی۔ او صوفی۔ ہائے غضب ہوگیا"

روحی۔ (گھبرا کر):۔ "کیا ہوا؟"

صوفی۔ (پریشان):۔ "ارے کچھ تو بتاؤ ریحانی"

[سب اس کی طرف دیکھتے ہیں۔ ریحانی احمقوں کی طرح کھڑا ہے]

ریحانی۔ [زبان میں لکنت]:۔ "یہ۔ یہ۔ یہ ـــــ ساری خطا۔ خطا"

پھوپی زیتون:۔ "اے ہے کیا ہوگیا آخر؟ کس کی خطا۔ کیسا قصور"

ریحانی:۔ "میں۔ میں کہتا ہوں۔ ساری خطا پریس والوں کی ہے"

صوفی۔ (جھلا کر):۔ "پریس والے کون؟"

ریحانی:۔ "ابھی ابھی پتلون کی جیب سے دعوت نامہ نکلا۔ غلطی سے اس پر پریس والوں نے کل کی بجائے آج کی تاریخ دی ہے۔ یہ پریس والے ـــــ"

روحی۔ (گھبرا کر):۔ "ہائے ہائے آج کی تاریخ؟"

نازی۔ "کل کی بجائے آج کی!!!"

ریحانی:۔ "کمبخت پریس والے ـــــ"

صوفی۔ (شدید غصہ):۔ "پریس والوں کو کیا کہہ رہے ہو؟ دعوت نامے تو تم نے چھپوائے تھے"

ریحانی۔ "صرف چھپوائے تھے نا۔ چھاپے تو پریس والوں نے"

[باہر باغ میں ہارن بجنے کی آوازیں۔ کار کے دروازے بند ہوتے اور کھلتے ہیں۔ کبھی کبھی مہمانوں کے بولنے کی آوازیں آجاتی ہیں۔ پھوپی زیتون ایک

دفعہ دریچے میں سے باہر جھانکتی اور کہتی ہے] پھوپی

زیتون۔" میں ابھی آتی ـــــــ "

[گھر کی طرف کا دروازہ کھول کر چلی جاتی ہے]

۔[سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے] :" ستم ہو گیا"

۔" یہ ساری آفت ان حضرت کی لائی ہوئی ہے۔ اس لیے

اب ریحانی کو بھیجو باہر مہمانوں کے خیر مقدم کے لئے"

:۔" مجھے کیا کہتی ہو؟ سارا کیا دھرا پریس والوں کا ہے"

:شیخیاں تو اتنی بگھار رہے تھے اور کارنامہ یہ کیا"

)۔" یہ پریس والے . . . . "

:۔" یہ پریس والے پریس والے کیا بک رہے ہو"

۔[گھبرا کر سٹیج پر ادھر اُدھر بھاگتے ہوئے۔ کبھی کبھی دریچے

سے باہر بھی جھانک لیتا ہے] :" انہیں نہ کوسوں تو اور

کسے کوسوں؟"

:۔ اپنے آپ کو کوسو"

[باہر دو ایک ہارن سنائی دیتے ہیں] "ہائے ہائے

اب ہو گا کیا!"

۔(دریچے سے جھانکتی ہے) "کاروں پر کاریں آرہی ہیں!"

ا۔" یہ پھوپی زیتون کدھر چلی گئیں۔ وہی چلی جاتیں باغ میں"

[رونے کی سی آواز] :" تم باہر جاؤ روحی۔ کھڑی

کیا دیکھ رہی ہو؟۔ ان لوگوں کو بٹھاؤ تو وہ کم از کم"

۔(چڑ کر) :" تم بھی کیا باتیں کرتی ہو صوفی۔ بٹھاؤں کہاں؟

اُلٹی کرسیوں پر یا ریحانی کے سر پر؟"

ا۔" اب اس میں میری کیا خطا؟ ــــــ ایسے خوبصورت

دعوت نامے ــــــ "

۔(قطع کلام کر کے غصے سے) :" چپ رہو ریحانی اب بھی

شیخی سے باز نہیں آتے"

۔(روتے ہوتے) " ہائے ہائے۔ اب انہیں بٹھائیں گے

کہاں؟"

ا۔" اور آپا روحی، انہیں کھلائیں گے کیا؟"

باہر باغ میں سے ایک تیز زنانہ آواز آتی ہے۔

" ارے صوفی ــ صوفی ــــــ روحی! کہاں ہو تم لوگ؟"

[صوفی ڈر کے ایک صوفے کے پیچھے جا دبکتی ہے]

صوفی۔(خوف زدہ) " ہائے ہائے یہ تو مہرو کی آواز ہے"

[روحی بھاگ کر پیانو کے نیچے جا بیٹھتی ہے]

روحی۔[خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہے] سش۔! آواز نہ نکالو۔

یہاں آجائیں گے وہ لوگ"

[ریحانی بھاگ کر دروازہ بند کر دیتا ہے تاکہ وہ

لوگ اندر نہ آجائیں]

ریحانی۔(واپس آتے ہوئے) :" اب ہم محفوظ ہیں۔ وہ نہ آسکیں گے"

ایک بوٹ پالش والا۔[دریچے کے پاس آکر زور سے] :" بوٹ

پالش۔ سلائی والا۔ بوٹ پالش والا حضور ــــــ "

ریحانی۔(بوکھلا کر) " مار دوں گا گولی سے"

بوٹ پالش والا۔(با آواز بلند) :" کیوں حضور؟ غریب کی جان لے کر

آپ کو کیا ثواب ملے گا؟"

ریحانی۔" بھاگ جاؤ یہاں سے۔ کمبخت کہیں کا۔ آیا ہے اس قیامت

کے وقت بوٹ پالش کرنے"

نازی :۔" ہاں کل میں نے اسے بلایا تھا ــــــ میری چپل ــــــ "

بوٹ پالش والا :" تو دے دیجئے بی بی وہ چپل ــــــ "

ریحانی :۔" چپ ــــــ ! جاتا ہے کہ نہیں ــــــ مہمانوں کی نظر پڑ گئی

تو سب یہاں آدھمکیں گے"

بوٹ پالش والا :۔" کون حضور؟"

نازی :۔" بوٹ پالش والے۔ اب تم جاؤ۔ مہمانوں کی نظر پڑ گئی

تو یہاں آدھمکیں گے"

بوٹ پالش والا۔[باغ کی طرف نظر ڈال کر پھر ذرا ہنس کر] :" اچھا

اچھا ــــــ ! بوٹ پالش۔ سلائی والا ــــــ بوٹ

پالش ــــــ "

[چلا جاتا ہے]

روحی۔(پیانو کے نیچے سے نکلتے ہوئے رقت بھری آواز میں) :" تو

حمد، رفعت

کھڑکی

افراد:

رضیہ	ایک بیمار لڑکی
انا	
رضیہ کا باپ	
ڈاکٹر	
جمالی	رضیہ کے باپ کے دوست

(جس وقت پردہ اُٹھتا ہے تو ایک کمرہ نظر آتا ہے جس میں
ن داخل ہونے کے لئے ایک دروازہ ہے اور عین نے سامنے
ے ایک مسہری بچھی ہوئی ہے جس پر رضیہ کوئی سترہ اٹھارہ
بک لڑکی، چہرے پر زردی چھائی ہوئی۔ بہت ہی کمزور
ہے۔ کروٹ لئے لیٹی نظر آتی ہے۔ مسہری کے ایک طرف
ہے۔ ر تاروں کے چمکنے کی روشنی کھڑکی کے شیشوں
ہوئی نظر آ رہی ہے۔ کھڑکی کے نیچے آتشدان ہے۔ جس میں
روشن ہے۔ کھڑکی کے قریب ایک گھنٹہ لٹک رہا ہے۔
ٹک ٹک کر رہا ہے۔ کمرے کے عین وسط میں ایک سبز رنگ کا
ہے۔ اس کے علاوہ کمرے کی دیواروں پر مختلف قسم کی
آویزاں ہیں اور کمرے میں مختصر سے سامان آرائش کے علاوہ
ل اور مسہری کے سرہانے ایک میز رکھی ہوئی ہے۔
بدلتی ہے۔ اور دفعتاً گھنٹہ ٹن ٹن دو بجاتا ہے۔ رضیہ گھنٹہ کی
ساتھ ایک دو تین چار گنتی گنتی ہے..... پھر خود بخود
نا کرتی ہے)

رضیہ:- ہوں ــــ پاگل!! ــــ میرے دل کی دھڑکنوں کی طرح یہ
گھنٹہ بھی رات دن دھڑکتا ہی رہتا ہے........
خاموش کیوں نہیں ہو جاتا.....؟؟ اس کی دونوں سوئیاں
متواتر چلتی ہی رہتی ہیں..... چوبیس گھنٹہ چلتی ہی رہتی ہیں
...... تھوڑی ہی دیر کے لئے سستانے ٹھہر جائیں...
...... پاگل!!

(انا جو کوئی پینتیس برس کی عورت ہے ہاتھ میں ایک برتن لئے
ہوئے داخل ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر جُھریاں پڑی ہوئی ہیں۔ وہ
حیرت سے رضیہ کی طرف دیکھتی ہے اور پھر کہتی ہے)

انّا:- بی بی تم سوئی نہیں ابھی تک؟

رضیہ:- ہاں انّا!!........

(انّا قریب آ کر مسہری کے قریب میز پر برتن رکھتی ہے)

رضیہ:- مجھے نیند نہیں آ رہی انّا ــــ

انّا:- (میز سے ذرا ہٹ کر) بی بی تم راتوں کو دیر تک نہ جاگا کرو۔

رضیہ:- انّا! صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک میں اس کمرے
میں بند پڑی رہتی ہوں۔ اس آتشدان کے قریب.....
مجھے باہر لے چل انّا۔

انّا:- باہر بہت سردی پڑ رہی ہے بی بی!!

رضیہ:- اُف کیسی سردی اور ٹھٹھرتی راتیں ہوں گی باہر! اور میں اس
آتش دان کے قریب اس کمرہ میں بند پڑی رہتی ہوں۔ انّا!
آخر مجھے اس کمرے میں کیوں بند کر دیا گیا ہے۔ یہاں میرا دم
گھٹتا ہے۔ اس آتشدان کے سُرخ شعلے..... مجھے یوں

محسوس ہوتا ہے یہ مجھے اندر ہی اندر جلا رہے ہیں۔

ا :- آتشدان کی آگ کچھ دھیمی کر دوں! (آتشدان کے قریب بڑھتی ہے)

ضیہ :- آگ دھیمی کر دینے سے کوئی آگ تو نہ بجھ جائے گی آنا! اس آگ کو بجھا دو نا۔ . . .

ا :- (آگ دھیمی کر دیتی ہے) بی بی نو بج چکے ہیں تم سو جاؤ۔

ضیہ :- نہ جانے یہ نرگوں بجتے ہیں، دس بجتے ہیں۔ گیارہ بجتے ہیں۔ اور صبح تک یہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ . . . میں شام سے صبح تک اس کھڑکی باہر برفانی راتوں کو بھی تو نہیں دیکھ سکتی . . . . . . اور تم یہ کھڑکی بھی بند کر دیتی ہو . . . . . . اور برف سے ڈھکی ہوئی چٹانیں تاریکی میں ڈوب جاتی ہیں آنا،

ا :- بی بی سو جاؤ۔

ضیہ :- آنا! یہ کھڑکی کھول دو۔

ا :- نہیں بی بی۔ سردی بہت سخت ہے، ڈاکٹر نے منع کیا ہے کہ کھڑکی یا دروازہ ہرگز نہ کھولنا۔

ضیہ :- اُف وہ منحوس ڈاکٹر تو مجھے مار کر ہی دم لے گا۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے یہاں . . . . . . اندر ہی اندر جیسے میں بھی آتشدان کی طرح سلگتی رہتی ہوں . . . . آنا کھڑکی کھول دو۔

نا :- بی بی آج سردی بہت سخت ہے . . . . ٹھنڈی ہوا سے تمہیں اور کوئی تکلیف نہ بڑھ جائے!!!؟

ضیہ :- نہیں آنا میرا جی چاہتا ہے کہ برفانی ہوائیں آ کر میرے تپتے ہوئے رخساروں میں اس قدر خنکی پیدا کر دیں . . . . . . جیسے چشمے کا پانی سرد ہوتا ہے نا آنا۔

ا :- بی بی . . . . .

ضیہ :- آنا چشمہ کا پانی کیسا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ کیسا ٹھنڈا . . . . . ؟؟

ا :- بی بی تم اچھی ہو جاؤ۔ تو پھر باوجی تمہیں چشمے پر لے کر جایا کریں گے۔

ضیہ :- اس چشمے کا پانی مجھے کتنا اچھا لگتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ چشمے کے سرد پانی میں گھٹنوں پیر لٹکائے بیٹھی رہا کروں۔

آنا :- بی بی تم ابھی ہو جاؤ جلدی سے باوجی کہتے تھے کہ وہ تمہیں اب کی مرتبہ سارے پہاڑ کی سیر کرائیں گے، کیا سمجھیں!

رضیہ :- اوہ پھر تو میں بنفشہ کے پھول بھی کتنے سارے جمع کروں گی! اور آنا! جب ڈیڈی مجھے آبشار کے کنارے لیکر جائیں گے تو جانتی ہو میں کیا کروں گی . . . . .

آنا :- کیا کرو گی بی بی . . . . . ؟؟

رضیہ :- گرتے ہوئے آبشار کے پانی کو خوب اچھال اچھال کر ڈیڈی کے کپڑے گیلے کر دیا کروں گی . . . . . اور آنا برف کے نقرئی تودوں پر دھوپ کی زرّیں کرنیں جب میری آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دیں گی۔ آنا . . . . . اور آنا! جب آبشار کی ننھی ننھی پھوار میرے چہرے پر موتیوں کی طرح بکھر جائے گی، تو آنا . . . . وہ نوکیلی چٹانیں . . . . جہاں شفق کی سرخی مسکرایا کرتی ہے . . . . . . آنا . . . . . میں وہاں جانا چاہتی ہوں آنا . . . . . میں وہاں جانا چاہتی ہوں . . . . .

آنا :- ہاں ہاں بی بی وہیں چلنا . . . . .

رضیہ :- کب آنا . . . . . کب چلو گی وہاں، جب میرا سارا جسم لکڑی کی طرح جل کر بھسم ہو جائے گا۔ جب میں تھک کر اس قدر نحیف اور بے دم ہو جاؤں گی کہ مجھ سے ایک قدم بھی نہ اٹھایا جائے گا۔ جب میری آنکھوں میں اتنی بھی طاقت نہ رہے گی کہ میں وہ سب کچھ دیکھ سکوں۔ میری اچھی آنا . . . . . . اب تو مجھ سے اٹھا بھی نہیں جاتا . . . . . آنا، وہ کھڑکی کھول دو۔

آنا :- بی بی . . . . . اگر میں نے کھڑکی کھول دی تو باوجی ناراض ہوں گے۔

رضیہ :- آنا کھڑکی کھول دو . . . . . . (روہانسی سی ہو کر) آنا کھڑکی کھول دو . . . . . (آواز بھرا جاتی ہے) آنا کھڑکی کھول دو۔

(رضیہ کا باپ داخل ہوتا ہے وہ کوئی پچاس برس کا عمر آدمی

ہے۔ نائٹ گاؤن پہنے ہوئے۔ آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ
سر کے بال کچھ سفید ہو چکے ہیں۔ بڑی بڑی مونچھیں ہیں، لیکن
داڑھی مُنڈی ہوئی ہے)

باپ:- رضیہ !! کیا بات ہے میری بیٹی ؟؟

انا:- بابو جی، کھڑکی کھولنے کو کہتی ہیں بی بی ....

باپ:- رضیہ .... ! رضیہ .....

رضیہ:- (جیسے چونک پڑتی ہے) ...... اب ..... کون ڈیڈی
...... ڈیڈی ...... (روتی ہوئی آواز میں) انّا ......
میرا کام نہیں کرتی ...... میرا کہنا نہیں مانتی ڈیڈی ...

باپ:- کیا بات ہے ؟ ...... میری بچی ..... (ماتھے پر ہاتھ رکھ کر)
ارے تمہیں تو تیز بخار ہے اس وقت ...... !!

رضیہ:- ڈیڈی .... انّا کھڑکی نہیں کھولتی ..... انّا کھڑکی نہیں
کھولتی ......

باپ:- کھڑکی کیسے کھولی جا سکتی ہے میری بیٹی۔ تمہیں کس قدر تیز
بخار ہے ...... اور باہر سخت سردی پڑ رہی ہے۔

رضیہ:- ڈیڈی کھڑکی کھول دیجئے ...... ابا جان

باپ:- میری اچھی بیٹی ضد نہیں کیا کرتے ......

رضیہ:- ڈیڈی آپ بھی کھڑکی نہیں کھولیں گے (رونے لگتی ہے)
اگر میری امّی ..... میری امّی ہوتیں تو وہ ضرور کھڑکی
کھول دیتیں۔

باپ:- وہ بھی تمہاری اس حالت کو دیکھ کر کھڑکی نہیں کھولتیں
سمجھیں !

رضیہ:- ڈیڈی کھڑکی کھول دیجئے ..... ڈیڈی کھڑکی کھول دیجئے
..... (کہتے کہتے رضیہ پر گویا نیم بیہوشی طاری ہو جاتی ہے)

باپ:- انّا ..... رضیہ کو تیز بخار ہے اس وقت ...... دیکھو
اس پر کیسی غفلت طاری ہو گئی ہے۔

انا:- ہاں بابو ...

باپ:- تم اس کے پاس ٹھہرو میں ڈاکٹر کو لینے جاتا ہوں ....
(جلدی جلدی دروازہ سے باہر چلا جاتا ہے) رضیہ بستر
پر خاموش پڑی ہوئی ہے اور انّا اس کی مسہری کے قریب کھڑی
ہوئی رضیہ کو تک رہی ہے۔ تھوڑی دیر تک خاموشی سی
طاری رہتی ہے رضیہ پھر کروٹ سی لیتی ہے اور آنکھیں کھول کے
پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتی ہے ......)

انا :- بی بی ۔۔۔ بی بی ہوشیار ہو، کیا بات ہے ؟

رضیہ :- ڈیڈی .... کہاں چلے گئے ابا جان مجھے چھوڑ کر ....

انا :- وہ ڈاکٹر کو لینے گئے ہیں بی بی ....

رضیہ :- ڈاکٹر کو ..... ؟؟ اسی منحوس ڈاکٹر کو جس نے میرا سارا
بانہہ انجکشن لگا لگا کر چھلنی کر دیا ہے۔

انّا :- بی بی تمہیں بہت تیز بخار ہے .....

رضیہ :- ہاں انّا ..... میرا سارا جسم پھکا جا رہا ہے ......
پھکا جا رہا ہے۔ میرا سارا جسم پھکا جا رہا ہے میرا سارا جسم
...... اف !! ...... اس کمرے کے باہر ہر چیز ٹھنڈی
ہوئی خنک اور سرد ہو گی، وہ پہاڑ برف میں دبے ہوئے
...... وہ چشمے برف سے منجمد ۔۔۔ وہ درخت برف سے
ڈھکے ہوئے ...... لیکن میرا جسم پھکا جا رہا ہے ۔۔۔
انّا تھوڑی دیر کے لئے وہ کھڑکی کھول دو ...... کھول دو
میری اچھی انّا ......

(رضیہ کا باپ پھر داخل ہوتا ہے ایک اوورکوٹ پہنے ہوئے
اور ہیٹ اُتار کر کھونٹی پر لٹکاتا ہے۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر آتا ہے۔ ہاتھ میں
چھوٹا سا بیگ ہے۔ ڈاکٹر سوٹ پہنے ہوئے ہے .... آتے ہی وہ رضیہ
کے قریب بیٹھ جاتا ہے ..... اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی نبض دیکھتا ہے)

ڈاکٹر :- کیسی طبیعت ہے بی بی ؟ (رضیہ اس کی طرف سے منہ پھیر لیتی
ہے) اوہ کافی تیز بخار ہے (رضیہ کے باپ سے مخاطب ہو کر)
کوئی ایسی بات نہیں۔ میں ایک انجکشن لگا دیتا ہوں۔ رات بھر
خوب آرام سے سوئیں گی۔

باپ :- اچھا ڈاکٹر (ڈاکٹر اپنا بیگ کھول کر انجکشن کا سامان نکالتا ہے)

رضیہ :- نہیں نہیں اب میرے انجکشن نہ لگاؤ۔ نہ لگاؤ ..... کوئی
انجکشن نہ لگاؤ۔

باپ :۔ میری بیٹی ! تمہیں سکون سے نیند آجائے گی۔

رضیہ :۔ سکون سے نیند آجائے گی۔ اوہ ۔۔۔۔۔ اوہ مجھے سکون سے سونا ہی تو چاہیئے ڈیڈی !

[ڈاکٹر انجکشن تیار کر کے رضیہ کے بستر کے قریب آتا ہے۔ اور پھر بازو کی آستین اوپر کرتا ہے۔ رضیہ کا باپ ٹارچ سے لائٹ ڈالتا ہے، ڈاکٹر انجکشن لگاتا ہے۔ جس پر رضیہ کی ایک ہلکی سی سسکی نکلتی ہے۔]

ڈاکٹر :۔ (ہنس کر) (اب تم بالکل آرام سے سو جاؤ۔ بے بی۔

رضیہ :۔ آرام سے !!۔۔۔۔ ہاں اب میں سونا بھی چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ کیا بج گیا !کیا بج گیا آتا ! ساڑھے نو بج گئے !!

باپ :۔ رضیہ !!!

رضیہ :۔ ڈیڈی میں بھی اب آرام سے سونا چاہتی ہوں۔ جیسے سب سو رہے ہیں۔ ان برفانی راتوں میں جیسے سب ہی تو ٹھٹھر کر سو گئے ہیں۔

ڈاکٹر :۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں صبح ہی آؤں گا۔ اچھا شب بخیر!

باپ :۔ شب بخیر ڈاکٹر!!۔۔۔۔۔ (باپ رضیہ کی طرف دیکھتا ہے اور پھر تفکرانہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے رضیہ کی طرف جھک کر کہتا ہے) رضیہ !!

رضیہ :۔ (چونک کر) ایں !! ہاں۔ کیا وہ چلا گیا ڈیڈی !۔۔۔ کیا وہ چلا گیا۔۔۔۔

باپ :۔ کون ڈاکٹر !!۔۔۔۔۔ ہاں۔

رضیہ :۔ ہاں ڈیڈی اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب میں بڑے آرام سے سو جاؤں گی۔ ساڑھے نو بج رہے ہیں نا۔

باپ :۔ (تکلیف دہ آواز میں) رضیہ ! میری بچی !!

رضیہ :۔ ڈیڈی !!۔۔۔۔۔ میری آنکھوں میں نیند لوریاں دے دے کر مجھے تھپک رہی ہے۔ گا رہی ہے۔۔۔۔۔
ہاں۔۔۔۔ جیسے امی مجھے لوریاں دیا کرتی تھیں نا۔۔۔ ڈیڈی!

باپ :۔ رضیہ ! میری بیٹی !!۔۔۔۔ تم ایسی باتیں مت سوچو !!

رضیہ :۔ ڈیڈی !! میں تو اب باہر۔۔۔۔ اس کھڑکی سے باہر اڑتی پھروں۔ جیسے برف کے گالے اڑتے پھرتے ہیں نا ڈیڈی !! کبھی چٹانوں پر کبھی اس پہاڑی پر کبھی اس پہاڑی پر کبھی اس چوٹی پر۔۔۔۔۔ اب مجھے سکون آ رہا ہے ڈیڈی !! جیسے جلتے کا پانی منجمد ہو کر رہ جاتا ہے نا۔

باپ :۔ رات کافی ہو چکی ہے۔ تم آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو رضیہ !!

رضیہ :۔ ہاں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتی ہوں۔ آنکھیں تو خود بخود بند ہو جائیں گی ڈیڈی !!

باپ :۔ اوہ تم کیسی عجیب باتیں کر رہی ہو۔

رضیہ :۔ ڈیڈی !! میرا جسم پھنک رہا ہے۔ جیسے کسی نے مجھے جلتے ہوئے الاؤ میں ڈال دیا ہو۔۔۔۔۔ میں نے وہ کہانی پڑھی تھی ! وحشیوں کی کہانی۔ جو۔۔۔ ایک لڑکی کو آگ کے الاؤ میں ڈال دیتے تھے۔ اور پھر اس الاؤ کے گرد سب مل کر وحشیانہ رقص کرتے تھے۔

باپ :۔ رضیہ !!

رضیہ :۔ ڈیڈی جیسے لاوا پگھل کر بہنے لگتا ہے نا میں بھی۔۔۔۔ جیسے آتش فشاں پہاڑ کے دہانے میں مجھے ڈال دیا ہو۔۔۔ اوہ !!

باپ :۔ میری بیٹی !! تمہارا بخار کم ہو جائیگا۔

رضیہ :۔ کم ہو جائے گا !! نہیں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ باہر بھاگ جاؤں باہر برف کے تودوں پر چشمے کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں خوب غوطے لگاؤں۔ ڈیڈی مجھے باہر لے چلئے !!

باپ :۔ تم بھی کتنی عجیب ہو۔ عجیب قسم کی ضدیں کر رہی ہو۔

رضیہ :۔ ڈیڈی آپ میری یہ ضد نہیں اٹھا سکتے۔

باپ :۔ تمہاری ہر جا و بے جا ضد کا ہی تو یہ نتیجہ ہے کہ آج تمہاری یہ حالت ہے۔

رضیہ :۔ اوہ !!۔۔۔۔ میری آخری ضد۔۔ یہ بھی پوری کیجئے ڈیڈی !!

باپ :۔ نہیں تم سو جاؤ !! ـــــ جب تم [illegible] میری گڑیا۔ تو میں تمہاری ساری ضدیں پوری [illegible]۔

رضیہ :۔ اور اگر میں اچھی نہ ہوئی ؟

باپ :۔ اوہ پاگل پن کی باتیں کیئے ہی جاؤگی۔ سو جاؤ میری بیٹی !! رضیہ !!....

رضیہ :۔ اچھا ڈیڈی۔ وہ کھڑکی ہی کھول دیجئے !۔۔ وہ کھڑکی ہی کھول دیجئے۔ وہ کھڑکی ہی کھول دیجئے...... وہ..... کھڑکی..... ہی کھول...... دیجئے..... وہ..... کھڑکی.....

[آہستہ آہستہ کہتے کہتے خاموش ہو جاتی ہے۔ رضیہ کا باپ جھک کر رضیہ کو دیکھتا ہے۔ انا۔ جو اس عرصہ تک ایک بُت بنی کھڑی تھی۔ اور قدرے اونگھنے لگی تھی۔ اس سے کہتا ہے]

باپ :۔ انا !!

انا :۔ ہاں بابو....

باپ :۔ رضیہ سو گئی ہے۔ ابھی ابھی آنکھ لگی ہے.....

انا :۔ ہاں بابو.....

باپ :۔ آج تم یہیں ٹھیرو.....

انا :۔ یہیں ٹھیروں رضیہ کے پاس !!

باپ :۔ ہاں۔ اور کوئی بات ہو تو مجھے فوراً خبر کر دینا۔

انا :۔ اچھا بابو....

(رضیہ کا باپ آہستہ سے کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ انا ایک کرسی کے سہارے بیٹھ جاتی ہے اور اونگھنا شروع کر دیتی ہے۔ کچھ وقفہ کے بعد جمالی آتا ہے۔ جمالی کوئی پچاس برس کا ادھیڑ آدمی ہے۔ چھریرہ بدن اور اورکوٹ پہنے ہوئے۔ سر پر نائٹ کیپ..... گویا باہر سے سیر کر کے آیا ہے]

جمالی :۔ رضیہ !! دیکھو آج.....

انا :۔ (ایک دم چونک کر) بابو ــــ شش..... شش۔
(اور منہ پہ ہاتھ رکھ کر بولنے سے منع کرتی ہے)

جمالی :۔ (حیرت سے) کیا بات ہے ؟!

انا :۔ بی بی ابھی سوئی ہیں۔ ڈاکٹر انجکشن لگا کر گیا ہے۔

جمالی :۔ ہوں ...... میں بنفشہ کے پھول لایا تھا۔ رضیہ کے لئے۔

انا :۔ بڑی مشکل سے سوئی ہیں۔ کہتی تھیں انا کھڑکی کھول دو۔ انا کھڑکی کھول دو۔

جمالی :۔ تو کھڑکی کیوں نہیں کھول دیتیں ؟

انا :۔ نہیں بابو۔ بی بی کو بہت تیز بخار ہے۔

جمالی :۔ ہاں ٹھیک ہے۔ اور رضیہ یہ نہیں جانتی کہ باہر کی سرد ہوا اس کے لئے کتنی مضر ہے۔ ہا ہا ہا۔ اوہ مجھے اس طرح نہیں ہنسنا چاہیئے۔ رضیہ ابھی سوئی ہے نا۔۔ لیکن تم یہاں کیوں ہو ؟....

انا :۔ بابو جی نے کہا ہے میں یہیں ٹھیروں۔ بی بی کے پاس !

جمالی :۔ اوہ (ہنستا ہے)

انا :۔ بابو !!......

جمالی :۔ اوہ رضیہ جاگ اُٹھے گی۔ اور پھر اسے یہی تاریکی۔ یہ گھٹا گھٹا کمرہ نظر آئے گا۔ اس وقت تو وہ خوابوں کی دُنیا میں..... دور آسمان کی پہنائیوں میں نہ جانے کیسے کیسے رنگ محلوں کی سیر کر رہی ہوگی۔ سو رہی ہے بیچاری !! تھک کر سو گئی ہے جیسے بالکل ہی تھک کر سو گئی ہے۔ (کھڑکی کے شیشوں سے جھانکتے ہوئے کہتا ہے) میری بیوی بھی اسی طرح تھک کر سو گئی تھی۔

انا :۔ آپ کی بیگم۔ بابو !! ــــ

جمالی :۔ ہاں ایک دن ایسا آیا۔ کہ وہ ہمیشہ کے لئے تھک کر سو گئی۔ جانتی ہے انا وہ کیوں سو گئی تھی ؟

انا :۔ کیوں بابو !!

جمالی :۔ وہ مقابلہ کرتے کرتے آخر تھک گئی تھی اور پھر سو گئی۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ وہ آزادی سے ہر جگہ اُڑتی پھرے۔ لیکن اس کے جسم پر زنجیروں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ زنجیروں کا لامتناہی جال.... اسے قید کر دیا گیا تھا۔

انا :۔ قید کر دیا گیا تھا۔ کس نے قید کیا تھا بابو !

جمالی :۔ میں نے !!

انا :۔ تم نے بابو؟

جمالی :۔ ہاں تم نے !!

انّا :۔ سب نے بابو !!

جمالی :۔ ہاں ..... سب نے !.. ساری دنیا نے۔ سارے ڈاکٹروں نے... بڑے بڑے طبیب اور سنگدل ڈاکٹر۔ جو عورت کے گرد کیڑوں کی طرح رینگتے ہیں۔ اس کے ماں باپ۔ بھائی بہن۔ رشتہ دار۔ دوست احباب.... وہ سمجھتے ہیں اگر اسے ہلکی ہوا میں چھوڑ دیا گیا تو وہ ہوا اس کے لئے مضر ثابت ہوگی۔ کیونکہ وہ خود گھٹے ہوئے تاریک ماحول میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔

انّا :۔ بابو تمہاری بیگم کو کیا بیماری تھی ؟

جمالی :۔ یہی بیماری جو رضیہ کو ہے۔ جو تمہیں ہے۔ جو ہر عورت کو ہے۔

انّا :۔ مجھے ! ہر عورت کو !!

جمالی :۔ ہاں ہر عورت ایک بیماری میں مبتلا ہوتی ہے ــ وہ دوسروں کے ہاتھوں کا کھلونا ہوتی ہے۔ جب تک کنواری ہوتی ہے ماں باپ اس سے کھیلتے ہیں۔ اور پھر اسے موم کی گڑیا سمجھ کر جدھر چاہتے ہیں اس کا منہ موڑ دیتے ہیں جب وہ خاوند کے ہاتھوں میں آجاتی ہے وہ خاوند جیسے چاہتا ہے اسے ناچنا پڑتا ہے۔ اور پھر وہ ماں بن جاتی ہے۔ اور اس کی اولاد اس سے کھیلتی ہے۔ انّا ! تم سوچ کیا رہی ہو۔ تم بھی تو ہو ایک کھلونا ! ــــ عورت ہزاروں زاویوں میں گھومتی ہے۔ لیکن صرف ایک کھلونے کی طرح..... تم مجھے اس طرح گھور گھور کر کیا دیکھ رہی ہو۔

انّا :۔ بابو تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ !!

جمالی :۔ تم سمجھتی ہو۔ یہ پاگل ہے ــــ ہاں میں پاگل ہوں لیکن اس رضیہ کو دیکھو۔ اس کے جسم کو۔ اس کی روح کو..... اس کی ساری زندگی کو ایک بیماری نے جکڑ کر رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر سمجھتے ہیں اسے نمونیہ ہو گیا ہے لیکن یہ چاہتی ہے کہ وہ کھڑکی کھول دی جائے۔ اور یہ بستر سے اٹھ کر کھڑکی خود کھول نہیں سکتی۔ اور یہاں کوئی اور کھڑکی کھولنا نہیں چاہتا۔ میری بیوی بھی بیمار تھی لیکن جب وہ مر گئی۔ تو پھر... اسے کوئی نہ روک سکا !! اور میں تو ابھی تک نہیں روک سکا !!

انّا :۔ کسے بابو !!

جمالی :۔ اس کی چیخوں کو !! اس کی چیخیں۔ بے پناہ چیخیں۔ ساری کائنات میں گونجتی ہیں۔ وہ خوفناک اور بھیانک چیخیں۔ مگر سوائے میرے کوئی نہیں سنتا !! سنو !! وہ اب بھی چیخ رہی ہے ..... میں اب بھی اس کی خوفناک چیخیں سن رہا ہوں۔ وہ سنو !! کھڑکی سے باہر اس کی بھیانک چیخوں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ سنا تم نے !!

انّا :۔ یہاں تو کسی کی چیخ کی آواز نہیں آرہی بابو !!

جمالی :۔ تم کیسے سن سکتی ہو۔ کیونکہ تم بہری ہو..... لیکن ایک دوسرے کو سرگوشیاں کرتی ہوئی پہاڑ کی چوٹیاں..... ان کے سینوں میں شاہدہ کی چیخیں سمائی ہوئی ہیں۔ وہ چیخ رہی ہے مسلسل چیخ رہی ہے۔ کمرے کے باہر وہ چیخ رہی ہے۔ جانتی ہو وہ کیا کہہ رہی ہے ؟

(اس کی نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑانے کی آواز آتی ہے انّا کھڑکی کھول دو)

جمالی :۔ (چونک کر رضیہ کو دیکھتے ہوئے) اوہ وہ جاگ نہ جائے۔ وہ سو رہی ہے۔ میں یہاں سے چلا جاتا ہوں کبھی وہ جاگ اٹھے رضیہ کی دبی دبی چیخیں بھی میری شاہدہ کی طرح ہیں اور میں انہیں برداشت نہ کر سکوں گا۔

(کمرے کے اندر کے دروازے سے چلا جاتا ہے..... انّا پھر کرسی کے سہارے بیٹھنا چاہتی ہے۔ کہ کرسی زور سے کھسکتی ہے جس کی آواز پر رضیہ چونک کر اٹھتی ہے)

رضیہ :۔ امّی ! ــــ امی !! ــــ

انّا :۔ بی بی۔ بی بی.....

رضیہ :۔ کہاں گئیں میری امّی !!..... امی !.....امی..... میری

انّا :۔ بی بی !!

رضیہ :۔ نہیں نہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گی (اٹھنے کی کوشش کرتی ہے)

ا:۔ بی بی۔ اُٹھنے کی کوشش نہ کرو۔ بی بی۔۔۔۔

یہ:۔ اَنّا۔ میری امّی۔ وہ کھڑکی سے باہر کھڑی ہیں۔ انھیں اندر بلالو!!

:۔ وہاں کوئی نہیں ہے بی بی۔۔۔۔ کوئی بھی تو نہیں ہے۔

یہ:۔ اوہ انا تم اندھی ہوگئی ہو۔ وہ دیکھو!! (آواز دے کر) امی!!۔۔۔ امّی اندر آیئے نا۔۔۔۔۔

:۔ بی بی یہ تمہارا وہم ہے۔ تمہارا وہم ہے۔

یہ:۔ نہیں نہیں۔ وہ ابھی کھڑکی سے باہر کھڑی ہیں۔ کھڑکی سے باہر۔۔۔ انا کھڑکی کھول دو۔ وہ دیکھو ان کے بکھرے ہوئے بال ہوا میں اُڑ رہے ہیں (زور سے آواز دیتی ہے) امّی! امی!! اندر آجایئے نا۔۔۔ امی!!۔۔۔ (اور پھر نقاہت سے گردن ایک طرف کرکے کہتی ہے) اَنّا کھڑکی کھول دو۔۔۔

(اور یہ کہتے کہتے رضیہ پر جیسے غشی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اس اثنا میں رضیہ کا باپ گھبرایا ہوا کمرہ میں آتا ہے)

پ:۔ کیا بات ہے انا؟!

:۔ بی بی چونک پڑی تھیں۔

یہ:۔ (پھر چونک کر) نہیں۔ کھڑکی کھول دو۔۔۔ کھڑکی کھول دو۔ اَنّا کھڑکی کھول دو۔۔۔۔

پ:۔ رضیہ! رضیہ!! بیٹی۔ اُٹھنے کی کوشش نہ کرو۔۔۔۔ میری بچی!!۔۔۔ ۔۔۔ (اور باپ رضیہ کے بازو پکڑکر اسے لیٹے رہنے کی کوشش کرتا ہے)

یہ:۔ نہیں مجھے چھوڑ دیجئے ڈیڈی!! میں وہ کھڑکی کھول کر رہونگی وہ دیکھئے ڈیڈی۔ میری امّی!! بال بکھرے ہوئے کھڑکی سے باہر!!۔ ڈیڈی!! باہر ٹھٹھری ہوئی راتیں ہیں میری امی۔ میری امی۔ وہاں ٹھٹھری کھڑی ہیں۔

پ:۔ (ٹھنڈا سانس لے کر) تجھے یہ کیا ہو رہا ہے رضیہ!! تمہاری امّی کہاں ہو سکتی ہیں!! وہ تو ہم سے کب سے جدا ہو چکی ہیں۔

یہ:۔ نہیں، وہ باہر کھڑی ہیں۔۔۔ وہ دیکھئے۔ اس شیشہ کے پاس۔۔۔۔ وہ اشارے سے مجھے بلا رہی ہیں ڈیڈی سنا می!!۔

۔۔۔۔امی۔ وہ دیکھئے۔ وہ ہنس رہی ہیں!! وہ بنفشہ کے پھولوں کی ٹوکری لئے کھڑی ہیں ڈیڈی۔!! ڈیڈی انہیں اندر بلا لیجئے!! باہر بہت سردی ہے۔ وہ ٹھٹھر کر رہ جائینگی!۔۔۔۔۔ کھڑکی کھول دیجئے ڈیڈی!!

باپ:۔ (گلوگیر آواز میں) رضیہ!! خدا کے لئے میرا کلیجہ پھٹ جائیگا تم اُٹھنے کی کوشش نہ کرو!!

رضیہ:۔ نہیں!! وہ کھڑکی کھول دیجئے!! وہ کھڑکی کھول دیجئے!۔۔۔۔ اَنّا! تو بھی میرا منہ تک رہی ہے۔ کھڑکی کھول دو۔۔۔۔ کھڑکی۔۔۔۔ کھول دو۔۔۔۔۔

(یہ کہتے کہتے رضیہ پر غشی طاری ہو جاتی ہے)

باپ:۔ رضیہ کی طبیعت آج زیادہ خراب ہے۔ میں پھر ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں۔ تم رضیہ کے پاس رہنا۔

(یہ کہکر باپ باہر کے دروازے سے چلا جاتا ہے)

(انا رضیہ کے بستر کے قریب بیٹھی ہوئی ہے۔ کمرہ میں خاموشی طاری ہے۔ گھنڈی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی ہے۔ رضیہ کے لب کچھ ہل رہے ہیں۔ اور بالآخر ایک جھٹکے کے ساتھ بند ہو جاتے ہیں۔ اور عین اس وقت انا جو اونگھ رہی تھی جھٹکے سے ہوشیار ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں رضیہ کا باپ اور ڈاکٹر گھبرائے ہوئے آتے ہیں۔ ڈاکٹر جلدی سے رضیہ کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے اور مایوسی اور تکلیف کی شدت سے رضیہ کا ہاتھ آہستہ سے اس کے پہلو میں رکھ دیتا ہے)

باپ:۔ ڈاکٹر!!۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔۔۔ رضیہ!!۔۔۔۔ رضیہ!! (دیوانہ وار رضیہ کو جھنجھوڑتا ہے) رضیہ!!۔۔۔ میری رضیہ!!۔۔۔۔۔۔ اوہ کیا تو کھڑکی سے باہر چلی گئی۔ اپنی امی کے پاس!! (رضیہ جلدی سے کھڑکی کی طرف جاتا ہے) کہاں گئی رضیہ!۔۔۔۔

(ڈاکٹر اس عرصہ میں رضیہ کے چہرے پر چادر ڈال دیتا ہے۔ انا۔۔۔۔ بستر کے قریب کھڑی ہوئی بسور رہی ہے۔ اور اپنے آنسو خشک کرتی ہے۔ رضیہ کا باپ کھڑکی کے پاس بت بنا ہوا وحشیانہ انداز میں کھڑا ہے۔ ڈاکٹر آہستہ آہستہ اس کے

آپ کے حسن کا محافظ

جانِ صبا

(ٹرانسپیرنٹ سوپ)

آپ کی جلد کو ریشمی،
نرم، مرمریں، اور
جوان رکھتا ہے۔

فلم اسٹار صابرہ سلطانہ کہتی ہے

جمیل سوپ ورکس لمیٹڈ
بوگرہ

○

دوستو تم بھی اُدھر کو دیکھو — میری معراجِ نظر کو دیکھو

سر اُٹھایا تھا کس انداز کے ساتھ — شعلۂ خاک بسر کو دیکھو

دُھل گئی داغِ ریا کی تہمت — عصمتِ دامنِ تر کو دیکھو

ہاتھ اٹھاتے ہیں دُعا کو نادان — اِن گدایانِ اثر کو دیکھو

رہبری، ہمسفری، راہزنی — میری اُفتادِ سفر کو دیکھو

نور کا سَیل ہے ویرانے میں — دل کو اس اُجڑے نگر کو دیکھو

اک جہاں دیکھ رہا ہے مجھ کو — اک نظر تم بھی اِدھر کو دیکھو

ظلمتِ شب کے فسانے نہ سُنا — نورِ شب زادِ سحر کو دیکھو

کوئی آیا، کوئی آیا جیسے — نظرِ جانبِ در کو دیکھو

دل کی دھڑکن کو بھی سمجھا پیغام — گوشِ محرومِ خبر کو دیکھو

پھر کہاں سیرِ جہانِ گذراں — جلوۂ راہگذر کو دیکھو

ہمہ افسوں، ہمہ افسانہ حفیظؔ
حاصلِ عمرِ بشر کو دیکھو

○

بیکار ہے گرہ ترے بندِ نقاب کی
بادل سے چھن رہی ہے چمک آفتاب کی

اب تک زباں پہ ہے ترے قرب کی مٹھاس
صدیوں کی طرح کٹتی ہیں گھڑیاں شباب کی

مبہم سی ایک آس پہ انسان زندہ ہے
جلتی ہے لو چراغِ حقیقت میں خواب کی

مجھ کو تو حسن و خیر کے پھولوں کی ہے تلاش
لڑھکا رہا ہے شیخ چٹانیں ثواب کی

فصلِ بہار میں بھی وہ تھی ہیبتِ خزاں
دستِ دعا بنی رہی پتی گلاب کی

دامانِ شب میں دن کے اُجالے کی بھیک ہے
تاروں میں بٹ گئی ہے کرن آفتاب کی

اِک پل کی زندگی ابدیت سے کم نہیں
کس شان سے چلی ہے سواری حباب کی

ٹھہرا ہوں اس خطا پہ سزاوارِ دار کا
سب نعمتوں سے میں نے حیات انتخاب کی

ہر ہر قدم پہ ٹھوکر بلاتے رہے مگر
فرصت کسے ندیم سوال و جواب کی

○

چرخ کی سعیِ جفا کوشش ناکارہ ہے
گردشِ دہر ہمیں جنبشِ گہوارہ ہے

لہریں لیتی ہے مرے سینۂ پرخوں میں تپش
موجِ گلگشتِ چمن یا کوئی مہ پارہ ہے

بہہ گئے دیدۂ نم ناک سے دریا لیکن
دل وہی ایک دہکتا ہوا انگارہ ہے

دل ہوا سوزِ جہنم میں گرفتار مگر
روح اب بھی کسی فردوس میں آوارہ ہے

کیسی تقدیر کی گردش! ابھی دل کو میں نے
گردشِ گنبدِ افلاک پہ دے مارا ہے

میرے شعروں سے تعرض نہ کر اے ناقدِ فن!
میری بربادیِ دل ہی کا شہ پارہ ہے

جب بھی فکر پہ قادر ہوں میں جب تک اختر
مجھے سرمایۂ اندوہ بہت پیارا ہے

ضمیر کشمیری

○

بہت بلند سہی قصر ماہپاروں کا
غرورِ عجز بھی کیا کم ہے خاکساروں کا
نہ کوئی داغِ تمنا، نہ کوئی داغِ وصال
بڑا ہی پاک ہے دامن گناہگاروں کا
سکوت پر بھی جرس کا گماں گزرتا ہے
کہیں قریب نہ ہو قافلہ بہاروں کا
کچھ اس ادا سے کسی کا ورُودِ ناز ہوا
حیا سے پھیل گیا رنگ شاخساروں کا
نہ کوئی وعدۂ محشر، نہ کوئی وعدۂ شب
ازل سے تھا یہی مطلب ترے اشاروں کا
ہمیں پہ گردشِ بُتاں، ہمیں پہ برق بلا
ہمیں پہ ختم ہوا عشق گلعذاروں کا
شعاعِ مہر سے بھی ظلمتِ الم نہ گئی
سحر علاج نہ تھا تیرے غم کے ماروں کا
وفا کے بعد غمِ معتبر ملا ہم کو
جفا کے بعد بھرم کھُل گیا نگاروں کا
ترے حضور رہے جلوؤں کے اس قدر انعام
دہن بھی کھُل نہ سکا تیرے شرمساروں کا
زمینِ دل کہ جہاں خاک اُڑ رہی ہے ضمیر
اسی زمیں پہ کبھی شہر تھا نگاروں کا

قتیل شفائی

ریشم جیسے بال تمہارے، چال سنکتی پُروائی
تم آئے تو جگیا بن کر مہکی اپنی تنہائی

یہ گُل رنگ بدن کا جادُو، یہ خوشبُو پیراہن کی
اپنے موسم سے کچھ پہلے اب کی بار بہار آئی

جالی کے اس گھونگھٹ میں یہ پھُول سا چہرا کیا کہنا
اصل میں تم کو دیکھ کے بھنورے بجاتے ہیں ہرجائی

جو بھی ہے فن پارا اس میں رُوپ تمہارا شامل ہے
تم سے اپنا مان بڑھائیں کیا غالب کیا چغتائی

کس میں اتنا ہوش کہ تم سے آنکھ ملا کر بات کرے
اب جانا یہ دل والے کیوں ہو جاتے ہیں سودائی

تم پہلو میں آئے تو حالات کا ماتم بھول گیا
آج تو اپنی آہوں میں بھی گونج رہی ہے شہنائی

آؤ قتیل کسی کے در پر ڈیرے ڈال کے بیٹھ رہیں
پہلے نام کمایا ہم نے اب کمائیں کچھ رسوائی

○

ہم تجھ سے بچھڑ کر جانے کیوں وہ عہد، وہ پیماں بھول گئے
جینے کی کچھ ایسی چاٹ لگی مرنے کے سب ارماں بھول گئے

آئینۂ دل پر آخر تک لے دے کے اک اپنا عکس رہا
ہر صورت خواب پریشاں تھی، ہم خواب پریشاں بھول گئے

دیکھی جو کہیں اک شمع حیا، کچھ ہم کو بھی جیسے یاد آیا
خود اپنے ہی پہلو میں رکھ کر اک شعلۂ عریاں بھول گئے

آنکھوں میں لہو کی بوند نہیں، سینے میں نہیں چنگاری بھی
وہ فصل تمنا بیت گئی، ہم جشن چراغاں بھول گئے

ہم اپنی کہانی کس سے کہیں خود ہم کو جھوٹی لگتی ہے
وہ کون تھا، کس کو چاہا تھا، اے عمر گریزاں بھول گئے

گر تجھ کو ملے اے بادِ سحر، ہم جیسا کوئی خاک بسر
کہنا کہ جسے اپنا کوئی گھر اور راہ بیاباں بھول گئے

یوں ہم نے عمر بسر کی ہے دنیائے وصال و ہجراں میں
اک غم کی رفاقت یاد رہی اور سارے عنواں بھول گئے

وامق جونپوری

○

مرے فکر و فن کو نئی فضا نئے بال و پر کی تلاش ہے
جو قفس کو یاس کے پھونک دے مجھے اس شرر کی تلاش ہے

ہے عجیب عالم سرخوشی نہ شکیب ہے نہ شکستگی
کبھی منزلوں سے گزر گئے کبھی رہگذر کی تلاش ہے

مجھے اس جنوں کی ہے جستجو جو چمن کو بخش دے رنگ و بو
جو نوید فصل بہار ہو مجھے اس نظر کی تلاش ہے

مجھے اس سحر کی ہو کیا خوشی جو ہو ظلمتوں میں گھری ہوئی
مری شام غم کو جو لوٹ لے مجھے اس سحر کی تلاش ہے

یہی کہنے کے لئے چارہ گر مجھے بے شمار ملے مگر
جو مزاج غم کو سمجھ سکے اسی چارہ گر کی تلاش ہے

مرا حوصلہ وہ بڑھائے کیا مجھے راستہ وہ دکھائے کیا
جسے خود ہی اپنی نمود کے لئے میرے سر کی تلاش ہے

مرے ناصحا مرے نکتہ چیں تجھے میرے دل کی خبر نہیں
میں حریف مسلک بندگی تجھے سنگ در کی تلاش ہے

مجھے عشق حسن و حیات سے مجھے ربط فکر و نشاط سے
مرا شعر نغمۂ زندگی تجھے نوحہ گر کی تلاش ہے

اُسے فکر کہ وامق خستہ گر کسی راز سے نہ ہو باخبر
مجھے ناز ہے کہ یہ دیدہ ور مری عمر بھر کی تلاش ہے

سلیم احمد

O

روکے نہ یہ فریبِ بہاراں چلے چلو
یہ دامِ رنگ ہے کہ گلستاں چلے چلو

پھولوں نے آنکھ بھر کے نہ دیکھا تو رنج کیا
کانٹوں کے التفات پہ نازاں چلے چلو

منزل نظر میں ہے تو اندھیروں کی فکر کیا
یارو مثالِ شعلۂ رقصاں چلے چلو

مدت سے دشتِ درد کی راہیں اداس تھیں
اب کے اُدھر بہ زورِ بہاراں چلے چلو

روکے جو راستے میں سو رہزن سے کم نہیں
وہ پھول ہو کہ خارِ بیاباں چلے چلو

ہر لمحہ بے کراں ہے جہاں تک سفر کریں
اور رُک گئے تو پھر وہی زنداں چلے چلو

جو چُپ رہا سلیم سو پتھر سا بن گیا
نالاں نہیں تو غزل خواں چلے چلو

○

انداز کشِ نعرہ زناں اور کوئی بات
منجملۂ آدابِ فغاں اور کوئی بات
اے محوِ غمِ تشنہ لباں اور کوئی بات
یہ محفلِ ساقی ہے یہاں اور کوئی بات
ناقدریٔ دُنیا کی شکایت ہے پرانی
اے طبعِ جواں فکرِ جواں اور کوئی بات
یہ مستی و ہستی کی حکایات بھی تا چند
اے حلقۂ رندانِ جہاں اور کوئی بات
افسانۂ رفتارِ مہ و سال کہاں تک
اے نقش گرِ عمرِ رواں اور کوئی بات
اب چارۂ بیمار کہاں جنبشِ لب میں
اے رشکِ مسیحا نفساں اور کوئی بات
اں لہجۂ و افکار میں یہ فرق بھی تا کے
ہاں نکتہ شناسانِ زباں اور کوئی بات
شائستۂ اعجاز نہیں زورِ تکلّم
وارفتۂ اندازِ بیاں اور کوئی بات
حیرت کے سوا بھی ہیں نظر کتنی ہی باتیں
لیکن وہ سمجھتے ہیں کہاں اور کوئی بات

نشور واحدی

○

اپنی بھی داستانِ محبت یُوں ہی چلی
کچھ دن وہ ملتفت نہ ہوئے بے رُخی چلی

گزرا تھا اُس گلی سے کہ زخمی ہوئی حیات
جانے کہاں سے پھول گرے، پنکھڑی چلی

سب منتظر تھے جلوہ گہہِ ناز کے قریب
جس زندگی کو آپ نے آواز دی چلی

کہنے کو بے وفا ہے نسیمِ سحر مگر
مُڑ مُڑ کے وہ بھی سوئے چمن دیکھتی چلی

تاریک تر ہیں کوچۂ مشرق کے پیچ و خم
روشن ہوا جہاں تو، اِدھر روشنی چلی

آخر کو منزلِ غمِ دوراں میں رہ گئی
دو چار گام ساتھ مرے زندگی چلی

ہے تیرے دم سے رونقِ منزل کی داستاں
اے گردِ راہ ساتھ مرے تو بھلی چلی

جب عاشقی میں وقت پڑا اہلِ درد پر
نے عقل کام آئی نہ دیوانگی چلی

ہر راہرو سنبھل کے اُٹھانے لگا قدم
رہبر سمجھ گیا کہ مری رہبری چلی

پھولوں کی انجمن کا وہاں ذکر کیا نشورؔ
کانٹوں پہ پاؤں رکھ کے جہاں زندگی چلی

سلیمان ادیب

○

غم کدے وہ جو ترے گام سے جل اُٹھتے ہیں
بُت کدے وہ جو مرے نام سے جل اُٹھتے ہیں

رات تاریک سہی میری طرف تو دیکھو
کتنے مہتاب ابھی جام سے جل اُٹھتے ہیں

رات کے درد کو کچھ اور بڑھانے کے لئے!
ہم سے کچھ سوختہ جاں شام سے جل اُٹھتے ہیں

وہ چمن بھی نہ ہوئے وجہِ نشاطِ غمِ دل
جو چمن عارضِ گلفام سے جل اُٹھتے ہیں

میں اگر دوست نہیں سب کا تو دشمن بھی نہیں
کیوں مگر لوگ مرے نام سے جل اُٹھتے ہیں

ذہنِ شاعر میں وہ انوارِ سحر کا عالم
شعر جب شبنمِ الہام سے جل اُٹھتے ہیں

○

ایک لمحہ تری محبت کا — زندگیٔ دوام سے بہتر
اس جہانِ خراب میں کیا ہے — ذوقِ مینا و جام سے بہتر
زلف و رخ کا تصورِ پیہم — کاوشِ صبح و شام سے بہتر
بشکم گرسنہ، پرِ پرواز — دانۂ زیرِ دام سے بہتر
ایک آزاد لاابالی پن — غیرتِ ننگ و نام سے بہتر
مسلکِ زیست آجتک نہ ہوا — ایک سودائے خام سے بہتر
موت کا انتشار بے پایاں — زندگی کے نظام سے بہتر
خود فراموشِ کنجِ تنہائی — صحبتِ خاص و عام سے بہتر
بانشینانِ کوئے مے خانہ — امرائِ کرام سے بہتر
ایک انسان کا گداز دل — ہر خدا کے کلام سے بہتر

کتنے شاہانِ وقت جانِ ایاز
ہیں تمہارے غلام سے بہتر

ور بارہ بنکوی

O

چمن میں لالہ و گل پر نکھار بھی تو نہیں
خزاں اگر یہ نہیں ہے بہار بھی تو نہیں

تمازتِ غمِ دوراں سے پھُنک رہی ہے حیات
کہیں پہ سایۂ گیسوئے یار بھی تو نہیں

ترے فراق کی راہیں بلائے جاں ہی سہی
وہ شام ہی سے ترا انتظار بھی تو نہیں

خیالِ ترکِ محبت بجا سہی لیکن
اب اپنے دل پہ ہمیں اختیار بھی تو نہیں

کبھی تو جانِ وفا ہے، کبھی ہے دشمنِ جاں
تری نظر کا کوئی اعتبار بھی تو نہیں

بہ ایں تغافلِ پیہم ستم تو یہ ہے سرور
میں اس کی خاطرِ نازک پہ بار بھی تو نہیں

سید امین اشرف

○

یوں تو وہ سب سے بصد شانِ حیا ملتا ہے
دیکھنا یہ ہے کیسے بختِ رسا ملتا ہے

تو وہ گوہر ہے جو رہتا ہے تہہِ آب سدا
یا کہیں اجنبی راہوں میں پڑا ملتا ہے

طنز ہے مجھ پہ نہ ملنا ترا اس قول کے بعد
عشق صادق ہو تو بندے کو خدا ملتا ہے

شاخِ گل سبزۂ خاکی پہ بھی جھک جاتی ہے
ہو محبت تو دلِ شاہ و گدا ملتا ہے

جاتی ہے تا بہ گلستاں ترے دامن کی ہوا
رنگِ غنچہ سے ترا رنگِ قبا ملتا ہے

تجھ کو دیکھا جو خراماں تو سمجھ میں آیا
کس طرح سلسلۂ برق و صبا ملتا ہے

کفن چور

آٹھ کہار اپنے کاندھے پر اٹھائے ڈولی لئے جا رہے ہیں، اس کے اندر نئی نویلی دلہن بیٹھی ہے آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی ہیں، ماں باپ یاد آ رہے ہیں، بھائی بہن کی تصویریں، آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہیں سینے میں بار بار دل دھڑک اٹھتا ہے، ہٹنے آگے براتی دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہے ہیں، اور دکھن کی ہوائیں ڈولی کا پردہ اڑا جاتی ہیں۔

ہانی خدا کی تعریف سے شروع ہوتی ہے۔ مثلاً شاعر کہتا ہے کہ
ی غلام ہوں — بالکل حقیر۔ میں اپنی اس کہانی کی ابتداُ اسی
رر ہا ہوں۔" پوری کہانی منظوم ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف
غربت و افلاس، شجاعت و جوانمردی، حسن و جمال عشق و
و اور آہیں، عبادت و بندگی وغیرہ۔ زبان گاؤں کی ہے سبک
ں رواں، دیہاتی استعاروں اور تشبیہوں سے بھرپور۔ کہانی
پہاڑی علاقوں کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں کرناٹلی کی سبک رفتا
سیں ہیں اور ابر آلود فضاؤں کا سرمئی سایہ ہے۔ حمد کے بعد کہانی
ا ہوتا۔

بانگام کے مشرق میں اونچے اونچے پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا
ان کے اجالے میں بھی خوفناک جانور شکار کی تلاش میں گھومتے
یہیں مرگھو قبیلے کی ایک بستی ہے۔ اس بستی کے لوگ جنگل میں لکڑی
جلاتے ہیں اور جانور کا شکار کرتے ہیں۔ یہیں بانس کا ایک بیوپاری
س کا نام تھا لودھا غازی۔ جب بھی وہ بانس فروخت کرنے کے
ں کے ہمراہ دو ماجھی ضرور ہوتے۔ ایک دن وہ کرناٹلی پار کر کے
ایا۔ دن بھر وہ مختلف بستیوں میں گھوم گھوم کر بانس بیچتا
کر وہ جمہ باڑی پہنچا، چند روز تک اس نے یہیں قیام کیا۔ اس دوران
دن اس نے ایک نوبرو حسینہ کو کھیت کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔
اس حسینہ کے حسن کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

"اس کی آنکھیں بھونرے کی طرح سیاہ تھیں۔ کانوں میں سونے کے بندے جگمگا رہے تھے۔ چہرہ چاند جیسا تھا۔ سر کے بال ہواؤں کے ساتھ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ہونٹوں پہ تبسم کی شفق پھوٹ رہی تھی اور منہ میں پان کا بیڑا تھا۔"

لودھا غازی اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ کسی طرح بھی اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا — چند روز اس بیقراری میں بیت گئے۔ ایک دن وہ حسینہ جب ندی کے کنارے غسل کر رہی تھی کہ لودھا غازی بھی وہاں پہنچ اور اسے زبردستی اپنے گھر لے گیا حسینہ اس کے قبضہ میں یوں تھی جیسے شیر کے منہ میں ہرنی ہو۔ لودھا غازی نے اسے بہتیرا سمجھایا لیکن اس کی آنکھوں کے آنسو نہ تھمے۔ اس کی اداسی دور نہ ہوئی۔ ہنگام روز بروز گہرا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی صحت جواب دے گئی۔ وہ کھانا پینا ترک کر چکی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد حسینہ کی حالت غیر ہو گئی۔ چمپا جیسا نازک بدن سیاہ ہو گیا چلنے پھرنے کی طاقت تک جواب دے چکی تھی۔ وہ قدم چلتی تو سر میں چکر سا آ جاتا۔ آنکھوں تلے تاریکی چھا جاتی۔ اس طرح پورے نو ماہ جھونکوں گئے۔ اس کے ایک بچہ پیدا ہوا لیکن وہ خود اس دنیا سے روپوش ہو گئی۔ اب لودھا غازی بچے کی پرورش کرنے لگا۔ اس کا نام منصور رکھا گیا۔ بڑا ہی نڈر اور بے خوف تھا۔ چلتا تو جیسے زمین کانپ اٹھتی۔

جسم کا رنگ سیاہ تھا اور آنکھیں سرخ۔ ماں کی محبت سے محروم ہو چکا تھا، باپ کا بھی پیار اسے نہ ملا — کیونکہ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ وہ بھی جنگل میں شیر کا لقمہ بن گیا۔ اب منصور اکیلا تھا۔ نہ اس کا گھر بار تھا نہ دھن دولت۔ جنگل میں مارا مارا پھرتا اور جنگل ہی کے پھل کھا کر اپنی بھوک مٹاتا۔ اور جب وہ بڑا ہوا تو دنیا کی ساری برائیاں اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھیں۔ چوری کرتا، ڈاکہ ڈالتا اور خون خرابہ کرنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

اس اثنا میں عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا۔

چاندنی رات تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پوری کائنات میں کسی نے بیلے کے پھولوں کی بارش کر دی ہو — اور کہار ڈولی لیے جا رہا تھا۔

منصور نے اس ڈولی کو دیکھا، سوچنے لگا — کس کی شادی ہے؟ آج؟ وہ درختوں کی آڑ میں چھپ گیا۔

ڈولی کے اندر نئی نویلی دلہن سسکیاں بھر رہی تھی — اسے ماں باپ یاد آ رہے تھے، بھائی بہن کی تصویریں آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھیں۔

رات کے اس گہرے سناٹے میں جھینگروں کی آوازیں سن کر دل دہل جاتے تھے۔

آگے آگے براتی دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہے تھے اور دکھنی ہوائیں ڈولی پر دہ اڑا جاتی تھیں۔

کہار اب ان ہی درختوں کے قریب آ گئے جن کے پیچھے منصور چھپا ہوا تھا۔

یکایک وہ ڈولی پر یوں جھپٹا جیسے شیر شکار پر جھپٹتا ہو۔ کہاروں اور براتیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ دلہن کی چیخ نکل گئی لیکن منصور کو رحم نہ آیا — اس نے دلہن کی ہنسلی اتار لی، کانوں کے بندے نکال لیے، چوڑیاں چھین لیں اور پھر بھاگ گیا۔

اس طرح خوشی غم میں بدل گئی — چاروں طرف کہرام مچ گیا۔

چھوٹا پیر گاؤں دیکھنے میں بڑا ہی خوبصورت تھا۔ اس کے چاروں طرف خوبصورت اور حسین مکان تھے۔ ان ہی مکانوں میں ایک مکان عظیم کا بھی تھا۔ عظیم جس کے ساتھ حسینہ آئزہ کی شادی ہوئی تھی، اس کی پانچ کشتیاں بھی تھیں جن پر مال و اسباب لاد کر دور دراز گاؤں بھیجے جاتے تھے۔ اس طرح عظیم کو کافی پیسے مل جاتے تھے۔ تجارت میں وہ بڑا ماہر اور پختہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی پہلی بیوی عرصہ ہوا اس دنیا سے چل بسی تھی۔ چالیس سال کی عمر میں اس نے آئزہ سے دوسری شادی رچا لی۔

آئزہ کی جوانی اتنی پرکشش تھی کہ عورتیں بھی اسے دیکھتی رہ جاتیں۔ ہنستی تو اس کے منہ سے لعل و گہر جھڑتا۔ سر کے سیاہ بال کالی گھٹاؤں کو بھی مات کر دیتے تھے۔ ایسے گھنے تھے کہ پاؤں کو چھو جاتے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور پلکیں دھنک کی طرح تنی رہتیں۔ ہاتھ پاؤں یوں تھے جیسے چمپا کلی ہو۔ چلتی تو دلوں میں خنجر چل جاتے۔ عظیم اسے پا کر بہت خوش تھا۔ اس کی اجاڑ اور ویران دنیا پھر سے آباد ہو گئی تھی۔ جب عظیم اسے دیکھتا تو وہ لجا کر آنکھیں نیچی کر لیتی اور تب عظیم کہتا —

"آئزہ یہ تو بتاؤ وہ تمہارا وہ ہار اور بندے کیا ہوئے؟" آئزہ جواب دیتی — "نہیں معلوم نہیں، ایک ڈاکو نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ میرے سارے زیور لے کر وہ جنگل میں فرار ہو گیا۔" عظیم اور آئزہ اسی طرح باتیں کرتے۔ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت گھر کر گئی تھی۔

اگہن میں جب غضب کی سردیاں پڑ رہی تھیں اور کھیتوں میں دھان پک گئے تھے۔ تو عظیم جوم کی تجارت کو نکلا۔ ماں نے اسے خدا حافظ کہتے ہوئے کہا۔ "اس بڑھاپے کا سہارا تو بس تم ہی ہو۔ نہ جانے پھر کب لوٹو گے۔ پل بھر کے لیے نظروں سے دور رہتے ہو تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔"

اور آئزہ بار بار حسرت آلود نگاہوں سے اسے دیکھتی اور دل ہی دل ناقابل برداشت درد اٹھتا ہوا محسوس کرتی۔ عظیم نے کہا "میری روح خدا حافظ کہو مجھے۔ تین ماہ تک ہم ایک دوسرے سے الگ رہیں گے۔" یہ سن کر آئزہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بولی۔

"نہیں نہیں میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ تم چلے جاؤ گے تو میری زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ [illegible]"

ںا چاہتی ہوں کہ تم میری نظروں کے سامنے رہو ۔"

عظیم اپنی ماں اور آئرہ کو تسلی دیکر دور دیس روانہ ہوگیا۔ اس
کشتی لہروں سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی آگے بڑھی جا رہی تھی اور وہ
یچھے مڑ مڑ کر اپنا گاؤں دیکھ لیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آئرہ کی تصویر
ی، ماں کی محبت تھی۔ گاؤں کی چاہت تھی۔

منصور ڈاکو کو عظیم کی روانگی کی اطلاع ملی تو وہ چندا پور گاؤں
ا پہلے وہ ایک بڑھیا کی جھونپڑی میں داخل ہوا اور بولا ۔"خالہ میں
ب مسافر ہوں۔ بہت دور سے پیدل چل کر آیا ہوں۔ پناہ دو گی اپنے
اں ؟" بڑھیا اس کی چکنی چپڑی باتیں سن کر رام ہوگئی۔ اس نے نہ صرف
صور کو پناہ دی بلکہ اس کی خوب خاطر و مدارت بھی شروع کردی۔

ایک دن کا واقع ہے۔ سورج سر پہ آچکا تھا۔ آئرہ کمر میں گاگر
لیکر ندی کے کنارے آئی۔ منصور نے اسے دیکھا۔ اس کے دل کی کیفیت دگرگوں
ہوگئی۔ آئرہ نے گاگر کو پنگھٹ پر رکھا اور خود ندی میں اتر گئی۔
نصور درختوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا مگر اس
کے قدم نہیں اٹھتے تھے۔ یہاں تک کہ آئرہ گاگر اٹھا کر گھر چلی گئی ——
اور وہ بت بنا کھڑا رہا۔

اب دن ڈھل چکا تھا۔ آئرہ نے چراغ روشن کیا۔ جیت کا
مہینہ تھا بے پناہ گرمی پڑ رہی تھی۔ اس کے دل میں بار بار عظیم کا خیال
رہا تھا۔ تین ماہ بیت گئے پر وہ اب تک نہیں لوٹا تھا۔ برہ کی آگ
سے تڑپا رہی تھی عجیب عجیب وسوسوں سے اس کا ذہن پریشان
ہوگیا تھا —— اس پریشانی کے عالم میں وہ بارہ ماشی گیت گانے لگی۔

"جوانی کی آگ ایندھن سے کم نہیں آخر کیسے برداشت کروں
میرے من کا راجہ اس آگ کو محسوس نہ کر سکا اور پردیس چلا گیا۔
رنگ برنگ کے پھول کھل اٹھے ہیں اور ان کی مہک سے
کائنات زعفران زار بنی ہوئی ہے۔
پر آہ کہ میں سدا کی ابھاگن آنسوؤں کا سیلاب بہا رہی ہوں!
بیدردی مجھے یوں چھوڑ کر کیوں چلے گئے،
محبت کی آگ میں جل جل کر بھسم ہو رہی ہوں۔
تم تو تین ماہ بعد لوٹ آنے کا وعدہ کر گئے تھے کیا مجھ پر رحم
نہیں آتا۔
بھونرے اڑ اڑ کر پھولوں پہ بیٹھتے ہیں اور رس چوس کر
چلے جاتے ہیں۔
ان کی آواز سن کر میرا دل تڑپ اٹھتا ہے۔
دکھن کی ہوائیں پورب دوارے ٹکرا رہی ہیں آ بھی جاؤ پیے
سے اور روپ دکھا جاؤ۔
پیارے اس سمے میرے پاس ہوتے تو تمہیں پان بنا کر دیتی
اور اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دیتی۔
اس بار تم آؤ گے تو میں تمہارے پاؤں سے لپٹ کر سوؤں گی اور
سر کے لمبے لمبے بالوں سے تمہیں اس طرح باندھ دوں گی کہ تم
پھر مجھ سے جدا نہ ہو سکو"

گیت ختم کرنے کے بعد آئرہ عظیم کے خیالوں سے لپٹ کر
سو گئی۔ رات گہری ہو چکی تھی اور چاروں طرف سناٹا تھا۔ اس اثنا
میں منصور آئرہ کے کمرہ میں گھس گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ موم بتی جلائی اور
آئرہ کو تلاش کرنے لگا۔ آئرہ نیند میں بے ہوش پڑی تھی۔ سر کے بال بکھرے ہوئے
تھے جسم پر کپڑا نہ تھا۔ منصور موم بتی اس کے چہرے کے پاس لے گیا اور یکایک
آئرہ نیند سے چونک کر یوں کانپنے لگی جیسے بارود گھر میں آگ لگ گئی ہو۔ منصور
نے اس سے کہا ۔ "میرے دل میں تمہاری محبت جاگزیں ہو چکی ہے۔ میں
سچ مچ دیوانہ ہو گیا ہوں۔ تم میرے آسمان پر پورنیماشی چاند ہو۔ اس آگ
کو اپنی جوانی سے ٹھنڈا کر دو جو تن بدن میں لگ چکی ہے"

آئرہ کی چیخ نکل گئی۔ اس نے ہمسایوں کو چیخ چیخ کر بلانا شروع کیا مگر
منصور اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ تو آئرہ کی بھرپور جوانی اور اس
کے حسن کو دیکھنے میں محو تھا۔ آس پاس کے لوگ مسلح ہو کر آگئے۔ سبھوں نے
منصور کو خوب زدوکوب کیا۔ اس کے بعد اسے باندھ کر سارے لوگ جنگل میں
چھوڑ گئے۔ سبھوں کے چلے جانے کے بعد اس نے بندھن کو کھولا۔ وہ بالکل
بے دم ہو چکا تھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ پیاس کی شدت سے حلق میں
کانٹے پڑ گئے تھے۔

چند روز اور بیت گئے۔ آئرہ علیل ہو گئی۔ اس کی جوانی کا سارا

بیوی سے کو چکا تھا عظیم اب تک نہیں لوٹا تھا۔ روتے روتے اس کا تکیہ بھیگ جاتا پر اس کے دل کو چین نہ ملتا۔ اس کرب کے عالم میں ایک دن جب اس کی روح پرواز کر گئی تو عظیم گھر لوٹا۔ اس منظر کو دیکھ کر اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ زار و قطار رونے لگا ”میری روح تم کہاں چلی گئیں مجھے معلوم ہوتا تو دریا میں چھلانگ لگا دیتا۔ اب یہ دولت کس کے کام آئے گی۔ اب کون مجھے اپنے پہلو میں بٹھائیگا اور میری آنکھوں کے آنسو اپنی ساری کے آنچل سے خشک کرے گا۔“

اڑوس پڑوس والوں نے سمجھایا ”زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے کیا فائدہ اب رونے دھونے سے“۔ اس کے بعد آئرہ کو سب دفن کر آئے۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ چاروں طرف ہولناک سناٹا تھا۔ منصور اپنے ہاتھوں میں کدال لے کر قبرستان آیا۔ اس نے قبر کو کھودا۔ آئرہ کا کفن میں لپٹا ہوا مردہ جسم اس کے سامنے تھا۔ کچھ دیر تک وہ کھڑا نہ جانے کیا سوچتا رہا پھر یکایک اس نے کفن کھولنا چاہا۔ اس سے پہلے بھی وہ کفن چرا چکا تھا۔ لیکن اس بار نہ جانے کیوں اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ قبر سے اوپر آگیا اور بھاگ جانا چاہا۔ مگر اس کے پاؤں سو سو من کے ہو چکے تھے۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کے ہوش و حواس معطل ہو گئے تھے۔ اور جب اسے کچھ ہوش آیا تو اس کے کانوں میں یہ آواز آئی ——”منصور آخرت کو نہ بھولو۔ اس پیشے کو فوراً چھوڑ دو اور توبہ کرو۔“ منصور ڈر گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا ”اس پیشہ کو چھوڑ دوں تو کھاؤں گا کیا؟“ وہی آواز پھر اس کے کانوں میں آئی۔ ”تو ایک روز تمہیں کف افسوس ملنا پڑے گا۔ موت آئے گی تو تمہاری دنیا سے تنہا جاؤ گے۔ اس وقت تمہارے ساتھ کوئی نہ ہوگا۔ خدا کو نہ بھولو“ اس کے بعد آواز غائب ہو گئی۔ اور منصور بہت دیر تک زمین پر پڑا رہا۔

صبح ہوئی تو منصور کے حافظہ میں ساری باتیں تازہ تھیں۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آواز اب بھی اس کا پیچھا کر رہی ہے وہ اٹھا اور سیدھا اپنے گھر گیا۔ اس کی زندگی میں زبردست تبدیلی آگئی تھی۔ اب اس نے نماز شروع کر دی تھی۔ لوگوں نے اس کی اس تبدیلی کو دیکھا تو آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ کوئی کہتا ”جب سے اس کو مار پڑی ہے اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے ہیں“ کوئی کہتا ”اب اس کی زندگی کا چراغ گل ہونے والا ہے“ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ ایک دن منصور کے چند شاگرد اس کے پاس آئے اور کہنے لگے ——”آخر کب تک آپ اپنے پیشہ سے دست بردار رہیں گے۔ اب تو بھوکوں مرنے کی نوبت آگئی ہے“ منصور کی رگ حمیت پھڑک اٹھی۔ اس نے کہا —”تو پھر کرو تیاری۔ ہم آج ہی ڈاکہ ڈالیں گے“ اتنا کہہ کر سب ایک مکان میں گھس گئے۔ اماوس کی رات تھی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ گہری خاموشی طاری تھی چاروں طرف منصور اکیلا کمرے کے اندر گھس گیا۔ خوبصورت پلنگ پر حسین لڑکی سو رہی تھی۔ اس کے سرہانے کے پاس ایک صندوق تھا۔ منصور نے اسے کھولا۔ اس میں روپے پیسے کے علاوہ سونے کے ان گنت زیور بھی تھے۔ اس نے سارے زیور باہر نکالے اور کچھ سوچنے لگا۔ اتنے میں صبح کی اذان ہواؤں میں بہتی ہوئی اس کے کانوں میں پہنچی۔ وہ بے چین ہو گیا۔ اس نے فوراً نماز کی تیاری شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر اس کے سارے شاگرد بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس اثنا میں گھر والے جاگ گئے۔ سبھوں نے جب یہ نظارا دیکھا تو انگشت بدنداں رہ گئے۔ گھر کے چند افراد تو ولی سمجھ کر اس کے پاؤں پر گر پڑے۔ منصور نے کہا۔ ”نہیں بھائی میرا نام تو کفن چور ہے اور کام ڈاکہ ڈالنا ہے —— تمہارے یہاں بھی ڈاکہ ڈالنے آیا تھا“ مگر انہیں یقین نہ آیا کہنے لگے ”ہم تو آپ کے خادم ہیں“ اور اتنا کہہ کر منصور کو دولت سے مالا مال کر دیا گیا —— منصور سارا مال و متاع لے کر اپنے گھر آیا اور ایک ایک پیسہ اس نے اپنے شاگردوں میں تقسیم کر دیا۔

زمانہ گذر گیا لیکن کفن چور پھر نظر نہ آیا البتہ کبھی کبھی قبرستان میں ایک درویش آتا اور آئرہ کی قبر کے پاس گھٹنوں سر جھکائے کچھ پڑھتا رہتا —— لوگوں نے اسے ”منصور“ سمجھا —— منصور کفن چور!

ڈاکٹر رب نواز اورک زئی

ترجمانِ حرّیت ــ خوشحال خان خٹک

جب اور جہاں بھی قومی آزادی کا سوال پیدا ہوتا ہے، میرا ذہن لامحالہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا حریت کے لئے ہر وہ انتہائی اقدام جائز ہے، جس پر کوئی انسان دوسرے انسان کے خلاف، کوئی بھائی دوسرے بھائی کے خلاف اور کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے خلاف مجبور ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب میرا ذہن اس سوچ کی تلاش میں گھومتے پھرتے تھک جاتا ہے، تو بالآخر اس نتیجے پر پہنچتا ہے، کہ آزادی چاہے قومی ہو، چاہے معاشی، چاہے سماجی ہو، چاہے سیاسی چاہے ذہنی ہو اور چاہے نظریاتی، اس کے لئے انسان فطرتاً ہر وہ اقدام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جسے اوّل النظر میں سوسائٹی کے حکمران طبقے کے خلاف ایک منفی عمل تو کہا جا سکتا ہے، لیکن بادی النظر میں اسی عمل کو ایک قوم کی زندگی کا انقلاب آفرین تغیر ــــ اور معاشرے کے ایک چھوٹے طبقے کا ارتقائی معاشرتی عمل بھی کہا جا سکتا ہے، اس لئے کہ انسان کچھ کھوتا ہے، تو تبھی کچھ پاتا ہے یا دوسرے لفظوں میں آزادی کے لئے کچھ بلیدان بھی تو دیا جاتا ہے اور تب ہی اس فطری جذبے کا مادی و معاشرتی وجود ایک قوم کے لئے عملی طور پر ممکن ہو سکتا ہے۔ جب یہ ایک طے شدہ امر ہے، کہ آزادی کچھ نہ کچھ قیمت رکھتی ہے، اور یہ قیمت ہوتی ہے، زندگیوں کا بلیدان، تو پھر یہ بھی مانی ہوئی بات ہے، کہ یہ عمل، جسے سوسائٹی کا حکمران طبقہ ایک منفی عمل کا درجہ دیتا ہے اور محکوم طبقہ مثبت عمل کا، درحقیقت ایک ایسا عمل ہے، جو ظالم و مظلوم، حاکم و محکوم اور غلام و آقا کے نفرت انگیز رشتے کو نہ صرف قطع کرتا ہے، بلکہ ایک نیا رشتہ بھی انسانوں کے مابین اس طرح استوار کرتا ہے، کہ وہ نہ صرف قوموں کے انفرادی و اجتماعی آزادی کے استحقاق کو ایک فطری حق کے طور پر تسلیم کرتا ہے، بلکہ انسانیت کا بین الانسانی اور آفاقی تعلق جذباتی بندھن میں نہیں، بلکہ حقیقی بندھن میں انسانی برادری کے رشتے کی استواری کے لئے پیدا کرتا ہے اور محبت و اخوت کی جڑوں کو دلوں کی گہرائی میں دور دور تک پھیلا دیتا ہے۔

یہی وہ عمل تھا، جسے خوشحال خاں خٹک نے اپنی قومی اُمنگوں و آرزوؤں کا مرکز بنایا اور یہی عمل کا وہ درخت تھا، جس نے خوشحال خاں خٹک جیسے حریت پسند اور انسانیت پرست نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے خون سے سینچا اور جسے پروان چڑھانے کے بعد مغل استبداد کی دستبرد سے بچانے کے لئے جذبۂ حریت کو آور ننگ و حمیت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا،

یہ ثابت کرنے اور جاننے کے لئے کہ خوشحال خاں خٹک

کا پہلو، جو اس کی اور قومی معاشرے کی مثبت امیدوں
و آرزوؤں کا مرکز تھا اور یہ ثابت کرنے اور جاننے کے لئے کہ
اورنگ زیب ایک مسلمان بادشاہ ہونے کے باوجود قومی آزادی
کا روادار نہ تھا اور دوسری قوموں کے لئے غلامانہ ذہنیت
اور معاشرتی محکومیت کا علمبردار تھا، ہمیں خوشحال خاں
خٹک کو ایک سپاہی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک شاعر کی
حیثیت سے حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنا ہوگا اور پھر یہ فیصلہ
کرنا ہوگا، کہ آیا خوشحال خاں خٹک کا تاریخی عمل جائز تھا
یا نہیں اور وہ عمل ہمارے ذہنوں سے ذہنی مطابقت رکھتا
ہے یا نہیں !!

پتہ نہیں، کہ خوشحال خاں کا وجود کس خمیر سے تھا،
لیکن اس کی نس نس میں ایک پٹھان کا جذبۂ خودی اور غیرت
مندانہ احساس سمویا ہوا تھا اور اس کے انگ انگ میں
آزادی کا جذبہ رچا ہوا تھا۔ اس کا ایک روپ نہیں تھا،
بلکہ تین روپ اور وہ بھی ایک دوسرے سے ملتے
جلتے روپ ملتے۔ ایک روپ تو تھا، نسلی طور پر افغان اور
افغانوں کی سی خو بو رکھنے کا، دوسرا روپ تھا، پیکر حریت
ہونے اور حریت سے انتہائی محبت کرنے کا اور تیسرا روپ
تھا فطری طور پر شاعر ہونے اور شاعری کے وجدان
میں بھی قوم و آزادی کے رنگے جانے کا، لیکن اگر اس
کے ان تینوں اشکال کو ایک رُوپ کی شکل دے دی
جائے، تو پھر خوشحال خاں، صرف پیکر حریت نظر آتا ہے
اور اس کے لئے چاہے شاعری کا دیس ہو یا جذبات
کا، فکر کا دیس ہو یا وجدان کا، مادے کا دیس ہو یا
عقل کا، وہ اس سے وفا و محبت کی راہ و رسم تب ہی
پیدا کرے گا جب اس کو یہ اطمینان ہو جائے، کہ اس دیس
میں غلامی کا پرتو موجود نہیں اور اس کے گوشہ گوشہ پر
حریت حکمران ہے۔

اس کو آزادی سے کتنی محبت تھی! اس کا ثبوت تو اس
بات سے بخوبی مل جاتا ہے، کہ لالچ و اقتدار کی قیمت پر
بک جانے والے بیٹے بھی اس باپ کی منزل حیات کو
نہ بدل سکے؛ اور اسے جادۂ حریت سے کسی طرح بھی ہٹا کر
کسی اور راستے پر نہ ڈال سکے۔

اسے اپنی ہمت پر کتنا ناز تھا اور اس کا ہمت کا فلسفہ
کتنا بلند اور کتنا آفاقی تھا، اس کا اندازہ کرنے کے
لئے اس کا یہ شعر ہمت کے ہیٹوں اور جرأت سے عاری
لوگوں کے لئے نہ صرف ایک طنزیہ درس کی حیثیت رکھتا
ہے، بلکہ ایک پوری زندگی —— اور ایک شیر کی سی زندگی
کی تفسیر کا بھی حامل ہے۔ دیکھئے وہ کیا کہتا ہے:۔

کہ فلک دی کو زمری پہ خولہ کبن ورکبری
گورہ د زمری پہ خولہ کبن سے نیز شے ہمت

"اگر فلک تجھے شیر کے منہ میں دے دے، دیکھو! شیر
منہ میں بھی ہمت مت چھوڑنا" سوچنے کا مقام ہے، کہ
شیر کے منہ میں کون ہمت کا ساتھ دے سکتا ہے، وہی اور
صرف وہی نا، جو شیر کا سا دل رکھتا ہے، کیوں کہ شیر کا مقابلہ
گیدڑ تو نہیں، شیر ہی کر سکتا ہے اور خوشحال خان ایسے
شیروں جیسے انسانوں ہی کا دلدادہ و شیدائی ہے اور اس
کے فلسفۂ حیات میں نامردوں اور بزدل انسانوں کی
زندگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہ اس شخص کے الفاظ ہیں، جو صرف غازی گفتار
نہیں تھا، بلکہ غازی کردار بھی تھا جو نہ صرف شیروں کی
سی زندگی گذارنے کے لئے عمر بھر زندگی سے متفر اور موت
سے محبت کرتا رہا، بلکہ دنیا اور خصوصاً اپنی افغان قوم کو
قدم قدم پر یہ درس دیتا رہا، کہ زندگی شیر کی سی ہمت
رکھنے کا نام ہے، ورنہ زندگی کوئی شے نہیں ہے۔"

خوشحال خان بھی انسان تھا اور زندگی سے محبت
کرنا جانتا تھا، لیکن وہ زندگی سے نفرت ہی کر سکتا تھا

اس لئے کہ زندگی اس کے لئے امرت کا جام نہیں، بلکہ زہر کا جام تھی اور موت اس کے لئے اور اس کے پیاسے ہونٹوں کے لئے امرت کا جام تھی، اس کے معاملے میں ایسا کیوں تھا؟ اس لئے کہ وہ عام انسانوں سے مختلف خصوصیات کا مالک تھا، وہ آزادی کی قدر و قیمت جانتا تھا، اور وہ جانتا تھا، کہ جو زندگی غلامی کی شکل میں اس کے گرد دیوانے کی طرح منڈلا رہی ہے، وہ کسی مقصد کی نہیں، بلکہ ذلت ہے اور ذلت خودداری کے ساتھ کبھی بھی ایک ہی جگہ نہیں پنپ سکتی۔ اس کے برعکس موت اس ذلیل زندگی سے نجات کا نام ہے اور یہ نجات بذات خود آزادی ہے، ایسی آزادی، جس کے حصول پر انسان موت کے بعد صبر کر سکتا ہے۔

اسی لئے وہ ذلت کی زندگی کو ٹھکراتا رہا اور وقت کی زبردست طاقت ——— مغل استبداد سے ٹکر لیتا رہا، اس امید پر کہ اگر وہ اپنے اور اپنی قوم کے لئے آزادی حاصل کر سکا، تو خیر، ورنہ موت کے بعد اور نہیں۔ تو غلامی اس ذلیل زندگی سے ضرور آزادی حاصل کرلے گا اور ان کا سانس لے سکے گا۔ اسی لئے وہ کہتا ہے:۔

یہ جہان دننگیالی دی دا دوہ کارہ
یا بہ سر ورکڑی یا بہ کامران شی

"جہان میں قابل فخر انسان کے دو کام ہوتے ہیں
وہ سر دے دیتا ہے یعنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے
یا کامران ہو جاتا ہے"

خوشحال خان کے "قابل فخر انسان" کی غایت کیا ہے؟ اس کے لئے اس کا یہ دوسرا فلسفہ قابل غور ہے فلسفہ کیا ہے؟ "کامرانی کا فلسفہ" اور یہ فلسفہ ان قابل فخر انسانوں کا ہے، جو سر دھڑ کی بازی مقصد کے لئے لگاتے ہیں اور مقصد کی راہ میں یا تو قربان ہو جاتے ہیں اور یا کامران!!

خوشحال خان اپنے قبیلے خٹک کا سردار تھا اور مغلوں کا حمایتی و مددگار بھی۔ کیونکہ اس کا پردادا اکوڑہ خان مغل شہنشاہ اکبر کے عہد میں شاہی انعامات و برکات سے نوازا گیا تھا اور خٹکوں نے اکوڑہ خان اور اس کے بعد کے جانشینوں کے عہد میں یوسف زئی قبیلے کے خلاف جنگوں میں مغلوں کا ساتھ دیا تھا اور شاہی وفاداریوں کا صلہ خاک و خون میں لت پت ہوکر دیا تھا۔ یہاں تک کہ خود عظیم پشتون خوشحال خان خٹک کا والد شہباز خان بھی یوسف زیوں کے خلاف ایک جنگ میں مارا گیا تھا۔ اور شہباز خان کی وفات کے بعد مغل شہنشاہ شاہجہاں نے خوشحال خان خٹک کو اس کا جانشین مقرر کیا تھا اور اسے اٹک سے موسیٰ درہ تک کے علاقہ کا سردار مقرر کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اٹک پر میر بحری کا حق بھی دیا تھا، یہ سب کچھ خوشحال خان کے عہد میں نہیں ہوا تھا، بلکہ اس کے پردادا اکوڑہ خان کے عہد میں اکبر اعظم کی طرف سے پٹھانوں کے اس قبیلے سے دوستی کے طور پر ہوا تھا اور اکبر اعظم کے بعد سے شاہجہاں تک اسی روایت پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن جب اورنگ زیب سریر آرائے حکومت ہوا، تو اس نے دوستی کی پرانی روایات کو توڑ دیا اور اپنے پیش رو مغل حکمرانوں کی مدبرانہ پالیسیوں کے خلاف کام کیا اور نہ صرف خوشحال خان کو اس علاقے کے حق چونگی و دوسرے مراعات سے محروم کر دیا، بلکہ خوشحال خان کے مخالفین کے اثر میں آکر اسے اس قدر تنگ کر دیا، کہ اس کا ذہن رسم و وفا کو بدلنے پر مجبور ہو گیا اور اس کے دل میں اس ظلم کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور پھر جب بغاوت کے لئے اس نے مغل حکومت کے خلاف اپنی تلوار کو میان سے نکالا، تو مرتے دم تک پھر نیام میں نہیں ڈالا۔ مغلوں کے خلاف اس جنگ میں وہ اکیلا نہیں تھا، بلکہ تیراہ کے آفریدی قبائل بھی اس کے ساتھ تھے اور ایمل خان اور دریا خان جیسے جیالے اور بہادر افغان

اس کے سچے رفیق تھے۔ خوشحال خان خٹک کے سامنے دو ہی راستے تھے، آزادی یا موت، اس کے علاوہ اور کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا، جسے وہ اختیار کرتا۔" وہ آزادی کے لئے بیقرار تھا اور اس لئے بے قرار تھا، کہ اس کی روح آزادی کے لئے بے قرار تھی۔ جس طرح اس کی روح جسم کے قید اور جسمانی ظلم کے اثر سے تنگ تھی، اسی طرح اس کا جسم اور ضمیر بھی مغل استبداد کی غلامی کے خلاف نبرد آزما تھا اور اُسے آزادی حاصل کئے بغیر کسی کل چین نہیں پڑتا تھا"

"آزادی نہ صرف اس کی روح کی زندگی تھی، بلکہ اس کے جسم کی بھی زندگی تھی اور اس کے جسم و آزادی میں بھی وہی تعلق تھا، جو روح اور آزادی میں تھا"۔

وہ آزادی کا اتنا والہ و شیدا کیوں تھا؟ اس سوال کا جواب یہی ہو سکتا ہے، کہ جب غلامی سے پیمان وفا باندھ کر بھی وہ سکھ چین کا سانس نہ لے سکا، بلکہ اپنے ہی وفا کے ہاتھوں ذلیل و خوار اور دربدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا، تو اس کا ضمیر غلامی سے متنفر ہو گیا اور اس پر یہ راز آشکار ہو گیا۔ کہ "اصل جینا آزادی کا جینا ہے، غلامی کا نہیں"۔

جب وہ اس راز کی تہہ تک پہنچ گیا، تو اس کا دل آزادی کے نغمے کے گیت سے مست ہو گیا اور اس نغمے میں غیرت کے ساز نے زندگی کا سا نشہ پیدا کر دیا اور خوشحال خان آزادی کے نغمہ و ساز پر زندگی کے گیت گانے لگ گیا۔ وہ ہر ایک چیز سے بے نیاز ہو گیا، خود سے، بیٹوں سے، جاہ و مرتبہ سے، دولت و ثروت سے، اور جو چیز بھی آزادی کے کاروان کی سدِ راہ ہوئی، اسے اس نے مسل ڈالا۔ مغل حکومت نے اسے خریدنے کی اس کے بعد بارہا کوشش کی، لیکن خوش حال خان خٹک اب بکنے والا نہیں تھا۔ وہ ایک بار آزادی کی قیمت پر بک چکا تھا اور اب بار بار وہ بکنا نہیں چاہتا تھا۔ جب مغل حکومت اپنی عالمگیری سطوت کے باوجود ایک انسان کی غیرت کو نہ خرید سکی اور اس کی ٹھیس خوردہ انا کو پھر سے غلامی کے تار و پود میں نہ بُن سکی، تو اس نے سازشوں کا جال خوشحال خان کے خلاف بچھا دیا اور اس کے بیٹوں کو بھی باپ کے خلاف آمادۂ جنگ کر دیا۔

مغل اپنی کامیابی پر خوش تھے اور کیوں خوش نہ ہوتے "کہ باپ کو اگر وہ نہ خرید سکے تھے، بیٹے تو انہوں نے خرید لئے تھے یا باپ اگر نہ بک سکا، بیٹے تو بک گئے۔

دولت و جاگیر کا لالچ، زر و اقتدار کی ہوس نے مغل استعماریت کی آرزوؤں کو پورا کر دیا اور خوشحال خان کے خلاف اسی کے فرزندوں نے غیروں کا ساتھ دیا۔ خوشحال خان یہ گمان بھی نہ کر سکتا تھا۔ کہ

"پرایا خون تو پرایا خون ہے، لیکن اپنا خون بھی کیسا پرایا ہو سکتا ہے"

لیکن وقت کی تاریخ نے ثابت کر دیا، کہ اس دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے، باپ دولت و اقتدار کی خاطر بیٹے کے گلے پر چھری چلا سکتا ہے اور بیٹا باپ کے گلے پر، بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو سکتا ہے اور اپنا اپنے کا! اس لئے کہ انسان فطرتاً بڑا کمزور واقع ہوا ہے۔ اس کی فطرت کا خمیر ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ ہر کوئی نفسا نفسی کے عالم میں گرفتار ہے اور محض اپنی اغراض کی تکمیل پر آمادہ عمل ہے، وہ ہر وہ فعل کر سکتا ہے، جو اس کی خود غرضانہ خواہشات کی تکمیل کے ممد ہو۔

وہ ایک باپ تو کیا، ایک بھائی تو کیا، ایک بیٹا تو کیا، ہزاروں باپ، ہزاروں بھائی اور ہزاروں بیٹے اپنی خواہشات کے لئے قربان کر سکتا ہے۔ اس کے لئے اپنی خواہشات کے مقابلے میں نہ انسان کی کوئی قیمت ہے اور نہ انسانیت کی۔

ہو سکتا ہے، خوشحال خان کے لئے یہ بے انصافی ہو، کہ اس کے بیٹوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ خون کی وفاداری بھی اس کے لئے بیوفائی میں بدل گئی، لیکن دنیا کی روایت

فطرت کی جو یہی روش ہے، تو پھر کسی کے بدلنے میں کیا
ہے۔

اگر خوشحال خان کی جگہ کوئی اور ہوتا، تو دنیا کے مقابلے
شکست خوردہ انسان کی حیثیت سے اگر نہیں، تو بیٹوں
ابلے میں ضرور ایک شکست خوردہ باپ کی حیثیت سے
رڈال دیتا۔ لیکن اس نے پھر بھی ہتھیار نہیں ڈالے! اس
نے شکست تسلیم نہیں کی۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ
ذلت ہے اور ذلت زندگی کی موت ـــ

اور خوش حال خان کو تو ابھی جینا تھا۔ آزادی کی امید
اس آزادی کی دلہن سے شادی کی آس پر، جس کے
نے بارہا اپنے وطن کی سرزمین کو خون کے رنگ
لے دیا تھا۔ اسے تو مادر وطن عزیز تھی۔ اس نے تو اپنے
ایک ایک انچ زمین پر اپنا اور اپنی قوم کا ارادہ آزما [illegible]
وقت کی قوت کا جواب ارادے کی قوت سے دیا تھا۔

خوش حال خان اگرچہ آزادی کی تڑپ میں مرگیا لیکن
مر رہا تھا، تو وہ غلام نہیں تھا۔ اور وہ کنوارا نہیں
نیا سے جا رہا تھا۔ بلکہ عروس حریت کے ساتھ جا رہا تھا۔
نے زندگی میں ایک مرد غازی ـــ ایک حریت پسند شاعر
اور ایک قومی سپاہی کا کردار ادا کیا تھا۔ اسے مغلوں
شدید نفرت تھی اور اس لئے نفرت تھی۔ کہ وہ اس کی اور
عزت و ناموس کے دشمن تھے۔ اورنگ زیب کا تو وہ
مخالف تھا۔ لیکن خواہ مخواہ کا مخالف نہیں، بلکہ اصول کا
وہ اورنگ زیب کے خلاف اپنا پر حقائق تاثر یوں
رتا ہے:۔

"اے زمانے! تیرا بُرا ہو، جس شخص نے حکومت
کے لئے اپنے بھائیوں کو قتل اور اپنے باپ کو
قید کر دیا، تو اسے محی الدین کہتا ہے"

اندازہ کیجئے، کہ اسے زمانے سے کتنا شکوہ تھا اور
نیتی شکوہ تھا، کیونکہ اورنگ زیب بعد میں اگر جو کچھ بھی
تھا، وہ شروع میں وہ نہیں تھا، بلکہ اس کے بالکل خلاف
تھا۔ اور اس کے اسی تضاد کی طرف خوشحال خان نے اس
تاثر کا اظہار کیا تھا۔

دنیا جانتی ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے، کہ اورنگ
زیب بڑا شکی اور وہمی حکمران تھا اور اسے اپنے بیٹوں تک
پر اعتماد نہیں تھا۔ یہی بد اعتمادی، شکی مزاج اور وہم پرستی
نہ صرف اس کے ماتھے پر ایک بد نما داغ ہے، بلکہ اس کے
وفاداروں، دوستوں اور بیٹوں تک کی دشمنی و بیگانگی کا
باعث ہے۔ ایک اور جگہ خوشحال خان اپنے ایک شعر میں قرآن
شریف کے اس حکم کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے۔

اطاعت د اولی الامر منکم نہ کیرم
چہ اورنگ پہ زړه کافر دے

"یعنی اطاعت اولی الامر کی اس لئے نہیں کرتا ہوں،
کہ اورنگ دل میں کافر ہے"

خوشحال خان علم دین سے پورا واقف تھا اور رموز
مسلمانی سے آگاہ اور اس نے مندرجہ بالا شعر میں قرآن
شریف کے اس حکم کا ذکر کیا تھا:۔

اطیعو اللہ واطیعو الرسول واولی الامر منکم۔

اب یہ تو خوشحال خان کا دل اور وہ غیب داں خدا
ہی جانتا ہے، کہ خوشحال خان کو اپنے مخالف مغل شہنشاہ
اورنگ زیب میں کافر ہونے کا کونسا رنگ نظر آتا تھا۔ جو اس
نے اورنگ زیب کو بظاہر مسلمان لیکن بباطن کافر قرار دیا۔

ہو سکتا ہے، خوشحال خان کا مطلب اورنگ زیب کے
شک و وہم سے ہو، جو ایمان کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتے
ہیں لیکن پھر بھی یہی کہنا بہتر ہے، کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔
بہرحال اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے، کہ خوشحال خان نے
اورنگ زیب کو کافر قرار دینے کے بعد جو جہاد شروع کیا تھا،
اس کا کوئی نہ کوئی ایسا پس منظر ضرور تھا، جسے خوشحال
خان اس شعر کے رنگ میں آیت کریمہ کی تفسیر کے طور پر

آگے وانے سے نہ ہچکچایا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آزادی یا کسی اور چیز کے لئے جہاد ہو سکتا ہے؟ ہاں کیوں نہیں! میرا یہی خیال ہے، اس لئے کہ صرف مذہب کی تقدیس کے نام پر جنگ کا نام ہی جہاد نہیں، بلکہ عروسِ آزادی کی حفاظت۔ وطن کی سرزمین کے دفاع —— مادرِ وطن کے آغوش کی اغیار کے دستبرد سے بچاؤ —— اور انسانیت کی مظلومیت پر ترحم کے لئے جنگ جہاد ہے۔ اور یہ جہاد جائز ہے، اس لئے کہ اس میں اگر ایک طرف مذہب سے الگ تھلگ تصادم کا امکان موجود ہے، تو دوسری طرف حقوق کی امانت و حفاظت کا سامان بھی موجود ہے۔ اس لئے

حقوق کے لئے لڑنا عین جہاد ہے اور خوشحال
خان کا جہاد حقوق سے ہٹ کر نہیں ہے بلکہ
حقوق کے لئے ہے ——

خوشحال کے جذبۂ حریت، وطن پرستی اور مغلوں سے نفرت کے احساس سے شاعرِ مشرق علامہ اقبال بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اس نے "خوشحال خان کی وصیت" کو اپنے پیغام "بالِ جبریل" میں یوں منظوم کیا:-

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم
کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں
قہستاں کا یہ بچہ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات
وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اُڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ
مغل شہسواروں کی گردِ سمند

یہ تو اقبال کا تأثر تھا، جو "بالِ جبریل" میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منظوم ہو گیا اور خوشحال خان کی وصیت کو یادگار کے طور پر ابدی حیثیت دے گیا۔ لیکن یہ تأثر ایشیا تک اس کے نعرۂ حریت اور قابلِ فخر وجود سے یورپ بھی بے نیاز نہیں ہے اور خوشحال خان خٹک کے اس شعر کی صدائے گم کی ستو نظموں کی طرح یورپ اور باقی دنیا تک پہنچ چکی ہے۔ خوشحال خان اس شعر میں کہتا ہے:-

دپښتو پہ ننگ می وتړلہ تورہ
ننگیالے د زمانے خوشحال خټک یم

یعنی "میں نے پشتو کے "ننگ" (فخر) کے لئے تلوار باندھی، میں قابلِ فخر (فخر) زمانے کا خوشحال خٹک ہوں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسا صدیاں گزرنے کے بعد بھی "قابلِ فخر انسان" خوشحال خٹک زندہ ہے، اس کی آزادی کی روح زندہ ہے اور وہ کبھی بھی نہیں مر سکتی ——

ادیب متوجہ ہوں

ہمارے احتجاج کے بعد ماہنامہ "نقش" کراچی پہلے ہی یہ اعلان کرچکا ہے کہ وہ ادیبوں کی اجازت کے بغیر ان کا ادب شائع نہیں کرتا۔

ماہنامہ "جائزہ" کراچی نے ہماری پے در پے درخواستوں کا کوئی جواب نہیں دیا جس کے بعد ہم نے ناظم کراچی سے رجوع کیا۔ اب مندرجہ ذیل مراسلہ موصول ہوا ہے۔

ترجمہ

نظامت کراچی مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۶۱ء

عزیزی جمیل الدین عالی

یہ آپ کے مکتوب نمبر ۵۹۰ مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۶۰ء کے حوالے سے ہے جس کا موضوع "جائزہ" کا مصنفین کی اجازت کے بغیر ان کا ادب شائع کرنا تھا۔

نظامت کراچی کے افسر تعلقات عامہ نے "جائزہ" کے مدیر سے مذاکرے کئے اور جیسا کہ ان کو مشورہ دیا گیا۔ انہوں نے صحت مند ادب کے فروغ کی خاطر یہ منظور کرلیا ہے کہ وہ آئندہ سے "جائزہ" میں شائع ہونے والے ادب کے مصنفین سے پیشگی اجازت لے لیا کریں گے۔

آپ کا مخلص

اے۔ کے۔ صوفی

سکریٹری ناظم کراچی

ہم مدیر "جائزہ" کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہماری خاطر یا ہمارے مطالبے کی بنا پر نہیں تو "صحت مند ادب کے فروغ" کی خاطر آئندہ سے ادیبوں کی اجازت کو قابل اعتنا سمجھا۔ مگر ان کی سابقہ کارروائیوں کے سلسلے میں گلڈ کے اراکین ان سے مواخذہ کرنا چاہتے ہیں۔

اب یہ ذمہ داری بالکل ادیبوں کی ہے کہ وہ "جائزہ" کو اپنی تخلیقات کے انتخاب کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں دیتے۔ گلڈ نے ایک اہم معرکہ سر کرلیا ہے اور مدیر "جائزہ" آئندہ سے براہ راست حکومت کے سامنے بھی جوابدہ ہوں گے لیکن ادیبوں کو بھی اپنی ذمہ داریوں کے معاملے میں زیادہ محتاط ہونا پڑے گا۔ لیکن اگر ادیبوں نے اجازت بھی دی اور شکایت بھی کی تو گلڈ جوابدہ نہ ہوگا۔

دعوت نامہ ——— بقیہ صفحہ ۱۸۸

[illegible]

ملنے کا پتہ ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) ، علی گڑھ
قیمت دو روپیہ ۵ نئے پیسے

خیال امروہوی
شعلۂ گفتار
(مجموعہ کلام)
ناشر مکتبہ صبح افکار ۔ ۹ ابیت القیام ، میکلوڈ روڈ لاہور ۔ قیمت تین روپیہ

عبدالغفور قریشی
پنجابی زبان وادب تے تاریخ
(پنجابی زبان کی تاریخ ادب)
ملنے کا پتہ ۔ مکتبہ جدید ، چوک انارکلی ، لاہور
قیمت دس روپیہ

سید قاسم محمود
۱۔ **دیوار پتھر کی**
(افسانوں کا مجموعہ)
ناشر ۔ کلاسیک ۔ لاہور

۲۔ **قاسم کی مہندی**
(افسانوں کا مجموعہ)
(زیر طبع)
ناشر مکتبہ [illegible] ۔ لاہور

کرشن موہن
[illegible]

اختر سلیمی
۱۔ **میم**
(افسانوں کا مجموعہ)
(زیر طبع)

۲۔ **داغ دل**
ناول
(زیر تصنیف)

جمیل ملک
۱۔ **سرچراغاں**
(دیوان غزل)
ناشر ۔ گوشۂ ادب ، چوک انارکلی ۔ لاہور
قیمت ۴ روپیہ

۲۔ **طلوع فردا**
(نظمیں)
(زیر طبع)
ناشر ۔ گوشۂ ادب ، چوک انارکلی ، لاہور

وفا راشدی
۱۔ **بنگال میں اردو**
(مشرقی و مغربی بنگال میں اردو زبان وادب کی تاریخ)
قیمت ۵ روپیہ

۲۔ **پیام نو**

خود نوشت سوانح حیات)
ناشر مکتبۂ اشاعت اردو حیدرآباد (دکن)

ڈاکٹر رب نواز اورک زئی
فلسفۂ زندگی
(مقالات)
(زیر تصنیف)

ابن حنیف
ہزاروں سال پہلے
(ناول)
ناشر ۔ مکتبۂ کارواں کچہری روڈ لاہور
قیمت ۳ روپیہ ۵ نئے پیسے

احمد ریاض
موج خوں
ہمارے مرحوم شاعر احمد ریاض کا حیات آموز اور حیات افروز مجموعہ کلام ۔
(زیر طبع)
ناشر ۔ مجلس یادگار ریاض کچہری بازار لائل پور

عبدالعزیز خالد
غزل الغزلات
عہد نامۂ عتیق کے گیت سلیمان کا منظوم ترجمہ مع حواشی
قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے
ناشر [illegible] جالندھر
[illegible] ۔ [illegible] روڈ

خبرنامہ

اطرافِ عالم

ٹیگور آڈیٹوریم

عثمانیہ یونیورسٹی کے احاطہ میں ٹیگور آڈیٹوریم کی تعمیر کا کام عنقریب شروع ہو جائے گا۔ ٹیگور صد سالہ جشن کمیٹی نے پانچ لاکھ روپے کی اس رقم کو جو لارنس چیریٹی ٹرسٹ (حیدرآباد) سے دیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے نام منتقل کر دیا ہے۔

غالب کا یوم ولادت

آگرے (یو پی) میں حال ہی میں غالب کا یوم ولادت منایا گیا۔ مسٹر ایس۔ این۔ چترویدی (میئر آگرہ کارپوریشن) نے اس تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ آگرے میں غالب کی ایک یادگار قائم ہونا چاہیئے۔

اردو مصنفین کی ہمت افزائی

حکومت آندھرا پردیش نے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے ایک کمیٹی قائم کی ہے۔ اس کمیٹی نے سنہ ۱۹۵۸ء اور سنہ ۱۹۶۰ء کے دوران میں لکھی جانے والی اردو کی دس بہترین کتابوں پر مبلغ پانچ پانچ سو روپے انعامات دینے کا اعلان کیا ہے۔

ہندوستان میں اردو یونیورسٹی

جمعیۃ العلمائے ہند نے اپنے سالانہ بیسویں اجلاس میں حکومت کے سامنے دو تجاویز پیش کی ہیں۔ پہلی تجویز اردو زبان کو ہندوستان میں اس کا جائز مقام دلانے سے متعلق ہے اور دوسری یونیورسٹی کے قیام سے تعلق رکھتی ہے۔ جمعیت نے حکومت سے پُرزور اپیل کی ہے کہ اردو کو علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرے۔ اور جس طرح ہندوستان کی دوسری زبانوں میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہوا ہے اسی طرح اردو میں بھی کرے۔

لکھنؤ میں یوم مجاز

لکھنؤ میں انجمن ترقی اردو کے زیر انتظام یوم مجاز منایا گیا۔ اس تقریب میں یو۔ پی کے بیشتر مقتدر ادباء اور شعرا نے شرکت کی۔

کل ہند اردو کانفرنس

انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر انتظام کانپور (یو پی) میں منعقد ہونے والی دو روزہ اردو کانفرنس کی تاریخوں کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ اب کانفرنس ۴/۵ فروری ۱۹۶۱ء کو کانپور میں منعقد ہوگی

دہلی میں خسرو اکیڈمی

حال ہی میں ضیا پاشی کی جائے رہائش پر دہلی کے مقتدر ادیبوں اور شاعروں کا ایک جلسہ ہوا۔ جس میں امیر خسرو اکیڈمی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ حافظ محمد ابراہیم کو اکاڈمی کا [illegible] اور [illegible] کو جنرل سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ اس تقریب میں [illegible] ممالک کے سفیروں نے بھی شرکت کی۔

حلقہ کراچی

آدم جی ادبی انعام کی تقسیم

کراچی [illegible] فروری کو صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ایک یادگار تقریب میں ملک کی شاندار خدمات، اعلیٰ کارکردگی اور ادب، آرٹ اور سائنس میں امتیازی کارگزاری پر انعام دینے کے سلسلے میں وہ تمغے تقسیم کئے جن میں آدم جی ادبی انعام پانے والے چار ادیبوں کے نقد انعام بھی شامل ہیں۔ اس موقع پر رائٹرز گلڈ کے سیکریٹری جنرل قدرت اللہ شہاب نے کہا کہ اعزازات کی تقسیم کی سرکاری تقریب کے ساتھ ساتھ آدم جی ادبی انعام کی تقسیم ملک کے ادیبوں کے لئے انتہائی مسرت انگیز امر ہے۔ اس طرح جہاں ایک طرف آدم جی انعام کی حیثیت مسلمہ ہوگئی وہیں، رائٹرز گلڈ بھی ایک علیحدہ تقریب کے مصارف برداشت کرنے سے بچ گیا ہے۔ سرکاری اعزازات کی تقسیم کے ساتھ غیر سرکاری انعامات کی تقسیم ایک غیر رسمی لیکن صحت مندانہ اقدام ہے شہاب صاحب نے یہ بھی کہا کہ جہاں تک اس انعام کی رقم کا تعلق ہے یہ ایشیا بھر میں ادب کا سب سے بڑا نقد انعام ہے۔ جس کے لئے پاکستان رائٹرز گلڈ خانوادہ آدم جی کا ممنون ہے اور توقع ہے کہ پاکستان کے دوسرے مالدار اصحاب بھی اس قسم کی عمدہ مثال قائم کریں گے۔ صدر مملکت کے ہاتھوں اس انعام کی تقسیم سے ایک تاریخی روایت قائم ہو گئی ہے۔ پچھلے دو برسوں میں صدر مملکت نے ادیبوں کے ساتھ جو قدردانی کا سلوک کیا ہے وہ ادیبوں کے لئے باعث فخر ہے۔ پاکستان کی ادبی تاریخ میں یہ روایت ہمیشہ منزلت کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

واضح رہے کہ اردو اور بنگلہ انعامات دو دو ادیبوں میں تقسیم ہوئے ہیں۔ اردو ادیبوں میں شوکت صدیقی اور غلام عباس کو ان کی کتابوں (بالترتیب) خدا کی بستی (ناول) اور جاڑے کی چاندنی (افسانے) پر انعام ملا ہے۔ بنگلہ کے ادیبوں عبدالستار اور روشن یزدانی کو یہ انعام ملا ہے۔ ان انعامات کا فیصلہ کرنے والی کمیٹیاں حسب ذیل ادیبوں پر مشتمل تھیں۔

اردو — ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ قرۃ العین حیدر۔ جمیل الدین عالی۔

بنگلہ — ڈاکٹر شہید اللہ۔ ڈاکٹر مظاہر حسین۔ محبوب العالم۔ بیگم یوسف جمال۔

یونیورسٹی فنڈ کمیٹی

کراچی [illegible] فروری ۱۹۶۱ء کو محترمہ بیگم شریف صاحبہ کی زیر صدارت انجمن ترقی اردو خواتین پاکستان کا ماہانہ جلسہ منعقد ہوا جس میں اردو یونیورسٹی کا فنڈ جمع کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جو ان خواتین پر مشتمل ہے۔

بیگم شریف۔ بیگم عرفان اللہ۔ بیگم ارشاد حسین۔ بیگم مرتضیٰ صدیقی۔ بیگم صلاح الدین۔ بیگم [illegible]
بیگم [illegible]۔ بیگم حسن۔ بیگم شمیم مرتضیٰ۔ بیگم جنید عالم۔ بیگم مقبول۔

یوم جوہر

[illegible] جنوری ۱۹۶۱ء کو یوم جوہر کے سلسلے میں خالقدینا ہال میں مولانا محمد علی جوہر کے خطوط، تصاویر، [illegible] اور دیگر نوادرات کی نمائش ہوئی۔

یوم حالی

بزم ادب کے زیر اہتمام ۱۷ جنوری ۱۹۶۱ء کو اردو کالج میں یوم حالی منایا گیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے جلسہ کی صدارت کی۔ کراچی کے بیشتر معتقد ادبا و شعرا نے حالی کی زندگی، شخ[صیت] اور ان کے فن پر روشنی ڈالی۔

برگ گل کے ایوب نمبر کی اشاعت اور اردو کی نصابی کتابوں کی نمائش

گزشتہ دنوں اردو کالج میں مختلف علوم و فنون کی اردو کتابوں کی نمائش ہوئی جس کا شہر کے اکثر [illegible] نے معائنہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ اردو میں نصابی کتابوں کی کمی کی شکایت ایک بے معنی بات ہے۔ اسی دن اردو [illegible] نے برگ گل کے ایوب نمبر کا افتتاح بھی ہوا۔ یہ خاص نمبر تقریباً ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور [illegible] انقلابی حکومت کے کارناموں اور انقلاب کے پس منظر پر قابل قدر مضامین شامل ہیں۔

گلڈ کی ادبی نشستیں

۶ جنوری کو ادارۂ مصنفین پاکستان (حلقہ کراچی) کا پندرہ روزہ ادبی اجلاس ہوٹل ایک[illegible] میں جناب منہاج برنا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب ایم الیاس نے افسانہ اور جناب قمر ہاشمی نے نظم پیش کی۔

ادارہ کا دوسرا پندرہ روزہ ادبی اجلاس ۲۰ جنوری ۱۹۶۱ء کو جناب مجتبیٰ حسین کی [illegible] میں منعقد ہوا۔ پروگرام کے مطابق ن۔ م۔ راشد نے ایک تازہ طویل نظم اور حامد عزیز [illegible] نے اپنی غزل پیش کی جس پر بہت دیر تک بہت دلچسپ اور خیال انگیز گفتگو ہوئی۔

اِدارہ مصنّفین پاکستان

دو سال

۳۰ر جنوری ۱۹۵۹
۳۱ر جنوری ۱۹۶۱

حصہ دوم

گلڈ کی تحریک سے پاکستان اور ہندوستان کے تقریباً سبھی ادب دوست کسی حد تک واقف ہیں۔
ادارہ "ہم قلم" کی فرمائش پر ہم نے کوشش کی ہے کہ اس باب میں گلڈ کی تاسیس، ہیئت تشکیل اور دو سالہ
کاموں پر ایک مختصر سی دستاویز مرتب کر دی جائے۔ اس دستاویز کے بیشتر حصے تشنہ ہیں کیونکہ مرکزی دفتر میں
اُردو بنگلہ زبان میں بیک وقت کام کرنے کے وسائل نہیں تھے اور بیشتر کام (بدقسمتی سے) انگریزی میں ہوتا تھا۔
اس دستاویز میں علاقائی مجلسوں کی کارروائیاں بڑی اہمیت اور افادیت کے باوجود شامل نہیں کیا کیونکہ
ورنہ ایک پوری کتاب بن جاتی۔ بہرحال مرکزی کارروائیوں میں علاقائی کاموں کی بہت سی جھلکیاں ملیں گی کیونکہ یہ
علاقے ہی ہیں جن پر مرکزی کام کا دارومدار ہے۔ کچھ عرصے میں ہم ایک مکمل دستاویز مرتب کریں گے جس کے
بعد سال بہ سال جملہ کارروائیوں کا ضمیمہ شائع کر دیا جائے گا تاکہ ایک مستقل کتاب ترتیب پاتی رہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس دستاویز کی زبان خشک ہے اور بڑے سے بڑے واقعہ کو خالص کاروباری
انداز سے پیش کیا گیا ہے مگر ہمارا دستور یہی رہا ہے ہاں اہل نظر سے امید ہے کہ وہ بین السطور بھی بہت کچھ
پڑھیں گے مثلاً لکھا ہوا تو یہ ملے گا کہ جنوری ۱۹۵۹ء میں کنونشن منعقد ہوا لیکن سوچنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس
کے لئے کتنے کارکنوں کو کیا کیا محنتیں کرنی پڑی ہوں گی اور آنے والوں نے کتنا کچھ سوچ بچار کیا ہوگا۔ اسی
طرح آدم جی ادبی انعام کے اجرا پر چند سطریں نظر آئیں گی جبکہ کام کرنے والے جان سکتے ہیں کہ کسی بھی بڑے
سے بڑے خانوادے کو اتنے بڑے اور مستقل انعام کے لئے آمادہ کرنا اور ضروری تفصیلات طے کرنا کوئی
چھوٹا کام نہیں۔ ہمارے کارکن سب اعزازی ہوتے ہیں جو مختلف پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض اوقات مل جل کر
کام کرنے میں بہت سی دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں مگر آپ دیکھیں گے کہ ہماری مرکزی علاقائی اور ذیلی علاقائی
منتظمہ کمیٹیوں میں سبھی لوگ کام کئے جا رہے ہیں۔ ہم سب پر غور کرتے ہیں اور کام کی باتیں موتی سمجھ کر چن لیتے
ہیں ہم نے کبھی اپنی غلطیوں پر اصرار نہیں کیا۔
اس میں شک نہیں کہ ناقدین کے علاوہ گلڈ کے چند مخالفین بھی ہیں جنہیں اس تحریک کا
وجود ہی ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ان کے کئی طبقے ہیں جن میں بااثر لوگ بھی شامل ہیں اور وہ لوگ بھی
جن کے مفادات پر گلڈ کے وجود سے مستقل اثر پڑتا ہے اور پڑے گا اور وہ لوگ بھی جن کی مختلف قسم
اجارہ داریاں گلڈ کی وجہ سے ختم ہو گئیں۔
ان کی داستان پھر کبھی بیان کی جائے گی
آج ہماری دو سالہ تاریخ سب کے سامنے ہے۔ اس پر تبصرہ آج کے ناقدین کے اختیار میں ہے لیکن
ان کے علاوہ ہمیں اس ایک مورخ سے بھی انصاف کی توقع ہے جو نہ ہمارا دوست ہے نہ دشمن اور جس کی
سچائی اور صداقت گوئی ضرب المثل ہے اور وہ ناقد ہے ———— مستقبل!

۴ دسمبر کا اعلان

ملک میں ایک نئے دور کا آغاز جو ہر شہری کے لئے نئی ذہنی تحریک کا باعث ہے پاکستان کے جملہ ادیبوں، فنکاروں اور شاعروں کو یہ ایک ایسا موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے اظہار و اسلوب کے نئے اور زیادہ توانا طریقے تلاش کریں اور اپنی طبعزاد و تخلیقی قوتوں کو اس نئے معاشرے کی ارتقا اور انجلا کے لئے برتیں کہ راہیں جو انقلاب کے بعد تشکیل پا رہا ہے۔

اس کے لئے خود شناسی اور احساس ذمہ داری کی ضرورت ہے جس سے ماضی کے سیاسی سربراہوں نے اپنی غیر مقصدیت کی بنا پر ہمیشہ دانشوروں کو محروم رکھا تھا۔

اس لئے اس اعلان کے مندرجہ ذیل دستخط کنندگان۔۔یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ کراچی میں جنوری ۱۹۵۹ء کے دوسرے ہفتے میں مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے ادیبوں کی ایک ایسی کنونشن بلایا جائے جس میں تمام ادبی شعبوں کے ادیب شامل ہوں۔

(۱) ادیبوں کی ایک قومی انجمن کی تشکیل کرنا۔ جو ادیبوں اور ان کے خاندانوں کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھے اور ان کے حقوق کی محافظت کرے جیسا کہ صدر مملکت محمد ایوب خاں کے ایک اعلان سے مترشح ہوتا ہے۔

(۲) تخلیقی ادیبوں کی کوششوں کو مربوط کرنا تاکہ وہ قومی تعمیر کے اہم کام میں مناسب حصہ لے سکیں۔

(۳) بیرونی ممالک میں پاکستانی ادب کی صحیح نمائندگی کرنا تاکہ پاکستانی ثقافت کی نشر و اشاعت ہو سکے جو اب تک افسوس ناک عدم توجہی کی شکار رہی۔

(۴) ادبی کاپی رائٹ کے بارے میں موجودہ قوانین کا جائزہ لینا اور ادیب و ناشر کے رشتے کے متعلق تفصیلی معاملات طے کرنا۔

(۷) عوام الناس اور حکومت کی مدد سے ایک نفع خیز قومی ادارہ مصنفین کی تشکیل کے راستے تلاش کرنا تاکہ ادیبوں اور ان کے متعلقین کی اقتصادی بہبودی ہو سکے۔

ہم مندرجہ ذیل دستخط کنندگان امید کرتے ہیں کہ چونکہ مندرجہ بالا اغراض و مقاصد ہر ادیب کی خاص امنگوں اور قومی عوام سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اس اعلان پر ملک کے ہر حصے کے ادیب لبیک کہیں گے اور جو ادیب ان اغراض و مقاصد پر رضامندی کا اظہار کریں وہ ادیبوں کے اس کنونشن کو جلد از جلد منعقد کرنے کے لئے اپنی اولین فرصت میں اس پتے پر خط و کتابت شروع کر دیں گے۔

معتمد
پاکستان رائٹرس کنونشن
۵۰، ڈی، گارڈن روڈ کراچی

الداعیان:۔ ابن الحسن۔ ابن سعید۔ جمیل الدین عالی۔ ضمیر الدین احمد۔ عباس احمد عباسی۔ غلام عباس۔ قدرت اللہ شہاب۔ قرۃ العین حیدر۔

(نوٹ:۔ مندرجہ بالا فہرست حروف تہجی کے مطابق ہے۔)

دعوت نامہ

(اُردو اور بنگلہ میں چھپا تھا)

پاکستان رائٹرس کنونشن

۱۹۵۹ء

★

مندوب

شاہد احمد دہلوی

صدر مجلس عمل

پروگرام

پہلا دن ۲۹ر جنوری ۱۹۵۹ء

پہلا اجلاس (عام) ۱۰ بج کر ۳۰ منٹ

تلاوت کلام پاک

افتتاحیہ تقریر —————— پروفیسر مرزا محمد سعید

رپورٹ —————— صدر مجلس عمل

خطبہ صدارت —————— جسیم الدین

عام و خصوصی جلسوں کے طریقۂ کار کا اعلان

دوسرا اجلاس (خصوصی) ۳ بجے شام

صدر کا انتخاب ۔ سب کمیٹیوں کا انتخاب ۔ ادارے کے دائرۂ عمل کا تعین

تیسرا اجلاس (خصوصی) ۶ بجے شام

سب کمیٹیوں کی کارروائی

دوسرا دن ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء

پہلا اجلاس (مخصوص) ۹ بجے صبح

سب کمیٹیوں کی کارروائی

دوسرا اجلاس (مخصوص) ۲ بجکر ۳۰ منٹ

سب کمیٹیوں کی کارروائی

تیسرا اجلاس (مخصوص) ۶ بجے شام

انتخاب صدر۔ سب کمیٹیوں کی سفارشات پر مباحثہ اور فیصلے

تیسرا دن ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء

پہلا اجلاس (مخصوص) ۹ بجے صبح

انتخاب صدر۔ سب کمیٹیوں کی سفارشات پر مباحثہ اور فیصلے

دوسرا اجلاس (عام) ۴ بجکر ۳۰ منٹ

مقالات

خطبہ اختتامیہ (ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

یادداشت

۱۔ ۲۹ جنوری ۱۹۵۹ء کے پہلے اجلاس کی صدارت جسیم الدین اور ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو آخری اجلاس کی صدارت ڈاکٹر عبدالحق کریں گے۔ جلسوں کے لئے صدر مندوبین خود منتخب کریں گے۔

۲۔ جو جلسے مخصوص ہیں ان میں صرف مندوبین شریک ہوں گے۔ ۲۹ جنوری کے پہلے اجلاس اور ۳۱ جنوری کے آخری اجلاس میں صحافی بھی شریک ہوں گے۔

۳۔ موصول شدہ قراردادوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل موضوعات پر سب کمیٹیاں تجویز کی گئی ہیں۔

(الف) قیام انجمن ادباء (Writers Guild) تشکیل دستور۔

(ب) ادیبوں کی بہبود و تحفظ حقوق

(ج) پاکستانی ادیبوں کے داخلی و خارجی مسائل کا مطالعہ اور سفارشات

(د) کاپی رائٹ قانون اور مصنف اور ناشر کے باہمی امور

(ہ) ادیبوں کے ادارہ اشاعت کا قیام

(و) متفرقات اور ضابطہ

۴۔ ہر سب کمیٹی پانچ مندوبین پر مشتمل ہوگی۔ ہر کمیٹی اپنا صدر خود چنے گی۔ ہر کمیٹی کو ایک کنوینر بھی دیا جائے گا۔

گذارش

۱۔ مندوبین کے لئے نشستیں مخصوص نہیں کی گئی ہیں۔

۲۔ وقت کی پابندی سختی سے کی جائے گی۔

۳۔ مغربی پاکستان اور کراچی کے مندوبین کے لئے سواری کا انتظام نہیں کیا جائے گا۔

۴۔ مندوبین اپنی آمد کی اطلاع حسب ذیل پتہ پر دیں:۔

۲۰ ہوٹل ایکسلسیر
اینورسٹی روڈ۔ کراچی

(فون:۔ ۵۳۰۵۵، ۵۳۰۵۶، ۵۳۰۵۸

۵۔ مندوبین اپنے ساتھ اجلاس میں کسی ذاتی مہمان کو نہ لائیں۔

پاکستانی ادیبوں کا کنونشن

۲۹ تا ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ع

اجلاس اول : ۲۹ جنوری

مرزا محمد سعید افتتاح کر رہے ہیں

شاہد احمد دہلوی خطبہ استقبالیہ
پڑھ رہے ہیں

جیسم الدین خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے

یبوں کی بہبود
ر تحفظ حقوق
، سب کمیٹی

قیام ادارہ مصنفین
اور تشکیل دستور
کی سب کمیٹی

سب کمیٹی
متفرقات اور رابط

ئی قومی و علاقائی
بان و ادب

. دارالاشاعت کے قیام
سب کمیٹی

مینی برائے منشور

ٹاپی رائٹ قانون اور مصنف و
شر کے تعلقات کی سب کمیٹی۔

نی ادیبوں کے داخلی و خارجی
سائل کی سب لمیٹی۔

ممدو بین ۔
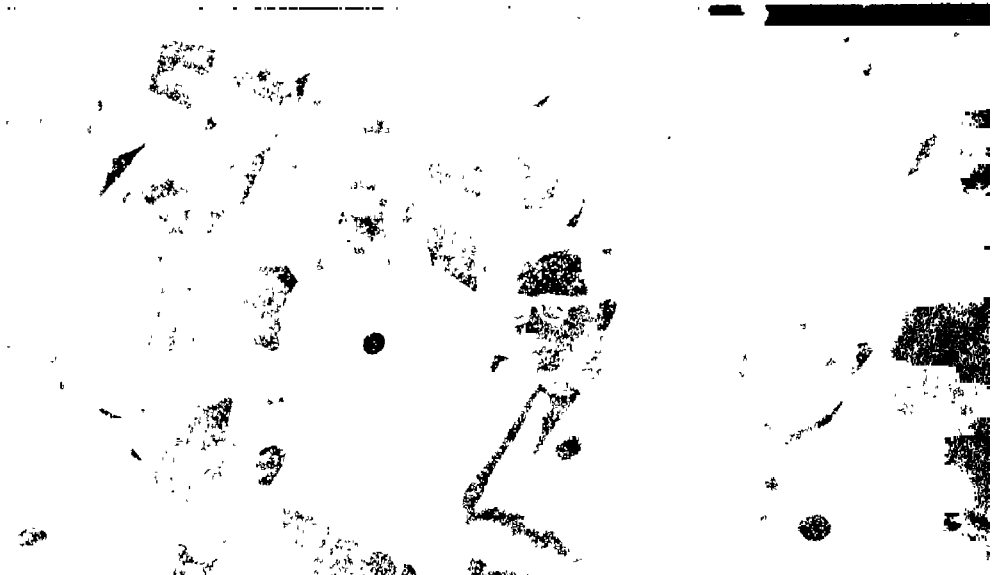
مہمانان گرامی

سندو بین
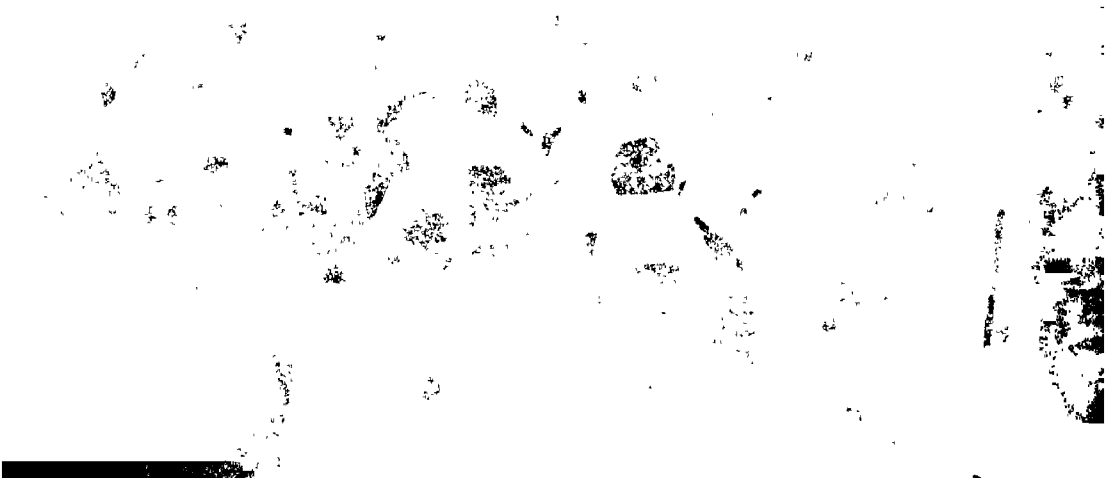
صدر مملکت تقریر فرما رہے ہیں

آخری اجلاس

۳۱ جنوری ۱۹۵۹ ع

ڈاکٹر مولوی عبدالحق
خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے

اعجاز بٹالوی منظور شدہ
دستور پڑھ رہے ہیں

ابن سعید سہ روزہ
کارروائی کی رپورٹ
پیش کرتے ہوئے

ابن الحسن منشور پڑھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال

ڈاکٹر سید سجاد حسین

پروفیسر ابو رشد

ممتاز حسین

تقریریں
۳۱ جنوری

قدرت اللہ شہاب سکریٹری جنرل منتخب ہونے کے بعد تقریر کر رہے ہیں
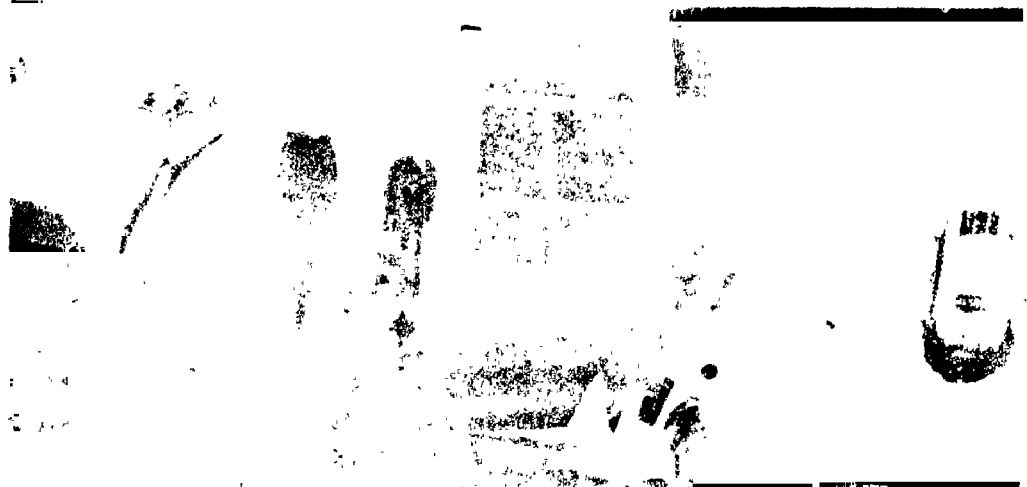
چند مندوبین

کنونشن کے چند رضا کار

اسمائے مندوبین

جو بنیادی اراکین قرار پائے

۱۔ حلقہ کراچی
۲۔ حلقہ مشرقی پاکستان
۳۔ حلقہ مغربی پاکستان

حلقہ کراچی

نام	پتہ	پیشہ	صنف
ابرار صدیقی	۳/۲۳ ۔ مسلم لیگ کوارٹرز ۔ ناظم آباد کراچی	صحافت	مضمون نگاری
ابراہیم جلیس	۱-۷/۳۱ ۔ پیر الٰہی بخش کالونی ۔ کراچی	"	افسانہ ۔ مضمون نگاری
ابن انشا	۵/۶ جہانگیر ایسٹ کراچی	ملازمت	شاعری
ابن سعید (لفٹنٹ کمانڈر ایم ایچ عسکری)	پاکستان نیوی نیول ہیڈ کوارٹرز ۔ کراچی	"	افسانہ
ابوالخیر کشفی	ایل ۔ ۴ ۔ ماڈرن کالونی ۔ کراچی	لیکچرر	تنقید
ابوالفضل صدیقی	۸/۶۲ جیکب لائن کراچی	صحافت	شاعری
ابوالليث صدیقی	صدر شعبہ اردو ۔ کراچی یونیورسٹی ۔ کراچی	پروفیسر	تنقید
ادا جعفری	۴/۲ نیپئر بیرک کراچی	امور خانہ داری	شاعری
ادیب سہارنپوری	اے ۔ ایم ۱۰ ، گرین بلڈنگ ۔ فریئر روڈ ۔ کراچی	ملازمت	"
اسلم فرخی	روشن سراج ۔ بلاک ۲ ناظم آباد ۔ کراچی	تدریس	" ڈرامہ تنقید
اصغر بٹ	ریڈیو پاکستان کراچی	ملازمت	" "
اطہر نفیس	اخبار جنگ کراچی	صحافت	افسانہ ۔ شاعری
اعجاز الحق قدوسی	۵۷/۴ ، نیا لالوکھیت ۔ کراچی	ملازمت	تاریخ ۔ ادب
افضل الرحمٰن ممتاز	۱/۳۶۵ ۔ گارڈن ۔ ایسٹ ۔ کراچی	صحافت	مضمون ۔ افسانہ
الطاف گوہر	چیف کنٹرولر ۔ درآمد و برآمد ۔ کراچی موجودہ راولپنڈی	ملازمت	شاعری ۔ تنقید
انتظار حسین	۷۹ ۔ انٹیلیجنس اسکول ۔ کراچی	"	ڈرامہ
انجم اعظمی	گورنمنٹ کالج فار مین ۔ ناظم آباد ۔ کراچی	تدریس	شاعری ۔ تنقید
انور	۴ ۔ ای ۴۷ بلاک ۲ پی ۔ ای ۔ سی ۔ ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹	ملازمت	افسانہ
انور احسن صدیقی	صفیہ منزل ۔ موہن اسٹریٹ ۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ روڈ ۔ کراچی	تدریس	شاعری ۔ تنقید
انور عنایت اللہ	۱۲۹/۲ ایم ۔ پی ۔ ای ۔ سی ۔ ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹	ملازمت	افسانہ ۔ ڈرامہ
انیس چودھری	۱۵۲/۴ ای ۔ جہانگیر روڈ ایسٹ کراچی	"	"
ڈاکٹر اے ۔ ایس نورالدین	معظم پریس بلڈنگ ۔ کراچی	"	تصوف
بسم اللہ نیاز احمد	۱۲/۷ / ۵ / ۱۳ ناظم آباد کراچی	تدریس	مضمون ، ریڈیو فیچر
تابش دہلوی	۲۴ ۔ ای ۔ جہانگیر ویسٹ ۔ کراچی	ملازمت	شاعری ۔ نثر
تابش صدیقی	۳۵۳ ۔ ایف ، جہانگیر ویسٹ	"	"
تصدق سہیل	۱۷ ۔ شاہجہاں ہوٹل ۔ صدر کراچی	"	افسانہ

الدین احمد	۱۴۱۔ پاکستان کوارٹرز۔ لارنس روڈ۔ کراچی	ملازمت	ڈرامہ۔ تنقید
پانی پتی	۲۹/۳۔ مارٹن روڈ۔ کراچی	خدمت ادب	شاعری
احمد نقوی	۳۹۹۔ ایف، جہانگیر ویسٹ کراچی	ملازمت	" تنقید
الدین عالی	۳۲۔ سی۔ گارڈن روڈ۔ کراچی	"	"
جالبی	۷۵۔ پیر الٰہی بخش۔ کالونی کراچی	"	تنقید۔ ترجمہ
کشمیری	اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ الفنسٹن اسٹریٹ کراچی ۳	تجارت	شاعری، افسانہ
جالندھری	بی/۲، باتھ آئی لینڈ۔ کراچی	ملازمت	نظم
سن قادری	نشاط منزل۔ ۱۔ ای ۱/۲ ناظم آباد۔ کراچی	"	تنقید۔ شاعری۔ افسانہ
شید احسن صدیقی	صفیہ منزل۔ موسیٰ اسٹریٹ آؤٹرام روڈ۔ کراچی	تدریس	شاعری۔ افسانہ
علی بخاری	۹۲۔ بھرگری روڈ۔ مقابل وٹھل بھائی پارک بندر روڈ ایکسٹنشن کراچی	صحافت	"
انیزی	"عصمت" کراچی۔ نزد ایروز سینما کراچی	"	ادب
طیب	۲۵۳۔ سولجر بازار۔ کراچی	ملازمت	شاعری
قادر	۸/۹۶ جیکب لائن۔ کراچی	"	" تنقید
تمنائی	ایسٹ۔ پبلیکیشنز۔ بندر روڈ۔ کراچی	تجارت	ترجمہ
فاروقی	x۔ ۳۔ قاسم آباد۔ کراچی	ملازمت	شاعری
رضوی	۲۴۵۔ پیر الٰہی بخش۔ کالونی۔ کراچی	ادب	ناول۔ مضمون نگاری
سید فرزند	۳۲۔ ڈی۔ گارڈن روڈ۔ کراچی	تدریس	مضمون نگاری
سلے حقی	۴۵/۲ جیکب لائنز۔ کراچی ۳	تدریس	شاعری، ڈرامہ
یم احمد	۱۰۲۔ ای جہانگیر روڈ۔ ویسٹ۔ کراچی	ملازمت	" " نظم۔ تنقید
یم انصاری	۸/۲۵ جیکب لائن۔ کراچی	"	افسانہ
ل احسن شوقی	معرفت محمد امین محمد بشیر۔ فضلے ہاؤس تیسری منزل میکلوڈ روڈ کراچی	"	شاعری
فیضی	۱۔ سوامی کنج ۱۔ے۔ایم۔۱۔ کراچی	"	" ترجمہ۔ تنقید
ر ترقی	اخبار جنگ۔ کراچی	صحافت	مضمون
یوسف بخاری دہلوی	۸/۲۵۔ کلیٹن روڈ۔ نیو ٹاؤن۔ کراچی	ملازمت	ثقافتی مضمون نگاری۔ تنقید
الحق حقی	۴۵/۲۔ جیکب لائنز۔ کراچی	"	شاعری۔ نثر
ند دہلوی	۹۰۵/۱۵ پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی	صحافت	مضمون
اعظیل	روزنامہ جنگ۔ کراچی	"	مزاح
زیری	۲/۱ اکبر روڈ۔ کراچی	"	شاعری۔ ادب
احمد	۱۰۲۔ ای۔ جہانگیر ویسٹ کراچی	"	تنقید

ڈاکٹر عصمت ارشاد	ایف ۲۔ سی کراچی جوائنٹ واٹر بورڈ کوارٹرز نزد محمد علی سوسائٹی کراچی		تنقید۔ افسانہ
ڈاکٹر شوکت سبزواری	اردو ڈیولپمنٹ بورڈ۔ کراچی	ملازمت	تنقید۔ ادب
شوکت صدیقی	۱۵۳/۱۵۴ شاہ وقار النساء۔ ثانیہ کالونی کراچی ۱۸	"	افسانہ
صہبا اختر	معرفت اطہر نفیس۔ روزنامہ جنگ کراچی	"	شاعری
صہبا لکھنوی	ماہنامہ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی	صحافت	" ادب
ضیاء الحسن موسوی	بیلی ویلی۔ نیو ٹاؤن۔ کراچی ۵	ملازمت	" ترجمہ مضمون۔ تنقید
ضیاء جالندھری	۴۳، ایل بلاک ۲ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی کراچی ۲۹	"	"
ظہیر الدین احمد	معرفت ڈان کراچی	صحافت	افسانہ
طاہر احمد	اسلامیہ کالج کراچی	طالب علم	"
طفیل احمد جمالی	معرفت روزنامہ امروز میکلوڈ روڈ۔ کراچی	صحافت	" مزاح
طفیل احمد خاں	پی۔ ایم۔ اے بلڈنگ۔ نشل روڈ۔ کراچی	"	تنقید، نثر
عابدی جعفر	مکتبہ ہم خیال، ۲۰۸۷۔ پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی		ناول
عباس احمد عباسی	۱۸۲۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی۔ کراچی ۲۹	ملازمت	مضمون نگاری
ڈاکٹر مولوی عبد الحق	انجمن ترقی اردو کراچی	"	تنقید۔ مضمون نگاری
عبد الرؤف عروج	۳۵۔ ایف۔ جہانگیر ویسٹ کراچی	صحافت	شاعری
عزیز حامد مدنی	۳۰۵۔ پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی	ملازمت	شاعری
عطا صدیقی	۴۔ ریاض منزل۔ سولجر بازار۔ کراچی	تدریس	افسانہ
ع۔ س۔ مسلم	۲۶۔ ادریس چیمبرز۔ ساؤتھ نیپیئر روڈ۔ کراچی	صحافت	" شاعری
عبد العزیز خالد	۲۷۔ بی۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی کراچی ۲۹	ملازمت	شاعری
غلام عباس	۲/۱ ایچ۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹	"	افسانہ
فخر ماتری	روزنامہ ملت کراچی ۱۹۹۔ ساؤتھ نیپیئر روڈ کراچی	صحافت	ادب
فرید جاوید	۳/۲ بی، سنٹرل جیکب لائنز کراچی	ادب	شاعری
فضل احمد کریم فضلی	"بیت الغزل" ۲۹۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹	ملازمت	" ناول
قرۃ العین حیدر	۶۱۔ ڈی۔ گارڈن روڈ۔ کراچی	"	افسانہ "
قمر جمیل	ریڈیو پاکستان کراچی	"	شاعری، ادب
قیسی رامپوری	۶/۹/۸ ناظم آباد نمبر ۲۔ کراچی	ادب	ادب
ماہر القادری	مدیر فاران۔ کراچی	صحافت	شاعری۔ ادب
بیگم مایا جمیل	۱۳۱۔ بی۔ بلاک ۲ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی کراچی ۲۹	تدریس	ادب

مجتبیٰ حسینی	۸۶۶/۲/۱ اے۔ لالوکھیت کراچی	ملازمت	تنقید
محشر بدایونی	۹۶۔ ایف۔ ابی سینا لائنز کراچی	"	شاعری
ڈاکٹر محمد شہید اللہ	ایڈیٹر ترقی اردو بورڈ ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۲۹ موجودہ۔ ۱۹۷ بیگم بازار روڈ۔ ڈھاکہ	تدریس	
			شاعری۔ نثر
محمد غوث الدین	۱۹۹۔ حیدرآباد کالونی۔ کراچی	ملازمت	ادب
محمد مجتبیٰ خاں	۱۱/۳ بی۔ ۱۱۔ ۲۲۔ ناظم آباد۔ کراچی	"	"
محمود علی خاں	۲۱۱۔ پیرالٰہی بخش کالونی۔ کراچی	-	تنقید
مسرت جہاں بیگم تیموری	۲/۴ جٹ لینڈ لائنز کراچی	"	نظم
مسلم ضیائی	۲/۹۶ آزاد نگر۔ ڈرگ روڈ۔ کراچی ۲۲	صحافت	شاعری۔ تنقید
مظفر حسین شمیم	۳۲۔ ای۔ ۹/۳ ناظم آباد۔ کراچی	ادب	ادب
ممتاز حسین	۸۶۷۔ پیرالٰہی بخش کالونی۔ کراچی	تدریس	تنقید
منظور ضیائی	معرفت "افکار" رابسن روڈ۔ کراچی	وکالت	مضمون نگاری
منظور عارف	۲۴۵۔ پاکستان کوارٹرز۔ کراچی	ملازمت	شاعری
منہاج برنا	معرفت "امروز" کراچی	صحافت	" تنقید
مہر شاہ	۱۱۸۔ ایم۔ کورنگی کالونی۔ کراچی	-	مضمون نگاری
مرزا محمد سعید	معرفت مرزا احسن جعفر پرسنل سکریٹری انکم ٹیکس کمشنر ساؤتھ زون۔ ۲۶ گارڈن روڈ۔ کراچی	تدریس	ناول
نظر جعفری	۲۴۔ ای۔ جہانگیر روڈ۔ ویسٹ۔ کراچی	ملازمت	شاعری
نظر حیدرآبادی	۱۴۷۔ حیدرآباد کالونی۔ کراچی	"	"
ولی اللہ	افسر تعلقات عامہ سفارت خانہ پاکستان جرمنی	"	افسانہ
ڈاکٹر یاور عباس	سیدہ منزل۔ کراچی	ڈاکٹری	شاعری۔ مضمون نگار
بیگم یوسف جمال حسین	۲۹۔ ڈی۔ گارڈن روڈ۔ کراچی	تدریس	افسانہ۔ ڈرامہ
یونس اظہر	۲۲۔ ویسٹ جہانگیر روڈ۔ کراچی	ملازمت	"

حلقہ مشرقی پاکستان

چاٹگام

...مفضل	۱۱۰ - جبلور روڈ - چاٹگام	تدریس	مضمون نگاری - افسانہ ناول
...یم شرف الدین	چاٹگام کالج - چاٹگام	"	افسانہ - شاعری
...لت عثمان	کامرس کالج - چاٹگام	"	-
...ب العالم	عالم باغ - کامرس - ٹوبوٹری لین - چاٹگام	پنشنر	افسانہ - فیچر
...ح الاسلام	الیف بلہ ۲۸ ، آباد گورنمنٹ کالونی - چاٹگام	ملازمت	شاعری

ڈھاکہ

...یل ابراہیم خاں	۱۶۲ - دھان منڈی - ڈھاکہ	تدریس	ناول - ڈرامہ - سوانح نگاری
...طسین	پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ - چیف پبلی کیشن اینڈ فیچرڈ ڈویژن حکومت مشرقی پاکستان - ڈھاکہ	ملازمت	شاعری - ادب - تنقید - تبصرہ
...رشد	۱۳۱ - توپ خانہ روڈ - ڈھاکہ ۲	تدریس	افسانہ - ناول
...ن احمد الملک	۹۷ - آ لا صادق روڈ - رمنہ - ڈھاکہ	ملازمت	شاعری - تنقید
...ت الزماں خاں	ریڈیو پاکستان ڈھاکہ	"	ناول - ڈرامہ
...ار رحمان	۱۵۶ - نواب پورہ روڈ - ڈھاکہ	صحافت	افسانہ - بچوں کا ادب - مضمون نگا
...ر الاسلام	۴۶ - ۵ - عظیم پورہ اسٹیٹ ڈھاکہ	ادب	" شاعری
...کے - ایم - امین الاسلام	۷۲ - دیوان بازار روڈ - ڈھاکہ	تدریس	تنقید
...نظیر احمد	شاہجہان پور رمنہ - ڈھاکہ	محنت	شاعری - مضمون نگاری
...م حسین	۲۶ - نواب پورہ روڈ - ڈھاکہ	صحافت	" بچوں کا ادب - مضمون نگا
...سیم الدین	پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ مشرقی پاکستان - ڈھاکہ	ملازمت	"
...ب الرحمٰن	۲۱۲ - جوگن ناتھ بہار روڈ - ڈھاکہ	"	" بچوں کا ادب
...ا ضیاء الرحمٰن	جوگن ناتھ کالج ڈھاکہ	تدریس	" افسانہ - مضمون نگاری
...ن محمد معین الدین	الحمرا لائبریری - بنگلہ بازار - ڈھاکہ	تجارت	" "
...ان محمد اظہر	نرسنگدی کالج - نرسنگدی - ڈھاکہ	تدریس	مضمون نگاری
...یار زین الدین	۲۵ - کیلاش گھوش لین - ڈھاکہ	ادب	افسانہ - ناول
...ڈ سید سجاد حسین	شعبۂ انگریزی - ڈھاکہ یونیورسٹی - ڈھاکہ	تدریس	تنقید

سید نورالدین	۸۔ شوگن باغیچہ۔ ڈھاکہ	صحافت	شاعری
شمس الدین ابوالکلام	پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ۔ مشرقی پاکستان۔ ڈھاکہ	ملازمت	شاعری۔ افسانہ۔ ناول
شمس الرحمٰن	ریڈیو پاکستان۔ ڈھاکہ	"	"
بیگم شمس النہار محمود	معرفت بنگالی اکیڈمی ڈھاکہ		
بیگم صوفیہ کمال	تارا باغ۔ ٹکاٹولی۔ ڈھاکہ	ادب	شاعری
عبدالرحمٰن خاں	۸۲۔ آغا مسیح لین۔ ڈھاکہ	تدریس	ترجمہ
عبدالرشید خاں	دفتر رجسٹرار آف پبلیکیشنز حکومت مشرقی پاکستان ڈھاکہ	ملازمت	شاعری، مضمون نگاری
عبدالقادر	۶۰۔ ای۔ عظیم پورہ اسٹیٹ ڈھاکہ	"	" مضمون
عسکرین شیخ	ڈھاکہ یونیورسٹی۔ ڈھاکہ	تدریس	ڈرامہ۔ مضمون نگاری
علاء الدین آزاد	جگن ناتھ کالج ڈھاکہ	"	افسانہ۔ ناول۔ شاعری
عندلیب شادانی	ڈھاکہ یونیورسٹی ڈھاکہ	"	ادب
غلام مصطفٰے	مصطفٰے منزل۔ سعودی نگر۔ رمنہ۔ ڈھاکہ	پنشنر	شاعری
ڈاکٹر قاضی مطاہر حسین	ڈھاکہ یونیورسٹی۔ ڈھاکہ	"	تنقید
متین الدین احمد	۴۲۔ توپخانہ روڈ۔ ڈھاکہ ۲	"	افسانہ۔ مزاح
محمد برکت اللہ	۲۶۔ ٹیپو سلطان روڈ ڈھاکہ ۱	"	تنقید
ڈاکٹر محمد عبدالحیٔ	شعبہ بنگالی و سنسکرت۔ ڈھاکہ یونیورسٹی۔ ڈھاکہ	تدریس	" مضمون نگاری
محمد ناصر علی	۴۳۔ دینا ناتھ سین روڈ۔ ڈھاکہ	ملازمت	بچوں کا ادب
منصور الدین	۲/۱۲ شانتی نگر۔ ڈھاکہ	تدریس	ناول۔ مضمون نگار
نظیر الاسلام محمد صفیان	معرفت ڈاکٹر این۔ این۔ سرکار۔ آئی۔ جی ڈھاکہ	ملازمت	شاعری، مضمون نگاری
عبدالمومن	ڈھاکہ یونیورسٹی ڈھاکہ	تدریس	ڈرامہ۔ افسانہ۔ مضمون
ولی اللہ	ڈھاکہ۔ افسر تعلقات عامہ سفارت خانہ پاکستان جرمنی	ملازمت بیرون خانہ جات	ادب

راج شاہی

ڈاکٹر محمد انعام الحق	راج شاہی یونیورسٹی۔ راج شاہی	تدریس	تحقیق

رنگ پور

مظہر الاسلام	کارمائیکل کالج رنگپور	تدریس	—

حلقۂ مغربی پاکستان

بہاول پور

رمنظر	غوث پورہ۔ بہاول پور	صحافت	شاعری

پشاور

سید قریشی	ریڈیو پاکستان۔ پشاور	ملازمت	مضمون نگاری
مراد	"	"	شاعری
یوہ شنواری	خیبر ایجنسی لنڈی کوتل	ادب	" نثر
رطرزی	ریڈیو پاکستان۔ پشاور	ملازمت	تنقید۔ شاعری۔ افسانہ
تید فارغ بخاری	۴۰۔ محل بہار کالونی۔ پشاور	تجارت	شاعری۔ ادب
مد مومند	۴۸۔ یونیورسٹی ہوسٹل ۱ پشاور یونیورسٹی۔ پشاور	صحافت	ادب

حیدرآباد

ترانصاری اکبرآبادی	دفتر نئی قدریں۔ حیدرآباد	صحافت	شاعری
کٹر تنویر زبیری	لیاقت میڈیکل کالج حیدرآباد	تدریس	افسانہ
منور احمد سلیم	سندھ یونیورسٹی۔ حیدرآباد	"	شاعری
ایت علی شاعر	ریڈیو پاکستان۔ حیدرآباد	ملازمت	"
سن بھوپالی	سی۔۹۔ پبلک ہیلتھ کالونی عقب زبیدہ گرلز کالج حیدرآباد	"	"

راولپنڈی

لا بابر	انٹر سروسز پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ جی۔ایچ۔کیو۔ راولپنڈی	ملازمت	افسانہ۔ ڈرامہ
بوان الحسن	۲۔ ہال روڈ۔ راولپنڈی	۔	افسانہ
بل حسین	۱۸۲۔ اے کریگ روڈ۔ راولپنڈی	۔	شاعری۔ تنقید
بیل ملک	این۔ ۲۲۲۔ پیا چہ اسٹریٹ نزد پولس سی اسٹیشن راولپنڈی	تدریس	" "
بومرادآبادی	۲۶۵۔ ڈلہوزی روڈ۔ راولپنڈی	ملازمت	"
لیفٹن سید ضمیر جعفری	ڈائرکٹوریٹ پبلک ریلیشنز جی۔ ایچ۔ کیو۔ راولپنڈی	"	" مضمون نگاری

ت تھانوی	اخبار جنگ راولپنڈی	صحافت	جرائد۔ ناول
العزیز فطرت	پوسٹ آفس سرابہار۔ راولپنڈی	ملازمت	شاعری۔ نثر
ت اللہ شہاب	ایوان صدر راولپنڈی	"	افسانہ
یزگلزار احمد	معرفت پرسنل برانچ جی۔ ایچ۔ کیو راولپنڈی چھاؤنی	"	تاریخ۔ افسانہ۔ رپورتاژ
ر صدیقی	ریڈیو پاکستان راولپنڈی	"	تنقید۔ شاعری۔ ڈرامہ
ر مفتی	ایوان صدر راولپنڈی	"	نثر۔ افسانہ
، نسیم حجازی	روزنامہ کوہستان۔ راولپنڈی	صحافت	ناول
م الظفر	ریڈیو پاکستان راولپنڈی	ملازمت	شاعری۔ ڈرامہ
ت ظفر	ریڈیو پاکستان پشاور	"	"

سرگودھا

ہاشمی	خانقاہ ڈمیری۔ سرگودھا		ناول۔ افسانہ

لاہور

ب احمد	۲۔ مین روڈ۔ لاہور	ملازمت	شاعری۔ تنقید۔ افسانہ
راہی	صوفی اسٹریٹ۔ گوالمنڈی۔ لاہور	فلم رائٹر	" نثر
ق احمد	۷۲۔ دی۔ مال۔ لاہور	صحافت	افسانہ
حسین بٹالوی	۸۳ ایف۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور	وکالت	"
دانی	دیال سنگھ کالج۔ لاہور	تدریس	شاعری
حمید	۳۔ وی اسٹریٹ فلیمنگ روڈ۔ لاہور۔	ادب	افسانہ
ر جاوید اقبال	۳۔ علامہ اقبال روڈ۔ لاہور	وکالت	ادب
علی خاں	۲۴، جے، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور	ادب	شاعری۔ ادب
سن زمانی عالمگیر	۲۱۔ ٹی گلبرگ۔ لاہور	صحافت	" افسانہ
یہ مستور	کملا راجہ اسٹیٹ بنگلہ ۲ اسٹریٹ ۸ کینال پارک لاہور	—	افسانہ
ن قادر	۳، ٹیمپل روڈ۔ لاہور	صحافت	شاعری
نہ قمر	یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور	—	افسانہ
باقر رضوی	اسلامیہ کالج سول لائنز کراچی	تدریس	شاعری۔ نثر
د رضوی	انفارمیشن آفیسر پبلیکیشن ڈیپارٹمنٹ۔ لاہور	ملازمت	" تنقید
ر شیخ	معرفت پروفیسر قیوم نظر گورنمنٹ کالج۔ لاہور	"	تنقید

سید وقار عظیم	یونیورسٹی اورینٹل کالج۔ لاہور	تدریس	تنقید
قہرت بخاری	۲۲۔ شیش محل روڈ۔ لاہور	ملازمت	شاعری
فیروز محمد اختر	۵۸۔ ٹیمپل روڈ۔ لاہور	صحافت	افسانہ
صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	۴۰۔ دیو سماج روڈ۔ لاہور	تدریس	شاعری
نذیر کاشمیری	۹۔ بیڈن روڈ۔ لاہور	فلم	" ڈرامہ۔ تنقید
عارف عبدالمتین	چشتیہ ہائی اسکول کرشن نگر۔ لاہور	تدریس	"
عبادت بریلوی	یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	تدریس	تنقید
عبدالرحمن صدیقی	۷۔ لارنس روڈ۔ لاہور	ملازمت	افسانہ
عبدالمجید بھٹی	۶۵۔ ریلوے روڈ۔ لاہور	ـ	شاعری
ڈاکٹر فقیر محمد فقیر	ماہنامہ "پنجابی" چوک میراں۔ انارکلی لاہور	صحافت	ادب
قتیل شفائی	رحیم روڈ۔ مصری شاہ لاہور	ادب	شاعری
قیوم نظر	گورنمنٹ کالج لاہور	تدریس	" ڈرامہ
محمد خلیل الرحمٰن	۴۰۔ ڈنگا شا بلڈنگ نسبت روڈ۔ لاہور	ملازمت	"
محمد صفدر	گورنمنٹ کالج	تدریس	شاعری، نثر
منیر نیازی	۳۔ جی۔ چوبرجی کوارٹرز لاہور	فلم	"
میرزا ادیب	ادب لطیف لاہور	صحافت	ڈرامہ۔ افسانہ
ناصر کاظمی	نیو بلڈنگ روڈ کرشن نگر لاہور	ملازمت	شاعری
ہاجرہ مسرور	۳۲۔ جیل روڈ۔ لاہور	ـ	افسانہ

منٹگمری

انور شبنم دل	گورنمنٹ کالج۔ منٹگمری	تدریس	نثر

میر پور خاص

سلیم جعفر (مرحوم)	سانگھڑ روڈ۔ ڈھولن آباد میر پور خاص	پنشنر	نثر۔ مضمون نگاری

نواب شاہ

سید رشید احمد	موتی بازار۔ نواب شاہ	وکالت	شاعری

(مندرجہ بالا فہرستیں حروف تہجی کے مطابق ہیں)

کنونشن کی کاروائی ۱۹۵۹ء

۲۹ـ ۳۰ـ ۳۱ جنوری

پہلی نشست
(صرف مندوبین)
۲۹ جنوری: صبح

۲۱۲ . مندوبین کے جی اے ہال کراچی میں جمع ہوئے پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی نے افتتاحیہ تقریر کی اور جسیم الدین سے صدارت کی درخواست کی ۔ شاہد احمد دہلوی نے خطبہ استقبالیہ پڑھا اور کنوینروں کی جماعت ختم کردینے کا اعلان کرکے کارروائی مندوبین کی صوابدید پر چھوڑ دی

مندوبین نے حفیظ جالندھری کی تحریک پر جسیم الدین عالی کو اسٹیج سیکرٹری نامزد کیا اور طے کیا کہ کارروائی پیش کردہ ایجنڈا کے مطابق (چند تبدیلیوں کے ساتھ) ہوگی ۔ جسیم الدین خطبہ صدارت پڑھا

دوسری نشست
(صرف مندوبین)
۲۹ جنوری: سہ پہر

حامد علی خاں صدر جلسہ منتخب ہوئے ۔ مندوبین نے اسٹیئرنگ کمیٹی کی تشکیل پر بحث کی اور پھر ۵۶ ادیبوں پر مشتمل ایک کمیٹی منتخب ہوئی ۔ سات کمیٹیاں نونو ادیبوں پر مشتمل انتخاب کی گئیں انہیں ۲۸۹ ، قرار دادیں دیدی گئیں جو اطراف ملک سے موصول ہوئی تھیں ان کمیٹیوں کی کنوینر بیگم ارخواتین تھیں کمیٹیوں نے فوراً کام شروع کر دیا ۔

تیسری نشست

کمیٹیوں کی کاروائی تا شب ۔

۳۰ جنوری

بیگم یوسف جمال حسین صدر منتخب ہوئیں ۔

۳۱ جنوری

اسٹرنگ کمیٹی کا اجلاس ۔ اسکے سامنے منظور شدہ مسودات تجاویز پیش ہوئے بحث ہوئی اور ترمیمات کی گئیں چند ذیلی کمیٹیوں کا کام جاری رہا ۔

دوسری نشست
دوپہر
(صرف مندوبین)

بیگم یوسف جمال حسین صدر منتخب ہوئیں ۔

گلڈ کے دستور کا مسودہ اجلاس عام کے سامنے پیش ہوا جس پر بحث ہوئی سہ پہر تک تمام قرار دادیں منظور ہوگئیں ۔

ساڑھے تین بجے عبوری انتخابات کئے گئے ۔

تیسری نشست
(جلسۂ عام)
۴ بجے سہ پہر

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے صدارت کی ۔

گلڈ کا منشور پڑھا گیا ۔

کنونشن ختم ہونے کے اعلان کے ساتھ سکرٹری نے گلڈ کے سکریٹری جنرل کو چارج دیا ۔

پانچ ادبی مقالات پڑھے گئے ۔

سکریٹری جنرل نے تقریر کی ۔

مندوبین نے صدر مملکت سے تقریر کی درخواست کی اور انہوں نے تقریر فرماتے ہوئے گلڈ کو دس ہزار روپیہ کا ذاتی عطیہ دیا ۔

چوتھی نشست
(مندوبین و مہمان)

ثقافتی پروگرام

محمد خیر مرزا احمد سعید

افتتاحی تقریر

خواتین و حضرات !

میں اس کا ممنون ہوں کہ اس تاریخی اجتماع کے افتتاح کی عزت مجھے بخشی گئی بہت سے ملکوں میں ادبی جماعتیں تو ہمیشہ سے کام کرتی آئی ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ملک بھر کے مختلف الخیال ادیبوں نے اپنے مفادات کے متعلق یک جہتی سے سوچا ہو۔ یورپ اور امریکہ میں چند ایسی انجمنیں کامیابی سے کام کر رہی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ اپنے لئے ایک مضبوط اور فعال ادارہ قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوں۔ ایسا ادارہ ہماری بہت بڑی ضرورت ہے۔ اس موقع پر مجھے آپ سے صرف اتنی گزارش کرنی ہے کہ آپ اس کنونشن کی کارروائیوں میں ذاتیات سے بلند ہو کر صرف اصولی اور اجتماعی مسائل پر سوچیں تو نتائج خوشگوار نکلیں گے اور اگر آپ نزاعی اور ذاتی معاملات میں پھنس گئے تو شاید کامیابی مشکل ہو۔ آپ لوگ اس وقت ایک نہایت اہم تاریخی موڑ پر جمع ہیں۔ اس اجتماع کے کارکنوں نے یقیناً بے مثال محنت اور خلوص سے کام کیا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ انھوں نے کس طرح ملک کے دور دراز گوشوں سے اتنے مختلف الخیال ادیب کھینچ بلائے یہ انتہائی مسرت کا مقام ہے اور اس کے لئے ان کے ساتھ ساتھ آپ سب مندوبین بھی ان کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

میں نہایت فخر و انبساط سے اس تاریخی کنونشن کا افتتاح کر رہا ہوں میری دعا ہے کہ یہ اجتماع مکمل طور پر کامیاب ہو۔

پہلی نشست ۲۹ جنوری سنہ ۱۹۵۹ء

خُطبۂ استقبالیہ

شاہد احمد دہلوی

جناب صدر معزز خواتین و حضرات!

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

میں اس کنونشن کی مجلسِ عمل کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں مندوبین کا شکریہ ادا کرنا واجب نہیں سمجھتا کیونکہ جس کام کے لئے وہ زحمت فرما کر یہاں جمع ہوئے ہیں وہ ان کا اپنا کام ہے۔ البتہ میں اس امر پر اظہارِ مسرت کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان سب نے مجلسِ عمل کی آواز پر لبیک کہا اور مکمل تعاون کا ثبوت دیا۔

پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ قومی پیمانہ پر ادیبوں کا اتنا بڑا اجتماع ہوا ہو آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ اس اجتماع میں ہر مکتبِ خیال اور ہر پیشہ کے ادیب موجود ہیں۔ یہ واقعی ایک تاریخی اور عظیم اجتماع ہے۔

اس وقت میرا مقصد کوئی ادبی قسم کا خطبہ پیش کرنا نہیں ہے ادبی موضوعات پر مقالے ہماری آخری نشست میں پڑھے جائیں گے جو اعلیٰ مقالات کے ذاتی خیالات ہوں گے۔ میری حیثیت میزبان اور میرے موجودہ فرائض کی ذمہ داریاں اس کی متقاضی بھی نہیں تھیں۔ کنونشن کے انتظام میں جو دشواریاں تھیں میں ان کی تفصیل بتا کر بھی آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ ہاں اتنا عرض کر دوں کہ نو آدمیوں کی ایک مختصر سی تنظیم سے جس کے پاس دفتر ہو نہ ملازمین نہ روپیہ ہو اور نہ فرصت اور جس کے سب رکن دن بھر فکرِ معاش میں مبتلا رہتے ہوں اتنے بڑے کام کی تکمیل کی امید نہیں کی جا سکتی تھی مگر جب نیت ثابت ہوتی ہے تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔ اس شہر سے چند مخلص ادیب اٹھے اور انھوں نے سر جوڑ کر پاکستانی ادب اور ادیبوں کی بہتری کے لئے ایک تجویز سوچی ان کی ہمت اور اللہ کی مدد ۔۔۔ وہ تجویز اس بڑے اجتماع میں تبدیل ہو گئی۔

خواتین و حضرات!

۲۸ دسمبر ۱۹۵۸ء کو کراچی کے آٹھ ادیبوں نے ایک اعلان نامہ جاری کیا جس میں اس کنونشن کی تجویز پیش کی۔ یہ ادیب کسی ایک مجلس کے رکن نہیں تھے بلکہ کسی ایک شہر کے رہنے والے بھی نہیں تھے۔ اس اعلان نامے کے بعد انھوں نے اپنے حلقۂ عمل کو وسیع کیا اور مجھے اپنے ساتھ کام کی دعوت دی میری دلی آرزو بھی یہی تھی۔ اس لئے باوجود خرابیٔ صحت کے میں ان کے ساتھ ہو گیا اس کے بعد انھوں نے ہر مکتبِ فکر کے کارکن ملائے اور یہ سب ان کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہم سب ایک جگہ جمع ہیں۔

کنونشن کے بارے میں جو پہلا اعلان ہوا تھا اسے ملک بھر میں انفرادی اور جماعتی طور پر پسند کیا گیا پریس نے بھی اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور بہت سے اخباروں نے تفصیلی اور تعمیری اداریئے بھی لکھے لیکن اس اعلان سے چند در چند غلط فہمیاں بھی پھیلیں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی خلوص کو اکثر شک کی نظر سے بھی دیکھا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ کام حکومت کے اشارے پر کیا جا رہا ہے یہ گمان انھیں یوں ہوا کہ اس اعلان پر جن ادیبوں کے دستخط تھے ان میں سرکاری ملازم بھی شامل تھے۔ یہ بھی سمجھا گیا کہ اس کام کے لئے حکومت نے خفیہ طور پر روپیہ دیا ہے ورنہ پاکستان کے ادیبوں میں یہ بات کہاں کہ اتنے بڑے کام کا بیڑا اٹھائیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ لوگ ذاتی مفاد اور ادبی مقاصد حاصل کرنے کے لئے یہ کنونشن کر رہے ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے شبہات خود غرضی اور اضطراری کیفیت کا نتیجہ تھے۔ لیکن ان سے مجھے اور میرے رفقائے کار کو بے حد اذیت ہوتی رہی کیونکہ میں پچھلے پینتیس چالیس سال سے ادب کی بری بھلی خدمت کرتا رہا ہوں اور مجلسِ عمل کے اراکین بھی اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ ادبی حیثیت اور ذاتی کردار رکھتے ہیں، ان میں جو سرکاری ملازم ہیں، اس بات پر کڑھتے تھے کہ آخر ان کا سرکاری ملازم ہونا کون سا جرم ہے آخر وہ پہلے بھی تو سرکاری ملازم تھے، اس لئے جب ہم ان ہی سے برابر اس قسم کی باتیں سنتے رہے تو ہماری بہت دل شکنی ہوتی رہی اور ہم سوچنے لگے تھے کہ شاید ہم نے یہ ساری بات

شروع کی ہے ہم میں آپس میں بھی اکثر اختلافات پیدا ہو جاتے تھے، اور اندیشہ ہونے لگا تھا کہ ہماری تجویز دم توڑ دے گی مگر نیت کی صداقت اور کام
لگن نے اس نوبت کو نہیں آنے دیا۔

قیام پاکستان کو ساڑھے گیارہ سال ہوئے قومی زندگی کے ہر شعبہ کی طرح ادب اور ادیبوں میں بھی افراتفری کا دور رہا۔ سیاست دانوں
اہل اقتدار نے اول تو ہماری طرف اور ہماری افراتفری گذارشات کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ اور اگر کی بھی تو یہ کی کہ کچھ ادیبوں پر کوئی نہ کوئی الزام لگا
انھیں قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر دیا جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کو فیشن کے طور پر اختیار کرنے والے چند افسروں کے ہاتھوں میں پورے ملک کی
تحریکوں اور تہذیبی اور ثقافتی اداروں کی اجارہ داری آگئی سرپرستی کی تو یہ کہ چند شعراء اور ادباء کو ذاتی وظیفوں سے نواز دیا، ہمیں ان وظائف اور
افسروں کی ان بالادستیوں پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پچھلی حکومتوں نے اتنا بھی کیا تو بہت کیا۔ مگر ہم اپنی اپنی شکایات میں حق بجانب ہیں
انھوں نے اتنے بڑے ملک کے اس سرمایہ کو جسے ادب کہتے ہیں اور ترقی دینے کی مطلق کوشش نہیں کی شاید وہ ادیبوں کو بدقماش، بے کار، اور
ذہنیوں کی ایک تفریحی جماعت اور کبھی کبھار ریڈیو پر مشاعرہ اور ایک آدھ تقریر کرا دینا یا ایک آدھ سرکاری رسالے کے اجراء کو پورے ملک کی
تہذیبی اور ثقافتی مطالبات کا جواز سمجھتے رہے انھوں نے مصوری، رقص اور موسیقی پر تو کبھی کبھار توجہ دی بھی کیونکہ ایسی نمائشوں اور محفلوں میں انھیں
مزا بھی آجاتا تھا، اور ان کی ذہنی پس ماندگی کا پول بھی نہیں کھل پاتا تھا مگر ادب اور ادیب کی بنیادی حیثیت سے وہ کبھی آگاہ
نہیں ہو سکے۔ اس غلط اندیشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو تازگی جوش اور عمل ہمارے ادیبوں میں سنہ ۱۹۴۷ء میں تھا وہ سنہ ۱۹۵۸ء تک
معدوم ہو گیا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ حکومتیں اچھا ادب پیدا کر سکتی ہیں۔ جی نہیں ہرگز نہیں، ادب تو اچھے ادیب ہی پیدا کرتے ہیں اور اپنی مرضی سے پیدا کرتے ہیں
پر پابندی لگائی جائے یا ہدایات کا پابند کیا جائے تو وہ لکھنا بند کر دیتے ہیں لیکن حکومتیں ملک میں اچھے اور بڑے ادیب پیدا کرنے کے حالات
ضرور پیدا کر سکتی ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ نئی حکومت ہمارے لئے نئی امیدیں لے کر آئی ہے۔ اب وہ کہاں تک اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوتی ہے
اس کا جواب وقت دے گا یہ ضرور ہے کہ اس حکومت کے تعمیری پروگرام کو دیکھتے ہوئے ہمیں بھی اس کوشش کا خیال پیدا ہوا اور ہمیں یقین ہے کہ یہ
حکومت ادب اور ادیبوں کے معاملے میں ہمدردی اور روشن خیالی کا ثبوت دے گی لیکن اس کے علاوہ حکومت سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ اور
ہمارے ملازم کارکنوں نے جو بھی کام کیا ہے وہ اپنی ذاتی حیثیت میں کیا ہے، ویسے ہم حکومت سے امداد لینا جرم نہیں سمجھتے۔ حکومت ہمارے ہی محاصل کی
ممنون ہے، اور ہمارے اپنے ملک کے شہریوں پر مشتمل ہے لیکن ہم نے اس اجتماع کے لئے ہر قسم کے معاملات میں آزاد اور خود کفیل رہنے کی کوشش کی ہے
ہم آدمی کوئی منظور شدہ جماعت بھی نہیں تھے، جو دفتروں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہم نے ریلوے کے محکمے سے مندوبین کے لئے اس رعایت کی درخواست
کی جو وہ صحافیوں اور طالب علموں کو دیتا ہے مگر پہلی بار ہماری درخواست رد کر دی گئی اور جب ہم نے مالی مجبوریوں سے متاثر ہو کر وہاں کے اعلیٰ افسروں
کو کنونشن کی اہمیت جتائی تو انھوں نے اتنی رعایت منظور فرمائی، کہ نچلے درجے کے ٹکٹ پر اس سے اونچے درجہ میں سفر کیا جا سکتا ہے یہ حکم بھی اتنی دیر
سے جاری ہوا کہ ہم اب تک اپنے کئی مندوبین کے بارے میں پریشان ہیں کہ انھیں اس رعایت کا فائدہ حاصل ہو سکا یا نہیں۔

ہم نے PIA سے بھی درخواست کی تھی اور ان کے پاس اپنے نمائندے بھی یہ عرض کرنے بھیجے کہ وہ مشرقی پاکستان کے مندوبین کے لئے کرایہ میں کمی کریں
وہاں سے صاف انکار ہو گیا حالانکہ یہ ادارہ بڑے افسروں اور امراء کو لندن کی سیر بارہا کرا چکا ہے۔

ساقی یہ تیری کم نگہی یاد رہے گی

مرکزی حکومتی اداروں سے ان دو درخواستوں کے علاوہ ہم نے نہ کوئی اور درخواست کی اور نہ ادھر سے کوئی پیشکش قبول ہوئی ہاں
۲۳/۲۴ جنوری کو جب ہمارے مشرقی پاکستان کے مندوبین کی تعداد بڑھ گئی اور ان کے مالی مسائل جواب دے گئے تو ایسٹ ویسٹ پاکستان

یونٹ فنڈ سے کچھ روپیہ صرف مشرقی پاکستان کے مندوبین کے لئے لیا گیا، وہاں کے مندوبین کے کرایہ کا انتظام ان ہی کی کوشش اور ان ہی کے روپیہ سے ہوا ہے۔

لاہور کے مندوبین کو کرایہ وہیں کے ایک مخیر علم دوست نے دیا ہے۔ یہاں ان کے قیام کا انتظام چند دیگر مقامات سے آنے والے مندوبین کے کرایہ اور ان کے قیام کا انتظام اور کراچی کے اخراجات کراچی کے چند علم دوست حضرات نے کیا ہے، وہ سب عطیات جو اس سلسلہ میں وصول ہوئے ان کی فہرست اس خطبے کے آخر میں دے دی گئی ہے ہم نے کوئی مہم چندے کی نہیں چلائی بلکہ رضاکارانہ امداد پر اکتفا کیا جو ان علم دوستوں نے ہمارے مقاصد دیکھتے ہوئے خود پیش کی، یہ سب اپنے ناموں کا اعلان نہیں چاہتے مگر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کے نام پردۂ خفا میں نہ رکھے جائیں۔

اچھا اب خوگر جور سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لیجئے ہم نے کوشش کی ہے۔ کہ یہ کنونشن پاکستانی ادیبوں کا ایک نمائندہ اجتماع ہو، اس لئے دعوت نامے جاری کرنے میں اس بات کا بہت خیال رکھا گیا ہے کہ کسی آبگینہ کو ٹھیس نہ لگنے پائے عددی حساب سے پاکستانی ادیبوں کی تعداد ہزاروں بلکہ لاکھوں پر ہے ظاہر ہے کہ ہم سب کو نہیں بلا سکتے تھے لہذا ایک خاصی تعداد کو شکوہ ہے کہ ہم نے انھیں نظر انداز کر دیا ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ اگرچہ وہ یہاں نہیں ہیں لیکن وہ ہمارے دل سے بہت قریب ہیں، اور اگر مالی وسائل اجازت دیتے تو یہ اجتماع شاید دوگنا ہوتا انھیں یقین کرنا چاہئے کہ کنونشن میں جو قرارداد یں منظور ہوں گی وہ تمام ادیبوں کی ترجمانی کریں گی اور کنونشن سے فائدہ پہنچے گا تو سبھی کو پہنچے گا، یہ بات ہمارے جتانے کی نہیں بلکہ خود ادیبوں کے سمجھنے کی تھی یہاں تو کوشش ہوئی کہ اجتماعی طور پر سوچ بچار کیا جائے مگر ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے معاملات کو ذاتی سطح پر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسی شہر کراچی میں چند اہل قلم نے ہمارے دعوت ناموں اور تحریری یاددہانیوں کو شاید اس لئے قابل جواب بھی نہیں سمجھا کہ سرکاری یا سماجی طور پر ان کی حیثیت عام مندوبین سے بہتر ہے، افسوس کہ ہماری برادری کے بعض غلط اندیش افراد نے ہم پر بہتان باندھے اور بعض نے دھمکیاں تک دے ڈالیں، ایک اچھے خاصے ادیب نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ مصر ادیبوں کو کنونشن میں کیوں بلایا گیا ہے، دریافت فرماتے ہیں کہ بھیڑوں میں اونٹ کیوں بلائے جاتے ہیں۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

چند حضرات کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ ادب کی باگ ڈور نوجوانوں کے ہاتھ میں دی جا رہی ہے کچھ لوگوں نے بڑے بڑے کرائے اور اخراجات مانگے کچھ نے اس کنونشن کو مشاعرہ سمجھ کر مول تول شروع کر دیا کچھ کو یہ اعتراض رہا کہ یہ کام نو آدمیوں نے کیوں شروع کیا اور گھر گھر پھر کر ہر شہر میں دستخطوں کی مہم کیوں نہیں چلائی۔

یہ چند مثالیں اس لئے پیش کی گئیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ ہماری برادری میں اس ذہنیت کے لوگ بھی موجود ہیں۔ اس ذہنیت کو بدلنے کی ضرورت ہے باہمی اختلافات کو مٹانے کی ضرورت ہے، ادب ایثار چاہتا ہے ادب رواداری چاہتا ہے۔ خشونت و منافقت کا شکار سب کچھ ہو سکتا ہے، ادیب نہیں ہو سکتا ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اگر اس اندھیرے میں کچھ درخشاں کرنیں نہ ہوتیں تو شاید یہ اجتماع ہی نہ ہونے پاتا شکر ہے کہ دور دراز سے آنے والے اپنے انتظامات سے بھی آئے ہیں پھر بہتوں نے ہمیں حوصلہ افزا خطوط لکھے ہمیں مکمل تعاون کا یقین دلایا اور جہاں تک ہو سکا ہمارے لئے اپنے اپنے شہروں میں کام بھی کیا اس طرح کراچی کے چند طالب علم رضاکاروں نے جس جانفشانی سے کام کیا ہے اور کر رہے ہیں وہ ہمارے لئے بڑے

...ڑی بات ہے ان رضاکاروں کی بدولت ہمیں اپنے مجوزہ دفتر کے لئے کوئی تنخواہ دار کارکن نہیں رکھنا پڑا۔

خواتین و حضرات !

ہمارا کام آپ سب کو ایک جگہ جمع کرنا تھا بحمداللہ آپ سب یکجا ہو گئے۔ آپ کے سامنے مجوزہ طریقہ کار ہے اور پروگرام کی تفصیل و خاکہ
...موجود ہے آپ چاہیں تو پروگرام کو قبول کرلیں آپ چاہیں تو اس میں مناسب تبدیلی کرلیں یا اسے بالکل ہی ساقط کردیں اور نیا پروگرام بنالیں
...پ چاہیں تو اس اجتماع ہی کو ختم کردیں ہمارا پہلا اور آخری مقصد تو یہ تھا کہ آپ سب ایک بار جمع ہو جائیں تاکہ ہم ادب کے لئے اپنے لئے
...ور اپنے ملک کے لئے مضبوط اور ٹھوس تجاویز پر عمل کریں اور ہماری درخواست ہے کہ اس اجتماع میں نزاعی ادبی مسائل زیر بحث نہ لائے
...جائیں یہ اجتماع عددی حساب سے اتنا بڑا ہے کہ انفرادی قرار دادیں پیش کرنے یا ان پر انفرادی تقریروں اور مباحثوں کی گنجائش نہیں اس
...لئے ہم نے موصول شدہ قرار دادیں موضوعات پر تقسیم کردیں جو آپ کے منتخب کردہ نمائندہ سنبھالیں گے۔ قرار دادیں پیش کرنے والی مختلف
...کمیٹیوں سے اپنے طور پر رجوع کرسکتے ہیں کیونکہ اگلے اجلاس میں سکریٹری صاحب خود اعلان کردیں گے کہ کن صاحب کی قرارداد کس کمیٹی کے پاس
...گئی ہے۔ کمیٹیوں کی سفارشات آپ کے سامنے اجلاس میں پیش ہوں گی۔

ہمارے پاس صرف تین دن ہیں اور کام بہت ہے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں کتنے "نظم و ضبط" اور کتنی محنت کی ضرورت ہے، یہ
...بات میرے کہنے کی نہیں ہے مگر یاد رکھئے کہ یہ ہماری تاریخ میں پہلا اور قیمتی موقع ہے۔ اس میں بہت روپیہ خرچ ہوا ہے اور بہت سے کارکنوں
...نے بڑی قربانیاں کی ہیں یہ بھی نہ بھولئے کہ اس وقت نہ جانے کس کس کی آنکھیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں اور وقت ہم سے کیا تقاضے کررہا ہے
...اگر ہم ادبی مباحثوں میں الجھ گئے یا ذاتی بنیادوں پر سوچنے لگے تو وقت بڑے افادی نتائج کے بغیر گزر جائے گا، اور ہمیں امید نہیں کہ کوئی ادارہ یا فرد اس
...کنونشن کے ناکام ہوجانے کے بعد مستقبل قریب میں اتنے بڑے کام کو دوبارہ شروع کرنے کی ذمہ داری لے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہمارا یہ اجتماع ایک
...منظم مجلس کی شکل میں بدل جائے تو حکومت مدد کرے یا نہ کرے، ہم اسے ایک خود کفیل ادارہ بنا سکتے ہیں۔

خواتین و حضرات !

مجلس عمل کے اراکین نے طے کرلیا ہے، کہ اس خطبے کے بعد ہم اپنی جماعتی حیثیت کو ختم کردیں گے، اور عام مندوبین کی حیثیت اختیار
...کرلیں گے اور ان کے جماعتی فرائض صرف اس کنونشن کے انتظامات تک محدود رہیں گے۔ مثلاً مہمانوں کے انتظامات اور اجلاس کی کارروائی۔
...اب اس پورے اجتماع کو جاری رکھنے کی ذمہ داری آپ کی ہے اور آپ سب اپنے قانونی اور ادبی فرائض سے واقف ہیں ہم نے دائمی
...بن کر جو زحمت اٹھائی ہے، وہ اب ختم ہوجانی چاہئے۔

چنانچہ اب ہم دسمبر کے اعلان پر دستخط کرنے والے آٹھ افراد اور ہم اپنی جماعتی حیثیت ختم کرنے کا اعلان کرتے ہیں اب یہ پہلا اجتماع اس
...دستہ مرحومہ کا جانشین ہے اس لمحے کے بعد آپ کیا کرتے ہیں اور تاریخ آپ کو کس طرح یاد کرتی ہے، یہ سب آپ کی ذمہ داری ہے۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

مورخہ ۲۹ر جنوری ۱۹۵۹ء

عطیات

بنگالی اکیڈمی	مشرقی پاکستان کے مندوبین کا کرایہ تقریباً اٹھارہ ہزار
ایسٹ اینڈ ویسٹ یونٹی فنڈ	صرف برائے اخراجات مندوبین مشرقی پاکستان دس ہزار
جناب نصیر اے شیخ کالونی ٹیکسٹائل ملز	کرایہ مندوبین لاہور ۔ ۵ ہزار
میسرز محمد امین محمد بشیر لمیٹڈ کراچی	ساڑھے سات ہزار
میسرز داؤد کاٹن ملز کراچی	ساڑھے سات ہزار
اقبال نعیم پاشا	ایک ہزار (برائے ابتدائی اخراجات)
ہوٹل ایکسلسیئر	کمرہ نمبر ۲ برائے دفتر کنونیشن
مجلس عمل کا چندہ	بیس روپیہ فی کس ۔/۔/۱۸۰

پہلی نشست ۲۹ جنوری ۱۹۵۹ء

خطبۂ صدارت

جسیم الدین

معزز خواتین و حضرات

ادیبوں کے اس جلسے کی صدارت کی عزت بخشے جانے پر میں اپنے کو بڑی الجھنوں میں مبتلا پاتا ہوں۔ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں مجھ سے کہیں زیادہ جہاندیدہ سال قابل اور ممتاز شخصیتیں موجود ہیں۔ ایسی شخصیتیں جنہوں نے زندگی بھر ادب کی خدمت انجام دی ہے اور اپنے ہم وطنوں کے لئے محنت سے آب حیات مہیا کیا ہے۔ اگر ان ہی میں سے کسی صاحب نے مسند صدارت کو رونق بخشی ہوتی تو یہ فرض بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ انجام پاتا۔ ان کی خدمات کی قدر دانی بھی ہو جاتی اور آپ حضرات بھی ایک خاص قسم کی خوشی اور فخر محسوس کرتے۔ مجھے اب اپنی نااہلی اور کمزوریوں کا شدید احساس ہو رہا ہے اور یہ احساس مجھے نڈھال کئے دیتا ہے۔ مجھے اپنے چاروں طرف ادب کے پھولوں کا جو چمن دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے رنگ و بو سے ساری فضا مہکتی اور دلکش دکھائی دے رہی ہے۔

اس وقت مجھے مشرقی پاکستان کے دریائے پدما۔ جمنا۔ میگھنا۔ دھلے شوری۔ مدھومتی۔ کمار۔ سیتا لکھا کے خوشگوار تموج سے تخلیق شدہ بھٹیالی گیتوں کے ساتھ ساتھ جہلم۔ بیاس اور سندھ کے کنارے بسنے والے کاشت کاروں کی جھونپڑیوں سے اٹھتے ہوئے گیتوں کی گنگناہٹوں کا ایک حسین امتزاج نظر آ رہا

اس دیس کی دوشیزاؤں کے نرم و نازک گلے سے چکی پیستے وقت جو سریلے نغموں کا آبشار پھوٹ بہتا ہے وہ دور دراز مشرقی پاکستان کی ادکیلوں کے ترنم کے ساتھ ہم آغوش ہو کر جامدانی آنچلوں کا روپ دھار رہا ہے۔ اور آج اس جگہ کیسے کیسے چابک دست باغبانوں کا اجتماع ہے۔ ایرانی بلبل ہزار داستان کے نغموں کے موقلم اور گلاب کے خون جگر کے رنگ سے کتنی حسین و جمیل تصویریں بناتے رہتے ہیں۔ کشمیری شالوں کے رنگ برنگ شامیانوں کے سائے میں تربوز کی قاشوں کے رنگ میں جو غزلیں ڈھلتی ہیں ان کی شیریں لہریں دور مشرقی پاکستان سے جا جا کر ٹکرا رہی ہیں ہم مشرقی پاکستان کے گل بوٹے سے مزین سوزن کاری کے شاہکاروں پر دور دور تک پھیلے ہوئے دھان کے کھیتوں کی ہریالی کا تحفہ لے کر آئے ہیں۔ آم اور کٹھل کے گھنیرے سایوں میں کسانوں کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں پروان چڑھنے والی سادہ اور بے لوث محبت اور سرسوں کے کھیتوں میں ارغوانی سرخ کے پھولوں سے بھی بھلی رنگین کہانیوں کا روپ مالا لائے ہیں۔ سندھ۔ پنجاب۔ بلوچستان اور سرحد کے خرمہ۔ اخروٹ۔ بادام۔ کھجور و انار کے درختوں کے سایہ میں آپ حضرات جو خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ ہماری کہانیوں کے ساتھ مل ملا کر ایک نئی دوستی کا رشتہ استوار کر رہے ہیں۔ اگر میں اس دوستی کے سنگم کا باعث ہو سکا تو یہ بات میرے لئے بڑے فخر کی ہوگی۔ آج پاکستان کو وجود میں آئے بارہ سال ہو چکے ہیں۔ وطن کے سیاسی اور اقتصادی بہت سے مسائل پر بحث و مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ وطن کے دونوں بازوؤں سے سیاسی اور صحافتی اور تعلیمی جماعتوں نے مختلف ممالک کے سفر اختیار کئے۔ مگر بدنصیب ادیبوں کی خاطر کسی کو بھی سوچنے کی . . . . توفیق نہیں ہوئی۔ ملک کے لکھنے والوں کے متحدہ اجتماع کے متعلق کسی نے کچھ سوچا ہی نہ تھا۔ آپ میں سے جن حضرات نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس اجتماع کی کوشش فرمائی ہے۔ ان کی خدمت میں، میں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ اس عظیم اجتماع میں ادیبوں کے مسائل سمجھنے کا جو موقع آپ نے فراہم کیا ہے اس سلسلے میں آپ کی کوششوں کو سراہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

قیام پاکستان کے بعد ملک کا صرف ایک طبقہ ہی بلندیوں پر گامزن ہونے لگا ملازمت کا میدان ہو، صنعتی ادارے ہوں یا تجارت سب ہی پر اسی ایک طبقہ کے لوگوں نے قبضہ جما لیا مگر ایک اور طبقہ تھا جو کہ رفتہ رفتہ تحت الثریٰ میں دھنستا چلا گیا اور یہ طبقہ ذہین کام کرنے والوں کا تھا۔ ہم لکھنے والے اسی طبقے سے متعلق ہیں اور ہم ہی داستان بیان کریں گے کہ ہم کس طرح نیچے گرتے چلے گئے۔ آئیے آج آپ مشرقی پاکستان کے ادب کی صادق تشنگی بات سنئے۔

صورت حال کچھ مختلف ہی کیوں نہ ہو مجھے یقین ہے کہ مغربی پاکستان کے ادیبوں کی بھی ان ہی جیسی درگت ہوئی ہوگی۔ آزادی سے قبل کے زمانے میں ہم کو اپنی تخلیقات کی طباعت و اشاعت کے لیے جدید ترین مواقع میسر تھے۔ لیکن آزادی کے بعد مشرقی پاکستان کی راجدھانی ڈھاکہ میں ہم ان تمام ذریعوں سے محروم ہو گئے۔ آزادی سے قبل مشرقی پاکستان میں گنتی کے چند ہی اسلامی کتابوں کے ادارے موجود تھے اور انہوں نے سرمایہ دار ناشروں کے ساتھ مقابلہ کر کے کسی نہ کسی طرح اپنی ہستیاں برقرار رکھی تھیں۔ اس زمانہ میں ہندوؤں کے اثر سے متاثر تعلیمی اداروں میں ان کی شائع کی ہوئی کتابیں شاذ ہی پڑھائی جاتیں لیکن آزادی کے فوراً بعد جب ہندو ہمارے تعلیمی اداروں کو خیرباد کہہ کر سرحد پار چلے گئے جب کتابوں کی تجارت کی اجارہ داری مسلمان ناشروں کے ہاتھ میں آئی تو وہ راتوں رات بیٹھے بٹھائے آدمی بن جانے کے خواب دیکھنے لگے اور حکومت سے کتابوں کی اشاعت کے نام پر کاغذ کے پرمٹ حاصل کر کے چور بازار میں فروخت کرنے لگے۔ نظموں، ڈراموں ناول وغیرہ جیسی غیر درسی کتابیں جو اسکول میں نہیں پڑھائی جاتیں چھاپنی بند کر دیں۔ اور جو ادیب مصنف پانی کے مول اپنی کتابوں کے حق طباعت دینے پر آمادہ ہو جاتے صرف ان ہی کی دو چار کتابوں کو نہایت بھدے انداز میں چھاپ کر ناشر حضرات گویا ان پر احسان فرماتے۔ کتابوں کی طباعت، اشاعت، کتابت، جلد گردپوش غرض ہر چیز نہایت گھٹیا ہوتی اس لئے لازمی طور پر بڑھیا کے لئے ان میں کوئی کشش اور دلچسپی نہیں ہوتی غرض ہم ناشروں کے ہاتھوں کا کھلونا بنے رہے اور اب تک بنے ہوئے ہیں۔

ڈھاکہ پہنچ کر میں نے ناشروں سے اپنی کتاب نقش کا نگار ماٹھ (Quilt field of The Embroidered) کی بات چیت شروع کی۔ ایک ناشر صاحب نے مستقل ۳ مہینے تک مجھے دوڑایا۔ آخر ایک دن انہوں نے فرمایا۔

اگر آپ اپنی کتاب کا حق فروخت کر دیں تو میں اسے شائع کر سکتا ہوں میں انہیں تسلیم کر کے چلا آیا اور اس لئے چلا آیا کہ میرے والد صاحب نے مجھے ایم۔ اے۔ پڑھانے میں خاصہ روپیہ صرف کیا تھا اور میں گورنمنٹ میں ملازم تھا۔ اگر میری گذر اوقات صرف کتاب پر منحصر ہوتی تو مجھے ناشر صاحب کی خدمت میں پانی کے مول اپنی کتاب فروخت کرنی پڑتی اور اس طرح مستقبل میں میری اولاد اس کتاب کی آمدنی سے محروم ہو جاتی مظہر الحق مشرقی پاکستان کے ایک ادیب ہیں جنہوں نے تقریباً ایک سو کتابیں لکھی ہیں ان کی بعض بعض کتابوں کے تیس تیس ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں لیکن وہ ایک بھکاری کی زندگی گزار رہے ہیں انہوں نے اپنی کتابوں کا حق بہت ہی سستے داموں میں فروخت کر دیا ہے۔ اس قسم کی مثالیں مشرقی پاکستان میں اور بھی ملیں گی ناشروں کی چیرہ دستیوں کا اب سدباب ہونا چاہئے وہ ادیب جو غربت اور افلاس سے تنگ آ کر اپنی کتابوں کے حقوق کوڑیوں کے مول بیچ دیتے ہیں وہ ان کو واپس ملنا چاہئے۔ اب ہمیں ایک ایسے قانون کی ضرورت ہے جس کی رو سے کوئی بھی ناشر کسی ادیب کی کتاب کا حق خریدنے سے قاصر ہو۔ مجھے امید ہے کہ حکومت اس سلسلے میں جلد از جلد مناسب قدم اٹھائے گی۔ برصغیر ہند و پاکستان کے مشہور افسانہ نگار فضل الحق آزادی کے بعد امیدوں اور تمناؤں سے لبریز دل لے کر ڈھاکہ آیا۔ نوکری اور روزگار کی تلاش میں۔ لیڈروں اور وزیروں کے دفتروں کی خاک چھانتا رہا مگر پیہم فاقہ کشی نے اسے ایک دن ریل گاڑی کے پہیوں کے نیچے خودکشی کرنے پر مجبور کیا۔ ایک گرانقدر زندگی جس کی پوری طرح نکھرنے بھی نہ پائی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کی تاریکی میں کھو گئی۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج اسی کی لکھی ہوئی کہانیوں سے ہمارا وطن اور ہمارا سماج یقیناً فیضیاب ہوتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک ادیب کو غربت سے دوچار رہنا ہی چاہئے غربی میں جذبات کی تربیت ہوتی ہے لیکن زمانہ حال میں یہ مقولہ نہیں چل سکتا۔ غیر ممالک کے ادیبوں کے متعلق مجھے جہاں تک معلوم ہے ان کی آمدنی اچھی خاصی ہے غربت اگر بھی تخلیق کے لئے ضروری ہوتی تو ہر ناسمجھ جہاں [illegible] اور [illegible] جیسے ادیب کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ اس کے برعکس افلاس اور غربت کی وجہ سے بہت سے ہونہار ادیب گھٹ کر ہی رہ جاتے ہیں۔

ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ ناشر صاحب میری کتاب چھاپنے پر رضامند نہیں تھے اور چھاپنے پر بہت ہی دشوار [illegible]

ضروری تھا۔ عام طور پر پڑھنے والوں کے لئے کتاب کو جاذب نظر بنانے میں عمدہ کاغذ نفیس چھپائی اچھے بلاک میکر اور ایک اچھے آرٹسٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔

کرنافلی مل کی وجہ سے کافی کاغذ تو مل جاتا ہے۔ مگر جس کاغذ سے جاذب نظر کتاب تیار ہو سکتی ہے وہ کاغذ نہیں ملتا۔ مزید برآں کرنافلی کاغذ کے دام بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ آزادی کے بعد مطابع کے مالکوں نے چھپائی کی اجرت بھی بڑھادی ہے۔ چھاپہ خانوں کی تعداد محدود ہے مگر چھپائی کا کام زیادہ ہے لہذا اجرت کے لئے مقابلہ نہیں ہے ڈھاکہ میں بلاک کے کارخانے میں من مانے دام وصول کرتے ہیں اور پھر بھی اچھے بلاک تیار نہیں ہو پاتے۔ میرے دوست زین العابدین کے زیر ہدایت نوجوان فنکاروں کی ایک جماعت تیار ہو گئی ہے مگر بلاک کے کارخانوں کی کمیابی ان کی تخلیقات کو بروئے کار لانے میں حائل ہو رہی ہے۔

ان حالات میں ہماری جو کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ وہ دیکھنے میں بھی خراب اور نسبتاً ان کی قیمتیں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ غیر ممالک سے درآمد کی ہوئی دیدہ زیب کتابیں ہماری کتابوں کے مقابلہ میں قیمتاً نصف سے بھی کم پڑتی ہیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ان حسین جاذب نظر کتابوں کے سامنے ہماری کتابیں بھدی اور بدنما ہوتی ہیں۔ ان صورت احوال میں اگر قارئین ہماری کتابوں کو پسند نہ کریں۔ تو انہیں مورد الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بیرونی کتابوں کی درآمد بند کرنے سے مقصد برآری نہیں ہوتی۔ بلکہ ہمیں ان سے صحت مند مقابلہ کرنا چاہئے۔ ہمیں اپنے قارئین کا دل جیتنا چاہئے کیونکہ ان کے لئے غالب اور نذرالاسلام کے کلام میں جو لطف حاصل ہوگا۔ وہ شیلی اور ملٹن میں عنقا ہوگا اگر ایسا ہی ہو سکتا تو ہمارے موجودہ بڑے بڑے سی۔ ایس۔ پی۔ افسران مشاعروں میں رات رات بھر کوئی لطف نہ حاصل کرتے ہمارا ملکی ادب ہمارے تحت الشعور کو ماں کا دودھ پلا کر توانائی بخشتا ہے۔ ہم اپنی کتابوں کو خوبصورت اور دیدہ زیب طریقہ پر پیش کرنا چاہتے ہیں بلکہ ٹھیک اسی طرح جیسے دلہن کو سجا کر سسرال بھیجا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اور بھی زیادہ حسین معلوم ہو۔ لہذا میری یہ تجویز ہے کہ

(۱) کرنافلی پیپر ملز میں اچھے سے اچھے کاغذ تیار کئے جائیں اور وہ بآسانی کم قیمت پر فراہم ہو سکیں۔ کاغذ ہی تو علم کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ہمارے جیسے غیر ترقی یافتہ ملک میں تعلیم ایک زبردست مسئلہ ہے۔ ہم کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ دوسرے ملک کے لوگ چاند پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ کاغذ کی آسانیاں مہیا کر کے تعلیم کو سارے ملک میں پھیلانا ہوگا۔

(۲) چھاپہ خانے تعلیم کا ایک اور ذریعہ ہیں۔ پریس کے مالکوں کو فیاضانہ لائسنس ملنے چاہئیں۔ بعض چھاپہ خانے والے بڑے ہو کر اپنے چھاپہ خانوں کو بھی بڑھانا چاہتے ہیں۔ جب چھاپہ خانوں کی تعداد بڑھے گی تو چھپائی کا مقابلہ ہوگا اور اعلیٰ سے اعلیٰ چھپائی ہونے لگے گی۔ اجرت بھی کم ہو جائے گی۔ ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ جس سے بلاک بنانے والے کارخانے سے آسانی سے سامان حاصل کر سکیں۔ اگر ضرورت ہو تو بلاک بنانے کی قیمتیں مقرر ہو جانی چاہئیں۔ مزید لائسنس دیئے جائیں تاکہ بلاک بنانے کے لئے نئی مشینیں خریدی جا سکیں جب کتاب شائع ہو جائے تو اس کی وسیع پیمانہ پر پبلسٹی کی جائے۔ اور اچھی پبلسٹی اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ پبلشر بھی اچھا ہو۔ غیر درسی کتابوں کے سلسلہ میں ناشر کو انکم ٹیکس کی ادائیگی سے آزاد ہونا چاہئے۔ ناشروں کو زیادہ سے زیادہ مواقع دیئے جائیں تاکہ وہ ادبی فنی اور غیر درسی کتابوں کے چھاپنے میں نئے ذوق و شوق اور ہمت سے کام لیں۔

مشرقی پاکستان میں اچھے معیاری ماہنامہ کا فقدان ہے اور جو دو چار ماہنامے ہیں ان کے خریدار بھی بہت کم ہیں۔ ماہنامے ہی صرف نئے لکھنے والے پیدا کرتے ہیں۔ بلکہ ان میں جو اشتہارات چھپتے ہیں انہیں دیکھ کر وہ کتابوں کے خریدنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ماہناموں کے فقدان کا یہ نتیجہ ہے کہ ناشروں کو کتابوں کے اشتہار بڑی اجرت پر روزناموں میں دینا پڑتے ہیں۔ روزنامے کا اشتہار صرف ایک دن کے لئے ہوتا ہے اگر ہر روز اشتہار دیئے جائیں تو اخراجات زیادہ پڑتے ہیں اس طرح کتابوں سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ماہناموں کی اشاعت کی توسیع کرنے کے انتظامات کرنے ہوں گے۔ ہم اپنے دوستوں سے ماہناموں کے خریدار بننے کی درخواست کر سکتے ہیں حکومت

ایسے ماہنامے زیادہ تعداد میں خرید سکتی ہے اور ان کو مختلف اسکول اور کالجوں میں تقسیم کر سکتی ہے۔

سستا لفافہ، ڈاک کی شرح میں کمی اور دوسری سہولتیں مہیا کر کے حکومت ماہناموں کو دوبارہ زندگی بخش سکتی ہے۔ جو رسالے حکومت کی طرف سے نکلیں ان میں اشتہارات کی شرح ½ اور دوسرے روزناموں میں ½ اور ڈاک کے ذریعے کتابوں کا محصول ½ کے حساب سے کم کر کے حکومت کتابوں کی اشاعت میں کافی مدد دے سکتی ہے۔ ایسا کرنے سے حکومت کا خرچ زیادہ نہ ہوگا کیونکہ ڈاک ریل اور اسٹیمر کے محکمہ میں جو ملازمین ہیں وہی یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ میری ایک اور تجویز ہے اور وہ یہ کہ ادیب اپنی تخلیقوں کے ذریعے جو آمدنی کریں وہ انکم ٹیکس سے آزاد ہو۔

کام یہاں ختم نہیں ہو جاتا سارے ملک میں کتابیں پڑھنے کی تحریک چلانی ہوگی۔ شہروں قصبوں اور دیہاتوں میں کتب خانے کھولنے پڑیں گے اور ملک کے طول و عرض میں کتابوں کی مانگ بڑھانی ہوگی۔ دو چار ادیبوں کو انعام دینے اور مشاہرہ پیش کرنے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ ایک ایسی فضا پیدا کرنی ہوگی جس سے ادیب اپنی تخلیقوں کے ذریعے اپنی روزی کا انتظام کر سکیں۔ گذشتہ جنگ عظیم میں فرانس نے اپنی ۱/۳ آمدنی ادب اور فن کے لئے مخصوص کر دی تھی۔ اس ملک کی میں نے سیر کی ہے اور یہ دیکھا ہے کہ رسالوں کی دوکان کے سامنے خریدنے والوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ فرانس نے جو دنیا کے ادب و فن میں اتنا بیش بہا اضافہ کیا ہے اس میں حکومت کا بڑا ہاتھ ہے۔

حصول پاکستان کے بعد بہت سی حکومتیں آئیں اور ختم ہو گئیں ان کے بہت سے بیانات اخباروں میں شائع ہوئے مگر ان میں کہیں بھی ادیبوں کا ذکر نہیں ملتا۔ ہماری موجودہ حکومت نے مختلف وقتوں میں جو بیانات دیئے ہیں ان سے ہماری امید بندھتی ہے لیکن جب تک عوام ہمارے متعلق سوچنا نہ شروع کر دیں گے اس وقت تک حکومت کی مدد بھی محض بیکار ثابت ہوگی۔ ہمارے ملک کو ادیبوں سے غفلت اور حقارت نہ کرنا چاہئے ہم ہی ملک کی چلتی پھرتی یونیورسٹیاں ہیں ہمارا کام وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں پر تعلیمی اداروں کا کام ختم ہو جاتا ہے ہم لوگوں کو ڈراموں ناولوں نظموں اور اپنے دیگر فن پاروں کے تاج محلوں سے مسحور کرتے ہیں اگر ہم نہ ہوں تو پڑھے لکھے لوگ جاہل ہی رہ جائیں ہم صرف فرصت کے وقت ہی سرور و نشاط مہیا نہیں کرتے ہم سکون بخشتے ہیں۔

تفرقہ مٹاتے ہیں گھروں میں آشتی فراہم کرتے ہیں ہم فراق زدوں کے لئے خیالوں کا فردوس بہم پہنچاتے ہیں اور دور افتادوں کے زخم دل پر الفاظ کا مرہم رکھتے ہیں۔ ہم سے غفلت نہ برتنا چاہئے ہم چھوٹے ہوں یا بڑے لیکن ہماری بھی ضرورت ہے۔ ہماری ہی تحریروں کے ذریعے بڑے بڑے ادیب پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر بہاری لال اور مائکل مدھوسودن نہ ہوتے تو روبندر ناتھ ٹیگور بھی وجود میں نہ آتے۔ ہم ادیب مختلف زبانوں اور مختلف ممالک میں اپنی تخلیقات سے آپ کے لئے سرور و نشاط فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اپنے قلم کی طاقت سے مختلف زمانوں میں ہم نے کتنی ہی حکومتیں بنائی ہیں کتنی حکومتیں بگاڑی ہیں کتنے آدرش پھیلائے ہیں کتنے آدرشوں کے ساتھ ٹکرائے ہیں اور اس طرح انسان کے لئے ایک رستہ تیار کیا ہے جس وقت آپ خواب میں بھٹکتے ہیں اس وقت ہم مٹی کے دیے جلا کر آپ کی خاطر کہانیاں لکھتے ہیں راتیں جاگ کر بتا دیتے ہیں اور وہ کہانیاں آپ کے سکھ دکھ میں رفاقت کرتی ہیں۔ آپ ہم سے غفلت نہ برتیں ہم کو اعزاز بخشنا وطن کو اعزاز بخشنے کے مترادف ہے۔ بڑی بڑی ریاستیں تباہ ہو جاتی ہیں سیاسی لیڈر تاریخ کے اوراق میں محبوس ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم ادیب ہر دور میں زندہ رہتے ہیں اگر کالی داس کی حمایت نہ کرتا تو آج راجہ بکرما دتیا زندہ نہ رہتا کیونکہ آج کالی داس ہی کے کارناموں میں راجہ بکرما دتیا اور اس کے اجینی کا ذکر ملتا ہے۔

بادشاہوں نوابوں کا زمانہ ختم ہو گیا وطن کے عوام ہی کو اب ہماری سرپرستی کرنی ہوگی ماضی میں جو دو ایک رہنما ادب کے لئے کچھ کرنا چاہتے تھے ان سے عالم و فاضل حضرات فنکار ان کے خزانے سے [illegible] تمام تر فیض حاصل کر لیا کرتے تھے مگر اب وہ دور آگیا ہے کہ علماء و فضلاء کو [illegible] تخلیقات کے کام میں مصروف رہنے دیا جائے تاکہ ادیبوں کے اجتماع میں صرف "اہل ذوق" اور "اہل احساس" کی آوازیں سنی جا سکیں [illegible] میں [illegible] اور [illegible] کا کام آج صرف گھوڑے اور سپاہی ہی تلاش کرنا ہے۔

مشرقی پاکستان کے ادب کا مقابلہ اکثر ہندوستانی ادب اور خاص طور پر مغربی بنگال کے ادب سے کیا جاتا ہے۔ ان کی حیثیت اور درجہ قریب قریب برابر [illegible] پڑھنے والوں کی آنکھوں میں چکاچوند سی ہو جاتی ہے۔ اگر وہاں کی حال کی شائع شدہ کتابوں کے ساتھ مشرقی پاکستان کی کتابوں سے صحیح مقابلہ کیا جائے تو واضح ہو [illegible] نہیں کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ صرف ٹیگور کو مستثنیٰ کر کے مغربی بنگال یا ہندوستان میں کوئی ایسا نہیں جس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہو۔ ترجمہ میں نظم سے زیادہ ناول کی اصلیت برقرار رہتی ہے۔ ہندوستان کے بہت سے ناولوں کو مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے لیکن ان میں سے ایک نے بھی تو تھامس ہارڈی یا مام کے ناولوں کی طرح بین الاقوامی شہرت نہیں حاصل کی۔ ٹیگور کے ناول ملک کی سرحدوں کے باہر نہیں پہنچ سکے۔ ٹیگور کے نوبل پرائز حاصل کرنے کے یہ معنی نہیں کہ ہم ایک پیر صاحب کے خاندان کی طرح وہاں کے تمام ادیبوں کی شان میں خراج عقیدت پیش کرتے رہیں۔ وہ اور ہم بین الاقوامی ادب میں ایک مرتبہ رکھتے ہیں اس کے باوجود کیا بات ہے کہ بھارت کے ادیبوں کی کتابیں ہمیں زیادہ پسند ہوتی ہیں۔ وطن کے لوگ ہماری کتابیں کیوں نہیں پڑھتے۔ اس "کیوں" کا جواب دینے کے لئے ہمیں ماضی کی سمت دیکھنا ہوگا۔

انیسویں صدی میں مغربی ثقافت بنگال میں داخل ہوئی۔ حکومت اور دولت کھوئے ہوئے مسلمانوں کو اس ثقافت سے علیحدہ رکھنے کے لئے طرح طرح کے جال بچھائے گئے تاکہ وہ اس سے فیض نہ حاصل کر سکیں۔ زندگی کی مختلف راہوں میں کامیابی حاصل کر کے ہندو معاشرہ اپنی ذات سے مرکوز ہو گیا اور ہندو سیاست، ثقافت، اقتصادیات میں ترقی کرتے کرتے بہت ہی بلند مقام پر پہنچ گئے۔ اور ہم مسلمان ان کی زندگیوں کو پریوں کی کہانی کی طرح سمجھنے لگے اور جیسے جیسے ہم ان کی عزت کرتے گئے وہ اور بھی اونچے ہوتے چلے گئے اور ان کی نگاہوں سے ہماری ثقافت [illegible] ہمارا ادب گرتا گیا خود ہمارے ادیب ان کی نقالی کرنے لگے اور بعض اپنی تخلیقوں میں ہندو کردار پیش کرنے لگے غرض اس طرح ہمارے اندر ایک احساس [illegible] سرایت کر گیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے بھولے بھالے کسانوں کے دل میں راجکمار اور راجکماریوں کی کہانیاں ایک سنسنی سی پیدا کر دیتی ہیں۔

مغربی ثقافت کو اپنا کر ہندو اتنے آگے بڑھ گئے کہ تمام ہندوستان میں یہ جملہ تسلیم کیا جانے لگا کہ بنگال جو آج سوچتا ہے ہندوستان اس پر کل غور کرتا ہے۔ لیکن نقل کی چمک زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہتی آج زندگی کی جدوجہد میں بنگالی پیچھے رہ گئے ہیں اس کا سبب شاید یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تہذیب و تمدن کو نظر انداز کر کے غیر ملکی تصورات کی مدد سے اپنے کو بڑھانے کی کوشش کی تھی اپنے ادب کی روایتوں کو چھوڑ کر جو غیر ملکی اثرات انہوں نے لئے تھے اور اس کی وجہ سے جو ادب وجود میں آیا اسے باہر والوں نے بین الاقوامی مرتبہ نہیں دیا اور اپنے ملک کے لوگوں نے بھی اسے پسندیدہ نہ سمجھا۔ پریس کی سہولتوں کے باوجود جدید لکھنے والوں میں کتنے ایسے ہیں جو چنڈی داس، ودیاپتی، گوبند داس اور مکند و رام کی طرح مقبول ہو سکے ہیں؟

ادب کے میدان میں ہمارا ادب اطمینان بخش نہیں پھر بھی پاکستان کی ادبی پیشکش یکدم معمولی اور ادنیٰ بھی نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان کے کاشتکاروں کے لوک گیت انگریزی، فرانسیسی اور چیک زبانوں میں ترجمہ کئے گئے ہیں اور انکو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اگر ہم سندھ، پنجاب اور سرحد کے لوک گیت اور جمع کریں اور ترجمہ کریں تو ہماری اور بھی عزت بڑھے گی ہمارے لوک گیت کافی دنیا میں حیرت پیدا کر سکتے ہیں اگر ہم انہیں جمع کر کے دنیا کو نہ دکھا سکے تو ہم آنے والی نسلوں کی نظروں میں غدار وطن ٹھہریں گے تعلیمی و اقتصادی معیار جس طرح بدل رہے ہیں ان سے لوک گیت کے نقصان یا غائب ہو جانے [illegible] چین اور جاپان بھی اپنی قدیم ثقافت کو دنیا کے سامنے پیش کر کے تخلیقی فنکاروں اور ادیبوں کو اپنے معیار بلند کرنے میں مدد دے رہے ہیں مشہور مغربی ادیبوں اور فنکاروں نے ان دونوں ممالک کے سامنے اپنے استفادہ کا اقرار کیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں پوتھی ادب ہے دنیا کے عجائبات میں سے ہے [illegible] علمی [illegible] کتابوں کو نظم میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔ یہ پوتھی ادب رفتہ رفتہ مرتا جا رہا ہے۔ اس لئے [illegible] ہیں وہ [illegible] استفادہ نہیں ہوتا۔ اس پوتھی ادب کو اگر نہ بچایا گیا تو وہ لوگ جو اس سے سرور حاصل کرتے ہیں وہ [illegible]

میرے چاروں طرف [illegible] حضرات تشریف فرما ہیں آپ کے درمیان مجھے بہت سے [illegible] آگے بڑھانے اور ترقی کی منزلوں کی طرف لے جانا ہم سب کا فرض ہے [illegible] خدا ہم سب کو کامیاب کرے۔

اسٹیرنگ کمیٹی کا انتخاب

۲۹ر جنوری ۱۹۵۹ء

(کراچی)

کنونشن کا دوسرا اجلاس صرف مندوبین کے لئے مختص تھا۔ رضاکار طلباء نے مندوبین کے "نشان امتیاز" کی جانچ پڑتال کی تاکہ مندوبین کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ شام کے تین بجکر ہندرہ منٹ پر جمیل الدین عالی نے کنونشن کے پروگراموں کی وضاحت کی۔ حامد علی خان کو صدر منتخب کیا گیا۔ بعد ازاں اسٹیرنگ کمیٹی کی تجویز منظور کی گئی۔ اس کے بعد اسٹیرنگ کمیٹی کی صوبائی اور لسانی نمائندگی پر کچھ دیر بحث و تمحیص ہوئی۔ بالآخر دو گھنٹے کے وقفے اور اسٹیرنگ کمیٹی کے نمائندوں کے سلسلے میں انتخابی سرگرمیوں کے بعد دوبارہ اجلاس شروع ہوا اور مزید نصف گھنٹے کی رد و قدح کے بعد ۵۶ ادیبوں پر مشتمل اسٹیرنگ کمیٹی منتخب کر لی گئی۔

ذیلی کمیٹیوں کا انتخاب

۲۹ر جنوری ۱۹۵۹ء

کراچی

مندوبین کا تیسرا مخصوص اجلاس حامد علی خاں کی صدارت میں شروع ہوا۔ سکریٹری نے اسٹیرنگ کمیٹی کے منتخبہ اور ذیلی کمیٹیوں کا اعلان کیا اور بتایا کہ ذیل کی کمیٹیاں ان تمام تجاویز کے تحت قائم کی گئی ہیں جو ملک کے ہر خطے سے موصول ہوئی ہیں۔

پہلی کمیٹی:۔ قیام ادارہ مصنفین پاکستان (WRITERS GUILD) تشکیل دستور

کنوینر:۔ بیگم بسم اللہ نیاز احمد

ممبران:۔ (مشرقی پاکستان) ڈاکٹر سید سجاد حسین۔ کوی غلام مصطفےٰ۔ ابراہیم خان۔

(مغربی پاکستان) ہاجرہ مسرور۔ ظہیر کاشمیری۔ اعجاز بٹالوی۔

(کراچی) قدرت اللہ شہاب۔ ممتاز حسین۔ شوکت صدیقی۔

دوسری کمیٹی:۔ ادیبوں کی بہبود اور تحفظ حقوق

کنوینر:۔ بیگم سلمیٰ حقی

ممبران:۔ (مشرقی پاکستان) بیگم شمس النہار محمود۔ بے نظیر احمد۔ علاء الدین آزاد۔

(مغربی پاکستان) آفتاب احمد۔ ضمیر جعفری۔ خاطر غزنوی۔

منشور کمیٹی۔ کنوینر بیگم شمس النہار محمود۔

ممبران:۔ میجر ابن الحسن۔ آفتاب احمد خاں۔ ابوالکلام شمس الدین۔ علاء الدین آزاد۔

(کراچی) حفیظ جالندھری۔ غلام عباس۔ مجتبےٰ حسین۔

تیسری کمیٹی:۔ پاکستانی ادیبوں کے داخلی و خارجی مسائل کا مطالعہ اور سفارشات

کنوینر:۔ بیگم یوسف جمال حسین

ممبران:۔ (مشرقی پاکستان) پروفیسر ابو رشد۔ منیر الدین احمد۔ دیوان محمد اشرف۔

(مغربی پاکستان) صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ شیر محمد اختر۔ حمایت علی شاعر

کراچی:۔ ضمیر الدین احمد۔ ابرار صدیقی۔ فخر ماتری۔

تی کمیٹی:۔ کاپی رائٹ قانون اور مصنف اور ناشر کے باہمی امور۔

ممبران:۔ (مشرقی پاکستان) جسیم الدین۔ نور المومن۔ ابو الحسین۔

(مغربی پاکستان) جاوید اقبال۔ یوسف ظفر۔ تجمل حسین۔

(کراچی) رازق الخیری۔ مظفر حسین شمیم۔ صہبا لکھنوی۔

پروفیسر سید وقار عظیم کو بطور خاص مشورے کے لئے شامل کیا گیا۔

نچویں کمیٹی:۔ ادیبوں کے دار الاشاعت کا قیام۔

کنوینر:۔ لیلیان سکستن (ندر ورفرانسیسی مہمان ادیبہ)

ممبران:۔ (مشرقی پاکستان) تعلیم حسین۔ عسکر ابن شیخ۔ نصیر علی

(مغربی پاکستان) محمد صفدر۔ خلیل الرحمن۔ احمد راہی

(کراچی) شاہد احمد دہلوی۔ جمیل جالبی۔ شان الحق حقی۔

عبد المتین عارف اور میرزا ادیب کو بطور خاص مشورہ کے لئے شامل کیا گیا۔

ٹی کمیٹی:۔ قومی اور علاقائی زبان و ادب کی ترویج و ترقی۔

کنوینر:۔ بیگم مایا جمیل

ممبران:۔ (مشرقی پاکستان) ڈاکٹر انعام الحق۔ عبد القادر۔ عبد الحی

(مغربی پاکستان) عبد المجید سندھی۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر۔ قلندر مومند

(کراچی) یونس احمر۔ ابن انشا۔ ابن سعید۔

ساتویں کمیٹی:۔ متفرقات اور رابطہ

ممبران:۔ (مشرقی پاکستان) اے۔ ایم۔ شرف الدین۔ حسن حنیظ الرحمن۔ اشرف الزماں خان۔

(مغربی پاکستان) احمد فراز۔ مختار صدیقی۔ ملک نسیم الظفر۔

(کراچی) سید فیض۔ منظور عارف۔ ضیاء جالندھری۔

☆

ذیلی کمیٹیوں کی سفارشات

ادیبوں کے معاشی اور معاشرتی مسائل

۱ - پاکستان رائٹرز کنونشن کے لئے ۲۹ دسمبر والے اعلان میں معاشرے میں تخلیقی فن کاروں کو ایک باعزت مقام دلانے اور ان کی معاشی اور معاشرتی بہبود کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

اا - اس اعلان میں بیرونی ممالک میں پاکستانی ادب کی ترویج واشاعت کا مقصد بھی شامل ہے۔

ااا - باوجود ملک میں با اثر ہونے کے ادیبوں کو کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ ماضی میں کسی مرکزی یا صوبائی حکومت نے کوئی انتظامی یا دیگر قدم اٹھا کر ان کے حالات سدھارنے کی کوشش نہیں کی سوائے اس کے کہ کبھی کبھی کسی ادیب کے انتقال کے بعد اس کے پسماندگان کو مالی امداد دے دی جاتی تھی۔

۱۷ - گزشتہ حکومتوں نے صحت مند ادب کی تخلیق کے لئے فضا سازگار کرنے کے لئے کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

۷ - ان حکومتوں نے اس کی بجائے ادیبوں کو قید خانوں میں بند کر کے ان کی ترقیات کا سدباب کیا۔

۷۱ - گزشتہ دور میں ادبی اداروں اور انجمنوں پر افسروں نے بہت سی بندشیں لگا رکھی تھیں اور ادیبوں کو حکومت کی مطبوعات اور نشریات میں حصہ لینے کی ممانعت کر دی تھی۔

گزشتہ حکومتوں نے سرکاری امداد اور پشت پناہی سے ادیبوں کا ایک مخصوص گروہ قائم اور دائم کر رکھا تھا۔

ملک کی حالیہ اندوہناک جہالت نے ادیبوں کے معاشی اور معاشرتی مسائل کو خراب تر ہونے میں مدد دی ہے۔

ملک کی موجودہ سطح تعلیم کو دیکھتے ہوئے ناشرین نے سستا اور سنسنی خیز ادب چھاپ کر ادبی تخلیقات کو نقصان پہنچایا ہے

اس لئے

ہم یہاں پاکستان رائٹرز کنونشن میں شریک ہونے والے مندوبین یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ

۱۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اپنے اوپر ادیبوں کے معاشی اور معاشرتی حالات کو سدھارنے کی ذمہ داری لے کر

(ا) ادیبوں کی آزادئ تحریر میں حائل نہوں تاکہ ان کے تخلیقی جذبے کا طریقۂ ترسیل بند نہ ہونے پائے۔

(ب) انفرادی ادیبوں، ادبی انجمنیں اداروں سے تمام ممنوعات اور پابندیاں اٹھادی جائیں۔

(ج) ہر ایک پر حکومت کی قائم کردہ یا امداد شدہ تمام ادبی۔ فنی یا ثقافتی اداروں کی رکنیت کھول دیں تاکہ ان اداروں پر ایک مخصوص گروہ ہی ہمیشہ کے لئے قبضہ نہ کئے رہے۔

(د) سستی اور سنسنی خیز مطبوعات کی اشاعت ختم کردیں۔

(ہ) ادیبوں کی بہبود کے لئے ایک ایسا فنڈ قائم کیا جائے جس سے نادار ادیبوں کی اولاد کی تعلیم، ادیبوں کی موت کی صورت میں ان کے مستحق پسماندگان کی مالی امداد، اور نادار اور معذور ادیبوں کی مالی امداد کا بندوبست ہو سکے۔

(و) ادیبوں کے لئے اخبار نویسوں کی طرح سفر میں مراعات منظور کریں۔

(ز) متوفی ادیبوں کے پسماندگان کی دیکھ بھال کریں۔

۲۔ منجملہ دیگر چیزوں کے ادیبوں کو اپنے پیشے سے روزی حاصل کرنے کے زیادہ مواقع فراہم کرنے کے لئے ریڈیو پاکستان کو ایک تجارتی ادارہ بنا دیا جائے۔

۳۔ حکومت ادارے (گلڈ) سے کسی ادبی تخلیق کو مبتذل یا غیر مبتذل قرار دینے سے پہلے مشورہ طلب کرے۔ اور ادارہ کے مشورے پر عمل کرے۔

۴۔ پاکستان اور دیگر ممالک کے درمیان مصنفین، کتابوں اور مجلّوں کا زیادہ تبادلہ ہو اور حکومت بیرونی ممالک میں پاکستانی ادب کو فروغ دینے کے لئے بیرونی ناشرین سے سلسلہ جنبانی کرنے کی زیادہ کوشش کرے۔

۵۔ ادیبوں کو ان کی تخلیقات کے شائع ہونے، دوبارہ شائع ہونے اور نشر ہونے کا معاوضہ دیا جائے۔

اردو ٹائپ

پاکستان رائٹرز گلڈ کنونشن یہ سفارش کرتا ہے کہ موجودہ طریقۂ طباعت میں لیتھو پر اردو ٹائپ کو ترجیح دینے کی کوشش کی جائے۔ اس مقصد کے لئے یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ

۱۔ اسکولوں اور ابتدائی مدارج کے لئے اردو کی تمام نصابی کتابیں ٹائپ میں طبع کی جائیں

۲۔ موجودہ اردو ٹائپ کو عام کرنے کے لئے حکومت یونیورسٹی اور دیگر انجمنیں ایک باہمی مجلس بنائیں (Coordination Committee)

بنگلہ ٹائپ

پاکستان رائٹرز گلڈ کنونشن یہ قرار دیتا ہے کہ حکومت، یونیورسٹی، اور ادارہ مصنفین پاکستان اور بالخصوص ایوان بنگلہ ـــ

(Bengali Academy) سب کوشش کریں کہ بنگلہ کی حروف تہجی اور (Compound letters) حروف مرکبات کی تعداد میں معتد بہ کمی کر کے موجودہ بنگلہ رسم الخط کو آسان بنایا جائے تاکہ بنگلہ زیادہ آسانی سے پڑھی جا سکے۔ ٹائپ میں آسانی ہو جائے اور ٹائپ کی مشینوں کا زیادہ استعمال ہو جائے۔ اور اس طریقہ سے ادبی تخلیقات کو فروغ ہو۔

ادیبوں کے حقوق کا تحفظ اور ان کی بہبود

۱۔ یہ کنونشن سرکاری ملازم ادیبوں کے سے مندرجہ ذیل پابندیاں اٹھانے کی سفارش کرتا ہے۔

(ا) ان کو اپنی کسی تخلیق کا جس کو حکومت نے اشاعت یا نشر کرنے کے لئے خریدا ہو معاوضہ پچیس روپے سے زیادہ نہیں ملتا۔ یہ قاعدہ ختم ہونا چاہیئے۔

(ب) سرکاری ملازمت کے بنیادی قواعد کے ماتحت ان کو اپنی تخلیقات سے وصول شدہ آمدنی میں سے ایک تہائی حکومت کو دینی پڑتی ہے۔

۲۔ ریڈیو پاکستان اور ادارہ مطبوعات پاکستان (سرکاری) میں مخصوص ادیبوں کی تخلیقات پر . . . . پابندی کو ختم کیا جائے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ ماضی میں کچھ بلند پایہ ادیبوں کو بغیر کسی معقول وجہ کے بالکل نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کو صرف تخلیقات پر نظر رکھنی چاہیئے اگر اس کی تخلیق متعینہ مقصد حل کرتی ہے یا حکومت کے نظریات کے ہم آہنگ ہے تو ادیب کی شخصیت سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیئے۔

کاپی رائٹ

یہ ذیلی کمیٹی موجودہ قانون حق تصنیف اور متعدد اداروں اور ادیبوں سے موصول شدہ قرار دادوں اور تجاویز بنظر غائر مطالعہ کے بعد مندرجہ ذیل سفارشات پیش کرتی ہے۔

۱۔ موجودہ قانون حق تصنیف میں ان ترمیموں اور ضمیموں کی ضرورت ہے۔

(ا) جملہ تخلیقات کا حق تصنیف لازمی طور سے قانوناً بحق مصنف محفوظ رہنا چاہیئے اور کسی تخلیق/تخلیقات کی فروخت کے سلسلے میں ناشرین کو یہ حق تصنیف پندرہ سال کی مدت سے زائد نہ ملنا چاہیئے۔

(ب) قانون کی متعلقہ دفعات میں اس طرح سے ترمیم کی جائے کہ اخلاف اور پسماندگان کے حق میں مصنف کے حق تصنیف محفوظ رہنے کی مدت پچاس سال سے بڑھ کر سو سال ہو جائے۔

(ج) قانون میں ایک شق یہ بڑھا دی جائے کہ مصنف سے باقاعدہ اجازت نامہ یا معاہدہ کے بغیر کسی شخص یا ادارے کو اس کے کسی گیت یا بول کو موسیقی میں ڈھالنے کی ممانعت ہوگی۔

(د) قانون میں ایک شق یہ بڑھا دی جائے کہ نصابی کتب کے معاملے میں حق تصنیف صرف بحق مصنف محفوظ ہو اور اس کا معاوضہ مانگنی کی صورت میں دیا جائے سوائے اس کے کہ وہ خود ہی معاوضہ کسی دوسرے طریقے سے چاہے۔

۲۔ (ا) یہ ذیلی کمیٹی حکومت پاکستان سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ادیبوں کو ان کی کتابیں بیرونی ممالک میں (خصوصیت سے ہندوستان میں) فروخت ہونے کی صورت میں فروخت کی رقوم کو ملک متعلقہ کے رائج سکوں میں حاصل کرنے کے حق پر غور کرے۔

(ب) وہ تمام رقوم جو ادیبوں کو فروخت یا مالٹی کی شکل میں موصول ہوں انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دی جائیں۔

۳۔ یہ ذیلی کمیٹی حکومت پاکستان سے سفارش کرتی ہے کہ وہ حکومت ہند سے حق تصنیف اور ہند و پاک ادیبوں کی تخلیقات کی اشاعت کے مسئلوں کو مندرجہ ذیل بنیادوں پر سمجھوتے کے لئے اٹھائے۔

(ا) ہر دو ممالک کے کسی ناشر کو متعلقہ مصنف کی باقاعدہ اجازت یا معاہدے کے بغیر اس کی کسی تخلیق، اس کے کسی حصہ کو چھاپنے یا اس کے ترجمے شائع کرنے کی اجازت نہ ہو۔

(ب) جو خلاف ورزیاں ہو چکی ہیں ان کا ادیبوں اور ان کے ورثاء کو معقول مالی معاوضہ دلایا جائے۔

(ج) تمام وہ مطبوعات جو مصنفین کی اجازت اور معاہدہ کے بغیر زیر اشاعت ہوں فوراً روک دی جائیں۔

۴۔ اس ذیلی کمیٹی کی خواہش ہے کہ مصنفین اور ناشرین مل کر ایسے اقدامات کریں، جس سے باہمی خیر سگالی، خوشدلی اور مفاہمت کی فضا سازگار ہو۔

۵۔ یہ ذیلی کمیٹی حکومت پاکستان سے سفارش کرتی ہے کہ ایک قومی دفتر دستاویزات کی بنا ڈالی جائے جہاں پر ہر مصنف کی ہر تصنیف کی دو جلدیں محفوظ کی جائیں اور قانون حق تصنیف میں ترمیمات رائج کر کے یا دوسرا قانون بنا کر ناشرین کے لئے لازمی قرار دیا جائے کہ وہ ہر کتاب کی دو جلدیں قومی دفتر دستاویزات میں جمع کرائیں۔

زبان و رسم الخط

(جملہ السنۂ علاقہ جات)

یہ مجلس سفارش کرتی ہے کہ

۱۔ علاقائی زبانوں کے ادیبوں کو "ادارہ" کی رکنیت کا اہل قرار دیا جائے۔

۲۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کی علاقائی مجالس اپنے مختلف حلقوں میں ذیلی مجلسیں قائم کریں۔

۳۔ علاقائی مجالس علاقائی ایوانہائے ادب میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں اور ان کی مجلسوں میں مناسب نمائندگی دی جائے۔

۴۔ حکومت سے درخواست کی جائے کہ ماضی کی عدم توجہی کے سبب پشتو کی مطبوعات کو منظور کرنے پر ضروری توجہ دی جائے۔

۵۔ حکومت سے درخواست کی جائے کہ تمام علاقائی زبانوں کی نشر و اشاعت اور فروغ کے لئے یکساں مواقع فراہم کئے جائیں۔

۶۔ علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لئے یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ

(۱) علاقائی یا قومی زبانوں کے مشہور ادیبوں کے اعزاز میں تقریبات صرف متعلقہ علاقہ ہی میں نہیں بلکہ پورے ملک میں منائی جائیں۔

(۲) ملک کے دونوں خطوں اور دیگر علاقوں کے درمیان ادیبوں کو ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ ملاقات اور اظہار خیال کے مواقع دیئے جائیں۔

۷۔ قومی اور علاقائی زبانوں کے ادب کی زیادہ توسیع کے لئے۔
(i) ادیبوں کی مشہور تخلیقات کا ترجمہ پاکستانی اور غیر ملکی زبانوں میں ہونا چاہیئے۔
(ii) اس مقصد کے لئے حکومت سے گزارش ہے کہ وہ ایک دارالترجمہ (Central Bureau of Translation) قائم کریں۔
(iii) ان ادیبوں کی جو ترجمہ کا کام کر رہے ہیں ہر طریقے سے زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جائے۔
۸۔ علاقائی زبانوں کو فروغ دیا جائے اور اس قسم کے انتظامات کئے جائیں کہ سب علاقوں میں تمام علاقائی زبانوں کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ رائج ہو جائے۔

ذیلی کمیٹی برائے آزادی اظہار

پاکستانی ادیبوں کا یہ کنونشن یہ سفارش پیش کرتا ہے کہ کتابوں کی درآمد اور برآمد کے سلسلے میں ان پابندیوں کو جو پاکستانی ادیبوں کے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی طور سے بھی منافی ہوں اٹھا دیا جائے۔
۲۔ یہ کنونشن سفارش کرتا ہے کہ کسی ادیب کی کسی تخلیق کے خلاف کارروائی "ادارے" کی متعلقہ کمیٹی سے مشورہ لینے کے بعد کی جائے۔
۳۔ یہ کنونشن سفارش کرتا ہے کہ بیرونی ممالک کو ثقافتی یا ادبی وفود بھیجنے سے قبل حکومت ادارے سے اس کی تشکیل اور نمائندگی کے سلسلے میں مشورہ لیا کرے۔
۴۔ یہ کنونشن حکومت سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ان ادیبوں کو جن کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا ہو فوراً رہا کر دے یا ان پر عدالت میں مقدمہ چلائے۔ نیز ان پر سے دیگر پابندیاں بھی اٹھالی جائیں۔

اشاعت گھر

ہرگاہ کہ
پاکستانی ادیبوں کا یہ کنونشن پاکستان میں ادب کے فروغ اور اشاعت کے سلسلے میں تجارتی ناشرین کے ہر اچھے کام کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے۔
پھر بھی یہ کنونشن محسوس کرتا ہے کہ مصنفین اور عام قارئین کے خیال میں ہمارے ملک میں مطبوعات کا معیار خاصا پست ہے۔
اور یہ کنونشن اس خیال کا حامل ہے کہ اگر مصنفین کو اشاعتی کاروبار میں زیادہ دخل ہو جائے اور ان کا ذہن ناشرین کا تابع نہ ہو جائے تو ان مطبوعات کا معیار بلند کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کنونشن کا یہ ایقان ہے کہ اشاعتی کاروبار میں دانشمندانہ رہبری کا فقدان ہے اس لئے کہ اب تک یہ کام صرف تجارتی نکتۂ نظر کا مرہون منت ہوتا ہے۔ اور اس کنونشن کی رائے میں حالاتِ حاضرہ کے تحت ادیبوں کا مفاد چاہے وہ مادی ہو یا فنی ناشرین کے تجارتی مفاد کا تابع رہتا ہے۔ اور ایسی مثالیں کم نہیں ہیں جہاں پر ادیبوں کا مستقل ظالمانہ استحصال ہوتا رہا ہے اور بڑے معلمات

ہجار ہوتے رہتے ہیں اور یہ کہ فخر پاکستان ہوتے ہوئے بھی یہ لوگ ابھی تک بہت مظلوم زندگی گذار رہے ہیں ۔
اور چونکہ کنونشن کی رائے میں اپنے حقوق کا تحفظ سب سے بہتر طریقے سے ادیب خود کر سکتے ہیں، اور مطبوعات کا معیار یقیناً بلند ہو سکتا ہے
، ادیبوں کو اپنی تخلیقات کی اشاعت بغیر تجارتی ناشروں کے مقابلے میں لائے ہوئے دیدی جائے ۔

اس لئے

۱- یہ سفارش کی جاتی ہے کہ ادارہ مصنفین پاکستان ایک اشاعت گھر قائم کرے جس کو "ادیبوں کا اپنا اشاعت گھر" کہا جائے یا ہر زبان میں کوئی بھی مناسب نام رکھ لیا جائے ۔
۱- مزید سفارش کی جاتی ہے کہ اس اشاعت گھر کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد ہوں ۔
(ا) یہ اشاعت گھر صرف ادیبوں کے مفاد کے لئے قائم کیا جائے ۔

(ب) یہ اشاعت گھر "ادارے" کے اراکین کی تخلیقات، متقدمین ادیبوں کے ادبیات عالیہ، یا وہ مطبوعات جو ادارہ اس کو تفویض کرے گا شائع کرے گا ۔
(ج) یہ اشاعت گھر کسی بھی قومی یا علاقائی زبان کے پاکستانی ادب کے ارتقاء اور فروغ کی کوشش کرے گا ۔
(د) یہ اشاعت گھر مغربی اور مشرقی پاکستان میں مفاہمت بڑھانے کے لئے ثقافتی اور ادبی تبادلوں کو ترقی دے گا ۔ اور ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے شائع کرے گا ۔
(ہ) یہ اشاعت گھر بیرونی ممالک میں پاکستانی ادب کو فروغ دینے کی کوشش کرے گا ۔
(و) یہ اشاعت گھر غیر ملکی زبانوں کے شاہکاروں کے تراجم پیش کر کے پاکستانی زبانوں کی توسیع کرنے کی کوشش کرے گا ۔
ذیلی کمیٹی مزید سفارش کرتی ہے کہ ادارہ اشاعت گھر کے دستور اور قوانین کا ر بنانے کے لئے ایک کمیٹی نامزد کرے ۔

(ترجمہ)

گلڈ کی تاسیس

۳۱ر جنوری ۱۹۵۹ء

۲۹ر جنوری کو دستور کا مسودہ ایک ذیلی کمیٹی کے حوالے کردیا گیا ۔ اس کمیٹی نے ۲۹ر کی سہ پہر اور ۳۰ر جنوری کو تمام دن اور نصف شب تک کام کیا اور ترمیم و تنسیخ کے بعد اسے منظور کیا ۔

۳۱ر جنوری کی صبح مسودہ اسٹیرنگ کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا ۔ جہاں مزید ترمیمات کی گئیں ۔

۳۱ر جنوری کی دوپہر کو جلسہ مندوبین نے مسودے پر غور کیا اور چند مزید ترمیمات کی گئیں ۔ یہ اجلاس ۲ بجے تک جاری رہا ۔

ڈھائی بجے گلڈ کی قرارداد معہ دستور کے منظور ہوگئی ۔ ساڑھے تین بجے عبوری عاملہ کے انتخابات مکمل ہوئے

قدرت اللہ شہاب

ادیب اور آزادیٔ تحریر

(رائٹرز کنونشن کے آخری اجلاس میں پڑھا گیا)

اس سے پہلے کہ ادیب اور اس کی آزادیٔ تحریر پر گفتگو کی جائے۔ یہ بہتر ہے کہ اس کی ذمہ داریوں کی وضاحت کر دی جائے ——— وہ ذمہ داریاں یہ ہیں :-

۱۔ ادیب کسی حیثیت سے بھی قانون سے بالا نہیں ہوتا۔

۲۔ وہ ایک ملک میں رہتے ہوئے کسی دوسرے ملک کا وفادار نہیں ہو سکتا۔

۳۔ کسی ایک نظریہ کی تبلیغ کرتے ہوئے شاعری کی آڑ لے کر کسی دوسرے نظریہ پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔

یہ حدیں تمام اچھے شہریوں پر عائد ہوتی ہیں، لیکن ان کا اطلاق زیادہ شدت سے ادیب پر ہوتا ہے، کیونکہ وہ ہر لمحے عوام کی نظروں میں رہتا ہے کیونکہ وہ لکھتا ہے ضروری نہیں کہ یاد کے خزانے میں گم ہو جائے۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی آواز کی گونج صدیوں تک سنائی دیتی رہے جتنا زیادہ مقبول کوئی ادیب ہوگا اتنا ہی اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ زیادہ ہوگا۔ وہ عام لوگوں کی طرح آزادی سے کوئی بات کہتے ہوئے جھجک محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کے سامنے اس کے سامعین ہوتے ہیں، اور اسے بڑی آسانی سے غلط سمجھا جا سکتا ہے، اثر انداز ہونے کی اہلیت ادیب کے لئے نعمت بھی ہے اور مصیبت بھی۔ مصیبت یہ ہے کہ ادیب جیسے غیر معمولی فرد کو عام ترازو میں تولا جاتا ہے۔ اگر آپ کو ادیب میں کچھ کمی محسوس ہو تو اس پر نہ ادیب مقصد ہے نہ آپ کی ترازو کا، بلکہ ممکن ہے یہ آپ کے جاننے یا آپ کی نظر کا قصور ہو۔

ادیب آپ سے برداشت کی نہیں فہم کی بھیک مانگتا ہے۔ مجسٹریٹ یا پولیس انسپکٹر کا فہم نہیں بلکہ ایک باشعور پڑھنے والے کا فہم ——— ایک اقدار میں یقین رکھنے والے کا فہم ——— ایک سچائی کے پرستار کا فہم ——— آپ چور کو پکڑنے کے لئے کسی دوسرے چور کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں لیکن ادیب کو سمجھنے کے لئے آپ کو پڑھنے والے کی تلاش کرنی ہوگی۔ سرکاری افسر جو ادیب اور اس کے حقوق کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر ان کا مطالعہ صرف دفتری فائلوں اور یادداشتوں تک محدود ہے اور ان کی زندگی کا ایک لمحہ بھی کتابوں کی قسمت میں نہیں، تو وہ ہمیشہ ادیب کو غلط سمجھیں گے اور اسے حقارت سے دیکھیں گے۔ یہ سرکاری افسر کبھی اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے کہ جسمانی سزائیں ضروری نہیں کہ روح کے لئے بھی عذاب ہوں، اور یہ کہ دنیا کے تمام قانون اور سائنس کی تمام ترقی وہ زنجیر دریافت کرنے سے قاصر رہی ہے جو علم اور سچائی کو جکڑ سکے۔

ادیب کی آزادی کے لئے دوسرا خطرہ اس حقیقت سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ فاصلے اور وقت کی حدوں سے ماورا ہو کر زندہ رہ سکتا ہے ان جانی اور ان دیکھی حقیقتوں کو چھوتا ہے۔ اور اس کے کل کے جواب ممکن ہے کہ آج کی زندگی کے تقاضوں کے بالکل برعکس ہوں۔ وہ نہ ہے نہ غدار ——— بات صرف اتنی ہے کہ اس کی نظر زیادہ گہری اور اس کے جذبات آپ سے زیادہ شدید ہیں۔ کوشش کیجئے کہ آپ ان بلندیوں تک پہنچ جائیں جہاں ادیب ہیں، ورنہ آپ اس سے کبھی انصاف نہیں کر سکیں گے۔

ادیب کی آزادی کو تیسرا بڑا خطرہ اس کی اقتصادی پسپائی سے ہے۔ ہمارے ملک میں کتابیں اس لئے نہیں بکتیں کہ وہ سستی نہیں، خرید سکتے ہیں وہ پڑھتے نہیں، جو پڑھنا چاہتے ہیں وہ خرید نہیں سکتے۔ اس تمام تضاد میں صرف ایک شخص فائدہ اٹھا جاتا ہے اور وہ ہے نا وہ ادیب کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیتا ہے اور پھر بھی اسے شکایت رہتی ہے کہ خون میں مناسب گرمی نہیں تھی۔ وہ ادیب کی صلاحیتوں کا تجارتی مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے۔

ادیب کی آزادی کے لئے ایک اور بھی خطرہ ہے اور وہ خطرہ بیرونی ہے۔ ہمارا ملک ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ ہم غریب ہیں۔ ہم نے معاملات کو الجھا دیا ہے۔ ان الجھنوں کی وجہ سے ہمارے کئی ہمدرد پیدا ہو گئے ہیں۔ مدد دینے والے ہمدرد، مذاق اڑانے والے ہمدرد اور ہمدردی کے پردے میں دشمنی کرنے والے ہمدرد بھی۔ یہ بھی ٹھیک ہوا۔ لیکن جو سب سے زیادہ خطرے کی بات ہے وہ یہ ہے کہ ——— اقتصادی اور سیاسی بدحالی کی وجہ سے ہم نے بحیثیت قوم اپنے آدرشوں کو بھلا دیا ہے ——— اور جب ہم نے خود ہی اپنے آدرشوں کو پس پشت ڈال دیا خلا کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ ہر خطے کے رہنے والے اور ہر قسم کے لوگ اس خلا کو پر کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

کوئی ہمارا ذہنی مکہ واشنگٹن بناتا ہے۔ کوئی ماسکو اور کوئی کلکتہ۔ ہر ایک کے ارادے مختلف ہیں۔ ماسکو اور کلکتہ والے ہمارے نظریات کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں۔ واشنگٹن والے اپنی راہ لگانا چاہتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے کہ ہمارا ذہنی مکہ صرف پاکستان میں ہے اور کہیں نہیں۔ پاکستان کے اد عالمی سیاست کی بساط پر مہرے نہیں بننا چاہتے۔ ہم غریب ہیں، اور جد وجہد کر رہے ہیں۔ لیکن ہمارا اپنا ذہنی اور ثقافتی افق ہے۔ کچھ دیر ہمیں ا چمن کی بھی سیر کرنے دیجئے۔

اس قومی لامرکزیت کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ ہماری تخلیقی قوتوں میں تعطل پیدا ہو گیا ہے۔ دوسری زبانوں کی منوں معمولی کتابیں ہمارے ادیبوں کے سروں پر اچھی اجرت کے لالچ میں لاد دی گئی ہیں۔ ہمارے اچھے سے اچھے ادیب کی تخلیق کا دس دس آنے بھی وصول نہیں کر سکتی لیکن اگر وہ ایک دو درجے کے غیر ملکی ادیب کی ایک گھٹیا کتاب کا ایک صفحہ ترجمہ کرتا ہے تو اسے دس روپے مل جاتے ہیں۔ آخر ہمارے ادیبوں کو بھی زندہ رہنا ہے اور اسی لئے سائیبریا کے جنگلوں اور کیلی فورنیا کے باغوں سے ہمارا ادب معمور ہے جب کہ کھلنا کے دھان کے کھیتوں کے گیت کوئی نہیں گاتا لاہور کی پر وقار عظمتوں کا ترانا کوئی نہیں سناتا۔

آخر میں ——— میں ادیب کی آزادی تحریر اور حکومت کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں تین مہینے پہلے تک سیاست دانوں نے آزادی کو ترقی دی تھی، خصوصاً لوٹنے اور کھسوٹنے کی آزادی تو فن کا درجہ حاصل کر گئی تھی ——— لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اُس ماحول میں میرے لئے ایسا مقالہ پڑھنا ناممکن تھا لیکن آج جب کہ مارشل لا کی ۶۹ دفعات میرا احاطہ کئے ہوئے ہیں، اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر میرے سامنے بیٹھے ہیں ——— میں محسوس کرتا ہوں کہ آزادی سے وہ کچھ کہہ دوں جو کہہ چکا ہوں۔ میرا خیال ہے ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہئے۔

آخری نشست ۳۱۔جنوری ۱۹۵۹ء

خطبۂ صدارت

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

محترم صدرِ پاکستان و معزز حاضرین!

میں آپ صاحبوں کو، سارے ملک کے اہلِ قلم کو ایک مرکز پر جمع دیکھ کر جو مسرت محسوس کرتا ہوں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا
میں ان باہمت دوستوں کو مبارک باد دیتا ہوں جن کی کوششوں سے یہ مبارک موقع آیا۔ اس نادر اجتماع پر نظر ڈالتا ہوں تو اس میں ایسے
ایسے فاضل ادیب دیکھتا ہوں جو جدید عہد کے تقاضوں، ادبی نکات و رموز اور ادیبوں کے حقوق و فرائض پر زیادہ بصیرت، گہرائی اور
دقتِ نظر سے بحث کر سکتے ہیں۔ یہ نوجوان ادیب زیادہ مستعد اور باخبر ہیں۔ میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں یہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ بنظرِ
انصاف دیکھا جائے تو ان کے ہوتے ہوئے میں اس منصب کا مستحق نہیں جو آپ نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ غور کرتا ہوں تو اس کی ایک ہی
وجہ معلوم ہوتی ہے۔ بڑے بوڑھوں کا ادب ہماری قدیم تہذیب میں داخل ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے زمرے میں کچھ دقیانوسی خیالات
کے حضرات شریک ہیں جو اپنی آبائی سنت پر قائم ہیں انہوں نے اہلیت سے زیادہ سفید بالوں کا لحاظ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ بری سے بری چیز میں بھی خوبی
کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل آتا ہے۔ طوالتِ عمر جسے میں اس زمانہ میں ایک عذاب سمجھتا ہوں اور جس سے میں سخت بیزار ہوں آج آخر وہی عیب میرے حق میں
ہنر ثابت ہوا۔ اور مجھے اس کی بدولت اپنے اہلِ قلم دوستوں سے ملنے، باتیں کرنے اور ان سے بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے لئے مجھ
پر آپ کا شکر واجب ہے یہ شکر رسمی نہیں صدقِ دل سے ہے۔

جب ہم حسنِ اتفاق سے ایک جا جمع ہیں تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اپنے ادب کا سرسری جائزہ لیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے
کہ ہم نے اپنے ادب میں شعر و سخن، غزل سرائی، فسانہ گوئی، مشاعرہ بازی، معمولی کتابوں کی تالیف یا تصنیف کا اضافہ نہیں کیا جسے دنیا کے سامنے نہیں
پاکستان ہی کے اہلِ فکر کے سامنے یہ کہہ کر پیش کر سکیں کہ یہ ہمارے ادب کی قابلِ قدر تخلیق ہے۔ جب تک ہم علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کر کے
اعلیٰ پایہ کی کتابیں تالیف و تصنیف نہیں کریں گے۔ ہمارے ادب کی بنیادیں مضبوط نہیں ہوں گی اور نہ وہ کسی مہذب اور ترقی یافتہ ملک میں
قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا ہمیں بہت سے کھانچے بھرنے ہوں گے، بہت سی خامیاں رفع کرنی ہوں گی اور بہت سی کمیوں کو پورا کرنا ہوگا ہمیں
مستند جامع لغات اور ان سائکلو پیڈیا ئیں لکھنی ہوں گی استناد کی کتابیں تالیف کرنی ہوں گی۔ فلسفہ و سائنس، تاریخ و معاشیات وغیرہ
کی تالیفات کے انبار لگانے ہوں گے اس کے علاوہ ہمیں دنیا کی امہاتِ کتب کے ترجمے کرنے ہوں گے۔ یہ انقلابی اور عہد آفریں کتابیں
ہمارے خیالات میں روشنی پیدا کریں گی اور رہنمائی کا کام دیں گی انجمن ترقی اُردو نے یہ کام شروع کیا تھا اور بہت کچھ کیا بھی لیکن پاکستان میں آکر یہ
سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ میں بڑی خوشی سے اس امر کا اظہار کرتا ہوں کہ حال میں سید محمد تقی صاحب نے بعض ایسی امہاتِ کتب کا ترجمہ شروع کیا
ہے جو نہایت مشکل اور دقیق علمی مسائل پر مبنی ہیں یہ کام آسان نہیں۔ اس کے لئے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے اور اگر ہمیں اپنے ادب کی
ترقی مدِ نظر ہے تو یہ چنے چبانے ہی پڑیں گے۔ یہ کام ہماری یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے پروفیسروں کا تھا جو ان مضامین میں اعلیٰ ڈگریاں رکھتے
ہیں مگر وہ اس سے قاصر رہے اس میں ان کا اتنا قصور نہیں جتنا ہمارے نظامِ تعلیم کا ہے، پروفیسر صاحب نے جو کچھ پڑھا تھا انگریزی زبان
کے ذریعے سے پڑھا تھا۔ اب جو انہیں پڑھانے کا منصب ملا تو اپنے شاگردوں کو بھی انگریزی کے ذریعہ پڑھایا۔ معلم اور متعلم دونوں اہلِ علم
ہو جو انہوں نے حاصل کیا ہے اپنے اہلِ وطن تک پہنچانے سے قاصر ہیں۔ ان کا علم گونگے کا گڑ ہے۔ اگر یہ نظامِ تعلیم نہ بدلا تو صدیوں تک ہم
انگریزی کے محتاج رہیں گے۔ اور علم کی اشاعت ملک میں عام نہ ہونے پائے گی آج کل صدیوں کی منزلیں برسوں بلکہ مہینوں میں طے ہونے لگی ہیں جو
نظامِ حکومت تین مہینے میں انقلابی قسم کی زرعی اصلاحات نافذ کر سکتا ہے وہ ایک مہینے میں اپنی زبانوں کو چھنا ہوا مقام بھی واپس دلا سکتا ہے۔

انگریزی زبان ایک علمی زبان کے طور پر باقی رہنی چاہئے اور رہے گی۔ لیکن ہماری درسگاہوں میں ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے فوراً ختم ہونی چاہئے اور آج ہی بلکہ ابھی غروب آفتاب سے قبل ختم ہونی چاہئے۔ اگر یہ مشکل ہے تو زرعی اصلاحات بھی مشکل تھیں اور آج سے چند روز قبل کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ایسی انقلاب انگیز اصلاحیں جن کا نام سنتے ہی ہمارے مصلحین اور سیاست داں کانوں پر ہاتھ دھر لیتے تھے اس طرح آناً فاناً عمل میں آجائیں گی۔ مشکل اسی وقت تک مشکل ہے جب تک ہم اسے مشکل سمجھتے ہیں۔ انسان دل پر رکھ لے تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

ہمارے ادب میں جو جمود پایا جاتا ہے وہ بہت غور طلب ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ اس موضوع اور اس کے اسباب پر ہمارے ادیبوں نے بہت کچھ بحث کی ہے لیکن اصل سبب کی تلاش کے لئے کسی قدر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ جب کسی ملک یا قوم میں سیاست کاری مسلط ہو جاتی ہے اور اس کا تسلط جس قدر قوت کے ساتھ ہوتا ہے اسی قدر اس ملک کی ثقافتی زندگی مفلوج ہو جاتی ہے اور اس کی ذہنی، روحانی اور اخلاقی قوتیں زوال پذیر ہونے لگتی ہیں اقتدار کی ہوس اس قدر غالب ہو جاتی ہے کہ توجہ مفاد عامہ سے ہٹ کر اپنی ذات اپنے عزیز و اقارب اور اپنی پارٹی کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ سیاست میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ زندہ بنیادی اصولوں کی جگہ مردہ وقتی ضابطے کارفرما ہو جاتے ہیں سیاست کار حکومت کی مشین کو اپنی ہوس کے لئے استعمال کرتے ہیں، اور اس ہوس کے زیر سایہ سازشیں اور تخریبی کارروائیاں پھلنے پھولنے لگتی ہیں۔ خیانت، بد دیانتی، جعلسازی، رشوت، مکر و فریب، غارت گری اور ہر قسم کی بد اخلاقیاں عام ہو جاتی ہیں۔ ہماری حکومت پچھلے چند سال اسی لعنت میں مبتلا تھی اگر کچھ دن اور یہی حال رہتا تو حکومت کی کل پاش پاش ہو جاتی۔ ایسی حالت میں انقلاب کا آنا لازم تھا انقلاب آیا بر وقت آیا۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اس طرح آیا کہ کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی۔

اب سیاست کاری کی لعنت اٹھ گئی ہے اور وہ ماحول جس نے زندگی کے تمام شعبوں میں جمود پیدا کر دیا تھا۔ باقی نہیں رہا۔ آپ نے بر وقت اپنی انجمن قائم کی ہے کیونکہ انفرادی کوششیں زیادہ کارگر نہیں ہو سکتیں، اجتماعی قوت بہت بڑی قوت ہے اسی کے بل پر آپ اپنے مقاصد پورا کر سکتے ہیں۔

اس وقت جو فضا ملک میں پیدا ہو گئی ہے اسے غنیمت سمجھنا چاہئے اور اب ہمیں ذہنی اور ادبی جمود کو توڑنے کے لئے وہی کرنا ہوگا جو ٹھارویں صدی میں فرانس میں ان سائی کلو پیڈسٹ (Encyclopaedist) نے کیا تھا۔ اس عالی ہمت، جرأت مند مفکروں کی مختصر جماعت نے علم و حکمت کی شمع روشن کی اور اوہام باطلہ اور خیالات فاسدہ کا قلع قمع کرنا شروع کیا۔ سائنس اور فلسفے کے مسائل اور موضوعات کو نئے پیرائے اور عام فہم زبان میں پیش کیا۔ کائنات اور انسان، ریاست (سٹیٹ) اور معاشرہ، مذہب اور اخلاق کے قدیم نظریات اور روایات کو بڑی جرأت اور آزادی سے عقل و حکمت کی کسوٹی پر کسا اور جملہ علوم انسانی کو از سر نو نئی بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس ان سائی کلو پیڈیا نے خیالات میں تغیر عظیم پیدا کر دیا اور ملک میں بیداری کی نئی لہر دوڑا دی۔ مگر حکومت اور کلیسا دو بڑی قوتیں در پے آزار ہو گئیں، طرح طرح کی سختیاں کی گئیں، تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ حکومت کی طرف سے کتاب کے چھپنے کی ممانعت کر دی گئی، مطبع میں چھپتے وقت مضامین میں تحریف کر کے کتاب مسخ کر دی گئی لیکن باوجود ان تمام موانعات اور مصائب کے ان علم و ادب کے شیدائیوں نے کام جاری رکھا۔ آخر پولیس کی مسلسل ایذا رسانی بے آبروئی اور تعذیب سے تنگ آکر بعض رفیق رفاقت ترک کر کے الگ ہو گئے مگران کے بہادر سرخیل اور رہنما ڈیدرو باوجود ان عقوبتوں کے اپنے عزم پر قائم رہا اور شب و روز جن کی طرح کام کرتا رہا، مضمونوں کو پروف پڑھتے پڑھتے اور مضامین نگاروں کے مسودوں کی اصلاح کرتے کرتے اس کی بصارت میں فرق آگیا۔ مگر اس نے اپنا کام مکمل کر کے چھوڑا۔

ان ان سائی کلو پیڈیا کی مجلدات اب آپ کو اپنے کسی کتب خانے میں نظر نہ آئیں گی اور شاید ہی اب کسی نے اس کی

کوئی کتاب یا اس کے مضامین پڑھے ہوں لیکن ان ہی معتوب اور ستم رسیدہ ادیبوں کے افکار و خیالات نے اس عظیم انقلاب کی راہ ہموار کی جو انقلاب فرانس کے نام سے مشہور ہے۔ جس نے سارے یورپ کو ہلا دیا تھا اور جس کا اثر دور دور تک پہنچا۔ اس پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں اور اب ہر زبان میں اس کی داستان دہرائی جاتی ہے۔

ہماری قوم میں بھی ہماری ہی زندگی میں ایک ایسا ذہنی انقلاب واقع ہو چکا ہے۔ یہ انقلاب سرسید احمد خان کی پرخلوص سرفروشانہ مساعی سے عمل میں آیا۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے قوم کے اس مصلح اعظم کو قریب سے دیکھنے اور کام کرنے کی سعادت حاصل ہے۔ سرسید علیہ الرحمۃ نے ایک شکستہ دل افسردہ اور مایوس قوم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ جمود توڑا، جدید مغربی تعلیم کا ڈول ڈالا توہمات، تعصبات، اوہام باطلہ کی بیخ کنی کی اور عقلیت کی طرف مائل کیا اپنی تحریروں اور مقالوں سے اُردو ادب کا درجہ بلند کر دیا اور سنجیدہ اور حکیمانہ مضامین لکھنے کا ڈھنگ ڈالا۔ یہ کام کچھ آسان نہ تھا۔ ہم اس وقت ان مشکلات کا اندازہ نہیں کر سکتے جو سرسید کو پیش آئیں سرسید نے جس وقت اس منزل میں قدم رکھا تو مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا لعن و طعن سب و شتم کی بوچھار ہونے لگی کفر کے فتوے صادر کر اور ملحد، دجال، کرسٹان کے خطاب عطا ہوئے اس نے سب کچھ سہا اور اپنے عزم پر قائم رہا اور آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور قوم کو ورطۂ غفلت و محرومی سے نکال کر ساحلِ مراد پر پہنچا دیا۔

میں نے ذہنی جمود توڑنے کی دو مثالیں پیش کی ہیں، ایک فرانس کے انسائیکلوپیڈسٹوں کی، دوسری سرسید احمد خان کی۔ آپ نے دیکھا ان عالی ہمت مجاہدوں نے کیسی کیسی سخت مصیبتیں، اور عقوبتیں، رسوائیاں اور ایذائیں برداشت کیں مگر اپنے مقصد سے منہ نہ موڑا یہی نوع انسان کے محسن ہیں اور زندہ جاوید ہیں ہمیں ان سے سبق حاصل کرنا چاہئے صرف انجمن بنا دینا قرار دادیں منظور کر دینا یا حکومت سے امداد حاصل کر لینا کافی نہ ہوگا ہمیں کام کرنا ہوگا۔ کام سے مراد یہ نہیں جو سرکاری دفتروں میں ہوتا ہے کہ ۹ بجے گئے اور ۴ بجے چلے آئے یہ کام جو ہمیں کرنا ہے پوری قوت اور استقلال سے کرنا ہوگا۔ دن رات، گرمی سردی، بارش سے بے نیاز ہو کر کام سے عشق ہونا چاہئے۔ عشق نہیں تو وہ کام نہیں بیگار ہے۔

جو لوگ کسی بڑے مقصد کو لے کر خلوص اور صداقت سے والہانہ کام کرتے ہیں اور اپنی جان تک کھپا دینے کی پروا نہیں کرتے وہ کبھی نہیں مرتے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور جو اپنی جانِ عزیز رکھ کر محنت سے جی چراتے ہیں وہ مردہ ہیں۔

سلطنتوں کے تخت اُلٹ جاتے ہیں، قومیں فنا ہو جاتی ہیں، تہذیبیں مٹ جاتی ہیں لیکن ان کے ادیبوں اور مفکروں کے کارنامے زندہ رہتے ہیں۔ قدیم یونان کو ایران کی جرار فوجوں نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا مگر ان کے حکماء ادباء اور مفکرین زندہ ہیں ان کا کلام بڑے احترام سے پڑھا لیا جاتا ہے اور اس کا ذہنی اور روحانی فیض بدستور قائم ہے۔ اب بھی جب کبھی سائنس یا فلسفہ میں کوئی نیا نظریہ یا ایجاد ہوتی ہے اس کا سراغ کسی نہ کسی صورت سے قدیم یونان میں لگتا ہے اس کے فلسفیوں، صناعوں اور ادیبوں کے نام ہر ملک اور ہر زبان میں زبان زد خاص و عام ہیں حتیٰ کہ ہمارے گھروں میں ہماری عورتیں بچے، افلاطون، ارسطو، سقراط و بقراط کا نام اس طرح لیتے ہیں گویا وہ ہم ہی میں سے تھے۔

ادیب قوموں کی اصل پونجی ہیں اس پونجی کی حفاظت اور نگہداشت قوم کا مقدس فرض ہے۔ ہمارے ادیبوں کا طبقہ کس مپرسی کی حالت میں ہے ان کی محنت رائگاں جاتی ہے ان کی جیسی چاہئے قدر نہیں ہوتی۔ بہت سے ایسے نوخیز ادیب ہیں کہ ان کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملتا ایسی تصانیف گمنامی کی نذر ہو جاتی ہیں جو قابلِ قدر ہوتی ہیں ایک ادیب شب و روز کی محنت اور دماغ سوزی سے اور بعض اوقات فاقے کر کے اپنی بساط کے مطابق کوئی چیز تخلیق کرتا ہے اور یہ ہر وقت اس کی اشاعت کی سبیل نکالتا ہے یہ دیکھ کر اسے

ت مدد ہوتا ہے کہ ایک دوسرا شخص یا ناشر بغیر اجازت اسے چھاپ کر فائدہ اٹھالیتا ہے اور ادیب کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ عدالت سے رجوع کرے۔ لیکن انصاف اتنا مہنگا ہے کہ اس کے مصارف اس کی استطاعت سے باہر ہیں پھر عدالت کا چکر بے ڈھب ہوتا ہے۔ کئی کئی مہینے بعض اوقات کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اس معاملہ میں بھارت اور پاکستان کے تعلقات بھی بہت تکلیف دہ ہیں، بھارت والے پاکستانیوں کی اور پاکستانیوں کی کتابیں بھارتی بلا تکلف شائع کرتے ہیں۔ یہاں قانونی چارہ جوئی بھی نہیں ہو سکتی، غرض ادیبوں کا مال بے ادبوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ اور اس قسم کی بہت سی خرابیاں اور بدعنوانیاں ہیں جن کی اصلاح صرف آپ کی انجمن کر سکتی ہے۔

اب آپ نے جب انجمن بنائی ہے تو اس کے ذریعہ ادب کی ترقی کے مختلف منصوبے عمل میں لا سکتے ہیں، ادب اور ادیبوں کے حقوق ادیبوں اور ناشروں کے تعلقات سے متعلق تجویزوں پر غور کر کے ضروری اور مناسب انتظام کر سکتے ہیں غرض ادب اور ادیبوں سے متعلق اس قسم کے تمام معاملات اسی انجمن کے ذریعہ طے ہو سکتے ہیں۔

ادب ایک شریف پیشہ ہے اس کی شرافت پر آنچ نہ آنے دیجئے۔ راستی اور خلوص آپ کا شعار ہونا چاہئے۔ آپ ادب کے ذریعہ قوم کے اخلاق اور کردار بنانے، روشن خیالی پھیلانے اور باطل خیالات اور اوہام کی تاریکی مٹانے میں بہت بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں اپنے پیچھے ایسی یادگار چھوڑ جائیے کہ آئندہ نسلیں اس سے فیض حاصل کرتی رہیں۔

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

مل کر کام کرنے میں بڑی برکت ہوتی ہے خدا کرے آپ کی یہ انجمن ادیبوں کے لئے بابرکت اور قوم کے حق میں مفید ثابت ہو۔

ڈاکٹر مولوی عبد الحق کی تقریر کے بعد مندرجہ ذیل حضرات نے مقالے پڑھے

مقالہ نگار	موضوع
ڈاکٹر جاوید اقبال	ادیب، قوم پرستی اور لادینیت
ڈاکٹر سید سجاد حسین	مشرقی پاکستان میں ادیبوں کے مسائل
پروفیسر ممتاز حسین	ہماری تہذیبی جد و جہد
پروفیسر ابو رشید	مشرقی پاکستان کا تخلیقی ادب

۲۹ جنوری ۱۹۵۹ء

صدرِ مملکت کا خطبہ

(تلخیص و ترجمہ از اخبارات)

مجھ سے کہہ دیا گیا تھا کہ مجھ سے کسی تقریر کے لئے نہیں کہا جائے گا، اور اسی لئے میں نے اپنی کرسی آرام سے سنبھال لی۔ اب مجھے مجبور کر دیا گیا ہے کہ میں کچھ کہوں۔ میں تقریر پر تیار نہیں ہوں اور ایسے لیے اہل علم و فضل سامنے ہیں۔ مجھے اعتراف کر لینا چاہیئے کہ میں آپ کی کارروائیوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ آج ادیبوں کو بہت سی مشکلات درپیش ہیں لیکن حال ہی پورا ملک چند در چند مشکلات میں گرفتار ہے۔ یہ مشکلات عارضی ہیں مگر ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ ہم مل جل کر بہت جلد انہیں دور کر دیں گے۔

مجھے یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ آپ کے مقررین میں تخلیقی اور بے باک خصوصیات نمایاں تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خصوصیات پاکستان کے استحکام اور عظمت کے لئے بہت کام آئیں گی۔

ایک طرح کی سادہ زبان میں پاکستان کا نصب العین بہت واضح ہے۔ انسانوں کے لئے بہتر سے بہتر آرام دہ بھرپور اور مکمل زندگی۔ ایک مضبوط اور ترقی پسند معاشرہ۔ اس کے لئے ہمیں گہری بنیادوں پر منصوبہ بندی اور مخلصانہ اور مسلسل کام کی ضرورت ہے اور میں جانتا ہوں کہ ہمارے عوام میں گیارہ برس کی خرابی کے باوجود ایک نہایت نمایاں استطاعت اور روح بیداری موجود ہے جسے بروئے کار لانے کا موقع ملنا چاہیئے۔ ہمیں ایک مضبوط لائحہ عمل پر حقیقت پسندی اور تسلسل کے ساتھ دو تین قرن تک چلنا پڑے گا۔

کام کا مطلب یہ نہیں کہ صرف عمال حکومت یا فیکٹریوں کے مزدور ہی کام کریں۔ ہم میں سے ہر ایک کو کام کرنا پڑے گا ہر کام کرنے والا ــــ ایک فاکروب تک ــــ اپنے کام میں ترقی کر سکتا ہے۔ وہ پاکستان کی تشکیل میں ایک اہم کردار

کی حیثیت رکھتا ہے اسے اپنے بہتر کام پر فخر کرنا چاہیئے۔
ان کام کے سلسلے میں ہمیں اعتماد ہونا چاہیئے کہ ہم درست کام کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں ادیب اور دانشور بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ بڑھتی ہوئی مادیت کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹا سکتے ہیں۔ گو ہم اس عالم میں مادیت کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے مگر ہم اسکی قوت کو اسلامی نظریات کے تابع کر سکتے ہیں تاکہ جلد اپنی منزل کی طرف پہنچ سکیں۔
پہلے انسانی جسموں کے لئے جنگیں ہوتی تھیں آج ذہن انسانی کی تسخیر کے معرکے بپا ہیں۔ اس سلسلے میں آپ پر بہت سے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ قرون وسطیٰ میں واپس نہیں جا سکتے لیکن آپ ذہن جدید کی زبان میں صالح نصب العین کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ دنیا بہت مختصر ہوتی جا رہی ہے اور ہمیں سب کو اس میں اپنی جگہ قائم رہنا اور اپنا کردار ادا کرنا ہے۔
کسی نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے کہ سنسر کے قانون کا وجود تخلیقی قوتوں کو دبا دیتا ہے۔ ہاں یہ ناخوشگوار بات ہے لیکن اگر کوئی حکومت واقعی حکومت کہلانے کی اہل ہے تو اسے آٹھ کروڑ انسانوں کے تحفظ کی ذمہ داری پوری کرنی پڑے گی۔
آج بیچ کنی ایک بڑا خطرہ ہے اور اگر کوئی شخص اپنے وطن میں غیر ملکی مفادات اور غیر ملکی نصب العین کی پرورش کرتا ہے تو وہ یقیناً اپنے ملک کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ یہ ایک افسوسناک صورتحال ہوگی جس کا مقابلہ بے جھجک اور مضبوط دل سے کرنا پڑے گا۔
خواہ کوئی ادیب اتنا بڑا ہو کہ وہ مریخ سے باتیں کرے اگر اس نے مادر وطن کی سالمیت کے خلاف کام کیا تو میں اپنے فرض میں کوتاہی کروں گا اگر اس سے بازپرس نہ کروں۔
میری کوشش یہ رہی ہے کہ لوگوں کو اپنے نئے کام کرنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ان کی مدد کی جائے آپ خود دیکھیں گے کہ آپ کو اپنے لائحہ عمل پر چلنے سے کوئی نہیں روکے گا ہر شخص کو سوچنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیئے اور ہم آپ کے لئے جو کچھ ممکن ہے کریں گے۔
آج کے نئے پاکستانی ڈھانچے کی زبان بدقسمتی سے مارشل لاء کی زبان ہے لیکن ہم نے اسے نرم سے نرم تر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے آپ اسے پسند کرتے ہوں لیکن اگر آپ پختون اور طریق کار پر غور کرتے رہیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہم بہت جلد اسے ایک علیحدہ لائحہ عمل میں بدل دیں گے جس سے انعرام ریاست کے ضوابط مرتب ہو جائیں گے اور جس سے پاکستان کی عظمت و خوشحالی کے مواقع بڑھتے رہیں گے۔
میں نے آپ کا بہت وقت لیا مگر میں آج بہت متاثر ہوا ہوں آپ نے جو انجمن بنائی ہے اس کے لئے آپ کو بہت سی مشکلات پیش ہوں گی۔ جیسا کہ بے طور پر کہیں نہ کہیں سے دس ہزار روپیہ کا انتظام کرانا ہوگا جو میں اپنی پیشکش کے طور پر دیتا ہوں۔ مگر از راہ کرم یقین کیجئے کہ میں جواب میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا۔ آپ اسے کسی مقصد کے لئے جس طرح چاہیں خرچ کیجئے۔

اراکین عبوری مرکزی مجلس عاملہ

۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء تا ۲۳ اپریل ۱۹۶۱ء

مرکزی عہدہ داران

سکریٹری جنرل —————— قدرت اللہ شہاب

اعزازی خازن —————— عبدالعزیز خالد

اعزازی افسر رابطہ —————— جمیل الدین عالی

حلقہ کراچی سے

جمیل جالبی

شاہد احمد دہلوی

شوکت صدیقی

غلام عباس

قرۃ العین حیدر

۱- ابن سعید —————— علاقائی معتمد

۲- طفیل احمد جمالی

حلقہ مغربی پاکستان سے

احمد راہی

اعجاز بٹالوی

امیر حمزہ شنواری

سید فارغ بخاری

سید وقار عظیم

شیخ ایاز

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

ہاجرہ مسرور

اشفاق احمد —————— علاقائی معتمد

حلقہ مشرقی پاکستان سے

ابوالحسین

ابراہیم خان

دیوان محمد اشرف

ڈاکٹر عبدالحی

سجاد حسین

سید ولی اللہ

بیگم شمس النہار محمود

عبدالقادر

عسکر ابن شیخ

غلام مصطفےٰ

متین الدین احمد —————— علاقائی معتمد

نوٹ:- مندرجہ بالا فہرست حروف تہجی کے مطابق ہے۔

مرکزی مجلس عاملہ کے پہلے اجلاس کی کارروائی

یکم فروری ۵۹ء

۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو انتخابات کے فوراً بعد منتخب شدہ اراکین مجلس عاملہ (مرکزی) نے طے کیا کہ دستور کی دفعہ ۵ (ii) کے اختیارات کے ماتحت مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس یکم فروری ۱۹۵۹ء کو ۱۱ بجے دوپہر کے جی۔ اے۔ ہال کراچی میں منعقد کیا جائے۔

اجلاس ۱۱ بجے شروع ہوا اور مندرجہ ذیل اراکین نے شرکت کی:

جسیم الدین۔ ڈاکٹر سجاد حسین۔ ولی اللہ۔ بیگم ہاجرہ مسرور۔ اشفاق احمد۔ اعجاز بٹالوی سید وقار عظیم۔ شاہد احمد دہلوی۔ جمیل جالبی۔ امیر حمزہ شنواری۔ غلام عباس۔ احمد راہی۔ عبد العزیز خالد۔ شوکت صدیقی۔ قدرت اللہ شہاب۔ میجر ابن الحسن، افضل الدین عالی نے خصوصی دعوت پر شرکت کی۔

جناب جسیم الدین نے اس اجلاس کی صدارت کی۔

مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں:

قرارداد ۱:- سکریٹری جنرل کو اختیارات دیے گئے کہ وہ
(i) ادارہ کے دفتر کے لئے کوئی مناسب جگہ کرایہ پر لیں۔
(ii) ایسے لوگوں کا مناسب عہدوں پر تقرر کریں جن کو وہ ضروری سمجھتے ہوں۔
(iii) ادارے کے قیام کے لئے ضروری صرف کریں۔

قرارداد ۲:- سکریٹری جنرل کو ہدایت دی گئی کہ وہ پاکستان رائٹرز کنونشن ۱۹۵۹ء کی منظور شدہ قراردادوں کی تعمیل کے لئے کارروائی کریں۔

قرارداد ۳:- سکریٹری جنرل کو اختیار دیا گیا کہ وہ دستور کے منظور شدہ تینوں علاقائی دفاتر کو ذاتی طور سے یا نمائندوں کے ذریعے قائم کریں۔

قرارداد ۴:- قلمکار اراکین سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنی تمام غیر مطبوعہ تخلیقات کی تفصیلات سے مرکزی دفتر کو مطلع کریں تاکہ پبلشنگ ہاؤس کے لئے من حیث المجموع ہر زبان اور ہر علاقے کا خاکہ تیار کیا جا سکے۔

عبوری علاقائی مجلس عاملہ

جنوری ۱۹۵۹ء تا اپریل ۱۹۶۰ء

حلقہ کراچی

معتمدین:۔

۱۔ ابن سعید ۔ اگست ۱۹۵۹ء تک
۲۔ عباس احمد عباسی (معاون سکریٹری) اپریل ۱۹۶۰ء تک
۳۔ طفیل احمد جمالی سکریٹری جنوری ۱۹۶۰ء سے

خازن:۔

انور

اراکین:۔

ابن انشا
ابوالاثر حفیظ جالندھری
شان الحق حقی
ڈاکٹر شمیم عصمت ارشاد
عباس احمد عباسی
فخر ماتری
قمر جمیل
مولانا ماہر القادری
مسز جہاں بیگم تیموری
ممتاز حسین
یونس احمر

(نوٹ:۔ مندرجہ بالا فہرست حروف تہجی کے مطابق ہے)

علاقائی مجلس عاملہ برائے سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء

مشرقی پاکستان

متین الدین احمد — علاقائی سکریٹری

عبدالقادر — علاقائی خازن

اے۔ کے۔ ایم امین الاسلام
بے نظیر احمد
تعلیم حسین
سیّد نورالدین
شمس الدین ابوالکلام
بیگم صوفیہ کمال
خان بہادر عبدالرحمٰن خاں
عبدالرشید
محمد برکات اللہ
ڈاکٹر محمد شہید اللہ
نورالمومن

☆

نوٹ :۔ مندرجہ بالا اسماء کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے ۔

حلقہ مغربی پاکستان

اشفاق احمد ———— سیکرٹری
بشیر محمد اختر ———— خازن

احمد فراز
تجمل حسین
جمیل ہاشمی
سجاد باقر رضوی
ظہور نظر
فقیر محمد فقیر
قتیل شفائی
قلندر مومند
ڈاکٹر محمد صفدر میر
یوسف ظفر

(مندرجہ فہرست حروفِ تہجی کے مطابق ہے)

حلقہ کراچی کی ثقافتی سرگرمیوں کی ایک جھلک۔

شام غزل

اوپر: حاضرین کا ایک حصہ — نیچے: دیناز منوالا حسرت کی غزل گارہی ہ

ڈاکٹر احسن فاروقی شام غزل کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے۔ فضلی صاحب
صدارت فرمارہے ہیں — ان کے ساتھ طفیل احمد جمالی سکریٹری
حلقہ کراچی بیٹھے ہیں

جمیل الدین عالی گجراتی ذیلی حلقہ کا افتتاح کر رہے ہیں

ملتان کا گلڈ ہوٹل

معطی
حاجی حمید الدین

عبدالرحمان خاں
بر در رشد ہیں

ملتان کے ادیبوں کی طرف سے عصرانہ

گلڈ گھر (
۱۵ جنو

مرکزی عاملہ

کا

دوسرا اجلاس

۴ - ۵ رجولائی ۱۹۵۹ء

(لاہور)

(پہلی نشست)

مرکزی مجلس عاملہ کا دوسرا اجلاس صبح نو بجے ۴ر جولائی ۱۹۵۹ء الحمرا، لاہور میں منعقد ہوا۔ مندرجہ ذیل اراکین نے شرکت کی۔

احمد راہی ۔ اعجاز حسین بٹالوی ۔ اشفاق احمد ۔ امیر حمزہ شنواری ۔ جسیم الدین ۔ دیوان محمد اظہر رف۔
سید وقار عظیم ۔ شاہد احمد دہلوی ۔ بیگم شمس النہار محمود ۔ شوکت صدیقی ۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
عبدالقادر ۔ عبدالعزیز خالد ۔ غلام عباس ۔ غلام مصطفیٰ ۔ فارغ بخاری ۔ قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب
متین الدین احمد ۔ ہاجرہ مسرور ۔

اعزازی افسر رابطہ جمیل الدین عالی بھی شریک تھے جنہوں نے مرکز کی رپورٹ پڑھی۔

اجلاس کی صدارت کے لئے جناب شاہد احمد دہلوی کا انتخاب ہوا۔

سیکرٹری جنرل نے مرکزی مجلس عاملہ کے سابقہ اجلاس منعقدہ یکم فروری ۱۹۵۹ء کی کارروائی پڑھ کر سنائی جس کی توثیق کی گئی۔

سرگرمیوں کا جائزہ

(۱) مرکزی دفتر ۔ مرکزی دفتر کی رپورٹ پیش کی گئی ۔ جو مندرجہ ذیل ہے ۔

مرکزی دفتر کی رپورٹ - یکم فروری ۱۹۵۹ء تا ۳۰ جون ۱۹۵۹ء

اس دفتر کا سب سے پہلا کام ادارے کو کسی مناسب قانون کے تحت رجسٹر کرانا تھا۔ کونشن میں شریک ہونے والے اراکین نے بار بار یاد دہانی کے باوجود درخواستوں پر چار جگہ دستخط نہیں کئے۔ اس لئے درخواست پر سات اراکین کے دوسرے گروپ نے دستخط کئے اور ادارہ کا رجسٹریشن سوسائٹیز ایکٹ ۱۸۶۰ء (Societies Act 1860) کے تحت ہو گیا۔ جس کی رو سے کونشن میں شریک ہونے والے اراکین قرارداد کے مطابق بنیادی اراکین قرار پائے۔

۲۔ مرکزی دفتر نے ادارے کو انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء (Income Tax Act - 1922) کے قاعدہ ۱۵۔ ڈی کے فوائد حاصل کرنے کے لئے وزارت مالیات (ریونیو ڈویژن) میں اندراج کرالیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مرکز، علاقوں اور شاخوں کو عطیے دینے والے اپنے عطیہ کی حد تک انکم ٹیکس سے مستثنیٰ رہیں گے۔

۳۔ دفتر ہذا نے مندرجہ ذیل مقامات پر علاقائی شاخوں کی تشکیل کی:

۱۔ کراچی ۔۔۔ ۱۱ر فروری ۱۹۵۹ء کو اپنی نگرانی میں

۲۔ ڈھاکہ ۔۔۔ ۲۴ر فروری ۱۹۵۹ء " " "

۳۔ لاہور ۔۔۔ ۸۔ مارچ ۱۹۵۹ء کو بنیادی اراکین کی نگرانی میں

۴۔ دفتر ہذا نے پاکستان رائٹرس کنونشن ۱۹۵۹ء کی قرارداد (برائے کاپی رائٹ) کی پُرزور حمایت کی۔ نتیجتہً کچھ مدت میں کاپی رائٹ قانون معرض وجود میں آجائے گا۔ اس سلسلہ میں اخبارات میں آئے دن خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

۵۔ دفتر ہذا کو اُمید ہے کہ وزارت اطلاعات، نیئے پاکستان اور کچھ اداروں میں جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں، بہت جلد اٹھالی جائیں گی۔ حالانکہ افراد متعلقہ ان پابندیوں کے معترف نہیں ہیں۔ مگر وہ بہترین تخلیقی کاوشوں کی مناسب نیابت کا انتظام کر رہے ہیں اور اُمید ہے کہ بہت جلد اس موضوع پر واضح احکامات صادر کر دیئے جائیں گے۔

۶۔ دفتر ہذا نے قانونی صلاح و مشورے کے لئے وکلاء کی ایک فرم کی مفت خدمات کا انتظام کر لیا ہے۔ ایک معاملہ میں ایک ناشر کے خلاف جس پر ہمارے ادارے کے ایک رکن کو دھوکا دینے کا الزام ہے نوٹس بھیجا جا چکا ہے۔ اس دفتر کے خیال میں یہ ایک علاقائی کام ہے کیونکہ قانونی موشگافیوں کے لئے مقامی معاہدہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

کراچی کے ایک رکن کا ایک اخبار کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا ایک معاملہ بھی زیر غور ہے۔

۷۔ کراچی میں ادارے کے اراکین کے لئے سات ڈاکٹروں چار ماہرین اور چار لیڈی ڈاکٹروں کا انتظام اعزازی طور سے کر لیا گیا ہے جو اراکین کو ہفتے میں ایک گھنٹہ دیا کریں گے۔

اس دفتر کی رائے میں یہ کام بھی علاقائی دفاتر کے کرنے کا ہے اور اس معاملے میں علاقائی دفتر کو کام آگے بڑھانا چاہیئے۔ دوسرے علاقوں میں بھی اپنے اپنے علاقوں میں رہنے والے اراکین کے مفاد کے لئے اس کام کی بنا ڈالنا چاہیئے۔

۸۔ تمام بنیادی اراکین جن کی عمر ۶۰ سال تک ہے، ان کی زندگی کا بیمہ پانچ ہزار روپے میں کرا دیا گیا ہے۔ یہ روپے صرف انتقال کے بعد ہی مل سکیں گے۔ اس اسکیم پر ایک نوٹ پیش کیا جا رہا ہے۔

۹۔ ایوانِ اشاعت کے بارے میں مرکزی عاملہ کے غور و خوض کے لئے ایک اسکیم بنائی ہے۔ یہ اسکیم ایجنڈے پر ہے۔

۱۰۔ مرکزی حکومت کو ادارے کے لئے ساٹھ ہزار روپے کے عطیے کے واسطے رضامند کر لیا گیا تھا۔ اس عطیہ کا اعلان امسال کے بجٹ [میں] کر لیا ہے۔ لیکن ہم اس عطیے کے بارے میں مزید کچھ نہیں جانتے کیونکہ ابھی حکومت سے کوئی مراسلہ موصول نہیں ہوا ہے۔

۱۱۔ اس دفتر نے حکومت سے ایوانِ اشاعت کے لئے ایک لاکھ روپے کے قرض کے لئے گفت و شنید شروع کی ہے۔ اُمید ہے کہ [چند] دنوں میں یہ قرض مل جائے گا۔

۱۲۔ علاقوں میں بالکل کام نہ ہونے کی وجہ سے اور ملک کے ہر گوشے سے بے حد اصرار پر اس دفتر نے ادیبوں کو ادارے کے رکن [بننے] میں مدد دینے کے لئے ۵۰ کنوینروں کو مقرر کیا۔ رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ مندرجہ ذیل مقامات پر ذیلی شاخیں ہو گئی ہیں۔

کراچی	-	بنگلہ - گجراتی
ڈھاکہ	-	اُردو
حیدرآباد	-	سندھی - اردو
سکھر	-	سندھی - اُردو
کوئٹہ		اُردو - بلوچی
ملتان		اُردو
راولپنڈی		اُردو - پنجابی -

دوسری ذیلی شاخیں زیرِ تکمیل ہیں۔
درخواستوں کی جانچ پڑتال علاقائی موضوع ہے۔

۱۳۔ ایک غیر ملکی انجمن ادبا نے ہمارے ایک ممبر کو بلایا تھا۔ مگر دعوت نامہ کو استعمال نہیں کیا جا سکا۔ کیونکہ ابھی طریقِ نیابت کے [بارے] میں وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ یہ موضوع مرکزی عاملہ کے زیرِ بحث آئے گا۔

۱۴۔ یونسکو مرکز کراچی سے سلسلہ جنبانی شروع کر دی گئی ہے۔ چونکہ اس دفتر کے ڈائرکٹر باہر تشریف لے گئے ہیں۔ اس وجہ سے [با]ت آگے نہیں بڑھی ہے۔ انھوں نے ہم سے باہمی معاملات طے کرنے کے لئے ذاتی گفت و شنید کے لئے زور دیا ہے۔ اس پر جولائی کے [پہلے ہفتے] ہفتے میں کچھ کیا جائے گا۔

۱۵۔ مرکزی دفتر بغیر کسی فنڈ کے کھل گیا تھا۔ پاکستان رائٹرس کنونشن ۱۹۵۹ء کے کنوینروں کو اپنی تمام بچت مبلغ پانچ ہزار چار سو بیالیس روپے [اد]ارہ کو عطیہ دینے پر رضامند کر لیا گیا تھا۔ اس دفتر کو کوئی اور عطیہ کسی قسم کا کہیں سے موصول نہیں ہوا۔ بالاستثنائے مذکورہ بالا جس کا اعلان مارچ ۵۹ [میں] کیا گیا۔ صدرِ پاکستان کا دس ہزار روپے کا عطیہ دستور کی مطابقت میں تین شاخوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس وجہ سے اس دفتر میں کچھ نہیں رہا۔

اس دفتر نے اب تک تین ہزار تین سو چھبیس روپے خرچ کئے۔ تفصیلات متعلقہ نقشے میں ہیں۔

حلقوں کے بارے میں

اس دفتر کو اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ اپنے معاملات و سرگرمیوں میں حلقے بالکل آزاد ہیں بہر صورت چونکہ ادارہ من حیث المجموع ارکین، معطین اور عوام الناس کو جواب دہ ہے، اس لئے حلقے کی کارگزاریوں کے [بارے میں] کچھ لکھنا ناگزیر ہے۔

یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ سوائے حلقۂ مشرقی پاکستان کے کسی دوسرے حلقہ میں ابھی تک کسی شعبے میں زندگی کے کچھ آثار نظر نہ
ثقافتی یا انتظامی امور تو ایک طرف رہے حلقۂ کراچی اور حلقۂ مغربی پاکستان نے تو ابھی تک بینک میں اپنا کھاتہ بھی نہیں کھولا ہے۔ حلقۂ کراچی کو
ڈھائی ہزار روپیہ کا ایک چیک دیا گیا تھا۔ جو ابھی تک رقم میں تبدیل نہیں کرایا جا سکا ہے۔ ان دو حلقوں نے باوجود بہت اہم معاملات ا
کی یاد دہانی کے مرکز کو ایک خط بھی نہیں لکھا ہے۔ اراکین کو کسی بھی قسم کے سوالات کے جواب نہ ملنے کی عام شکایت ہے۔

کسی بھی حلقے سے چندہ جمع ہونے کی اطلاع نہیں ملی ہے۔ حلقۂ مشرقی پاکستان میں ابھی یہ سوال ہی معرضِ بحث میں ہے کہ آیا ف
مرکز وصول کرے گا یا حلقہ۔ حالانکہ یہ کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔

کسی بھی حلقے سے کسی بھی قسم کی ثقافتی کارگزاری کی اطلاع موصول نہیں ہوئی ہے۔

متفرقات

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب ایجنڈے کے لئے نوٹس بھیجا گیا اور بعدہٗ جب ایجنڈہ بھیجا گیا تو مرکزی عاملہ کے
اراکین نے رسید تک نہ بھیجی نہ ایجنڈے یا کسی اور معاملے کے لئے کسی قسم کی تجویز پیش کی۔ اراکین سے توقع تھی کہ وہ
اخراجات کے بل پیشگی ہی بھیج دیں گے۔ لیکن کسی نے پرواہ تک نہ کی۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے ادارے کے سلسلہ میں کسی قسم کی کا
کا مظاہرہ نہیں کیا۔

(۱۱) علاقائی دفتر

(الف) حلقۂ مغربی پاکستان کی رپورٹ علاقائی سیکرٹری نے زبانی طور سے پیش کی۔ اراکین نے حلقۂ مذکور کی
بے عملی پر متنبہ کیا اور ہدایت کی کہ وہ سرگرمی سے کام شروع کرے۔

(ب) حلقۂ کراچی کی رپورٹ محترمہ قرۃ العین حیدر نے پیش کی۔ چونکہ حلقۂ مذکور کے سیکرٹری تشریف نہ لا سکے تھے۔ معلوم ہوا کہ حلقۂ کرا
بھی درحقیقت کوئی سرگرمی نہیں دکھائی۔ علاقائی مجلس عاملہ کو متنبہ کیا گیا اور یہ ہدایت کی گئی کہ وہ سرگرمیاں شروع کرے۔

(ج) حلقۂ مشرقی پاکستان کی رپورٹ علاقائی سیکرٹری نے پڑھی۔ کچھ اراکین نے اُسے اطمینان بخش قرار دیا۔ اور کچھ اراکین نے ان
اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اراکین علاقائی مجلس عاملہ نے اپنے فرائض کما حقہٗ ادا نہیں کئے۔

(د) مختلف ہدایات پر غور کیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ تمام ملک کے ادیبوں میں جذبۂ اخوت کی نشوونما کی جائے، اور ا
تدابیر اختیار کی جائیں کہ تمام ادیب ایک دوسرے کو انفرادی اور اجتماعی طور پر ذاتی مشکلات کے حل کرنے میں مدد دیں۔ حلقوں کو
کی گئی کہ وہ ادبی نشستوں کا سلسلہ شروع کریں اور مرکز کو اپنی سرگرمیوں سے مطلع رکھیں۔

۴ - انشورنس اسکیم کا انتظام :- ۱۱ اراکین کو مروجہ اسکیم پر مندرجہ ذیل نوٹ بھیجا گیا تھا۔

بیمہ اسکیم پر نوٹ
۲۹ جون ۱۹۵۹ء

ادارۂ مصنفین پاکستان کے ہر رکن (دو سو بارہ) کا جس کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز نہیں کر چکی ہے، ۱۱ جون
سے فی کس پانچ ہزار روپے کے حساب سے زندگی کا بیمہ ہو گیا ہے۔ چاہے اسباب انتقال کچھ ہی ہوں۔
اس عجیب اسکیم کے ماتحت، ادارے کا بحقیقت بیمہ کیا گیا ہے، اور انفرادی طور سے تمام اراکین اس سلسلہ میں طبی معائنوں، اور
لوازمات سے بری الذمہ ہیں۔ اور جب تک کہ ایک ادیب "ادارے" کا رکن ہے اس کی زندگی بیمہ شدہ ہے۔

بیمے کی پہلی قسط مبلغ بارہ ہزار چھ سو تیرہ روپے ادا کئے جا چکے ہیں۔ یہ رقم بینک آف بہاولپور سے دو ذاتی تمسکات پر قرض لی گئی
مرکزی دفتر نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ بیمے کی قسط کی رقم کی دائمی طور سے منظوری دیدے۔ بہر صورت کسی طرح بھی انفرادا
سے اس بیمے کے لئے کسی رکن سے پانچ روپیہ ماہوار سے زیادہ قسط نہیں وصول کی جائے گی۔ اور ان میں سے ایسے اراکین جن کا خیمہ

بھی نہیں ہے، ان کی قسطوں کی ادائیگی ادارہ اپنے مرکزی فنڈ (۱۰۰۰ روپے) سے کرے گا۔ قسطوں کا نقشہ مندرجہ ذیل ہے۔

بیمہ پالیسی کی برسی پر سب سے قریبی جنم دن	سالانہ قسط
چالیس سال تک	۵۰ روپے
اکتالیس سے ۵۰ سال تک	۷۰ "
اکیاون سے اُنسٹھ سال تک	۱۰۰ "

یہ اسکیم بعینہ یہی فوائد ان درخواست دہندوں کے لئے بھی مہیا کرتی ہے جس وقت وہ ادارے کے اراکین کی حیثیت سے لئے جائیں۔

۲۔ موجودہ اسکیم کے ماتحت قسطوں کو (maturity) بلوغ کے بعد واپس نہیں دیا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی اسکیم کے لئے بہت ملیں درکار ہیں۔ یعنی تیس سال سے کم عمر والے اراکین کے لئے ایک سو پچیس روپے۔ چالیس سال سے کم عمر والے اراکین کے لئے ایک سو پچاس روپے، سال سے کم عمر والے اراکین کے لئے ایک سو پچھتر روپے اور ساٹھ سال سے کم عمر والے اراکین کے لئے دو سو روپے کی سالانہ قسطیں متعین ہوں گی۔ آئندہ پالیسی میں موجودہ سے بہتر شرائط حاصل ہونے کی اُمید ہے۔

۳۔ اب مرکزی دفتر یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آیا تمام اراکین سے ان کی عمر کے لحاظ اور مناسبت سے جو قسط قابل وصول ہے وہ وصول کرنی چاہیئے، اراکین کے لئے قسط کی ایک ہی رقم مقرر کر دی جائے جو ان تمام قسطوں کا اوسط ہو۔ نیز یہ بھی کہ آیا یہی پالیسی نئے اراکین کے لئے بھی اختیار کی جائے لئے پالیسی میں گنجائش رکھی گئی ہے۔

مرکزی دفتر کے زیر غور یہ مسئلہ بھی ہے کہ ان اراکین کو بھی جو ساٹھ سال سے تجاوز کر گئے ہیں، یہی مراعات اور فائدے بہم پہنچائے جائیں۔

اس نوٹ پر غور و خوض کیا گیا۔ اور اراکین نے اسکیم کو منظور کر لیا۔ لیکن اراکین کا یہ خیال تھا کہ مرکز Endowment اور Retirement Pension پالیسی کا انتظام بہت سستے نرخ پر کرے جو معذوری اور بیماری کا احاطہ بھی کر سکے۔ جب تک کہ ادارے کے حالات اس بار کے متحمل نہیں ہو سکتے موجودہ پالیسی کو جو صرف "موت پر معاوضہ" پر مبنی ہے جاری رہنے دیا جائے تاکہ یہ مراعات نئے اراکین کو مل جائیں۔

سیکرٹری جنرل کی ایما پر یہ طے پایا کہ کسی ممبر کو سے بیمہ اسکیم کے سلسلہ میں پانچ روپے ماہانہ سے زیادہ نہ لیا جائے اور وہ اراکین جن کا ذریعہ معاش نہیں ہے اس سے مستثنیٰ کر دیئے جائیں۔ اور ادارہ تمام اخراجات اپنے تمام معاشی وسائل سے اٹھائے۔

۵۔ اِشاعت گھر (پبلشنگ ہاؤس) کی تشکیل : (الف) یہ قرار پایا کہ ہر علاقے کی ایک علاقائی مجلس مطبوعات (ریجنل کمیٹی) ہو گی جو مندرجہ ذیل اراکین پر مشتمل ہو گی۔

(i) دو اراکین علاقائی مجلس عاملہ

(ii) دو عام اراکین جو اس علاقہ ہی سے تعلق رکھتے ہوں۔

(iii) ایک رکن مرکزی مجلس عاملہ جو اس علاقہ میں مقیم ہو

(iv) اس کے علاوہ جہاں ضرورت محسوس کی جائے پاکستان کے کسی علاقے کے متعدد ماہرین لسانیات شامل کئے جا سکتے ہیں۔

(ب) مزید قرار پایا کہ اس طرح کی تشکیل شدہ علاقائی مجلس مطبوعات مسودہ ملنے کے چھ ہفتوں کے اندر اس کے بارے میں مرکزی مجلس مطبوعات (سنٹرل پبلیکیشنز کمیٹی) کو اپنی سفارشات سے آگاہ کرے گی۔ مرکزی مجلس مطبوعات مندرجہ ذیل اراکین پر مشتمل ہوگی۔

(i) تین اراکین مرکزی مجلس عاملہ

(ii) دو اراکین عام

(iii) اس کے علاوہ جہاں ضرورت محسوس کی جائے ایک یا کئی ماہرین لسانیات شامل کئے جا سکتے ہیں۔

قواعد انتخاب مسودہ جات

(ج) مزید قرار پایا کہ اگر علاقائی مجلس مطبوعات کسی مسودے کو رد کر دے گی تو مصنف متعلقہ کو اس کے خلاف مرکزی مجلس مطبوعات میں اپیل کرنے کا حق ہوگا۔ مرکزی مجلس مطبوعات کا فیصلہ آخری ہوگا۔

(د) مزید قرار پایا کہ علاقائی سیکرٹری علاقائی مجلس مطبوعات کے کنوینر ہوں گے اور سیکرٹری جنرل مرکزی مجلس مطبوعات کا کنوینر ہوگا

(س) مزید قرار پایا کہ اگر کوئی رکن مندرجہ بالا مجلس مطبوعات میں کام نہیں کرنا چاہتا یا اس کے اجلاس سے غیر حاضر رہتا ہے تو سیکرٹری جنرل کو اختیار ہوگا کہ وہ بغیر کسی اطلاع کے اس کی جگہ دوسرے رکن کو مقرر کر دے۔[1]

مختلف مجالس مطبوعات کے اراکین کے تقرر کے لئے ۵ جولائی ۱۹۵۹ء کو غور کیا جائے گا۔

نئے اراکین کا داخلہ

کراچی سے گجراتی، بنگالی اور اردو کے ادیبوں کی اور مشرقی پاکستان سے اردو اور بنگالی کے ادیبوں کی درخواستوں پر غور کیا۔ علاقائی مجالس عاملہ کی منظور شدہ تمام درخواستوں کو منظور کر لیا گیا۔ اور مرکز نے از خود کسی درخواست کو رد یا منظور نہیں کیا۔ مغربی پاکستان کے ادیبوں کی اس دن درخواستیں پیش نہیں کی گئیں۔ لہٰذا علاقائی سیکرٹری کو ہدایت دی گئی کہ وہ ان درخواستوں کو ۵ جولائی ۱۹۵۹ء (اگلے دن) کو ضرور پیش کر دیں۔ علاقائی سیکرٹری نے اطلاع دی کہ علاقائی مجلس عاملہ ۵ جولائی ۱۹۵۹ء کو تمام موصول شدہ درخواستوں پر غور کرے گی۔ اور انہیں اسی دن ۳ بجے شام کو علاقائی مجلس عاملہ کی سفارشات کے ساتھ مرکزی مجلس عاملہ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

متفرقات باجازت صدر

(i) کچھ ادیبوں کے خلاف حکومت کے چند اداروں کے غیر ہمدردانہ رویے کے بارے میں (جمیل الدین عالی) کی قرارداد سنائی گئی۔ اور منظور کی گئی۔

مرکزی دفتر نے مرکزی مجلس عاملہ کو مطلع کیا کہ اگرچہ حکومت بعض ادیبوں کے خلاف کسی قسم کی پابندی یا متعصبانہ رویے کے وجود کو نہیں تسلیم کرتی لیکن ہر دفتر میں یہ ہدایات بھیجی گئی ہیں کہ اس قسم کے شکوک کو دور کرنے کی ہر امکانی کوشش کی جائے۔

(ii) سیکرٹری جنرل نے اعلان کیا کہ حکومت کی جانب سے ادارے کے لئے مبلغ ساٹھ ہزار روپے کی گرانٹ منظور کی گئی ہے۔ نیز اشاعت گھر کے لئے ایک لاکھ روپے کے بلا سود قرضہ بھی منظور کیا گیا ہے۔

(iii) ساٹھ ہزار روپے کے عطیے اور ایک لاکھ روپے کے قرض پر صدر پاکستان کے لئے قرارداد تشکر منظور کی گئی۔

---

[1] یہ اسکیم ایک سال جاری رہی اور پھر اجلاس عام لاہور کی ہدایت پر ختم کر دی گئی۔

[2] بعد میں ان کمیٹیوں نے کام نہیں کیا اور یہ طریق کار ناکام ہوگیا۔

(مترجم)

دوسری نشست

مرکزی مجلس عاملہ، ادارۂ مصنفین پاکستان

دوسری نشست ۵ جولائی ۱۹۶۰ء کو ۹ بجے صبح الحمرا، لاہور میں منعقد ہوئی۔

۱۔ صدر کا انتخاب

جلسے کی صدارت کے لئے بیگم شمس النہار محمود (مشرقی پاکستان) منتخب ہوئیں۔

۲۔ ذیلی حلقوں کی تنظیم

مجلس عاملہ نے علاقائی سکریٹریوں کو اس بات پر متنبہ کیا کہ انھوں نے ذیلی حلقوں کے سلسلہ میں کوئی عملی دلچسپی نہیں ظاہر کی جس کی وجہ سے
[سک]ریٹری جنرل کے ایما پر چند ذیلی حلقوں کی تشکیل کی گئی تھی۔ مجلس عاملہ نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ ذیلی حلقوں کے قواعد پر فوراً غور کیا جائے کیونکہ صرف دو
[ذی]لی مجالس نے مجوزہ قواعد پیش کئے تھے۔ یہ طے کیا گیا کہ تمام ذیلی حلقوں کے مجوزہ قواعد کا انتظار کیا جائے اور مرکزی مجلس عاملہ کے آئندہ اجلاس میں اس
[پر غور] کیا جائے، اس دوران میں سکریٹری جنرل کو اختیار دیا گیا کہ وہ ان قواعد کو جو وقتاً فوقتاً ذیلی حلقوں کی طرف سے پیش کئے جائیں جانچ کر منظور کرتے رہیں تاکہ
[ذی]لی حلقے مسلسل کام کرتے رہیں۔

مرکزی مجلس عاملہ نے مشرقی پاکستان میں اردو ذیلی حلقے کے قیام پر غور کیا اور اس کو منظور کیا۔ مجلس عاملہ نے مشرقی پاکستان میں اردو کے ادیبوں کی
[علیحدہ] شکل میں کسی اور ادارے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اور یہ امید ظاہر کی، کہ مشرقی پاکستان کے اردو کے ادیب، مشرقی پاکستان کے اردو ذیلی حلقے میں
[شام]ل ہو جائیں گے۔ سکریٹری جنرل سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے آئندہ دورے کے دوران ڈھاکہ میں ان چند اردو کے ادیبوں کی ایڈہاک کمیٹی کے ممبروں سے
[ملا]قات کریں جنھوں نے ابھی ادارہ میں شمولیت نہیں کی۔ اور انھیں بتائیں کہ مرکزی مجلس عاملہ، اگلے اجلاس عام کی منظوری کے بغیر مشرقی پاکستان کے اردو ادیبوں
[کی مت]وازی تنظیم کو نہیں مان سکتی۔

مرکزی دفتر سے فرمائش کی گئی، کہ وہ تمام ذیلی حلقوں کو ہدایت کرے کہ وہ کسی غیر ادیب کو چاہے وہ اعلیٰ افسر یا کوئی مشہور شخصیت کیوں نہ ہو نہ تو اپنے
[جل]سوں کی صدارت کا موقع دیں، نہ انھیں اپنی مجالس اور مذاکروں میں بالخصوص اپنی پیشہ ورانہ مجالس میں کوئی ممتاز مقام دیں، یہ صرف ادیبوں کا ہی حق
ہے کہ وہ ایسے ممتاز مراتب پر فائز ہوں جو ان کے خاص مفادات و کاروبار سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔ صدر پاکستان کے عطیات برائے ادبا و پسماندگان

کچھ ادیبوں اور ان کے پسماندگان کو عطا کردہ صدارتی عطیات کو بنظر استحسان دیکھا گیا، یہ بھی طے کیا گیا، کہ گلڈ (ادارہ) کبھی دیگر تمام مستحق ادیبوں اور ان
کے پسماندگان کے معاملات پر بھی صدر محترم کی توجہ دلائے، یہ قرار پایا کہ علاقائی سکریٹری ضروری غور و فکر کے بعد مستحق ادیبوں اور ان کے پسماندگان کے
[معام]لات کو اپنے علاقے کی طرف سے مرکز کے سامنے پیش کریں۔ مستحق ادیبوں کے معاملات کو از خود بھی اٹھائیں اور یہ انتظار نہ کریں کہ ادیب ان کے پاس درخواست
[لائ]یں۔ وہ اپنی تفصیلی رپورٹ میں ادیب یا ان کے پسماندگان کے مالی حالات کے متعلق لکھیں۔ اور سفارشات سے مرکز کو آگاہ کریں۔ اس میں وہ ذیلی
[حلق]وں سے بھی مشورہ طلب کر سکتے ہیں۔

مرکزی دفتر کو چاہئے کہ وہ از خود اور علاقائی سکریٹریوں کی سفارشات کی بنیاد پر صدر پاکستان کے سامنے ایسے تمام معاملات پیش کرے،

۵۔ تمام معاملات کا ریکارڈ متعلقہ دفاتر میں باقاعدہ طور سے رکھا جائے۔

۴۔ [illegible] کمیشن کے لئے قومی رسم الخط پر بحث

امیر حمزہ شنواری کے پیش کردہ مطالبہ پر غور کیا گیا۔ اور یہ طے کیا گیا کہ سر دست اختلافی سوال کو اٹھایا نہ جائے، اور فی الحال ایک کمیٹی قائم کیا جائے جو السنہ پاکستان پر مجموعاً اور ان کے رسم الخط پر غور کرے، اس مقصد کے لئے صدر پاکستان نے مبلغ پانچ ہزار روپے کا استقراری عطیہ طے فرمایا ہے۔

مندرجہ ذیل اراکین اس کمیٹی کے لئے اکثریت سے منتخب ہوئے۔

امیر حمزہ شنواری
پروفیسر سید وقار عظیم
پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
پروفیسر عبدالحئی۔
ڈاکٹر محمد شہید اللہ
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔

سکریٹری جنرل کو اختیار دیا گیا، کہ وہ اس کمیٹی کے اجلاس منعقد کریں۔ اس کمیٹی کو اختیار دیا گیا کہ وہ خود اپنے دائرہ، کار، طریقہ کار، نیز مقام اجلاس کا تعین کرے، اور حسب ضرورت کسی ایک یا ایک سے زیادہ ماہرین لسانیات کو شامل کرے اور جن لوگوں سے ضروری سمجھے شہادتیں لے۔ اس سرکاری سلسلے کا نظم و نسق سکریٹری جنرل کے اختیار میں ہوگا۔

بیرونی ممالک سے ادیبوں کو دعوت نامے

بیرونی ممالک کے دعوت ناموں کے بارے میں اراکین کو مطلع کیا گیا۔ سکریٹری جنرل نے واضح ہدایات کی عدم موجودگی میں وفد بھیجنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کی توثیق کی گئی۔ آئندہ کے لئے یہ طے کیا گیا کہ اگر بیرونی دعوت نامے مناسب وقت پر موصول ہوئے تو علاقائی سکریٹریوں سے وفد کے بارے میں مشورہ لیا جائے گا۔ اور اگر دعوت ناموں میں کافی وقت نہیں دیا گیا تو سکریٹری جنرل خود نامزدگی کر سکتا ہے۔ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ حتی الامکان ان اراکین کو بیرونی ممالک جانے کا موقعہ دیا جائے گا جو اس سے پہلے بیرونی ممالک نہیں گئے۔

اس بات پر بھی غور کیا گیا کہ اراکین کو بیرونی ممالک کی جانب سے جو ذاتی دعوت نامے بلا واسطہ موصول ہوتے ہیں ان کو قبول نہ کیا جائے۔ بعض اراکین کا خیال تھا، کہ اس قسم کے ذاتی دعوت ناموں کے سلسلے کو بالکل بند کر دیا جائے، اور مدعوئین سے کہا جائے کہ وہ مدعو کرنے والوں سے کہیں وہ ادارے کی معرفت دعوت نامے بھیجیں۔ یہ بھی خیال ظاہر کیا گیا کہ اس قسم کے بلا واسطہ ذاتی دعوت ناموں کے سلسلے کی حوصلہ شکنی کی جائے اور اراکین غیر ملکی سفارت خانوں سے ذاتی دعوت نامے حاصل کرنے کے لئے تعلقات بڑھانے سے روکا جائے۔ بہرصورت یہ طے کیا گیا کہ سر دست اس کی پابندیاں عائد نہ کی جائیں بلکہ اراکین سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے بیرونی سفر کی اطلاع مرکزی دفتر کو بھیجا کریں۔

یہ بھی طے کیا گیا کہ حکومت پاکستان سے درخواست کی جائے کہ وہ جملہ ثقافتی وفود میں ہمارے ادارے کو مناسب نمائندگی عطا کرے نیز حکومت حکومت کی معرفت قائم کی جانے والی فیلوشپ میں بھی اس کا خیال رکھے۔

سکریٹری جنرل کو خاص طور سے ہدایت کی گئی، کہ وہ اس معاملے میں وزارت امور خارجہ اور وزارت امور تعلیم سے رجوع کریں۔

ے اسلام کے ادیبوں کا کنونشن

شوکت صدیقی کے ایما پر دنیائے اسلام کے ادیبوں کا کنونشن منعقد کرنے کی تجویز پر غور کیا گیا۔ کچھ اراکین نے کہا کہ اس معاملہ کی اہمیت اس متقاضی تھی کہ اس کو مرکزی مجلس عاملہ سے پہلے پریس میں نہ لایا جاتا۔ مرکزی دفتر نے اطلاع دی کہ کسی قسم کا پریس نوٹ دفتر سے نہیں بھیجا صحافیوں نے از خود کسی فرد سے سن کر خبر چھاپ دی۔

کافی غور و خوض کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اس تجویز کا کوئی واضح اور مکمل خاکہ نہیں پیش کیا گیا۔ چنانچہ طے ہوا کہ اس تجویز کا تفصیلی خاکہ پیش کیا ے تاکہ آئندہ جلسے میں اس پر غور ہو سکے۔

(۷) مرکزی دفتر نے پاکستان رائٹرز گلڈ کنونشن ۱۹۵۹ء کے فیصلوں کی تکمیل میں دشواریوں کو بیان کرتے ہوئے اراکین میں جوش و خروش کی کمی اور عدم توجہی کی طرف اشارہ کیا۔ سکریٹری جنرل نے بتایا کہ زیادہ تر کام خود اراکین انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس جذبے کا اظہار نہیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ ادارے میں جذبۂ اخوت کو استوار کرنے کے لئے اراکین کو بلا تفریق مرتبہ، مرکز اور اپنے علاقوں کی قیادت میں بے لوث اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اراکین عاملہ نے طے کیا کہ وہ ایک ایسی مہم چلائیں گے جس سے عام اراکین میں ایسا جذبہ پیدا کیا جا سکے کہ وہ فرصت کے اوقات میں ادارے کی جانب سے جس کام کے لئے بلایا جائے، وہ کام کر سکیں۔

(۸) یہ بھی طے کیا گیا کہ علاقائی مجالس عاملہ کو ہدایت کی جائے کہ وہ چندہ جمع کرنے کی ایسی محتاط مہم چلائیں جس سے ادارے کے نام پر حرف بھی نہ آئے اور ساتھ ہی ساتھ ادارے کی مالی حالت میں استحکام پیدا ہو۔

ہر رکن مجلس عاملہ نے وعدہ کیا کہ وہ مجلس عاملہ کے آئندہ اجلاس کے انعقاد سے پہلے پانچ سو روپیہ چندہ جمع کرے گا۔ سکریٹری جنرل کا خیال تھا کہ اس سال کی کل مطلوبہ رقم ایک لاکھ روپے ہونی چاہئے۔ خازن اور اعزازی افسر رابطہ سے کہا گیا کہ ان میں سے ہر ایک دس ہزار روپے چندہ جمع کرے۔

یہ بھی طے کیا گیا کہ ادارے کے ہر برسر روزگار رکن سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک فیصد حصہ لازمی طور سے ادارے کے عام فنڈ میں جمع کرے۔ جس کا استعمال مرکز کی نگرانی میں مختلف مالی خساروں کو پورا کرنے کے لئے کیا جائے۔ سکریٹری جنرل اس بات پر آمادہ ہوئے کہ جملہ اراکین کو اس مضمون کا ایک سرکلر بھیجا جائے۔ یہ بھی طے ہوا کہ کل آمدنی کی تصدیق کے سلسلے میں اراکین کے اپنے بیان کے علاوہ کسی اور شہادت کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

سکریٹری جنرل کو اختیار دیا گیا کہ وہ عام اراکین سے داخلہ کی فیس اور چندہ وصول کرنے کی آخری تاریخ میں توسیع کریں، جو انتظامی مشکلات کی بنا پر نہیں وصول ہو سکا تھا۔ نیز یہ بھی اختیار دیا گیا کہ وہ مرکزی سرگرمیوں کے لئے وقتاً فوقتاً مالی منظوریاں دیتے رہیں۔

۳۰ جون ۱۹۶۰ء تک آمدنی کی تفصیلات بہم نہ ہونے کی بنا پر خازن نے بجٹ تیار نہیں کیا تھا اس لئے سکریٹری جنرل کو اختیار دیا گیا کہ دستور کے مطابق مرکزی عاملہ کی طرف سے اس معاملے کے نگراں ہوں، اور خازن، سکریٹری جنرل کے احکامات کو مرکزی عاملہ کے احکامات سمجھیں اور ان پر عمل کریں۔ مرکزی دفتر کی تجویز کردہ مالی ذیلی مجلس financial Sub-committe کے قیام کو ضروری سمجھا گیا۔

(۹) مرکزی دفتر اور اشاعت گھر کے نظم و نسق کا اختیار سکریٹری جنرل کو دیا گیا۔

(۱۰) علاقائی مجلس عاملہ کی منظور شدہ دفعات دستور پر غور کیا گیا۔ چند اراکین نے لفظ "ادیب" کی وضاحت چاہی۔ لیکن اس کو ملتوی کر دیا گیا۔ اور یہ طے کیا گیا کہ مستقبل میں رکنیت کیلئے صرف تخلیقی ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ ۲۱۱ درخواستیں منظور کی گئیں اور باقی

کو علاقائی دفتر کو مزید تفصیلات فراہم کرنے کے لئے واپس کر دیا گیا کیونکہ درخواست کو مسترد نہیں کیا گیا ہے۔ علاقوں کی مسترد کی ہوئی درخواستوں [illegible] فیصلہ نہیں کیا گیا۔

(ب) اعجاز بٹالوی نے ایک ایوان ادب (اکیڈمی آف لٹریچر) کے قیام پر گفتگو کی۔ انھوں نے اعداد و شمار سے بتایا کہ مختلف انجمنوں کو ثقافتی، لسانی اور ادبی سرگرمیوں کے فروغ کے لئے کتنی کتنی مالی امداد دے رہی ہے۔ اراکین کی رائے کے مطابق ثقافتی ادارا کو حکومت کی مالی امداد تقریباً دس لاکھ تک پہنچتی ہے مگر اس کا بیشتر حصہ ایسی انجمنوں کو دیا جا رہا ہے جو یا تو تقریباً ناپید ہیں یا بے عمل۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ حکومت سے درخواست کی جائے کہ وہ ایک ایوان ادب کے قیام پر غور کرے اور وہ تمام امداد جو اس ضمن میں دیگر انجمنوں کو جاری ہے، یکجا کر کے ایوان ادب کو دے دی جائے۔ مرکزی دفتر کو اس ضمن میں حکومت کی خدمت میں معروضہ پیش کرنے کے لئے کچھ نکات دیئے گئے۔ اراکین کا خیال تھا کہ ملک میں اس قسم کی صرف ایک انجمن ہونی چاہیئے جو اپنی مختلف شاخوں کی مدد سے تحقیقی سرگرمیوں، ثقافتی مقاصد اسی قسم کے دیگر مقاصد کے فروغ کے لئے کام کرے۔ کیونکہ ملک کی ثقافتی اور ذہنی سرگرمیوں کو مجتمع کرنے اور فروغ دینے کا کام صرف ایک ہی جماعت سرانجام دے سکتی ہے۔ حکومت سے یہ بھی درخواست کی گئی کہ وہ تمام امداد پانے والی انجمنوں کے معاملات اور کارکردگی کے بارے تحقیقات کرنے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کرے۔

(ج) یہ طے پایا کہ مرکزی عاملہ کا آئندہ اجلاس جنوری ۱۹۶۵ء میں ڈھاکہ میں منعقد کیا جائے۔

(د) سکریٹری جنرل کو مختلف اشاعت گھروں میں اراکین کی نامزدگی کا مجاز کیا گیا، کیوں کہ اراکین کمیٹی نامزدگی پر متفق نہیں ہو سکے۔

(ص)۔ حلقہ ارباب ذوق (مرکز) سے آیا ہوا ایک خط سنایا گیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ حلقے کی ادبی نشستوں میں شریک ہونے والوں کو راولپنڈی پولس پریشان کر رہی ہے۔

پنجابی مجلس پر حکومت کی عائد کردہ پابندی کے خلاف احمد راہی نے ایک تحریک پیش کی۔ بیگم ہاجرہ مسرور نے کہا کہ اس ضمن میں انجمن مصنفین کا سوال بھی اٹھانا چاہیئے۔

اراکین نے سکریٹری جنرل کو ہدایت کی کہ وہ ان تمام معاملات کی تحقیقات کریں، اور عاملہ کے آئندہ اجلاس میں ان پر اپنی رپورٹ پیش کریں جس پر عاملہ غور کرے گی۔

اس نشست کا اختتام ۷ بجے شام کو۔۔۔ صدر صاحب کی اختتامی تقریر پر ہوا جس میں موصوف نے مسلسل تمام دن بغیر کھانا کھائے کام کرنے پر اراکین کو داد دی۔ اور یہ امید ظاہر کی کہ۔ ادارہ ۔ پاکستانی ادیبوں اور تخلیقی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لئے روز افزوں کوشش کرتا رہے گا۔

اراکین جو ۵ جولائی ۱۹۵۹ء کو ادارے میں لئے گئے

حلقہ کراچی

(اردو)

[illegible]نصیرالدین	۱۲ ڈی / ۱۹۸ - پی - ای - سی - ایچ سوسائٹی - کراچی	طب	افسانہ - شاعری - مضمون
[illegible]س حیدری	اخبار جنگ کراچی	صحافت	شاعری۔

بنگالی ذیلی حلقہ

[illegible]اق	۵/۲۸ - ای جہانگیر روڈ ایسٹ - کراچی ۵	ملازمت	افسانہ - ناول
[illegible]ہر	۲۹۳ - ایف - پرانا لوکمبت - کراچی ۵	تصنیف	شاعری - افسانہ۔
[illegible]ن شریف	ڈپٹی چیف پلاننگ کمیشن کے - ڈی - اے - بلڈنگ - کراچی	ملازمت	
[illegible]العزیز البیرونی	۸/۳۷ - ای - جہانگیر روڈ - ایسٹ کراچی	تصنیف	
[illegible]الغفور	۱۰/۳۳ - بی - فیڈرل کیپٹل ایریا - کراچی	ملازمت	
[illegible]س الدین احمد	۱۷۹ ای جہانگیر روڈ - ویسٹ - کراچی - ۵	"	شاعری - افسانہ - مضمون - ڈرامہ - تنقید
[illegible]مد علی	۲۷۶ - پاکستان کوارٹرس - لارنس روڈ - کراچی ۳	"	شاعری - مضمون
[illegible]حسین چغتائی	۹۰ - ای جہانگیر روڈ ویسٹ - کراچی۔	"	شاعری - افسانہ - مضمون - تنقید

سندھی ذیلی حلقہ

[illegible]ابراہیم	معرفت سندھی - ادبی بورڈ - سندھ اسمبلی بلڈنگ بندر روڈ - کراچی	ملازمت	شاعری - مضمون - افسانہ - ڈرامہ
[illegible]احمد انصاری	ایچ - ۲/۲۸ پی - ای - سی - ایچ - سوسائٹی کراچی	"	شاعری - افسانہ - مضمون نگاری - ڈرامہ - تنقید

گجراتی ذیلی حلقہ

[illegible]ب قریشی	معرفت وطن - منا و تھ نیپئر روڈ - کراچی	صحافت	شاعری - افسانہ
[illegible]ین کسات	۱۵۰-۲۲ - واؤ آباد - زہرہ روڈ - ڈرگ روڈ - کراچی ۵	"	مضمون - افسانہ

نام	پتہ	پیشہ				
[illegible] جی پٹیل	۳۲ رضیہ مینشن۔ دوچیار روڈ۔ پچھانی کلب کھارادر کراچی ۲	تجارت	شاعری۔ افسانہ			
توفیق ناظر	۷/۴۔ نزد بس کالونی۔ گولیمار ۲ کراچی ۱۸	ملازمت	۔	۔		
جعفر منصور	۱۰۔ پریم کنج بلڈنگ۔ ڈی میلو روڈ۔ کراچی	۔	۔	۔	ناول	
حبیب جی اکھانی عنوان	معرفت "ملت" گجراتی۔ ساؤتھ نیپیر روڈ۔ کراچی	صحافت	۔	۔	مضمون۔ ۔	
رفیق ہمدانی	۱۸/۱ اے نثار منزل۔ گدوانی اسٹریٹ۔ کراچی ۲	تجارت	۔	۔		
زلیخا پروین	۱۹۔ سی، گارڈن روڈ۔ کراچی	تدریس	تنقید	۔	مضمون	
زین العابدین محمد	۱۴۔ آدم منزل۔ ولسن اسٹریٹ۔ نزد ایروز سینما۔ کراچی	صحافت	ڈرامہ			
سالک پوچیا	نورہوا تمباکو۔ جوڑیا بازار۔ کراچی۔	تجارت	شاعری	افسانہ		
سید مظہر الحق فاروقی	اسماعیل جی موسیٰ جی بلڈنگ۔ ہرداس پرنسز اسٹریٹ رنچھوڑ لائن کراچی	تدریس	۔	۔		
عبدالستار میاں چاند میاں شوقین جیت پوری	کاٹھیاواڑی ہوٹل۔ اسلام آباد۔ جمشید روڈ۔ کراچی	۔	۔	۔		
ایم۔ طیب شبنم	اعجاز مینشن۔ پہلی منزل۔ فلیٹ ۱۳۔ ہرداس اسٹریٹ رنچھوڑ لائن کراچی	ملازمت	تنقید	۔		
علی محمد ثنی شرر	معرفت مدرسہ اسلامیہ ٹ، کھوڑی گارڈن۔ کراچی	تدریس	شاعری			
غلام حسین مصطفیٰ	مصطفیٰ اینڈ سنز۔ اورینٹل بک سیلر نمبر ۱۱/۳۳۲۔ کیمبل اسٹریٹ کراچی	صحافت	تنقید	۔	ناول	
غلام رسول ولی محمد رنگ	حلیم بلڈنگ۔ رنچھوڑ لائن۔ جناح اسٹریٹ۔ کراچی	ملازمت	شاعری	۔		
قاسم اے حبیب شمع پوربندری	خدیجہ منزل۔ لارنس روڈ۔ نزد ٹاور۔ کراچی	۔	۔	۔	مضمون	
محمد ادیب	معرفت ملت گجراتی۔ نیو چالی۔ کراچی	صحافت	۔	۔	۔	۔
محمد صادق شیخ احمد صادق	۲/۱۲ اک اک اسکول۔ کلفٹن کوارٹرز۔ کراچی	۔	تنقید	۔	۔	
میگھانی عبدالعزیز لنار علی	ولیکا چیمبرز۔ ساؤتھ نیپیر روڈ۔ کراچی	وکالت	۔	۔	۔	نا
نور النساء شریف	حاجی مینشن۔ اے۔ ایم۔ ۱۰ روڈ فریئر روڈ۔ کراچی	۔	ناول	۔		
نور محمد جمال حسین نور	حاجی سر عبداللہ ہارون بلڈنگ۔ پہلی منزل ۳۔ پلاس اسٹریٹ نزد ساؤتھ نیپیر روڈ۔ کراچی۔	صحافت	۔	۔		
یوسف عبدالغنی مانڈویا	مجاہد پرنٹری۔ نونہال روڈ۔ کراچی ۳	۔	تنقید	۔	۔	

(مندرجہ بالا اسماء کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے)

حلقہ مشرقی پاکستان

پبنا

زنا سیر	موضع چھتولیا۔ ڈاک خانہ سراج گنج۔ ضلع پبنا	-	شاعری افسانہ ناول ڈرامہ
محمد ایوب	موضع بیری پولت۔ ڈاکخانہ بیرا۔ پی۔ ایس قاضی پور ضلع پبنا	ملازمت	مضمون نگاری۔ تنقید

پٹیرہ

سراج الدین احمد	میسرز پاکستان لائبریری۔ چاند پور۔ پٹیرہ	ملازمت	افسانہ ناول

دیناج پور

احمد حسین	موضع اسلام باغ۔ ڈاک خانہ پنچ گڑھ۔ ضلع دیناج پور	ملازمت	شاعری افسانہ ناول ڈرامہ
اے۔ کے۔ ایس۔ نور محمد	خواجہ ناظم الدین مسلم ہال۔ ڈاک خانہ و ضلع دیناج پور	"	" " " " مضمون نگاری۔ تنقید۔
محمل الرحمٰن	ضلع اسکول دیناج پور	تدریس	" ڈرامہ
سید مشرف حسین	کے۔ این۔ ایم۔ ہال اور لائبریری ڈاک خانہ و ضلع دیناج پور	ملازمت	شاعری، افسانہ
محراب علی	خواجہ ناظم الدین مسلم ہال اینڈ لائبریری۔ دیناج پور	"	مضمون نگاری، ڈرامہ تنقید
محمد ابو القاسم	ایس۔ این۔ کالج۔ دیناج پور	تدریس	افسانہ مضمون نگاری تنقید
ڈاکٹر محمد حبیب الرحمٰن	نوپارہ ڈسپنسری۔ ڈاک خانہ نوپارہ۔ ضلع دیناج پور	مطب	شاعری
محمد حمایت علی	خواجہ ناظم الدین مسلم ہال اینڈ لائبریری۔ دیناج پور	ملازمت	مضمون نگار "
محمد ظہیر الدین منڈل	ڈاک خانہ پل ہٹ دیناج پور	"	شاعری ڈرامہ
محمد نور الامین	خواجہ ناظم الدین مسلم ہال اینڈ لائبریری۔ دیناج پور	"	" افسانہ مضمون نگاری تنقید
محمود مکرم حسین	ایس۔ این۔ کالج دیناج پور	تدریس	ناول " " " "

ڈھاکہ

ابو جعفر شمس الدین	بلاٹ ملک اے، مقابل پولیس لائن ڈھاکہ	صحافت	ناول، افسانہ ڈرامہ تنقید
ابوالخیر محمد نور الاسلام	۴۴۰۔ جوگی نگر۔ ڈھاکہ ۳	وکالت	شاعری " مضمون نگاری تنقید
ابوالکلام شمس الدین	۲۰-۲ قاسم لین۔ ڈھاکہ	صحافت	ناول " " "
ابوالہاشم	۴۰۔ رام کرشن مشن روڈ ڈھاکہ ۳	ادب	تنقید "

...لـــ	۵۴۔ ٹپوا ٹولی۔ ڈھاکہ	صحافت	افسانہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید
...بیب	۱۱۰۔ بنگشل روڈ۔ ڈھاکہ ۱	ملازمت	شاعری ” ناول
...ن فریدہ بانو	معرفت ڈاکٹر عاشق الرحمن خان ۸۰۵ دھانمنڈی روڈ ڈھاکہ ۲	گھر گرہستی	” ” تنقید
...ہ	۱۴۔ بیچارام ڈیوڑھی ڈھاکہ ۱	ملازمت	افسانہ ”
...ساو	معرفت جناب ایم۔ احمد۔ تیج توری بادار۔ تیج گاؤں ڈھاکہ ۵	-	” ڈرامہ
...لدین احمد	دفتر ادنو پاک سکریٹریٹ سکنڈ فیز سکیم باغیچہ۔ ڈھاکہ ۲	ملازمت	” ” شاعری تنقید
...نورالاسلام	معرفت قاضی فضل الرحمن۔ شاہجہان پور۔ ڈھاکہ ۲	”	مضمون نگاری
...یم شہاب الدین	۴/۲۔ اسکاٹن۔ گارڈن روڈ۔ ڈھاکہ ۲	”	” افسانہ
...ایم۔ عبدالجلیل	دیوبیندر کالج۔ منک گنج۔ ڈھاکہ	تدریس	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون نگاری۔ ڈرامہ۔ تنقید
...ار آرزو	۱۲/۶۔ جوگی نگر۔ ڈھاکہ ۳	ادب	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون نگاری ڈرامہ۔ تنقید
...ان	شعبہ سیاسیات۔ ڈھاکہ یونیورسٹی۔ ڈھاکہ	تدریس	مضمون نگاری۔ تنقید
...بن چودھری	۳۱۔ عبدالعزیز لین۔ نواب گنج۔ ڈھاکہ ۱	ملازمت	افسانہ۔ ناول۔ ڈرامہ۔ تنقید۔
...حیدر قریشی	الدین لاج۔ ۴۔ راجان چودھری روڈ۔ گندریا ڈھاکہ ۴	ادب	افسانہ۔ شاعری۔ مضمون نگاری تنقید
...سلام چودھری	۵/کے، عظیم پورہ اسٹیٹ۔ ڈھاکہ ۲	تدریس	” تنقید ”
...امیان الدین	شانتی باغ۔ کھیل گاؤں۔ ڈھاکہ ۲	ملازمت	” ”
...شاہجہاں	۸/۹۔ رام کرشن مشن روڈ۔ ڈھاکہ ۳	-	شاعری۔ افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری ڈرامہ
...یو۔ کیو۔ ذوالفقار علی	پرووسٹ۔ ڈھاکہ ہال۔ ڈھاکہ یونیورسٹی ڈھاکہ	تدریس	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید
...یت اللہ	۴/۷۔ عبدالعزیز لین۔ نواب گنج۔ ڈھاکہ	”	
...محمد خان	۱/۲/۴ پی۔ اینڈ۔ ٹی کالونی۔ موتی جھیل۔ ڈھاکہ ۲	ملازمت	” مضمون نگاری تنقید
...ئی	شعبۂ الیکٹریکل انجینئرنگ۔ انجینئرنگ۔ کالج۔ ڈھاکہ	تدریس	” ”
...تون	۶۲۔ ناظم الدین روڈ۔ ڈھاکہ	”	ناول۔ مضمون
...الحق پوری	دفتر روزنامہ آزاد۔ ڈھاکہ ۲	صحافت	شاعری۔ افسانہ۔ ناول
...شرقی	۸۔ مین شاہی لین۔ اسکاٹن۔ رمنہ۔ ڈھاکہ ۲	ملازمت	” ” ڈرامہ
...ق	دفتر روزنامہ اتحاد ۲/۱ کارکن باری لین۔ ڈھاکہ	صحافت	” تنقید
...ظور	۶/۱۰۔ آرام باغ روڈ۔ فقیرہ پول۔ ڈھاکہ ۲	”	افسانہ مضمون نگاری۔ تنقید
...ان	ایف۔۱۔ ڈھاکیشوری کالونی۔ رمنہ۔ ڈھاکہ ۲	ملازمت	” ”

نام	پتہ	پیشہ	صنف
رحمان	۲/۶۵ پرانا پلٹن۔ ڈھاکہ ۲	ادب	شاعری
ظم	دفتر میرج رجسٹری۔ ماکہ بازار۔ ڈھاکہ ۲	ملازمت	تنقید۔ مضمون نگاری
حمد	انجمن عالم والا۔ کمال پور۔ ٹرک خانہ۔ واری۔ ڈھاکہ	ادب	شاعری۔ ڈرامہ
ابوالحسین	۳۳۔ سوامی باغ روڈ۔ ڈھاکہ ۱	"	" افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری ڈرامہ
عبدالشہید	مدیر روزنامہ نجات ۲/۲۶ راجہ بیکا موہن۔ بسک لین۔ ڈھاکہ	صحافت	مضمون نگاری۔ تنقید۔
لام احمد	۲/۳۳ پی۔ اینڈ۔ ٹی کالونی۔ موتی جھیل۔ رمنہ۔ ڈھاکہ ۲	ملازمت	شاعری۔ افسانہ
لام اکبر	شاہجہان پور۔ ڈھاکہ ۲	ادب	" " ڈرامہ
بدالحق	پی ۱۲ جی ۱، موتی جھیل سول اسٹاف کوارٹرز۔ ڈھاکہ ۲	ملازمت	افسانہ مضمون نگاری
سلے۔ ایف	۴۰۔ ذیرپل لین۔ ڈھاکہ	"	مضمون نگاری۔ ڈرامہ۔ تنقید
رین احمد	۵۔ اردو روڈ۔ ڈھاکہ	"	افسانہ۔ ناول
قاسم	۱۹۔ عظیم پور روڈ۔ ڈھاکہ ۱	-	مضمون نگاری۔ تنقید
بین	نیو بلڈنگ۔ اسٹیٹ بینک کالونی کی مشرقی طرف۔ موتی جھیل ڈھاکہ ۲	ملازمت	شاعری۔ افسانہ۔ ناول۔ ڈرامہ۔
	۱/۲ عالم گنج لین۔ ڈھاکہ	"	" "
الدین چودھری	۳۱۔ سوامی باغ لین۔ ڈھاکہ	-	" مضمون نگاری ڈرامہ
ہیم	۲۵۸۔ جگشل روڈ۔ ڈھاکہ ۱	ملازمت	مضمون نگار
الحق	شعبہ سیاسیات۔ ڈھاکہ یونیورسٹی۔ ڈھاکہ	تدریس	"
اللہ	۲۔۴۱ قاسم لین ڈھاکہ ۲	ملازمت	شاعری۔ افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری ڈرامہ۔ تنقید
ق	روزنامہ نجات۔ ڈھاکہ	صحافت	مضمون نگاری۔ تنقید
ر	پی۔ ۱۲۶ جی ۱۰۔ موتی	ملازمت	" شاعری
الرحمان	۲۸۔ بی۔ عظیم پور اسٹیٹ۔ ڈھاکہ ۲	تدریس	" تنقید
لرحمان خان	۲۶۔ سوامی باغ لین۔ ڈھاکہ ۱	پرائیویٹ	افسانہ " "
الاحمد	۹۵۔ اسلام پور۔ ڈھاکہ ۱	صحافت	" ناول بچوں کا ادب
ودھری	۳۱۔ سوامی باغ لین۔ ڈھاکہ	تدریس	افسانہ۔ مضمون نگاری۔ ڈرامہ تنقید۔ بچوں کا ادب
	۴۔ ڈی کا پیک روڈ۔ نزد جہاں آرا لاج۔ کمال پور ڈھاکہ ۲	ادب	شاعری

راج شاہی

نام	پتہ	پیشہ	صنف
، صاحب محمد افضل	میلے منزل۔ نواکاؤں۔ راج شاہی	پنشنر	افسانہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید
ر منظر الاسلام	راج شاہی یونیورسٹی راج شاہی	تدریس	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید

رنگ پور

نام	پتہ	پیشہ	صنف
بوطالب	کارمیکل کالج۔ ڈاک خانہ عالم نگر۔ ضلع رنگ پور	تدریس	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید
سلطان	ڈھاپ۔ ڈاک خانہ و ضلع رنگ پور	ملازمت	" " "
ں الاسلام	ٹاؤن راشننگ آفیسر۔ سید پور۔ ضلع رنگ پور	" "	" " "
لام رسول	کارمیکل کالج رنگ پور	تدریس	" "

سلہٹ

نام	پتہ	پیشہ	صنف
نیہ مصطفےٰ علی	ڈاک خانہ مولوی بازار۔ سلہٹ	پنشنر	افسانہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید
قادر	موضع چاردانی۔ ڈاک خانہ دھیانگر۔ سلہٹ	-	شاعری۔ افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری۔ ڈرامہ۔ تنقید
ل الحق سیلبری	موضع سیل برس۔ ڈاک خانہ دھرم پتہ۔ ضلع سلہٹ	صحافت	شاعری۔ ناول۔ مضمون نگاری۔ تنقید

کشتیہ

نام	پتہ	پیشہ	صنف
عبدالرحمٰن	۹۔ بی۔ سی۔ ماسٹریٹ کشتیہ	ہومیوپیتھ	شاعری۔ مضمون نگاری۔ تنقید
ر عبدالستار	شعبۂ سیاسیات کشتیہ کالج۔ کشتیہ	تدریس	مضمون نگار
ر یعقوب	کشتیہ کالج۔ کشتیہ	"	" تنقید

کھلنا

نام	پتہ	پیشہ	صنف
یوان عبدالحمید	دفتر کنزرویٹر آف فارسٹس۔ مغربی سرکل۔ کھلنا	ملازمت	شاعری۔ مضمون نگاری
روق محمود	موضع سکہ کمیت۔ ڈاک خانہ چرولیہ۔ پی۔ ایس بگیرہٹ ضلع کھلنا۔	صحافت	" " افسانہ تنقید

میمن سنگھ

نام	پتہ	پیشہ	صنف
بوالکلام مقبول احمد	پرائمری اسکول۔ پولس لائن میمن سنگھ	ملازمت	شاعری۔ افسانہ۔ ناول۔ ڈرامہ

...انی	موضع ڈاک خانہ ہیا پور، تھانہ کیندوا ضلع میمن سنگھ	-	شاعری۔ مضمون نگاری۔ تنقید
...لطان	میمن سنگھ ٹاؤن۔ میمن سنگھ	وکالت	افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری تنقید
	موضع پاس درلہ ڈاک خانہ ٹنگیل۔ ضلع میمن سنگھ	-	افسانہ۔ ناول
...ا	موضع شنکر چیرہ۔ ڈاک خانہ پنچ باغ۔ پی۔ ایس غفارگاؤں ضلع میمن سنگھ۔	صحافت	مضمون نگاری۔ تنقید
...ام	موضع ایچا پور۔ پی۔ ایس۔ کالی ہاتی ٹنگیل۔ ضلع میمن سنگھ	ملازمت	شاعری۔ افسانہ

نواکھالی

	مغربی بدی پور۔ ڈاک خانہ سونا پور۔ نواکھالی	تدریس	ڈرامہ

(نوٹ:۔ مندرجہ بالا فہرست حروف تہجی کے مطابق ہے)

حلقۂ مشرقی پاکستان

(اردو ذیلی حلقہ)

نام	پتہ	پیشہ	صنف
آفتاب بیگم	تاماباغ ۱۰۰۔ ابھائے داس لین ٹیکاٹولی۔ ڈھاکہ	گھرداری	افسانہ۔ ڈرامہ
اختر حسین خاں	نورآباد۔ کومیلا	ملازمت	" مضمون تنقید
ام عمارہ	۵۲ حسین الدین خان پہلی لین۔ نواب گنج۔ ڈھاکہ-۱	-	" ناول
امیر الاسلام مشرقی	۷۰۔ آر کے مشن روڈ۔ ڈھاکہ-۱	پنشنر	شاعری مضمون
ایاد عاصی	۲/۱، طاہر باغ لین، ڈھاکہ	صحافت	افسانہ "
بانو اختر مشہود	۴۳/۲ چوبار ٹولی۔ فیل خانہ۔ ڈھاکہ-۱	تعلیم	"
حبیب انصاری	۱/۲، اصفہان پارک۔ آغا بازار، ڈھاکہ-۲	تجارت	مضمون نگاری۔ ڈرامہ
خلیل الرحمن رعکاس	معرفت رحمن پبلشنگ کمپنی ۸۔ جناح ریونیو۔ رمنہ ڈھاکہ	"	"
خواجہ محمد عادل	دلکشا گارڈن۔ دلکشا۔ رمنہ۔ ڈھاکہ	ملازمت	" شاعری
خواجہ محمد علی	امین جوٹ ملز چاٹگام	"	" افسانہ
دلیل الرحمن دلیل ناطق	معرفت میکنن میکنزی اینڈ کمپنی۔ چاٹگام	"	شاعری
رشید الزماں خلش	۵/۱، عظیم پور اسٹیٹ۔ ڈھاکہ	"	" تنقید
سعید الرحمن سرور بارہ بنکوی	۱۲۔ نارتھ بروک ہال۔ روڈ	"	" مضمون نگاری
سید اقبال عظیم	ڈھاکہ کالج۔ ڈھاکہ	تدریس	" "
سید محمد محی الدین تمنا عمادی	۶۴۔ عبدالعزیز لین۔ نواب گنج۔ ڈھاکہ-۱	"	" "
شیریں دلیل	معرفت دلیل ناطق، میکنن میکنزی اینڈ کمپنی چاٹگام	ملازمت	" افسانہ
صلاح الدین محمد	معرفت پریس کلب ڈھاکہ	صحافت	" مضمون نگاری
عبدالسبحان (مقبول الحق)	نورآباد۔ کومیلا	تجارت	" "
عبدالمعبود (عابد واجپئی)	۱۸۔ ہرموہن سل اسٹریٹ۔ لال باغ ڈھاکہ	صحافت	" "
عطاء الرحمن محمد جمیل	کلیان پور۔ ڈاک خانہ۔ محمد پور کالونی۔ ڈھاکہ	ملازمت	" "
فضل الرحمن افضل	بی۔ ایس۔ نہر بلڈنگ۔ اسٹرینڈ روڈ۔ چاٹگام	"	"
محبوب خزاں	۲۸/۱۔ اسکاٹن گارڈن۔ ڈھاکہ (موجودہ پتہ۔ نیو ٹاؤن کراچی)	"	" مضمون نگاری
محمد عارف علوی	۱۶ آفیسرز۔ ای۔ بی۔ ریلوے۔ چاٹگام	"	افسانہ "
محمد عطاء الرحمن عطا اصفی	۲/۶۔ جگناتھ سہا روڈ۔ لال باغ ڈھاکہ-۱	"	شاعری
وحید قیصر ندوی	۷۸۔ مولوی بازار۔ ڈھاکہ	صحافت	شاعری۔ ناول۔ مضمون۔ تنقید

(نوٹ:۔ مندرجہ بالا اسماء کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے)

حلقہ مغربی پاکستان

بہاول پور

	اسسٹنٹ ڈائرکٹر انفارمیشن۔ بہاول پور	صحافت	شاعری
	دار السرور۔ بیکانیری۔ بہاول پور	ادب	"
	معرفت محبوب غزنوی۔ ڈاک خانہ منڈی صادق گنج بہاول پور	زراعت	"

پشاور

	رام داس بازار پشاور	تاجر	افسانہ۔ مضمون۔ تنقید
	خواجہ بلڈنگ ایبٹ آباد	ملازمت	" " ڈرامہ
	ایڈیٹر قند مردان	"	شاعری۔ افسانہ۔ ناول۔ مضمون۔ ڈرامہ۔ تنقید
	پی۔ ڈویژن۔ جوگن شاہ پشاور	"	شاعری
	نمبر ۴ گلبار کالونی۔ پشاور	ڈاکٹری	" افسانہ۔ مضمون۔ ڈرامہ۔ تنقید
	پشاور	ملازمت	" " مضمون نگاری۔ تنقید
	صدیقی ہاؤس۔ نزد پرانی کوتوالی۔ پشاور شہر	تجارت	شاعری
بر	معرفت ریڈیو پاکستان پشاور	ملازمت	"
	نزد پرانی کوتوالی پشاور شہر	تجارت	" افسانہ
	محلہ پیر شاہ سید مردان	ملازمت	" " مضمون نگاری
س	دنگران۔ قصہ خوانی۔ پشاور	تدریس	" مضمون
	۴۰۳۔ مال روڈ۔ مردان	طالب علم	افسانہ نگاری

جھنگ

۱	جھنگ سٹی	ملازمت	شاعری

حیدرآباد

ارشد رضا	۱۱۹/اے/۲/۲۶۷ ہیرآباد۔ حیدرآباد	ملازمت۔	مضمون نگاری۔ تنقید
الیاس عشقی	ریڈیو پاکستان حیدرآباد	"	شاعری۔ ڈرامہ۔ "
تنویر عباسی	لیاقت میڈیکل کالج حیدرآباد	طالب علم	"
شاد کلکتوی	ٹیلیگراف ورکشاپ کوٹری	ملازمت	" مضمون نگا
عبدالرحیم قابل اجمیری	ہیرآباد۔ حیدرآباد	"	"
علیم الکریم عباسی	ٹین کالج۔ حیدرآباد	ملازمت	" افسانہ ڈرامہ
غلام مصطفٰے خان	سندھ یونیورسٹی۔ حیدرآباد	تدریس	مضمون نگاری۔ تنق
کوکب جمیل	اے/۱۱۳-۲/۲۶۲ ہیرآباد۔ حیدرآباد	صحافت	" افسا
محسن ڈبائی	ایڈیٹر انسان۔ حیدرآباد	"	شاعری۔ افسانہ۔ نا
			مضمون نگاری۔ ڈرا
مرزا عابد عباس	پرنسپل سٹی کالج حیدرآباد	تدریس	شاعری۔ افسانہ۔ مضم
			ڈرامہ۔ تنقید

راولپنڈی

محمد علی شمیم	مکان نمبری ۵۸۲۔ نزد اے۔ وی کالج روڈ راولپنڈی	ملازمت	شاعری۔ افسانہ۔ مض

سکھر

محمد آفاق صدیقی آفاقی	میونسپل پارک وی۔ او لڈ سکھر	تدریس	شاعری۔ افسانہ۔ م

کوئٹہ

انعام الحق کوثر	گورنمنٹ کالج کوئٹہ	تدریس	افسانہ۔ مضمون نگا
انور رومان	گورنمنٹ کالج کوئٹہ	تدریس	" "

کیمبل پور

ریاض احمد سلیم	ایف۔ ۱۶۸۔ تھانہ کیمبل پور	ملازمت	افسانہ نگاری

لاہور

ابوالظفر نازش رضوی	۱۳۷۔ ملتان روڈ۔ لاہور	صحافت	شاعری۔ افسانہ۔ ناول

احمد ندیم قاسمی	عقب دیال سنگھ لائبریری۔ نسبت روڈ۔ لاہور	ادب۔صحافت	شاعری افسانہ
بانو قدسیہ	معرفت داستان گو	گھر گرہستی	افسانہ ناول
بشیر منذر	کتب مینار۔ پبلشرز۔ نمبر ۱۱۔ ایبک روڈ۔ انارکلی۔ لاہور	ملازمت	شاعری
حنیف جاوید	۴۷ ۹-این۔ سمن آباد۔ لاہور	بیمہ ایجنٹ	مضمون نگاری۔ ڈرامہ۔ تنقید
حافظ سید یوسف حسن	نیرنگ خیال۔ ۲۰، فلیمنگ روڈ۔ لاہور	صحافت	افسانہ۔ مضمون۔ ڈرامہ۔ تنقید
سردار محمود	لاہور اکیڈمی۔ ۲۰۵۔ سرکلر روڈ۔ لاہور	اشاعت کتب	افسانہ نگاری
ڈاکٹر سلیم الدین اکبر	۱۵۰۔ پی۔ گلبرگ۔ لاہور	ڈاکٹری	ناول۔ افسانہ نگاری
سید قاسم محمود	۱۰۔ تکیہ سردار شاہ۔ کیش لال روڈ لاہور	صحافت	افسانہ۔ ناول۔ ڈرامہ
سید محسن ہاشمی	معرفت نیرنگ خیال۔ ۲۰، فلیمنگ روڈ۔ لاہور	"	" مضمون۔ تنقید
عبدالسلام خورشید	۱۰۔ مسلم ٹاؤن۔ کینال سائڈ۔ لاہور	تدریس	مضمون نگاری۔ تنقید
عزیز اثری	ماہنامہ جلترنگ ۹ ایبک روڈ۔ انارکلی۔ لاہور	ادب	شاعری
جی۔ ایم۔ اثر	گورنمنٹ کالج لاہور	تدریس	"
فیض احمد فیض	۲۱۔ ایمپریس روڈ۔ لاہور	ملازمت	"
کرم الٰہی زریں	۴۲۷۔ بھاٹی گیٹ۔ لاہور	صحافت	" ناول۔ افسانہ۔ مضمون۔ ڈرامہ۔ تنقید
نور بجنوری	معرفت ٹوبیک آپٹیکل کمپنی ۱۶۔ اسپتال روڈ۔ لاہور	ملازمت	شاعری، ناول

لائل پور

حافظ لدھیانوی	ڈسٹرکٹ سیونگ آفیسر۔ ویلیج گمنٹ فنڈ۔ لائل پور	ملازمت	شاعری افسانہ۔ ڈرامہ
حیدر شکیب	مکان نمبر پی ۴۰۔ گلی نمبر ۱ سنت پورہ لائل پور	تجارت	" افسانہ۔ ڈرامہ

ملتان

ابن حسن برنی	معرفت حبیب بینک لمیٹڈ۔ ملتان	ملازمت	افسانہ۔ مضمون نگاری
اعجاز حسین بہار جالندھری	کوارٹر ۳ بلاک ۱۲ ٹیکسٹائل کالونی اسلام آباد	صحافت	شاعری
اکرام الحق	الاکرام۔ نشاط روڈ۔ ملتان	وکالت	مضمون نگاری۔ تنقید
تصدق رسول	اندرون بوہڑ گیٹ ملتان	"	شاعری۔ افسانہ نگاری۔ مضمون نگاری۔ تنقید
حبیب احمد آفاق کاظمی	مکان نمبر ۸/۳۰، حبیب منزل۔ محلہ قادر آباد۔ مقابل لوہاری دروازہ۔ ملتان شہر	ملازمت "	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون۔ تنقید

...الد	۱۰۔ مال روڈ۔ ملتان چھاؤنی	وکالت	شاعری
...مد سعید ساقی	مہتمم انوارالعلوم کچہری روڈ ملتان شہر	ملازمت	مضمون نگاری۔ تنقید
...خان	۹۳۔ ریلوے روڈ ملتان چھاؤنی	وکالت	شاعری۔ ناول۔ مضمون نگاری
...کشن ملتانی	مظفرگڑھ	صحافت	〃
...رشید نسیم	رشید منزل۔ جمال پورہ۔ مقابل دولت دروازہ ملتان شہر	تدریس	〃 افسانہ۔ مضمون۔ تنقید
...انیس فیروزپوری	۱۱/۲۲۵۔ چوڑی سرائے بازار۔ اندرون دلی دروازہ ملتان	ملازمت	افسانہ۔
...بدالرحمن خان	چوک کچہری روڈ۔ ملتان	〃	〃 مضمون نگاری۔ تنقید

منٹگمری

...ی نسیم	گورنمنٹ کالج منٹگمری	تدریس	شاعری۔ تنقید
...شیرازی	ناظم باغات۔ محکمہ زراعت منٹگمری	ملازمت	〃 〃 مضمون نگاری
...ہاشمی	سعید منزل ہاشم گنج منٹگمری	—	افسانہ نگاری
...محمد رضوی	جناح چوک منٹگمری	حکمت	شاعری۔ مضمون نگاری۔ تنقید
...جہ	منٹگمری	ملازمت	شاعری
...خان قمر	جناح چوک منٹگمری	زمینداری	〃

نوٹ:۔ مندرجہ بالا فہرستیں حروف تہجی کے مطابق ہیں

ادارۂ مصنفین پاکستان (مرکز)

مرکزی مجلس عاملہ کا تیسرا اجلاس منعقدہ ڈھاکہ ۲۹، ۳۰ جنوری ۱۹۶۰ء
کارروائی

۲۹ جنوری ۱۹۶۰ء

۱۔ آغاز

اجلاس کا آغاز "ایوانِ بنگلہ" میں صبح دس بجے ہوا۔ مندرجہ ذیل اراکین نے شرکت کی:۔
پرنسپل ابراہیم خاں ۔ ابوالحسین ۔ احمد راہی ۔ اشفاق احمد ۔ اعجاز حسین بٹالوی
جسیم الدین ۔ جمیل جالبی ۔ دیوان محمد اظرف ۔ ڈاکٹر سید سجاد حسین ۔ پروفیسر سید وقار عظیم
شاہد احمد دہلوی ۔ بیگم شمس النہار محمود ۔ شیخ ایاز ۔ عبدالقادر ۔ عسکر بن شیخ ۔ غلام عباس
فارغ بخاری ۔ قدرت اللہ شہاب ۔ قرۃ العین حیدر ۔ محمد عبدالحی ۔ ہاجرہ مسرور
جمیل الدین عالی ۔ عبدالعزیز خالد ۔

۲۔ صدارت

اجلاس کی صدارت کے لیے بیگم شمس النہار محمود منتخب ہوئیں ۔

۳۔ توثیق

مرکزی مجلس عاملہ کے دوسرے اجلاس منعقدہ ۴ جولائی ۱۹۵۹ء بمقام لاہور پر غور کیا گیا، اور اس کی توثیق کی گئی۔

۴۔ کارگذاریاں

مرکزی کارگذاریاں زیرِ غور آئیں اور ان کو بنظرِ استحسان دیکھا گیا۔

سیکرٹری جنرل نے "سائنس اور فنونِ لطیفہ"، "ادیب اور قومیت" وغیرہ عنوانات پر منعقدہ ادبی مذاکرات پر کا اظہار کیا تھا۔ ان پر بحث کی گئی، اور آخر میں یہ طے پایا کہ جب تک "ادارے" کا کوئی عہدہ دار "ادارے" کی طرف سے کوئی بیان نہ دے اس کے ذاتی تاثرات پر مبنی سمجھا جائے گا۔ جس کا "ادارے" کی پالیسی سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اس ضمن میں سیکرٹری جنرل نے کہا کہ وہ "ادارے" کی ایک "پالیسی" کی تقریر میں اس امر کی مزید وضاحت کر دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ وہ ہمیشہ متنازعہ فیہ موضوعات پر خود بھی اپنی ذاتی حیثیت کا اظہار کرتے رہیں گے۔ اور اس امر پر دوسروں کو بھی خوش آمدید کہیں گے ——

(نوٹ:۔ مندرجہ بالا فہرست حروفِ تہجی کے مطابق ہے۔)

علاقائی کارگذاریاں پیش کی گئیں۔ حلقہ جات کراچی اور مشرقی پاکستان کی کارگذاریوں کو سراہا گیا۔ حالانکہ اراکین کا یہ خیال تھا کہ یہ حلقے اور زیا[دہ کام]
[کر] سکتے تھے۔ حلقۂ مغربی پاکستان کی بے عملی پر اظہار ملامت کیا گیا۔ اراکین کی رائے میں دفتر لاہور بالکل سویا ہوا تھا۔ مگر مغربی پاکستان کے چند
[حل]قے مرکز کی مدد سے خوب کام کر رہے تھے جس سے ملتان میں "کلڈ ہاؤس" جیسے نتائج برآمد ہوئے۔ علاقائی سیکرٹری نے وعدہ کیا کہ آئندہ مغر[بی پاک]
ستان میں "ادارے" کو پوری طرح بروئے کار لایا جائے گا۔

مشرقی پاکستان کی علاقائی عاملہ کو پچاس ہزار روپے فنڈ جمع نہ کرنے پر تنبیہ کی گئی۔ یہ فنڈ مرکز کے کئے ہوئے انتظامات کے تحت جمع ہو[نا تھا]
۔ اراکین کے سامنے یہ بات رکھی گئی کہ حالانکہ میجر جنرل امراؤ خان جنرل آفیسر کمانڈنگ مشرقی پاکستان نے ازراہِ تعاون "ادارے" کو مشرقی پاکستا[ن]
[کے] دس بڑے صنعت کاروں کے نام دس دس ہزار روپے عطیہ دینے کے لئے تعارفی خطوط دیدیئے تھے۔ لیکن علاقائی سیکرٹری ان صنعت کارو[ں]
[سے] ان وفود سے جا کر عطیے حاصل کرنے میں بالکل ناکامیاب رہے۔ نتیجتہً کچھ بھی جمع نہیں ہو سکا۔ چندہ جمع کرنے کے لئے علاقائی سیکرٹری ابوالحسن
[...] پر مشتمل ایک اور کمیٹی بنائی گئی۔ اور اس کمیٹی کو اختیار دیا گیا کہ وہ چندہ جمع کرنے کے سلسلہ میں کسی اور رکن کو بھی لے سکتی ہے۔

تمام علاقوں کو ہدایت دی گئی کہ وہ از سر نو اپنی تشکیل کریں۔ اور اپنی کارگذاریوں کا میدان زیادہ وسیع کریں۔

۵۔ بیمہ

متعدد کمپنیوں سے مرکز کے مذاکرات سے مرتب کیا ہوا بیمہ پالیسی پر ایک نوٹ زیر غور آیا۔

مرکزی دفتر کو ہدایت کی گئی کہ موجودہ بیمہ پالیسی کی آئندہ مالی توثیق نہ کی جائے۔ کیونکہ موجودہ اسکیم مفید نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بجائے ا[یک]
[او]ر بیمہ پالیسی آئندہ اجلاس عام میں پیش کرنے کے لئے مرتب کی جائے۔

علاقوں کی مالی رپورٹ پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا۔ کیونکہ کسی علاقے نے چندہ جمع کرنے کی مہم میں سرگرمی نہیں دکھائی تھی۔

۶۔ اشاعت گھر

چونکہ جولائی ۱۹۵۹ء کی قائم شدہ انتخابی کمیٹیاں نہ کام کر سکتی تھیں نہ کوئی کام انھوں نے کیا تھا، لہٰذا ان کو ختم کر دیا گیا اور مرکز[ی]
[...] اختیار دے دیا گیا کہ وہ کام شروع کرے۔ مزید سیکرٹری جنرل کو یہ اختیار دیا گیا کہ اگر مرکزی کمیٹی کا کام ممکن یا اطمینان بخش نہ ہو تو اس معا[ملے]
[می]ں وہ جس صورت سے چاہیں عمل کریں۔

حکومت سے درخواست کی گئی کہ وہ صدر پاکستان کے مجوزہ قرض کو جلد از جلد دیدے۔ عاملہ کے خیال میں "ادارے" کا نام ہی ا[س]
[قرض کی] ضمانت کے لئے کافی تھا۔ لیکن اگر پھر بھی وزارتِ مالیات اس بات پر زور دے تو سیکرٹری جنرل، اعزازی خازن اور اعزازی افسر[ان]
[اس] قرض کے لئے اپنی ذاتی ضمانتیں دیں۔

یہ طے پایا کہ تمام مسودات جو "ادارے" میں موصول ہوں بیمہ شدہ ہوں۔ اور ان کو انتخاب یا غیر انتخاب کا معاملہ ان کے وصول ہو[نے کے]
[ان] دو مہینے کے اندر طے ہونا چاہیئے۔ ان مسودات کے بیمہ کی فیس مصنفین کو دینا پڑے گی۔ اور ان مسودات کی حفاظت تا آں کہ
[وہ سیکرٹری] جنرل کے پاس پہنچ جائیں علاقائی سیکرٹری کے ذمے ہوگی۔ دفتر کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس پر ایک تفصیلی رپورٹ اجلاس عام
[آئ]ندہ پیش کرے اور اگر اس وقت تک حکومت سے قرضہ نہ مل سکا ہو تو اس کے نہ ملنے کی وجوہات بھی پیش کرے۔

۷۔ متفرقات بہ اجازت صدر

صدر کی اجازت سے مندرجہ ذیل نئے نکات ایجنڈے میں شامل کر لئے گئے۔ اور ان پر فیصلے لئے گئے۔

۱۔ اشفاق احمد اور اعجاز حسین بٹالوی نے تجویز پیش کی کہ تخلیقی قوتوں کی نقد انعامات سے حوصلہ افزائی کی جائے

[مرک]زی دفتر کچھ بڑے انعامات کا انتظام کرے۔ یہ انعامات ہر سال کی سب سے بہترین تخلیق پر دیے جائیں اور کسی ادیب کو اس کی تصنیفات کی روشنی میں نہ دیئے جائیں۔

اعجاز بٹالوی نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ ادارے کو ایسا مالی بندوبست کرنا چاہیئے کہ ملک کی تمام زبانوں اور خصوصیت سے [...]ہ اور بنگلہ کے مختلف اصناف ادب کے لئے چھوٹے چھوٹے گلڈ انعامات قائم کئے جائیں۔ اس تجویز کو اصولی طور سے تسلیم کر لیا گیا۔ سیکرٹری جنرل سے کہا گیا کہ وہ اس تجویز کو تکمیل دینے کے لئے مالی انتظامات کریں۔

(ii) اشفاق احمد نے تجویز پیش کی کہ ادارہ ڈھاکہ اور لاہور میں کتب خانے قائم کرے۔ ان میں تمام مجلتوں کی شروع سے کر اب تک [...]ریں ہونی چاہئیں۔ اس مقصد کے لئے ایک اعلامیہ لکھا گیا اور نشر کر دیا گیا۔

(iii) سیکرٹری جنرل نے پشاور، چاٹگام، حیدرآباد، ڈھاکہ، راولپنڈی، سلہٹ اور کراچی میں "گلڈ ہاؤس" بنانے کی تجویز پیش [...] عاملہ نے طے کیا کہ اس معاملے میں مزید کوشش کی جائے اور چندہ جمع کیا جائے تاکہ "ادارے" کی اپنی عمارتیں ہوں، اور اپنے ذرائع آمدنی [...]ہر آ جائیں۔ اس معاملے میں ملتان گلڈ ہاؤس کی اسکیم کو بنظر استحسان دیکھا گیا۔ اور یہ طے کیا گیا کہ اگر مذکورہ بالا مقامات کے علاوہ بھی [...]ی اور مقام پر گلڈ ہاؤس بننے کی سبیل ممکن آئے تو سیکرٹری جنرل کو اختیار ہے کہ وہ عاملہ کا انتظار کئے بغیر اس معاملہ میں ضروری قدم اٹھائیں

(iv) شیخ ایاز نے سندھی زبان کے تحفظ کے لئے ایک تجویز پیش کی۔ جس کو ان کی رضامندی سے مجلس السنہ و رسم الخط کو غور و خوض [...]سفارش کے لئے بھیج دیا گیا۔ اس مجلس سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی نشست میں (جو اسی روز شام کو منعقد ہو رہی تھی) شیخ ایاز [...]بلائے بھی گئے۔

(v) صدر اور فارغ بخاری نے بچوں کے ادب کو خصوصی توجہ دینے کے لئے تجویز پیش کی۔ اس تجویز کو اشاعت گھر والے [...]وگرام میں برائے غور شامل کر لیا گیا۔

(ترجمہ)

۳۰ر جنوری ۱۹۶۰ء

دوسری نشست

۱۔ صدارت

صدارت کے لئے بیگم شمس النہار محمود کو منتخب کیا گیا۔

۲۔ قواعدِ کار برائے ذیلی مجالس

اختلافی سفارشات کی بنا پر ذیلی شاخوں کے لئے قواعدِ کار کے مسودات کو پھر التوا میں ڈال دیا گیا۔ اور ذیلی مجالس کا انتظام اجلاس عام تک سیکرٹری جنرل کے سپرد کر دیا گیا۔ تاکہ اجلاس عام میں مرکزی سفارشات پیش کر دی جائیں۔

۳۔ ناقص دفعات

مرکزی دفتر نے دستوری دفعات کی ناقص شقوں کی طرف توجہ دلائی جن کی وجہ سے کچھ معاملات میں مثلاً علاقائی مجالسِ عاملہ اور ان کے اراکین کے بالکل کام نہ کرنے کی صورت میں کوئی بندش نہ ہونے کی وجہ سے بڑی گڑبڑ پڑتی ہے۔ اعجاز بٹالوی نے قانونی رائے دی کہ اس معاملے میں مرکزی مجلس عاملہ کو کوئی اختیار نہیں ہے کیونکہ ان قواعد میں ترمیم کرنے کا حق صرف اجلاس عام کو ہے۔ اس لئے یہ طے کیا گیا کہ تمام ”علاقوں“ کو متنبہ کیا جائے کہ وہ کچھ کارگزاریاں دکھائیں ورنہ دستوری دفعات کو زیادہ سخت کر دیا جائے گا۔ اعزازی افسر رابطہ نے یقین دلایا کہ وہ اجلاس عام کے لئے دفعات متعلقہ میں مناسب ترمیمات پیش کریں گے۔ اس کے بعد اس تجویز کو واپس لے لیا گیا۔

۴۔ عام مرکزی و علاقائی انتخابات

یہ طے کیا گیا کہ ہر صورت میں عام انتخابات اپریل ۱۹۶۰ء میں لاہور میں منعقد کرا دیئے جائیں گے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ مرکزی رقم کم ہونے کی وجہ سے ہر علاقہ اپنے مندوبین کے اخراجات کا خود کفیل ہوگا۔ مزید یہ طے کیا گیا کہ اگر رقم کافی نہ پائی گئی تو علاقہ مغربی پاکستان رہائش و طعام کی حد تک سب کا میزبان ہوگا۔ سیکرٹری جنرل نے وعدہ کیا کہ اگر مشرقی پاکستان کا علاقہ اپنے لئے خود رقم مہیا نہ کر سکا تو وہ مشرقی پاکستان ہی میں اس کے لئے پانچ ہزار روپے کا بندوبست کر دیں گے۔

مزید طے کیا گیا کہ سالانہ عام انتخابات (مرکز) کے سلسلہ میں اراکین کو رجسٹرڈ نوٹس بھیجے جائیں اور اجلاس عام کی صدارت کے فرائض ایک ایسا رکن انجام دے جو دستور کے ماتحت نہ تو اجلاس عام کا رکن بننے کا خواہشمند ہو، نہ کسی عہدہ کا امیدوار ہو اور اگر سیکرٹری جنرل انتخابی نامزدگی داخل کریں تو اعزازی ”افسر رابطہ“ اور ”سے“ کا انتظام سنبھال لیں اور وہی انتخابات منعقد کرائیں۔ اعزازی افسر رابطہ کو اختیار دیا گیا کہ وہ مرکزی انتخابات سے پیشتر علاقائی انتخابات کرائیں تاکہ اجلاس عام کے لئے جو مندوبین شرکت کر سکیں وہ منتخبہ ہوں۔

۵۔ نئی رکنیت

ذیلی کمیٹیوں کی جانچ پڑتال کے بعد نئے اراکین لے لئے گئے۔

۶۔ متفرقات بہ اجازت صدر

صدر کی اجازت سے مندرجہ ذیل تجاویز پر بحث کی گئی اور منظور کئے گئے۔

(i) مجلوں کا اجراء

کوی غلام مصطفٰی، ڈاکٹر عبدالحیٔ اور پروفیسر سید وقار عظیم کی ادارت میں ڈھاکہ اور لاہور سے دو مجلوں کا اجرا کیا جائے۔
اور اس سلسلہ میں اور علاقوں کی بھی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ذیلی علاقوں کو بغیر علاقے کی منظوری کے مجلے جاری کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

(ii) مرکزی مجلس اشاعت

مرکزی مجلسِ اشاعت جو ۲۹ جنوری ۱۹۶۰ء کو قائم ہوئی، اس میں مندرجہ ذیل اراکین نامزد کئے گئے۔

اردو:-

جمیل جالبی، ہاجرہ مسرور، سید وقار عظیم، شاہد احمد دہلوی۔

بنگلہ:-

پرنسپل ابراہیم خان۔ ابوالحسن۔
اور تینوں علاقائی سیکرٹری۔
اگر ان کے اجلاس ممکن نہ ہوسکے تو سیکرٹری جنرل خود ہی کام آگے بڑھائیں گے۔

(iv) خیرسگالی وفود

مشرقی اور مغربی پاکستان میں زیادہ وفود بھیجے جائیں اور حکومت ہر اس وفد میں جن میں ادیبوں کی شمولیت ہو "ادارے" سے ضرور مشورہ طلب کرے۔

(v) سالانہ رپورٹ

مرکزی دفتر کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ بغیر مرکزی مجلس عاملہ کے سامنے پیش کئے ہوئے سالانہ اجلاس عام میں رپورٹ پیش کرے۔ کیونکہ اب مرکزی عاملہ کا اجلاس صرف رپورٹ منظور کرنے کے لئے اپریل ۱۹۶۰ء سے پہلے منعقد نہیں کیا جاسکتا۔

(vi) حسابات کی تنقیح

سیکرٹری جنرل کو اختیار دیا گیا کہ اجلاس عام میں پیش کرنے کے لئے "ادارے" کے حسابات کی تنقیح کراچی کے کسی چارٹرڈ یا رجسٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے کرائے۔ کیونکہ عاملہ ڈھاکہ میں بیٹھ کر کراچی کے کسی اکاؤنٹنٹ کو نامزد کرنے سے قاصر تھی۔ یہی ہدایات علاقوں پر بھی عائد ہوں گی۔ جن کو اپنے اجلاس عام میں تنقیح شدہ حسابات پیش کرنے ضروری ہیں۔ بصورت دیگر مرکزی اجلاس عام میں ان کے لئے اظہار ناپسندیدگی کیا جائے گا۔

(vii) چند جماعتوں پر پابندیاں

لاہور میں منعقدہ مرکزی مجلس عاملہ کے دوسرے اجلاس میں کچھ جماعتوں پر حکومت کی پابندی کے بارے میں سیکرٹری جنرل سے طلب شدہ رپورٹ پیش کی گئی۔ چونکہ حکومت ان جماعتوں کو سیاسی جماعتیں تصور کرتی ہے، اور کسی ادیب کی ادبی تخلیق یا تصنیف پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔ لہٰذا عاملہ نے اس معاملہ کو واپس لے لیا۔ البتہ یہ طے کیا گیا کہ اگر کسی ادیب کو چاہے وہ "ادارے" کا رکن ہو یا نہ ہو ایک ادیب کی حیثیت سے کسی حلقے یا انجمن کی طرف سے پریشان کیا گیا تو "ادارہ" فوراً اس کے حقوق کی حفاظت کرے گا۔

۷۔ شکریہ

صدر نے سب کا شکریہ ادا کیا۔

(ترجمہ)

اراکین جو ۳۰ جنوری سنہ ۱۹۶۰ء کو ادارے میں شامل کئے گئے

کراچی

نام	پتہ	پیشہ	شعبہ
آغا امر	۲۵/۴۔ مارٹن روڈ۔ کراچی ۵	ملازمت	افسانہ۔ ڈرامہ
آفاق حسین آفاق	۲۸/۱۔ جیکب لائن کراچی	〃	شاعری۔ تحقیق
ڈاکٹر احسان محمد خان	۴۔ اے، محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ ٹورک روڈ۔ کراچی ۵	〃	مضمون نگاری۔ تنقید
محمد بشیر	فلیٹ ۱۵۔ یو۔ بی۔ بی۔ بلڈنگ ۲۔ ارنس روڈ۔ کراچی	〃	مضمون نگاری، مزاح
ویرا احمد	۶/۱۔ المدینہ۔ ناظم آباد۔ کراچی	〃	شاعری۔ افسانہ۔ ناول۔ تنقید
حمید نسیم	ریڈیو پاکستان کراچی	〃	شاعری۔ ڈرامہ۔ تنقید
خلیق ابراہیم خلیق	۱۱/۵۔ III۔ بی۔ ناظم آباد	〃	شاعری۔ مضمون نگاری۔ تنقید
خواجہ جمیل احمد	۹۱۔ ایف، جہانگیر روڈ (ویسٹ)۔ کراچی۔ ۵	〃	افسانہ۔ مضمون نگاری۔ ڈرامہ۔ تنقید
روشن نگینوی	۴،۲۔ پاکستان کوارٹرز لارنس روڈ۔ کراچی	〃	شاعری
سید احمد رفعت	۴۷۔ راجہ مینشن ۱ نزد عیدگاہ و پولس اسٹیشن بندر روڈ کراچی ۱	〃	ڈرامہ
سید الطاف علی بریلوی	اسحاق منزل ۲۸۹/۱، علامہ شبیر احمد عثمانی کالونی ناظم آباد بی روڈ کراچی ۵	〃	مضمون نگاری
سید بادشاہ حسین	پہلی منزل۔ الجبروالا بلڈنگ، نزد اورنٹیل چیمبر ساؤتھ نیپئر روڈ۔ نیوپالی۔ کراچی	صحافت	افسانہ۔ مضمون نگاری۔ ڈرامہ۔ تنقید
سید شہنشاہ حسین ادم لکھنوی	۸۶۔ ای۔ جہانگیر روڈ (ویسٹ) کراچی	ملازمت	شاعری
سید شریف الحسن فاروقی	جگی ۱۸ ڈی۔ گوجر نالہ بلاک ۲ ناظم آباد۔ کراچی	〃	افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری
عارف حجازی	جھونپڑی ۲۸ گوجر نالہ ۲ ناظم آباد کراچی ۱۸	〃	افسانہ
شہاب قزلباش	۵۔ آر۔ ۲۔ بلاک ۳ قصر شاعر۔ ناظم آباد ۱۸	صحافت	شاعری۔ افسانہ۔ ڈرامہ۔ تنقید
ضیاء الدین احمد برنی	۵۰۱۔ گرڈول۔ لیکھراج روڈ۔ کراچی ۱	پنشنر	مضمون نگاری۔ تنقید
عبدالقیوم ندوی	۲۰۲۔ بی۔ اسلام گنج کراچی ۵	تالیف	مضمون نگاری
محمد اسحاق فہیم	محراب خاں روڈ۔ غریب آباد۔ لیاری کوارٹرز۔ کراچی ۲	ملازمت	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید

محمد تقی حسن	۴۲۔ اے، بابرہ آباد۔ ڈرگ کالونی۔ بلاک ۳ کراچی ۴۵	تصنیف	ناول، مضمون نگاری
...عمر	معرفت ... پی۔ اے۔ ایف آفیسرز میس۔ ماری پور کراچی	ملازمت	افسانہ
...نور ریاض	... جہانگیر روڈ۔ ایسٹ کراچی	تصنیف	افسانہ۔ ناول
...راج الدین ابو الخطیب	۵۔ ۸۔ بی بلاک، محمود آباد۔ کراچی ۶	"	افسانہ۔ ناول، مضمون نگاری تنقید

کراچی

بنگلہ ذیلی حلقہ

...روشن آرا بیگم	معرفت ایس زمان، ۹۵۔ ای جہانگیر روڈ ویسٹ کراچی
...یم۔ اے۔ غفور	بی ۲۳/۱۔ فیڈرل کیپٹل ایریا۔ کراچی
...یم۔ علی۔ نواز	پروفیسر بنگلہ۔ کومیلا

حلقہ مغربی پاکستان

پشاور

...رشاد احمد صدیقی	بنا ط گل حسن۔ کریم پورہ پشاور سٹی	ملازمت	افسانہ۔ ڈرامہ، مضمون نگاری
...شرت درانی	روزنامہ انجام پشاور	صحافت	افسانہ۔ ناول، تنقید، مضمون نگاری
...احمد سلیم	ریڈیو پاکستان پشاور	صحافت	افسانہ۔ ڈرامہ
...حسن خاں سوز	بکٹ گنج۔ مردان	ملازمت	افسانہ
...خلیل الرحمن خان	کالونی سرحد ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ نوشہرہ ضلع پشاور	ملازمت	شاعری
...خلیل رامپوری			
...رفیع فصیح احمد	۱۲، واربرٹن روڈ۔ پشاور چھاؤنی		افسانہ۔ ناول
...رفعت ڈیروی	محلہ حافظ اللہ بخش ڈیرہ اسمٰعیل خاں	ملازمت	" "
...ریاض قمر	معرفت ڈان میڈیکل اسٹور ڈیرہ اسماعیل خان	تجارت	شاعری
سید محمد راشد علی دہقان	ریڈیو پاکستان پشاور	ملازمت	شاعری۔ ناول، مضمون نگاری، تنقید
سید محمد شاہد برقی	... پشاور یونیورسٹی۔ پشاور	ملازمت	شاعری، مضمون نگاری
سید مظہر گیلانی	حکیم آباد پشاور	زمیندار	شاعری۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، تنقید
شرر نعمانی	گورنمنٹ کالج کوہاٹ	تدریس	شاعری، مضمون نگاری

شعیب قریشی	پیر خیل کوہاٹ	ملازمت	افسانہ۔ ڈرامہ۔ مضمون نگ تنقید
صاحبزادہ فیض الرحمن (صاحبزادہ فیضی)	موضع بزید خیل بڈابیر پشاور	"	شاعری
عبدالعزیز اختر وارثی	محلہ نیازی کوہاٹ شہر	"	شاعری۔ مضمون نگاری۔ تنقید
عبداللہ جان مغموم	ریڈیو پاکستان پشاور	"	شاعری۔ افسانہ۔ ڈرامہ۔
عشرت ملک	بیکہ توتے گیٹ۔ پشاور شہر	"	شاعری
عنایت علی شاہ مینا جعفری	حیات ہومیو شفا خانہ محلہ تلیاں۔ پشاور	ڈاکٹری	شاعری۔ مضمون نگاری۔ تنقید
فہمیدہ اختر علی کوزئی	معرفت عبدالرؤف خاں۔ فضل حق اسٹریٹ پشاور	تدریس	افسانہ۔ ڈرامہ۔ تنقید
فہمیدہ سعید	معرفت محمد سعید خاں اسسٹنٹ۔ دفتر ایڈیشنل کمشنر ڈیرہ اسمٰعیل خاں	صحافت	تنقید افسانہ مضمون نگاری
قدوس صہبائی	مدرسین۔ پشاور چھاؤنی	"	شاعری۔ افسانہ مضمون نگ ناول۔ ڈرامہ۔ تنقید
قربان علی جوہر میر	۲۵۴۔ تربازا اسٹریٹ سرکی گیٹ پشاور	طالب علم	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون نگ ناول۔
لال محمد عاصی رضوی	بازار کلاں نزد کلاک ٹاور۔ پشاور	تجارت	شاعری
مجید شاہد	معرفت محمد یعقوب گردوارہ۔ ڈھکی شریف خان کریم پورہ پشاور شہر	ملازمت	شاعری
مختیار علی مینر	محلہ ناؤ۔ بجوری۔ کوچہ آخندزادہ پشاور	ملازمت	افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری
مرزا محمود سرحدی	چوک ناصر خاں۔ پشاور	پنشنر	شاعری
محسن احسان	ڈھکی نامہ۔ قصہ خوانی پشاور	ملازمت	"
مسعود انور شفقی	ڈبگری گیٹ پشاور	"	" مضمون نگاری۔ تنقی
محمد اسلم فرید	مکان ۸۰۰ سکے رامپورہ۔ پشاور شہر	"	"
محمد ایوب صابر	موضع جنگل خیل۔ محلہ پیر خیل ضلع کوہاٹ	"	"
محمد رمضان (رسا بریلوی)	کالونی سرحد ٹکسٹائل ملز لمیٹڈ۔ نوشہرہ۔ ضلع پشاور	"	"
محمد شفیع صابر	فاروڈ کالج پشاور	تدریس	" ڈرامہ۔ مضمون نگاری
محمد لطیف وہبی	چارسدہ۔ پشاور	ملازمت	"
محمد تنظیر رشک کاشمیری	محلہ فقیر غلام محمد۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان	تدریس	"

مود شوکت	محلہ شکر دھند. کوہاٹ شہر	تدریس	شاعری. افسانہ. مضمون نگاری. ناول. ڈرامہ. تنقید
مفر تاتاری	اسٹار نیوز ایجنسی. بازار کلاں پشاور	تجارت	شاعری
ک محسن علی عمران	نہرہ اسٹریٹ. ڈیرہ اسمٰعیل خاں	ملازمت	″ مضمون نگاری
میر احمد زار	سی. ۳۰۴۲ محلہ خدمت گاراں والا. ڈیرہ اسمٰعیل خاں	تدریس	مضمون نگاری. تنقید
مہ شہناز	معرفت عبدالسلام خاں. ریس کورس گارڈن پشاور	″	″ افسانہ
زبیر محمد خاں آزاد	واعظان اسٹریٹ. محلہ سنگرب کوہاٹ شہر	تدریس	شاعری. ناول. مضمون نگاری. ڈرامہ. تنقید
ی محمد طوفان	۱۵۱. محلہ ہری گنج. پشاور شہر	ادب	شاعری. افسانہ. ڈرامہ. تنقید

حیدرآباد

غنی اعظمی	سی/۱۷۲، لطیف آباد ۷ حیدرآباد	ملازمت	شاعری
شتاق حسین اظہر	پاکھا پیر چاری. گاڑی کھاتہ. حیدرآباد	صحافت	″ افسانہ. مضمون نگاری
بر شاہناز	شبیر منزل. بالاشاہی اسٹریٹ. ویسٹ کچا حیدرآباد	تدریس	″ ″ ڈرامہ
ثی سلیمی	۱۲۰۸ بھائی خان چاری. حیدرآباد	″	″ مضمون نگاری. ڈرامہ. تنقید
ش انوری	اسلام نگر. بہاول پور	صحافت	″ ″
ر بخش اللہ داد خاں جتوئی	سائٹ تھ رسالہ روڈ. حیدرآباد	زراعت	″ ″ تنقید
ان رشید	سندھ یونیورسٹی حیدرآباد	تدریس	″ ″ افسانہ. ناول
ابو شمس	مکان نمبر 8/115، ۲۲۹۳ حیدرآباد	x	افسانہ ″
زینت عبداللہ چنا	مقابل ریڈیو پاکستان. حیدرآباد	x	″ ″
ممتاز علی شیخ	ہیرآباد. حیدرآباد	وکالت	شاعری ″ تنقید
پ چند رشاد	مٹھی. ضلع حیدرآباد	تعلیم	″ ″
طان جمیل نسیم	ڈاکٹر پرسرام بلڈنگ. ملیم چند. گوروداس مل لین. بنک روڈ. حیدرآباد	″	″ ڈرامہ. ناول. افسانہ
ر الحیدری	سندھی ادبی بورڈ. بنک انسکائین. حیدرآباد	صحافت	″ افسانہ. مضمون نگاری
ج علی محمد	صدر. حیدرآباد	″	مضمون نگاری. تنقید
ستار خاں گلکار اشرفی	ٹیلیگراف ورکشاپ کوٹری	ملازمت	شاعری. مضمون نگاری. افسانہ. تنقید
الغفور انصاری	اے ۶۰ ہیرآباد کوارٹرس. نزد گورنمنٹ گرلز اسکول حیدرآباد	تدریس	افسانہ. مضمون نگاری. ڈرامہ. تنقید
رگرامی جاوید خاں	مدیر مہران ۵ سرمائی گاڑی کھاتہ. حیدرآباد	صحافت	شاعری. مضمون نگاری. تنقید

قمرالدین صدیقی قمر صدیقی	مکان نمبرہ، فلاح صوبن آباد، میرپورخاص	ملازمت	شاعری
محمد بخش جوہر	مدیر، روزنامہ "ہلالِ پاکستان" حیدرآباد	صحافت	شاعری، افسانہ، مضمون نگاری، ناول، تنقید، ڈرامہ
محمد خان غنی	پروپرائٹر ہاشمی پرنٹنگ پریس، حیدرآباد	صحافت	شاعری، افسانہ، مضمون نگاری، ڈرامہ، تنقید
محمد سومار شیخ	جیلانی پبلیکیشن، بدین، ضلع حیدرآباد	تدریس	شاعری، ناول، مضمون نگاری، ڈرامہ، تنقید
محمد عتیق حسن نگار عرفانی	معرفت ریاض اکبر علی خان سٹی کالج، حیدرآباد	صحافت	افسانہ، مضمون نگاری، ڈرامہ
محمد مظہر علی خان مظہر عرفانی	" " " "	تدریس	شاعری
مخدوم امیر احمد عباسی	پرنسپل اورنٹیل کالج حیدرآباد	"	شاعری، مضمون نگاری، تنقید
مرزا گل حسین احسن کربلائی	ٹنڈو آغا اسماعیل شاہ، حیدرآباد	ملازمت	شاعری " ڈرامہ
مقبول احمد بھٹی	ڈیلو جوپیٹر حیدرآباد	صحافت	تنقید "
مقبول احمد صدیقی	ہلالِ پاکستان، حاجی امین الدین روڈ، حیدرآباد	"	شاعری افسانہ
ممتاز مرزا	ٹنڈو آغا اسمعیل شاہ، حیدرآباد	تعلیم	ڈرامہ "
میر محمد نظامانی میرل	سندھ یونیورسٹی حیدرآباد	تدریس	شاعری، ناول، افسانہ، مضمون نگاری، تنقید
میمن محمد علی ڈپلائی	معرفت ہفتہ وار انسان ڈبلیو سی، حیدرآباد	صحافت	افسانہ، مضمون نگاری
میو و خان پروانہ بھٹی	ٹنڈو محمد خان حیدرآباد	"	شاعری، افسانہ
ایم۔ آر۔ خان اسیت	ڈاک خانہ نمبر ۲، اسٹیشن روڈ، میرپورخاص	ملازمت	شاعری مضمون نگاری
ڈاکٹر نجم الدین عباسی	قاضی عبدالقیوم روڈ، گاڑی کھاتہ حیدرآباد	ڈاکٹری	افسانہ "
نوازش نشوا	مٹھی، تھرپارکر	تعلیم	شاعری، افسانہ
نیاز حسین قائم دین میمن (نیاز ہمایونی)	طبیہ کالج، ٹنڈو طیب، حیدرآباد	ڈاکٹری	" " ناول، ڈرامہ، مضمون نگاری
یار محمد حیات طیفور	سندھی ادبی بورڈ، تلک انکلائین، حیدرآباد	ملازمت	شاعری، افسانہ، مضمون نگاری

خیرپور میرس

جمال ابڑو	سب جج خیرپور میرس	ملازمت	افسانہ
سید قائم رضا نسیم امروہوی	پرنسپل نظامانی خیرپور میرس	تصنیف	شاعری، افسانہ، مضمون نگاری، ڈرامہ

...واحد علی کیانی	۱۱۵/۱۴ گردھی چھاپ۔ خیرپور میرس	تصنیف	شاعری۔ مضمون نگاری
...ران صدیقی	ادھرواباد بچل شاہ محلہ خیرپور میرس	ملازمت	شاعری

راولپنڈی

...ز ہوشیارپوری	۵/۲۸۵۔ کرتارپورہ۔ راولپنڈی	وکالت	شاعری
...م بریلوی	مکان نمبر ڈی ۲۸۰۷۔ چوک نیا بازار راولپنڈی	ملازمت	ناول، مضمون نگاری۔ ڈرامہ۔ تنقید
...م قمر	انٹرسروسز پبلک ریلیشنز ڈائرکٹریٹ۔ ہال روڈ۔ راولپنڈی	"	مضمون نگاری
...ب جالب	معرفت احمد ازعلی، یونیورسٹی، پوسٹ آفس۔ راولپنڈی۔	ادیب	شاعری
...ہ فرزی	سوطرز ہم۔ ڈلہوزی روڈ۔ راولپنڈی	ملازمت	شاعری
...ید سلیم سیبی	سوٹ ۱۰۔ ۲۰۵ گلین ویو اسٹیٹ۔ مے ڈار روڈ راولپنڈی	تدریس	" افسانہ
...عطا حسین کلیم	جی/۱۹۹ اے/۲۰۳ لیاقت روڈ راولپنڈی	ملازمت	" مضمون نگاری۔ تنقید
...نت مرزا تنویر	سی ایل ۱۹۔ مریڑ حسن۔ راولپنڈی	صحافت	" ڈرامہ۔ تنقید
...ناصر زیدی	سی۔ بی۔ او۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی۔ کاکول۔ ہزارہ	ملازمت	مضمون نگاری
...حیدری	گورنمنٹ کالج راولپنڈی	تدریس	شاعری۔ مضمون نگاری۔ تنقید
...ختر	۴۔ اے مانی روڈ سمن آباد لاہور	ملازمت	مضمون نگاری
...ضل ہانی صدیقی	ریڈیو پاکستان۔ راولپنڈی	ملازمت	شاعری
...بدالقیوم شفق ہزاروی	مکان نمبر کے۔ ایل۔ ۱۲۴۔ نک روڈ۔ ایبٹ آباد	زراعت	شاعری۔ ڈرامہ۔ افسانہ
...د قریشی	مکان نمبر ۱۱۷۳۔ ریجمنٹ بازار۔ لال کرتی راولپنڈی	ملازمت	شاعری۔ ڈرامہ۔ تنقید
...ل الہی	مکان نمبر بی/۱۰۱۴۷۔ صنعرمال۔ راولپنڈی	"	مضمون نگاری

سیال کوٹ

...ثقلین نقوی	گورنمنٹ ہائی اسکول۔ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ	تدریس	افسانہ۔ ناول

کیمبل پور

...ق علی خاں	پرنسپل گورنمنٹ کالج کیمبل پور	تدریس	مضمون نگاری۔ افسانہ
...محمد حشان	گورنمنٹ کالج کیمبل پور	"	" تنقید
...حسن محمود	سول جج۔ کیمبل پور	ملازمت	" تنقید
...غلام جیلانی برق	کیمبل پور	تدریس	تحقیق
...مہدی صابر	تحصیل پنڈی گھیب، ضلع کیمبل پور	"	مضمون نگاری۔ شاعری
...ہانی خان ...کجھا	۲۱۔ کے۔ ای۔ سولجر بازار۔ کیمبل پور	وکالت	"
...امت تبسم	تحصیل فتح جنگ۔ ضلع کیمبل پور	تدریس	" شاعری۔ تنقید

نام	پتہ	پیشہ	ادبی شعبہ
محمد [illegible]	ایڈووکیٹ کیمبل پور	وکالت	مضمون نگاری۔ تنقید
محمد شریف کنجاہی	گورنمنٹ کالج کیمبل پور	تدریس	" " شاعری

گجرات

نام	پتہ	پیشہ	ادبی شعبہ
پیر فضل حسین	دربار شاہ دولہ صاحب گجرات	زمینداری	شاعری
خیال یتانی	ڈی۔ بی۔ ہائی اسکول۔ بہراں والی۔ ضلع گجرات	تدریس	شاعری۔ مضمون نگاری۔ تنقید
عبدالغنی راحت گجراتی	رنگ پورہ اسسٹرٹیٹ گجرات	ملازمت	شاعری۔ افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری
قربان طاہر	اقبال گنج گجرات	صحافت	افسانہ مضمون نگاری
کیپٹن محمد رمضان تبسم قریشی	اقبال گنج گجرات	ملازمت	شاعری۔ ناول۔ مضمون نگاری۔ تنقید
محمد عرفان	زمیندار کالج گجرات	تدریس	مضمون نگاری۔ تنقید

لاڑکانہ

نام	پتہ	پیشہ	ادبی شعبہ
پروفیسر ظہیر فتحپوری	گورنمنٹ کالج۔ لاڑکانہ۔ موجودہ پتہ۔ ممتاز کالج خیرپور میرس	تدریس	شاعری۔ ناول۔ مضمون نگاری۔ تنقید
منظر حسین ساکلی	معرفت ظہیر فتحپوری۔ گورنمنٹ کالج لاڑکانہ	ملازمت	ادب

لاہور

نام	پتہ	پیشہ	ادبی شعبہ
احمد سعید	۴۰۔ جے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور	تدریس	افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری۔ ڈرا[ما]
امجد حسین	چیف رپورٹر۔ پاکستان ٹائمز لاہور	صحافت	" "
انور سجاد	نیلین چہ منڈی۔ لاہور	ڈاکٹری	افسانہ۔ ناول۔ ڈرامہ
بشیر احمد ساجد	ٹینا جیکل سنٹر۔ ۲۴ گل برگ روڈ۔ لاہور	ملازمت	شاعری۔ مضمون نگاری۔ تنقید
حاجی لق لق	مکان ۱۳ گلی ۵ بھوت نگر لاہور	صحافت	شاعری۔ افسانہ۔ مزاح۔ مضمون نگا[ری]
حبیب کیفوی	معرفت داستان گو۔ ۲۷۔ دی۔ مال۔ لاہور	ملازمت	شاعری۔ مضمون نگاری۔ ڈرامہ۔ تنقی[د]
حمید اختر	۱/۲ پارک سنت نگر لاہور	صحافت	افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری۔ ڈرا[ما]
حبیب جالب	معرفت انار علی۔ یونیورسٹی پوسٹ آفس لاہور	ادب	شاعری
خلیل صحافی	۲۷۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور	صحافت	افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری۔ ڈرام[ا]
خواجہ دل محمد	۳۔ گل برگ کالونی۔ لاہور	تدریس	شاعری
[illegible] میرزا [illegible]	۲۵۔ جمال الدین روڈ۔ لاہور	"	ڈرامہ
[illegible]	۱۰ کوئنز سٹریٹ لاہور		
سید امتیاز علی تاج	۲۰۔ ایبٹ روڈ۔ لاہور	تصنیف	افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری

نام	پتہ	پیشہ	اصناف
یدسبط حسن	22/ایچ سمن آباد لاہور	صحافت	مضمون نگاری۔ تنقید
رسید عبداللہ	پرنسپل اورینٹل کالج لاہور	تدریس	تحقیق۔ تنقید
یدمطلبی فرید آبادی	ڈاک خانہ سرافی والی براہ پسرور ضلع سیالکوٹ	زراعت	شاعری۔ مضمون نگاری۔ ڈرامہ۔ تنقید
ی بانو	76۔سی۔ ماڈل ٹاؤن لاہور	تصنیف	افسانہ۔ ناول
شہزاد احمد	17۔ بی نسبت روڈ۔ لاہور	ملازمت	شاعری۔ مضمون نگاری۔ ڈرامہ
ح الدین ندیم	مکان 39 گوند روڈ سٹریٹ 63 چیمبرلین روڈ۔ لاہور	ملازمت	شاعری
لمجید شیخ	829/ایچ سمن آباد۔ لاہور	صحافت	افسانہ۔ ناول۔ تنقید
لمسیح پال اثر صہبائی	4/7 غلام نبی کالونی پونچھ روڈ۔ لاہور	وکالت	شاعری
لکریم قمر	6۔ گیلانی اسٹریٹ اچھرہ۔ لاہور	حکمت	شاعری۔ مضمون نگاری
رت رحمانی	18۔ اے رتی گن روڈ۔ لاہور	ملازمت	شاعری۔ افسانہ۔ ناول۔ ڈرامہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید
م حسین ذوالفقار	معرفت اورینٹل کالج لاہور	تعلیم	تنقید
م علی چوہدری	بالمقابل احمدیہ بلڈنگ برانڈرتھ روڈ۔ لاہور	تدریس	افسانہ
ورسائیں	مکان 1642 شاہی محلہ لاہور	"	شاعری
اسلم	بارود خانہ لاہور	تصنیف	ناول۔ افسانہ
سین بابا عالم سیاہ پوش	5۔ فیروزپور روڈ۔ کنال بنک لاہور	فلم رائٹر	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون نگاری۔ ڈرامہ۔ تنقید
حلیم قریشی	16/4 رحمان پورہ۔ فیروزپور روڈ۔ لاہور	ملازمت	شاعری
اختر	1۔ ایم۔اے مانی روڈ سمن آباد۔ لاہور	ملازمت	مضمون نگاری
م۔ آئی۔ صدیقی (دارم صدیقی)	4 چمبل روڈ۔ لاہور	"	افسانہ۔ ناول
یر انور	نسبت روڈ۔ لاہور	"	افسانہ
راز	4/14 گوردوارجن نگر۔ لاہور	فلم رائٹر	افسانہ۔ مضمون نگاری۔ ڈرامہ۔
زیر محمد اشرف خان	اسٹور سے گوری کوٹ گلگت ایجنسی	ملازمت	شاعری۔ تنقید
مت جمال انصاری	اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور	تدریس	شاعری۔ تنقید۔ مضمون نگاری
لش ادیب	دھوبی بازار ایبٹ م 15 - لاہور	فری لانس	افسانہ۔ ناول

آل پور

منظور حسین شور	بی ۲۲/ سنت پورہ مقابل گورنمنٹ کالج آل پور	تدریس	شاعری

مُلتان

حنیف احسن	معرفت منشی عبدالرحمن خاں چہلک ملتان سٹی	ملازمت	افسانہ۔ ناول۔
حنیف چودھری	دفتر ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر، کچہری روڈ۔ ملتان	"	افسانہ، ناول، ڈرامہ۔ تنقید
مختار مسعود	ڈپٹی کمشنر۔ ملتان۔ موجودہ پتہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی	"	مضمون نگاری
نور احمد خاں فریدی	قصر ادب۔ جگو والا براستہ لودھراں ضلع ملتان	"	افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری۔ تنقید

نواب شاہ

ا۔ م۔ م۔ فرشوری	$\frac{I.A}{40A}$ ہسپتال روڈ نواب شاہ	ملازمت	شاعری۔ مضمون نگاری۔ تنقید

حلقہ مشرقی پاکستان

(بنگال)

باقرگنج

محمد مزمل حق	حلیم منزل۔ ڈاک خانہ بھولا۔ ضلع باقرگنج	زمینداری	شاعری

پبنا

اے۔ ایم۔ ہارون الرشید	رشید منزل پبنا	ڈاکٹری	ناول

ٹپیرا

عنت علی	برہمن بریا کالج۔ برہمن بریا۔ ٹپیرا	تدریس	افسانہ

ڈھاکہ

ابوالفضل نور احمد	ریڈنگ روم سپروائزر ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری۔ ڈھاکہ	ملازمت	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون نگاری۔ ناول۔ ڈرامہ۔
اجیت کمار گویا	او۔ ٹنٹی بازار۔ ڈھاکہ	تدریس	مضمون نگاری۔ تنقید

احد شریف	۸۔ ایسے کے داس روڈ۔ ڈھاکہ	تدریس	مضمون نگاری۔ تنقید
ابوالفضل الرحمٰن	۱۰۔ دھان منڈی ریذیڈنشل ایریا پاک سوسائٹی گنج ڈھاکہ	ملازمت	افسانہ۔ ناول
اشرف صدیقی	۳۷۔ دیوان بازار روڈ۔ ڈھاکہ	تدریس	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون نگاری ڈرامہ۔ تنقید
بیگم امینہ سلطانی	۱۸۔ ستیش سرکار روڈ۔ ڈاک خانہ فرید آباد۔ ڈھاکہ ۴	״	شاعری۔ افسانہ
اے۔ ٹی۔ ایم انیس الزماں	۸۸۔ بام چرن چکرورتی روڈ۔ ڈھاکہ ۳	تدریس	افسانہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید
ایس۔ ایم۔ بدل الرشید	۸۔ بدما لوچن رائے لین مہاشلی ڈھاکہ ۱	״	شاعری۔ ناول۔ مضمون نگاری۔ ڈرامہ
ثناء اللہ نوری	۱۹۔ عظیم پورہ روڈ۔ ڈھاکہ	ملازمت	افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری۔ تنقید
چودھری شمس الرحمٰن	معین محل ککریل روڈ۔ ڈاک خانہ۔ رمنہ۔ ڈھاکہ	״	״ ״ ״ ״
حسن آرا	۳۳۔ اولڈ مغل ٹولی۔ ڈھاکہ	ادب	شاعری۔ افسانہ
بیگم حشمت رشید	۷۔ پدما لوچن رائے لین مہاشلی ڈھاکہ ۱	تصنیف	افسانہ
حمایت حسین	ریلی برادرز لمیٹڈ نرائن گنج	ملازمت	شاعری۔ افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری
رشید کریم	۱۲۔ کے۔ ایم۔ داس لین واری ڈھاکہ	״	افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری۔ تنقید
سبے ودھ داس گپتا	۵ شانکھری بازار۔ ڈھاکہ ۱	صحافت	افسانہ۔ مضمون نگاری
سید شہادت حسین	۱۳۶۔ بنکس روڈ۔ ڈھاکہ	״	ناول
سید محمد طیفور	کوہ نور ہاؤس صدیق بازار روڈ۔ ڈھاکہ ۲	ملازمت	تاریخ
سید مرتضیٰ علی	۵۰۰۔ دھان منڈی ڈھاکہ	پنشنر	مضمون نگاری
پروفیسر سید مقصود علی	شعبہ سیاسیات ڈھاکہ یونیورسٹی۔ ڈھاکہ	تدریس	افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری ڈرامہ۔ تنقید
ایس۔ ایم۔ اکبر الدین	۴۳۔ کیپٹن بازار روڈ ڈھاکہ	تصنیف	افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری۔ ڈ
شاہد حسین	״ ״ ״ ״	״	ناول۔ ترجمہ
شاہد علی	۶۷۔ اسے۔ پرانا پلٹن ڈھاکہ	تصنیف	افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگاری۔ تنق
پروفیسر شاہ فضل الرحمٰن	شعبہ لسانیات ڈھاکہ یونیورسٹی ڈھاکہ	تدریس	مضمون نگاری
شمس الہدیٰ چودھری	۱۲ اسکیٹن گارڈن روڈ۔ ڈھاکہ	ملازمت	افسانہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید
علاء الدین	۱۔ ایف عظیم پورہ اسٹیٹ۔ ڈھاکہ	״	شاعری۔ ناول۔ ڈرامہ
صوفی ذوالفقار حیدر	خوشی باغ عرضو بازار ڈھاکہ	״	شاعری۔ افسانہ۔ ناول۔ مضمون نگا
عبدالرحمٰن	دارالمصنفین بابو ریلی لبرہ نرائن گنج		
عبدالغنی بزاری	۱۰۳۔ بابو چرن۔ چکرورتی روڈ۔ ڈھاکہ	صحافت	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون نگاری تنقید۔

...الدین...	۱۰۔ مستقل سرکاری ... ڈھاکہ ۔۲	خدمت خلق	شاعری
...سلیمان	۱۰۔ آتش خان لین۔ لال باغ۔ ڈھاکہ	ملازمت	شاعری۔ افسانہ۔ ناول
...عادل احمد	۲۔ اکھاڑے واسس لین۔ واری۔ ڈھاکہ	"	افسانہ۔ ناول
...العالم	ریڈیو پاکستان۔ ڈھاکہ	"	افسانہ۔ مضمون نگاری۔ ناول۔ تنقید۔ ڈرامہ
...چودھری	دارالعافیہ۔ دھان منڈی۔ ڈھاکہ	تدریس	ڈرامہ۔ افسانہ۔ تنقید
...الدین احمد خاں	۱۳۔ اکھاڑے واسس لین تارا باغ ٹکا ٹولی ڈھاکہ ۳	ملازمت	مضمون نگاری۔ تنقید
...نالی	۱۲ علی حسین خاں روڈ۔ ڈھاکہ ۔ ۱	تدریس	شاعری۔ مضمون نگاری
...اقبال زاہدی	رضیہ منزل۔ شانتی نگر۔ ڈھاکہ ۔۲	صحافت	افسانہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید
...اسماعیل	۲۶۔ قاضی علاء الدین روڈ۔ ڈھاکہ	ملازمت	مضمون نگاری
...الدین حسین	۶۲۔ نارتھ بروک ہال روڈ۔ ڈھاکہ	"	"
...علی خاں	یونیورسٹی بنگلہ ۲۸۔ نیل کھیت روڈ۔ ڈھاکہ	"	" افسانہ
...استاد	۳۴ ۔ نیل کھیت بیرکس۔ ڈھاکہ	"	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید۔
...مدیر	۴۳۔ پرانی مغل ٹولی۔ ڈھاکہ	صحافت	افسانہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید
...علی اللہ	۲۔ جی۔ عظیم پور اسٹیٹ۔ ڈھاکہ	ملازمت	" "
...سرور چودھری	۲۵۔ نیو اسکیٹون۔ رمنہ ڈھاکہ	تدریس	افسانہ
...چودھری	دارالعافیہ۔ دھان منڈی ڈھاکہ	"	افسانہ۔ مضمون نگاری۔ ڈرامہ۔ تنقید
...رئیس الدین	۲۱۔ حاجی عثمان غنی روڈ۔ رمنہ۔ ڈھاکہ	"	مضمون نگاری۔
...الدین احمد	۳۱۔ تانبا رائے لین۔ ڈھاکہ ۱	تصنیف	ادب

جیسور

...عابد زمان	پچھم و رائے پورہ۔ جیسور	تدریس	شاعری۔ افسانہ۔ مضمون نگاری۔ تنقید

چاٹگام

...فاروقی	چاٹگام کالج۔ چاٹگام	تدریس	مضمون نگاری۔ تنقید
...آرا	چاٹگام ویمن کالج۔ چاٹگام	تدریس	مضمون نگاری۔ افسانہ
...حسن خان	ڈاک خانہ۔ پٹھان ٹولی ڈھاکہ	ملازمت	مضمون نگاری

م موثر علی	معرفت برما آئل کمپنی لمیٹڈ، پوسٹ بکس ۲۸ چاٹگام	ملازمت	شاعری

راج شاہی

خلیل الرحمن صدیقی	جہانگیر منزل، گھوڑا مار۔ راج شاہی	تدریس	شاعری، مضمون نگاری، تنقید
مصطفےٰ نور الاسلام	راج شاہی یونیورسٹی۔ راج شاہی	〃	افسانہ۔ ناول، مضمون نگاری، تنقید

سلہٹ

امین الرشید چودھری	جیوتی منزل، سلہٹ	زراعت	شاعری
پرنش داس سرساگر	مرزا جنگل، سلہٹ		
عبدالغفار چودھری	محلہ جعفر پور۔ ڈاک خانہ وضلع سلہٹ	ملازمت	شاعری۔ افسانہ، مضمون نگاری
			ناول۔ ڈرامہ
ڈاکٹر محمد عبدالقادر	دلکشا ٹی اسٹیٹ۔ ڈاک خانہ شلوا، سلہٹ	〃	شاعری، مضمون نگاری، تنقید
محمد سلیم چودھری	شیخ گھاٹ، سلہٹ	〃	مضمون نگاری۔ تنقید
محمد نور الحق	سنٹرل مسلم ساہتہ سنسد۔ بشارت ہال۔ درگاہ محلہ، سلہٹ	〃	مضمون نگاری، تنقید

کھلنا

ڈاکٹر ابوالقاسم	دولت پور کھلنا	ملازمت	افسانہ۔ ناول، مضمون نگاری

نواکھالی

م۔ ع۔ ہاشم خان	ڈسٹرکٹ انسپکٹر اسکول نواکھالی	تدریس	ناول

مشرقی پاکستان

(اردو سیکشن)

ابوالکلام سلیم الشافعی	۴۰۔ نریندر لین ڈھاکہ	ملازمت	شاعری، افسانہ، مضمون نگاری، تنقید
محمد سعدی	گیابابو پاڑہ۔ ڈاک خانہ سید پور ضلع رنگ پور	〃	〃 〃 〃 〃
			ڈرامہ
دیب سہیل	۴۵ اے۔ ایئرڈ کالونی سید پور	〃	شاعری۔ افسانہ
منزل اصغر کمپنی	پرڈا یونیکس لمیٹڈ، قائد اعظم روڈ چاٹگام	〃	〃 〃 تنقید

[illegible]	۱۰۱/۲ الف، علیم پورہ اسٹیٹ ڈھاکہ ۱۲	تعلیم	شاعری۔
انور فرہاد	۵۰۔ ناظرہ بازار لین۔ ڈھاکہ	〃	〃 افسانہ
ایس۔ بی۔ ایس۔ ایم			
[illegible] باہر قریشی	ریلوے کوارٹر ۹۳۲/بی نیا شری پارہ سید پور	ملازمت	شاعری، مضمون نگاری، ڈرامہ، تنقید
جاوید عباس	۳۷۔ جوگی نگر، واری۔ ڈھاکہ	تعلیم	افسانہ، مضمون نگاری
حسین احمد	۱/۵۔ پاسی بیک۔ ڈھاکہ	〃	شاعری۔ تنقید
حیدر صفی	چاند نگر۔ ڈاک خانہ سید پور ضلع رنگ پور	تجارت	افسانہ
سعد منیر	۲۔ کے علیم پورہ اسٹیٹ ڈھاکہ ۱۲	تدریس	افسانہ۔ تنقید
سعید الحق	ریڈیو پاکستان۔ ڈھاکہ	ملازمت	مضمون نگاری۔ تنقید
سید ابو تمیم	الائیڈ ٹریڈنگ کارپوریشن لمیٹڈ جناح ایونیو۔ ڈھاکہ	〃	افسانہ، ناول۔ ڈرامہ، تنقید
سید اسد رضا جعفری	کوارٹر نمبر ای۔ سی ریلوے اشان کالونی ٹائیگر پاس چاٹگام	〃	شاعری، مضمون نگاری، تنقید
سید دلیل احمد شاہد	نیا بابورہ۔ ڈاک خانہ سید پور ضلع رنگ پور	تدریس	شاعری، افسانہ، تنقید
سید شبیر علی کاظمی	ایسٹ پاکستان کیڈٹ کالج۔ فوجدار ہٹ چاٹگام	ملازمت	افسانہ۔ تنقید
سید عشرت المتین عشرت	صوبہ میاں بیگم بازار۔ ڈھاکہ	زمینداری	شاعری
سید غلام محمد بدر الدین	۲۳۔ جناح ایونیو۔ ڈھاکہ	صحافت	افسانہ۔ ناول، مضمون نگاری
سید محمد اسحاق نجمی	ای۔ بی۔ ریلوے اسپتال سید پور ضلع رنگ پور	ڈاکٹری	شاعری، مضمون نگاری
شوق بارکپوری	قائد اعظم اردو لائبریری۔ صدر گھاٹ روڈ۔ چاٹگام	ملازمت	شاعری
ڈاکٹر رشید	۱۵۳۔ دھان منڈی ریزیڈنشیل ایریا ڈھاکہ	تدریس	مضمون نگاری
عبدالرزاق شاہد صدیقی	ای ۳۷/۳ علیم پورہ اسٹیٹ ڈھاکہ	ملازمت	شاعری۔ افسانہ، مضمون نگاری
عبدالرحمان آصف	۶۰ یوسف بازار لین۔ زندہ۔ ڈھاکہ	تجارت	شاعری۔ تنقید
[illegible] صدیقی (بنجرہ [illegible])	معرفت پروفیسر [illegible] احمد نیا بابورہ سید پور رنگ پور	ملازمت	شاعری۔ افسانہ۔ ناول۔
غلام [illegible] صدیقی	دفتر [illegible] ای۔ بی ریلوے پہاڑی ٹولی۔ چاٹگام	〃	شاعری، مضمون نگاری، تنقید
غلام محمد	۴۲۔ ٹیپو سلطان روڈ۔ ڈھاکہ	〃	افسانہ
[illegible] قمر	ریلوے اکاؤنٹس افیسرس کالونی۔ سالٹ گولہ چاٹگام پورٹ	ملازمت	شاعری
[illegible] اقبال	سلطان خان کالونی۔ قائد اعظم روڈ۔ [illegible] ٹولی، چاٹگام	〃	شاعری۔ افسانہ۔ تنقید
[illegible]	خلیل ولی اینڈ کمپنی۔ اسٹرینڈ روڈ۔ چاٹگام	〃	افسانہ۔ تنقید
[illegible]	معرفت پی۔ آئی۔ اے۔ کے۔ سی۔ دیال روڈ چاٹگام	〃	شاعری۔ مضمون نگاری
یوسف [illegible]	[illegible] کریم اسٹیل روڈ۔ چاٹگام	〃	

ادارہ مصنفین پاکستان مغربی پاکستان کا دفتر.

گلڈ کی پہلی سالگرہ

منعقدہ

(ڈھاکہ ۳۱ جنوری سنہ ۶۰ء)

پہلی سالگرہ

مغربی پاکستان کے ادیب

گلڈ مرکزی مجلس عاملہ کا تیسرا اجلاس ۲۹ اور ۳۰ جنوری ۱۹۶۰ء کو ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ ۳۱ جنوری ۱۹۶۰ء کو "ادارے" کی پہلی سالگرہ منائی گئی۔ کراچی اور مغربی پاکستان سے مرکزی مجلس عاملہ کے اراکین کے علاوہ بارہ دیگر ادیبوں نے اس جشن سالگرہ میں شرکت کی۔

وسیع اور صاف ستھرے انجینئرنگ انسٹی ٹیوٹ میں دانشوران پاکستان نہایت سنجیدگی اور باوقار طریقے سے جمع ہوئے۔ سالگرہ کی تقریبات کا افتتاح ایک اجلاس عام سے ہوا۔

صدر پاکستان کا حوصلہ افزا پیغام پڑھ کر سنایا گیا جس میں انھوں نے ادیبوں سے کہا کہ وہ اُن کی آزادیٔ تحریر کی خود حفاظت کریں گے۔ بشرطیکہ تحریر مادرِ وطن کے مفاد کے خلاف نہ ہو۔

مشرقی پاکستان کے علاقائی سیکریٹری نے اس موقع پر مغربی پاکستان کے ادیبوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ "ادارے" کا تجربہ آزاد دنیا میں سب سے نرالا ہے۔ اس سے پیشتر ملک میں ادیبوں کی نظریاتی اور خالص ادبی انجمنیں تھیں جن کے دائرے بہت محدود تھے لیکن "ادارے" کے قیام کے بعد اس نے ان تمام اداروں کو بغیر ایک دوسرے سے ٹکرائے ہوئے ملا دیا۔ تمام ادیب اب کھلے عام یہ کہتے ہیں کہ "ادارے" نے اب تک اپنے آپ کو غیر سیاسی اور غیر نظریاتی رکھا ہے۔ اس کے باوجود اپنے اراکین کے حقوق کی شد و مد سے محافظت کی ہے۔ اور ادیبوں کی ایک ایسی برادری قائم کر دی ہے کہ اب ملک میں ادیبوں کا نام احترام سے لیا جانے لگا ہے۔ اس کے علاوہ ادارے نے مختلف نظریاتی گروہوں کے درمیان خیر سگالی پیغامبر کا کام سرانجام دیا ہے۔

اس اجلاس عام کے فوراً بعد کتابوں کی نمائش کا افتتاح ہوا۔

معتمد رعالم ڈاکٹر محمد شہید اللہ نے آسان فہم عربی میں افتتاحی تقریر کی۔ کتابوں کی نمائش سے مشرقی پاکستان میں ادب کی ترقی و ترویج کا اندازہ ہوتا تھا۔

شام کو عصرانہ دیا گیا جس میں کراچی اور مغربی پاکستان کے مہمان ادیبوں کے علاوہ مقامی ادیبوں اور ادب دوستوں نے بھی شرکت کی۔ افراد کم تھے۔

رات کو ایک ثقافتی پروگرام رہا جس میں مشرقی پاکستان کے فن کاروں نے فن رقص و سرود کا مظاہرہ کیا۔ مقامی فن کاروں نے اردو کی غزلیں بھی سنائیں۔

یکم فروری ۱۹۶۰ء کو انجمن ترقی اردو کی طرف سے ہوٹل شاہ باغ میں ایک شاندار عشائیہ دیا گیا۔ اس میں ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ رات کو مشاعرہ ہوا جس میں گورنر مشرقی پاکستان اور مرکزی وزرا بھی تشریف لائے۔ اس مشاعرے میں جملہ پاکستانی زبانوں کے شعراء نے کلام پڑھا۔ مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔

کراچی اور مغربی پاکستان کے ادیبوں سے ملنے کے لئے مختلف مقامی ادیبوں نے ظہرانے اور عصرانے دیئے اور تفصیلی ملاقاتیں کیں۔

۲ فروری سے ۱۲ فروری تک کراچی اور مغربی پاکستان کے ادیبوں نے مختلف شہروں کی سیر کی اور مقامی ادیبوں سے ملے۔ مختلف ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ادیب مشرقی پاکستان کے دور دراز مقامات تک پہنچے جن میں سندربن، سلہٹ، چٹاگام وغیرہ شامل ہیں۔

(ترجمہ)

گلڈ کی پہلی سالگرہ پر قدرت اللہ شہاب کی تقریر

(اجلاس ڈھاکہ)

مرکزی سرگرمیوں پر ایک رپورٹ چھاپ کر تقسیم کر دی گئی ہے جس کا مطالعہ آپ آرام سے کر سکتے ہیں۔ اس وقت میں آپ سے گلڈ کے تصور کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

جب پچھلے سال آج کے دن گلڈ کے تصور نے عملی شکل اختیار کی۔ بشمول میرے بہت سے لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ تاسیس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔

مگر ادیب کے بعد ادیب اپنے مرمریں برج سے اتر کر جماعت میں ہونے گئے اور ہم نے مل جل کر ہ نمبر ۲ ہوٹل ایکسلسیر میں تھوڑا تھوڑا وقت گزارنا شروع کر دیا جہاں گذشتہ سال سے ہمارا دفتر قائم ہے۔ یہ ایک تاریک اور گھٹا ہوا کمرہ ہے جہاں چائے کی قیمت ریستوران سے زیادہ لی جاتی ہے اور جہاں کے بیرے ہم سے گریزاں گریزاں رہتے ہیں کیونکہ ہم انہیں مسافروں کی طرح معقول انعام نہیں دے سکتے۔ ہوٹل کا مالک بھی کبھی کبھی ہم کو قاتلانہ نظروں سے دیکھتا ہے کیونکہ اب تک ہم نے تو اس کو مناسب کرایہ ادا کیا ہے نہ اس کا ارادہ رکھتے ہیں اس لئے کہ وہ بہرحال ہماری استطاعت سے زیادہ بیٹھتا ہے۔

ہوٹل کے کمرے کے باہر بھی بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے ہمیں ایسی ہی سرد مہری دکھائی ہے جیسے ہوٹل ہمیں ٹھنڈی چائے دیتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اس ہوٹل کے بیروں کی طرح ہم سے کم توجہی برتتے ہیں اور ایسے بھی جو بالکل ہوٹل کی مانند یہ چاہتے ہیں کہ ہم بہت جلد ختم ہو جائیں۔ میں ان مثالوں کو بڑھانا نہیں چاہتا کیونکہ اس سے مجھے زیادہ تلخی کا احساس نہیں ہوگا۔

آج مجھے ایک لمحے کے لئے ماضی کی طرف مڑ کر یہ دیکھنے سے نہایت فرحت ہو رہی ہے کہ اسی چھوٹے سے کمرے میں ایک سال کے اندر کیا کیا دلچسپ واقعات پیش آئے ہیں۔ میں جزئیات پر تبصرہ نہیں کروں گا مگر مجھے کہنے دیجئے کہ میں نے گلڈ کے تصور کو اس نرمی اور آہستگی سے پھیلتے دیکھا ہے جیسے ایک کنواری کی چڑھتی ہوئی چمکیلی زلفیں۔ آج کوئی بھی خبر راس سے کہ کس بازار تک چلا جائے ناممکن ہے کہ آٹھ گھنٹے کے سفر کے اندر اندر ہمارا نشان (قلم) لگائے ہوئے کوئی ادیب اس کی پیشوائی کو موجود نہ ہو۔ جماعتی تانا بانا صرف ایک سال کا ہے مدت اہمیت نہیں رکھتی بلکہ جو چیز اہم ہے وہ یہ کہ جو لوگ یہ نشان لگائیں اور جو لوگ یہ نشان نہ لگائیں دونوں اس نشان کا یکساں احترام کرتے ہیں۔

میں اس دن کیلئے جیتا ہوں جب ایک کسٹم انسپکٹر آپ کے اسباب کی تلاشی اس لئے نہ لے اور ایک ریلوے ٹکٹ کلکٹر آپ کا ٹکٹ یہ دیکھ کر چیک نہ کرے کہ آپ اعتبار اور تکریم کا ایک نشان لگائے ہوئے ہیں۔ وہ دن جب ایک بد دماغ افسر آپ کو انتظار کی زحمت اس لئے نہ دے کہ آپ کے کارڈ پر یہ نشان لگا ہوا ہے وہ دن جب یہ نشان نفرتوں کو ختم کر کے محبتوں کی علامت بن جائے اور شبہات کی جگہ اعتماد اور حقارت کی بجائے مودت باہمی کی روایات قائم کر دے یہ وہ آرزو ہے جس کے لئے میں ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ مگر اس ضمن میں میں چند ملتجیات آپ کو گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں۔

پہلی تجویز خود میرے متعلق ہے اور ان کے لئے بھی جو میری طرح ہیں، ہمیں ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ گلڈ صرف ایک ٹریڈ یونین ہے۔ یہ ایک انتظامی ادارہ ہے ایک نظریاتی تنظیم نہیں ہے۔ گلڈ کا واحد نظری نصب العین ہے (اگر یہ اصطلاح استعمال کی جائے) دانشورانہ دیانتداری اور اس کے استعمال کی آزادی اور حمایت۔ اس کے علاوہ ہر ادیب اپنی مملکت خیال کا بادشاہ ہے چنانچہ اگر ہم میں سے کوئی فرد اس سلسلے پر کوئی بات کہتا یا لکھتا ہے تو وہ خواہ گلڈ میں ہمارا کوئی عہدہ ہو یا نہ ہو اپنی ذاتی حیثیت ہی میں کہتا اور لکھتا ہے۔ یہ واضح

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے تاکہ غلط فہمیوں کی گنجائش نہ رہے۔

میری دوسری تنبیہ عمالِ حکومت کے اس طبقے کے لئے ہیں جو اس شک میں مبتلا ہیں کہ گلڈ سیاسی سطح پر "یمینیت" یا "یساریت" کا آلۂ کار بن جائے گا۔ یقیناً ہم ایک سیاسی جماعت نہیں ہیں اور گلڈ صرف ہماری لاشوں پر ہی سیاسی شکل اختیار کر سکتا ہے علاوہ ازیں کوئی یہ بتائے کہ کیا یہ گناہ ہے کہ کوئی دائیں طریقے سے بائیں یا بائیں طریقے سے دائیں بازو میں شامل ہو۔ تخلیقی قوتوں کو مضطرب رہنا ضروری ہے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی کسی نہ کسی چیز سے غیر مطمئن رہیں کیونکہ انہیں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہے۔

جب تک یہ دانشورانہ بے اطمینانی اندرونی یا بیرونی اشارے پر تخریبی صورت اختیار نہ کرے ادب میں نہ یمینیت کوئی چیز ہے نہ یساریت۔ ادب کی سمت صرف ایک ہے اور وہ سمت سیدھی ہی ہے۔ دانشورانہ یمینیت یا یساریت پر پابندی لگانے کی ہر کوشش صرف ایک نتیجہ پیدا کر سکتی ہے جو یہ ہوتا ہے کہ ادبی یمینیت یا یساریت سیاسی یمینیت یا یساریت میں بدل جاتی ہے۔ ان میں سے شاید کوئی شیریں اور کوئی تلخ لگے مگر دونوں انسانی زندگی کے توازن کے لئے زہر ہیں۔

میری تیسری تنبیہ اپنے ملک کے دولت مندوں کے لئے ہے۔ وہ بہت سے ہیں اور ان کے جسم اور روحیں سونے کے بوجھ سے پھٹی جاتی ہیں۔ ادھر ہم طبقۂ دانشوراں کی بہبود کا ایک انوکھا منصوبہ لے کر چلے ہیں اور چونکہ ہمارے ادارے کے دستور میں غیر ملکی امداد منع ہے اس لئے ہمیں ملکی ذرائع پر ہی بھروسا کرنا ہے۔ ہمارے دولت مندوں نے رفاہِ عامہ کے لئے بہت سے کام کئے ہیں اب یہ ایک اور میدانِ عمل ان کے سامنے حاضر ہے۔

میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جس نے فرانسیسی خوشبویات کی بیس ہزار بوتلوں میں ایک ایسی لڑکی کو غسل کرایا تھا جس کے لئے اس کے دل میں محبت نہیں تھی بلکہ صرف ہوس تھی۔ میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ اگر اس نے اس کی نصف رقم گلڈ پر خرچ کی ہوتی تو پورا ملک شعر و نغمہ کی خوشبوؤں سے اور بھی مہکتا ہوتا۔

خواتین و حضرات آیئے ہم دعا کریں کہ گلڈ کی دوسری سالگرہ پر حالات اتنے بہتر ہوں کہ گلڈ کے نئے سکرٹری جنرل کو یہ تنبیہات نہ دہرانا پڑیں۔ یہ کوئی خوشگوار فرض نہیں ہے۔

(ترجمہ)

صدرِ مملکت کا پیغام

ادارے کی پہلی سالگرہ پر

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ ادارہ مصنفین پاکستان ڈھاکے میں ۱۳ر جنوری ۶۰ء کو اپنی پہلی سالگرہ منا رہا ہے۔ گذشتہ سال اسی دن جب کراچی میں مجھے ادیبوں کے کنونشن کی ایک نشست میں شریک ہونے کا موقع ملا تو میں نے دل گرما دینے والے اور حوصلہ افزا مناظر دیکھے تھے۔ اس کے بعد سے میں نے نہایت دلچسپی کے ساتھ ادارے کے بڑھتے ہوئے کام کا مطالعہ کیا ہے اور مجھے مسرت ہے کہ آپ لوگ ادیبوں کے طبقے کے لئے ایک مضبوط اور پاکیزہ ادارہ خیر قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس امر پر میں آپ کو گرمجوشی کے ساتھ مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

میں جانتا ہوں کہ آپ جیسے ذی علم حضرات مشوروں کے محتاج نہیں ہوتے، لیکن ایک قاری کی حیثیت سے مجھے اگر کچھ کہنے کی اجازت دی جائے تو میں ایک مشورہ پیش کروں گا جو یہ ہے :-

اپنے ذہن میں آزادی کے ساتھ سوچئے۔ اپنے اظہار میں آزادی کے ساتھ عمل کیجئے۔ اپنے گرد و پیش کا ردِ عمل آزادی کے ساتھ مرتب کیجئے اور اپنی نزاکتِ احساس کو کسی مصلحت یا کسی خوف سے کند نہ ہونے دیجئے۔

اپنی طرف سے میں اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ آپکو بقول والٹیر یقین دلاؤں کہ ممکن ہے مجھے کسی معاملے میں آپ سے اختلاف ہو اور شاید میں اس پر احتجاج بھی کروں لیکن میں یقیناً آپ کے حقِ اظہار کی حفاظت کروں گا بشرطیکہ وہ خود مادرِ وطن کے وجود کے منافی نہ ہو۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ اپنے لئے بہت سے اہم پروگرام بنا رہے ہیں۔ اس ضمن میں میرا مشورہ یہ ہے کہ تخلیقی ادب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کو بین اللسانی ترجموں پر بھی زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ خاص طور سے اردو اور بنگلہ زبانوں کے معاملے میں۔ اس کے علاوہ جو نیا تعلیمی نظام میں اس ملک میں رائج کرنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ آپ کو ہر درجے کے طالب علموں کے لئے قومی مفادات کے مطابق نصابی کتابیں لکھنے کے بے شمار مواقع فراہم کرتا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ "ادارہ" اس نہایت اہم منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔

میری خواہش تھی کہ میں ڈھاکہ میں آپ کے اجلاس میں شرکت کے لئے مزید قیام کر سکتا، لیکن پہلے سے طے شدہ چند مصروفیات کے سبب یہ ممکن نہیں ہے۔ بہر حال میری دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں

محمد ایوب خان

(ترجمہ)

علاقائی انتخابات

براے

سنہ ۱۹۶۰ - ۶۲ء

۱- مغربی پاکستان

۲- کراچی

۳- مشرقی پاکستان

علاقائی مجلس عاملہ حلقہ مغربی پاکستان۔۔ ۶۲-۱۹۶۰ء

انتخابات منعقدہ ۳ اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

(کل ووٹ بذریعہ رجسٹری ڈاک وصول ہوئے)

کل آراء جو شمار ہوئیں ۱۶۲

مرکزی نگران۔ جمیل الدین عالی

الیکشن کمشنر۔ احمد ندیم قاسمی

معاون شمار کنندگان

۱۔ حافظ لدھیانوی

۲۔ محمد سعید

۳۔ انجم رومانی

۴۔ حفیظ الکریم ثمر

منتخبہ اراکین

احسان دانش	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
احمد فراز	ڈاکٹر فقیر محمد فقیر
ڈاکٹر جاوید اقبال	مولانا گرامی
جمیلہ ہاشمی *	میرزا ادیب
حامد علی خاں	ناصر کاظمی
ڈاکٹر سید عبداللہ	

۱۰ اگست سنہ ۱۹۶۰ء میں دستور کے مطابق مجلس عاملہ نے مندرجہ ذیل عہدے دار منتخب کئے۔

علاقائی سکریٹری۔ پروفیسر سید وقار عظیم

علاقائی خازن۔ احسان دانش

* بعد جمیلہ ہاشمی۔ مرکزی مجلس عاملہ برائے ۶۲-۱۹۶۰ء میں منتخب ہو گئیں۔ ان کی جگہ دستور کے مطابق علاقائی مجلس عاملہ نے پروفیسر عظیم کو بطور رکن منتخب کیا۔

(نوٹ:۔ مندرجہ بالا فہرست حروف تہجی کے مطابق ہے)

علاقائی مجلس عاملہ حلقہ کراچی سنہ ۶۲-۱۹۶۰ء

انتخابات منعقدہ ۱۰ر اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

کل آراء جو شمار ہوئیں ۱۰۷

مرکزی نگران ـــ جمیل الدین عالی

صدر اور الیکشن کمشنر ـــ بیگم یوسف جمال حسین

معاون شمار کنندگان جو اجلاس میں منتخب ہوئے۔

قرۃ العین حیدر

شاہد احمد دہلوی

ریاض فرشوری

عباس احمد عباسی

منتخبہ اراکین

آغا ناصر

ابن انشا

انور

توفیق خاطر

ڈاکٹر شمیم عصمت ارشاد

شمیم احمد

طفیل احمد جمالی

محمد مقصد علی

★ ممتاز حسین

یوسف عبدالغنی مانڈویا

یونس احمر

نوٹ:- دستور کے مطابق نئی مجلس عاملہ نے مندرجہ ذیل عہدے دار منتخب کئے۔

علاقائی سکریٹری ـــ طفیل احمد جمالی

علاقائی خازن ـــ انور

★ بعدہٗ ممتاز حسین مرکزی مجلس عاملہ (برائے ۶۲-۱۹۶۰ء) کیلئے منتخب ہو گئے۔ ان کی جگہ دستور کے مطابق علاقائی مجلس عاملہ نے مولانا رازق الخیری کو بطور رکن منتخب کیا۔

(نوٹ:- مندرجہ بالا فہرست حروف تہجی کے مطابق ہے)

علاقائی مجلس عاملہ حلقہ مشرقی پاکستان سنہ ۶۲ - ۱۹۶۰ء

(انتخابات معینہ مارچ شکایتوں پر مرکزی تفتیش کے بعد ملتوی ہوئے)

انتخابات منعقدہ ۱۵ اپریل ۱۹۶۰ء

کل آراء جو شمار ہوئیں۔ ۲۲۹

مرکزی نگران۔ بیگم یوسف جمال حسین

معاون شمار کنندگان

ابراہیم خان

عبدالقادر

سلیم الدین احمد

معراج الدین حسین

منتخبہ اراکین

۱۔ اشرف الزمان خان
* ۲۔ بے نظیر احمد
۳۔ بیگم صوفیہ کمال
۴۔ تعلیم حسین
۵۔ ڈاکٹر انعام الحق
۶۔ ڈاکٹر قاضی مطاہر حسین
۷۔ ایس۔ ایم۔ اکبرالدین
۸۔ شاہد علی
۹۔ فراخ احمد
۱۰۔ متین الدین احمد
۱۱۔ محمد ابوالقاسم

نوٹ:۔ دستور کے مطابق مجلس عاملہ نے مندرجہ ذیل عہدیدار منتخب کئے:۔

علاقائی سکریٹری۔ ڈاکٹر انعام الحق

(ڈاکٹر انعام الحق اکتوبر [illegible] میں ڈھاکہ سے راج شاہی تبدیل ہو گئے۔ اور علاقائی مجلس عاملہ نے ان کی جگہ ڈاکٹر قاضی مطاہر حسین علاقائی سکریٹری منتخب کیا۔)

علاقائی خازن۔ اشرف الزمان خان

* بعد میں بے نظیر احمد مرکزی مجلس عاملہ ۶۲-۱۹۶۰ء میں منتخب ہو گئے۔ ان کی جگہ دستور کے مطابق علاقائی مجلس عاملہ نے کو ن منتخب کیا۔

(نوٹ:۔ مندرجہ بالا فہرست حروف تہجی کے مطابق ہے)

اراکین اجلاس عام۔ ادارہ مصنفین پاکستان منعقدہ ۲۴ اپریل ۱۹۶۰ء بمقام لاہور

دستور کے مطابق یہ اجلاس عام ان اراکین پر مشتمل تھا۔

(۱) سابقہ اراکین عاملہ (مرکز)
(۲) علاقائی عاملہ کمیٹیوں کے نئے منتخبہ اراکین

حلقہ کراچی سے

سابقہ اراکین عاملہ (مرکز)

جمیل جالبی
شاہد احمد دہلوی
شوکت صدیقی
عبدالعزیز خالد
غلام عباس
قرۃ العین حیدر

نئی علاقائی عاملہ

طفیل احمد جمالی ــــــ علاقائی معتمد
الف ــــــ علاقائی خازن

آغا ناصر
ابن انشا
توفیق خاطر
شمیم احمد
ڈاکٹر شمیم عصمت ارشاد
محمد مقصد علی
ممتاز حسین
یوسف عبدالغنی مانڈویا
یونس احمر

مشرقی پاکستان سے

سابقہ اراکین عاملہ (مرکز)

ابوالحسین
ابراہیم خاں
جسیم الدین
دیوان محمد اشرف
ڈاکٹر سجاد حسین
سید ولی اللہ
بیگم شمس النسا محمود
ڈاکٹر عبدالحیٔ

عسکر بن شیخ
غلام مصطفےٰ

نئی علاقائی عاملہ

ڈاکٹر قاضی مطاہر حسین ــــــ علاقائی معتمد
اشرف الزماں خاں ــــــ " خازن
ڈاکٹر انعام الحق
ایس ایم اکبر الدین
بے نظیر احمد
تعلیم حسین

شاہد علی	حسین الدین
بیگم صوفیہ کمال	محمد ابوالقاسم
فرخ احمد	

مغربی پاکستان سے

سابقہ اراکین عاملہ (مرکز)	نئی علاقائی عاملہ
اشفاق احمد	احمد فراز
احمد راہی	ڈاکٹر جاوید اقبال
اعجاز حسین بٹالوی	بیگم جمیلہ ہاشمی
امیر حمزہ شنواری	حامد علی خاں
سید فارغ بخاری	ڈاکٹر سید ولی اللہ
سید وقار عظیم	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
شیخ ایاز	غلام محمد گرامی
صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	ڈاکٹر فقیر محمد فقیر
بیگم ہاجرہ مسرور	میرزا ادیب
	ناصر کاظمی

صدارت :۔ شروع میں ڈاکٹر شہیداللہ (مہمان خصوصی)
منتظم :۔ جمیل الدین عالی (اعزازی افسر رابطہ)
یہ حضرات الکشن میں کسی طور حصہ لینے کے مجاز نہیں تھے۔
قدرت اللہ شہاب نے صرف رپورٹ پیش کرنے کے لئے شرکت کی

نوٹ :۔ مندرجہ بالا فہرست حروف تہجی کے مطابق ہے۔

پہلی سالانہ رپورٹ اپریل ۱۹۶۰ء سے اقتباسات

اگرچہ اب تک کئی قابل ذکر کام انجام پا چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ادارۂ مصنفین پاکستان کے پہلے دور کے متعلق یہ رپورٹ مرتب کرتے ہوئے اس د[فتر]
کو کوئی خاص فخر محسوس نہیں ہوتا۔

رپورٹ کے حصّہ اول میں ادارہ کے پس منظر اور اس کے قیام کے بعد رونما ہونے والے خاص خاص واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی حصّے میں [ا]
تنظیم کے موجودہ مختلف النوع خدوخال اور اس کے گرد و پیش کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں تاکہ ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس تحریک کا مجموعی خاکہ نظروں [کے]
سامنے آجائے۔

حصّہ دوم (الف) میں ان کاموں کی صراحت ہے جو انجام پا چکے ہیں اور حصّہ دوم (ب) میں وہ کام مذکور ہیں جو پاکستان رائٹرز گلڈ کنونیشن [نے]
اس دفتر کو تفویض کئے تھے مگر جو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔

حصہ سوم میں آئندہ دو سال کے کام کا منصوبہ منظوری کے لئے پیش کیا گیا ہے یہ اس عام پروگرام کے مطابق ہے جس کی صراحت گلڈ کے اغرا[ض]
و مقاصد میں کی گئی ہے۔ اس عام اجلاس میں منظور شدہ قرار دادیں وغیرہ بھی اس منصوبے کا جزبن جائیں گی۔

یہ رپورٹ مرکزی دفتر نے یکم فروری ۱۹۵۹ء سے ۱۶ اپریل ۱۹۶۰ء تک کے عرصہ کی بابت مرتب کی ہے اور سکریٹری جنرل بھی عام اجلاس
میں ایک الگ بیان دینے والے ہیں۔ یہ بات واقعی قابل افسوس ہے کہ رپورٹ ایسی زبان میں پیش کی جا رہی ہے جو ہماری قومی زبان نہیں ہے لیکن فی الحال
اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ کیونکہ بحالات موجودہ تھوڑے سے وقت میں بنگالی اور اردو دونوں زبانوں میں ایک ساتھ رپورٹیں لکھ کر انھیں شد[ید]
مالی زیر باری کے بغیر چھپوانا ممکن نہ تھا۔ امید ہے کہ اراکین ان غلطیوں کو صرف نظر کریں گے جو غیر زبان کی وجہ سے سرزد ہو گئی ہوں۔

جمیل الدین عالی
اعزازی افسر رابطہ
(مرکز)

لاہور
۲۳ اپریل ۱۹۶۰ء

حصہ اوّل

تخلیقی فن کاروں کی تنظیم دنیا کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ امریکی بر اعظم، یورپ کے کئی ملکوں اور چین اور سوویت روس میں ادیبوں کے متعدد
ادارے اور جماعتیں موجود ہیں۔ اگرچہ ایسی تنظیم اس برصغیر (بلکہ بیشتر ایشیائی ملکوں) کے لئے نئی ہے تاہم گلڈ کے تصور سے پاکستان کے کم از کم وہ اہل قلم ضرور
واقف ہیں جنہوں نے ان اداروں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ تنظیمی کام کی ہمت شکن شدت سے قطع نظر جس کا سامنا تنظیم کی ذمہ داری لینے والوں
کو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بعض الجھنیں اور پریشانیاں ایسی ہیں جو اس قسم کی سب تحریکوں میں قدر مشترک ہیں۔

اگر کسی فن کار پر دفترشاہی کی دقیقہ پسندی کا دباؤ پڑے تو اس میں یا تو ہٹ دھرمی پیدا ہو جاتی ہے یا اگر وہ اس خارجی اثر کو قبول کرے تو اپنی خلاقیت کے
بیشتر حصے سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ فن کاروں پر صرف حکومت کا ہی دباؤ پڑنے کا امکان نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چند فن کار خود اپنے
اجتماعی غلبے کے ذریعہ دوسری چھوٹی جماعتوں اور افراد کو اپنا نقطۂ نظر زبردستی قبول کرنے پر مجبور کریں۔ ہم طویل عرصے تک اپنے ملک میں "فن برائے فن"
اور "فن برائے زندگی" کی باہمی آویزش دیکھ چکے ہیں (یہ آویزش اب بھی جاری ہے۔ مگر پہلی سی تلخی کے ساتھ نہیں) پھر یہ کہ عام ناخواندگی، تاجرانہ
ذہنیت اور شخصی آزادیوں پر سابقہ حکومتوں اور ان کے "دلدادہ فن" افسروں کے حملوں یا حملے کے خطروں کی وجہ سے تخلیقی صلاحیتوں کو شدید نقصان
پہنچتا رہا۔ ان صلاحیتوں کے پروان چڑھنے کے لئے آزادی، نشر و اشاعت اور حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی۔ آزادی کے لئے ہر جہتی مہم اور اس کے
تحفظ کے لئے وسیع انتظامات کی ضرورت ہے۔ نشر و اشاعت اچھی کتابوں کی کثیر پیمانے پر اشاعت کی محتاج ہے (جس کے لئے نیک نیت سرمایہ
داروں اور حوصلہ افزا معاوضے کی ضرورت ہے) اور حوصلہ افزائی اسی وقت ہوتی ہے جب غیر مبہم طور سے تخلیقی جوہر کو جوہر تسلیم کر لیا جائے۔
ان مقاصد کے حاصل کرنے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں ایک تو یہ تھا کہ ادب اور ادیبوں کی قسمت کو حکومت، ناشروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے
اس طریقے پر زمانہ دراز تک عمل ہوتا رہا لیکن اس کے نتائج بلاشبہ حوصلہ شکن ثابت ہوئے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے فن کاروں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے۔ اسے خوش قسمتی کہئیے یا بدقسمتی کہ بعض ادیبوں
نے یہ دوسرا طریقہ اختیار کیا اور ایک کنونشن منعقد کیا جو آخر میں مالی اعتبار سے بہت مہنگا اور پیچیدہ ثابت ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ ایک
اقدام تھا جس کی مثال پہلے کسی نہیں ملتی۔ اور یہ کوشش ایسے وقت پر کی گئی جب کہ ملک کی سیاسی ہئیت میں عجیب و غریب اور نامانوس
تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔

آئندہ ابواب میں کسی حد تک دکھی زبان میں، جس سے بچنا راقم الحروف کے لئے ممکن نہ تھا (کیونکہ وہ بھی اُن اشخاص میں شامل ہے
جو گزشتہ ۱۹ مہینوں سے اس "مصیبت" میں پھنسے ہوئے ہیں) یہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح ایک سیدھے سادے بے ضرر خیال نے مختلف
منزلیں طے کیں۔ یہاں ایک حقیقت کی وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ ہماری ساری تنظیمی سرگرمی کا آخری مقصد خود تنظیم نہیں بلکہ ایسا ماحول پیدا
کرنا ہے جو خلوص بڑے پیمانے پر اعلیٰ ادب کی تخلیق اور اشاعت کے لئے سازگار ہو یہ بلاشبہ ایک ایسا مقصد ہے جس کی حوصلہ افزائی کرنا ہر اچھے
شہری اور حکومت کا فرض ہے۔

"گلڈ" کے عام معنی ایک ایسی سوسائٹی کے ہیں جو باہمی امداد اور مشترکہ مقاصد کے حصول کے لئے قائم کی جائے۔ اس میں وہ نظام شامل ہے جس کے
ذریعے ادبی سرگرمی کے وسائل، طریقوں اور اس سے حاصل ہونے والے منافع کو اسی سوسائٹی کے ممبروں کی ایک کونسل مشترکہ اور جماعتی فائدے
کے لئے منظم اور منضبط کرے۔ سادہ زبان میں اسے ایک "ٹریڈ یونین" کہہ لیجئے۔

ادیبوں کی تربیت میں کو ان تمام طبقوں کی تنظیموں سے بہرحال مختلف ہونا چاہیئے جن کی سرگرمیاں دانشورانہ تخلیق کی نوعیت نہیں رکھتیں۔ اس
یں داخلیت، معروضیت، پراگندہ خیالی، مقصدیت، انفرادیت اور اجتماعیت غرض ان سبھی چیزوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔ جن کا عکس تخلیق تصانیف
پر جھلکتا ہے۔ پاکستانی ادیبوں کی تنظیم کے خدوخال میں تو ان کے مختلف بلکہ متصادم مشاغل اور پیشوں کی جھلک بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ابھی یہاں کوئی
شخص کل وقتی ادیب نہیں ہوسکتا۔

۱۹۵۹ء میں پاکستانی ادیبوں کا جو کنونشن منعقد ہوا اور جس نے گلڈ کو جنم دیا اسے بس گلڈ قائم کرنے کی ایک ... بنائی ہوئی تھی۔ اس
کنونشن میں کئی اہم قراردادیں منظور کی گئیں جو پاکستانی ادیبوں کے دانش ورانہ، مادی اور قومی مقاصد سے تعلق رکھتی ہیں۔ مرکزی گلڈ
نے بھی ان کو عملی جامہ پہنانے کی ممکنہ کوشش کی مگر جہاں کچھ "حقیقی" کامیابیاں حاصل ہوئیں وہاں اس ادارے میں ایک اس قسم کا
لاجلا دانش ورانہ اور تنظیمی رنگ بھی پیدا ہوگیا جس کا ابتدا میں کسی کو خیال نہ تھا۔ اس کی مزید تشریح کرنے سے پہلے مختصراً یہ بیان کرنا
دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کن خاص مرحلوں سے گزرنے کے بعد گلڈ نے اپنی موجودہ حیثیت اختیار کی۔

جب آٹھ اشخاص نے ادیبوں کو منظم کرنے کے کام میں ہاتھ ڈالا تو چاروں طرف ایک انتشار کی کیفیت نمایاں تھی۔ بعض تخلیقی
فن کاروں نے خدشہ ظاہر کیا کہ پاکستان میں مارشل لا نافذ ہوتے ہی گلڈ قائم کرنے کی سوچنا حکومت کی ایک نیم سیاسی ہنگامہ خیزی ہے
جسے طور پر مشکوک اور روٹھے ہوئے دانشوروں کو کسی نہ کسی طرح منانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ وقت نے ثابت کردیا کہ یہ خیال
سراسر غلط تھا۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ یہ "احساس" بالکل فطری تھا کیونکہ اگر کسی سلسلے میں اور بالخصوص فن کاروں کو سرکاری امداد
دی جائے تو اس سے عموماً یہی مطلب نکالا جاتا ہے کہ (رقم دینے والے کے اشاروں پر) چیزیں "گھڑ گھڑ کر" پیش کی جائیں گی۔ اگرچہ یہ
اعلان کردیا گیا تھا کہ اس تنظیم سے حکومت کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہے پھر بھی کنونشن کی مخالفت میں بعض قوی شبہات موجود تھے۔ جو
حسب ذیل ہیں۔

(۱) ادیبوں کو رشوت دی جائے گی یا سیاسی لحاظ سے انھیں "صف بستہ" کیا جائے گا۔
(۲) گلڈ کے غیر سرکاری ذرائع سے حکومت اظہار خیال کی آزادی پر کنٹرول کرے گی۔

اس ادیبوں کی دیانت داری اور آزادی پر اس لئے آہستہ آہستہ برا اثر پڑے گا کہ سچی فن کارانہ سرگرمیوں اور خیالات
غیر صحی اثرات غلبہ پا جائیں گے۔

دوسری طرف فن کاروں کو بھرپور سرکاری امداد ملنے کے اصول کے بھی طاقت ور حامی موجود تھے۔ جن کی پختہ رائے تھی کہ
ملک میں خواندہ آبادی کے قلیل تناسب کی وجہ سے پڑھنے والوں اور ناشروں کی تعداد اتنی نہیں کہ ادیبوں کی تخلیقات کی معقول تعداد
کی اشاعت ہوسکے اور انھیں ذہنی اور مالی تقویت نصیب ہو۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ پاکستان کو جو قانونی، انتظامی اور معاشرتی نظام
ورثے میں ملا ہے وہ آزادانہ تحقیق و جستجو اور بے لاگ تخلیق کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے اور ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے حکومت کو باخبر
کردینا چاہیئے کہ ادیبوں کے متعلق اس کے فرائض کیا ہیں۔

خوش قسمتی سے ایک بات ایسی تھی جس پر سب متفق تھے۔ ملکی اور غیر ملکی ناشروں اور سرکاری اور نیم سرکاری ایجنسیوں کے ہاتھوں
ادیبوں کو جو مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں انھیں ختم کرنا چاہیئے اور ان تخلیقی فن کاروں کی بگڑی ہوئی قسمت بنانی چاہیئے جن کی تصانیف سے ناجائز
فائدہ اٹھایا گیا ہے یا جن کے مسودوں کو شائع ہونا نصیب نہیں ہوا ہے۔ بہرحال خاص مشترک بات یہ بھی تھی کہ کسی نہ کسی سلسلے میں سرکاری
امداد کے سب خواہاں تھے۔

کنوینروں نے متضاد اور مختلف آراء کو یکجا کرنے کی کوشش کی مگر ان کنوینروں کی تعداد صرف آٹھ تھی اور معترضین بہت زیادہ، اور ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ خود ادیبوں کی شخصی رقابتوں، انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایک دوسرے سے قدیم نظریاتی اختلافات اور زبان کے بندھنوں نے ان کے باہمی تعلقات کو مدتوں کشیدہ رکھا تھا۔ انھیں مل کر بیٹھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ جنوری ۱۹۵۹ء میں جملہ زبانوں کے ۲۱۲ ادیب جن میں انسانی مستقبل سے مایوس قنوطی، مقصدی، جوشیلے اور آزاد غرض ہر خیال کے لوگ شامل تھے پاکستان کے ہر حصہ سے آکر جمع ہوئے کہ "دیکھیں کیا تماشا ہوتا ہے"۔

انھیں یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ روز اول ہی کنوینروں نے اپنے کام سے استعفیٰ دیدیا۔ وہ تھک کر چڑچڑے ہو گئے تھے۔ انھوں نے عطیہ دینے والوں کی ایک فہرست شائع کردی تھی اور مندوبین کو ایک استقبالی سپاسنامہ پیش کیا تھا۔ جس کی عبارت میں تھکن اور تلخی شامل تھی۔

مندوب یہ دیکھ کر بھی حیران رہ گئے کہ ہر طبقے اور ہر علاقے سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے مختلف مضامین کی ۲۸ قراردادیں بھیجی ہیں۔ اب یہ مندوبین انتخابی عمل کے ذریعہ جلد جلد ایک سبجکٹ کمیٹی اور سات ذیلی کمیٹیوں میں تقسیم ہو گئے تاکہ عام اجلاس میں پیش کرنے کے لئے ان مطالبات، قراردادوں اور احتجاجات کی تدوین، جانچ پڑتال اور درجہ بندی کرکے انھیں یکجا کیا جائے اور مسودے دوبارہ تیار کئے جائیں۔ اس طرح کوئی ۲۵ مندوبوں نے بند کمرے میں ۲۰ گھنٹے تک مختلف کمیٹیوں میں کام کرکے مختلف موضوعات پر یکجائی قراردادیں مرتب کیں اور اس کے علاوہ گلڈ قائم کرنے کے لئے دستور کا ایک مسودہ منظور کیا۔ تیسرے دن عام اجلاس نے ان قراردادوں پر غور کیا اوران کی ترمیم اور عبارت کی دوبارہ تشکیل کی۔ انہی منظور شدہ قراردادوں کو "احکامات" کہا جاتا ہے۔

آخری، غیر کاروباری، ثقافتی اجلاس میں صدر پاکستان نے ازراہ نوازش شرکت فرمائی ادیبوں کو اظہار خیال کی آزادی کا یقین دلاتے ہوئے انھوں نے ایک گھنٹہ پہلے جنم لینے والے اس گلڈ کو دس ہزار روپیہ کا عطیہ مرحمت فرمایا جس کے لئے اس وقت تک ان سے کوئی اپیل بھی نہیں کی گئی تھی کیونکہ ان کی تشریف آوری سے صرف آدھ گھنٹہ پہلے عہدہ داروں کے انتخابات مکمل ہوپائے تھے۔

یہ ہے گلڈ کے وجود میں آنے کی سرگزشت۔ اس کے قائم ہوتے ہی اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ اور مبارک سلامت کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ گلڈ کو ناپسند کرنے والے ادیبوں کا خیال تھا کہ ابھی تک تو خیر گزری ہے مگر آئندہ دیکھئے اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔ بعض کہتے تھے چیز تو اچھی ہے مگر بُرے ہاتھوں میں پڑی ہے۔ یہ اشارہ عاملہ کمیٹی کی طرف تھا جس میں کچھ سرکاری ملازمین بھی شامل تھے۔ جوشیلے اراکین پہلی شام سے کام کی ترقی کا اندازہ لگانے بیٹھ گئے جس کا نتیجہ مایوسی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

بہرحال گلڈ نے کام کرنا شروع کردیا۔ اسے فرائض تو بہت سے سونپے گئے تھے مگر اس کے پاس نہ تو کام کرنے والے تھے اور نہ پونجی۔ صدر کا دس ہزار کا عطیہ دستور کے بموجب تینوں علاقوں میں تقسیم کرنے کے لئے تھا۔

علاقائی انتخابات نے نئے جھگڑے کھڑے کئے۔ جو لوگ منتخب نہیں ہوئے تھے ان میں سے چند نے منتخب ہوجانے والوں پر طرح طرح کے الزام لگانے اور گردوپیش عالم مایوسی پھیلانے لگے۔ منتخب ہونے والوں میں کچھ ایسے ادیب بھی شامل تھے جو عمر میں پہلی مرتبہ کسی اجتماعی کام میں حصہ ڈال رہے تھے۔ ان میں دوسری انسانی کمزوریاں بھی تھیں مثلاً شروع شروع میں وہ اس بات پر تیار نہ تھے کہ انھیں تنظیمی کام کے لئے "بیزر" یا "کم درجے" کے ادیبوں کے شانہ بشانہ کھڑا کیا جائے۔ ان میں سے بعض حضرات ادیب کی حیثیت سے بہت اچھے تھے مگر تنظیمی قابلیت کے مالک نہ تھے۔ بعض اپنے اپنے پیشوں اور کاموں میں اتنے مصروف تھے کہ کسی تحریک یا تنظیم کے ابتدائی مرحلوں میں جس رضاکارانہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے اسکے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

پرانے مخالفین میں کچھ نئے مخالفین کا بھی اضافہ ہو گیا اور یہ محض اس لئے کہ کنونشن ناکام کیوں نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ ناتجربہ کار کنوینروں نے بھی کچھ [illegible] کی تھیں جن کا خمیازہ جلد مندوبین اور پھر خود گلڈ کو بھگتنا پڑا۔ بعض ادیب سہواً نظر انداز ہو گئے تھے اور بعض سمجھتے تھے کہ ان سے شایانِ شان طریقے پر درخواست نہیں کی گئی۔ بعض لوگ جنہیں مدعو کیا گیا تھا مختلف وجوہات کی بنا پر شرکت کرنے سے قاصر رہے تھے۔ اور کنونشن میں جو کچھ پیش آیا اسے باور کرنے پر تیار نہ تھے۔ ملک میں پہلے سے زیادہ امید اور بے چینی پھیل گئی تھی۔

سب سے بڑھ کر تخلیقی سرگرمیوں کے وہ "ٹھیکہ دار" یعنی پیشہ ور سرپرست، اور قدیم ضابطوں کے پرستار حاکم تھے جنہیں "ذہن تخلیق کے محافظ" کی پیدائش نے ان کی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچایا تھا۔ بس انہیں یہ تحریک، "ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی"

اخباروں نے عام طور پر گلڈ کے قیام کو پسند کیا مگر اس کے اغراض و مقاصد سے وہ بھی پوری طرح واقف نہ تھے۔ بعض ناشروں کے نزدیک یہ سارا معاملہ سراسر زیادتی تھی۔ ان کی نازیبا حرکات پر عام جلسے میں سخت ترین نکتہ چینی کی گئی تھی۔

شروع میں گلڈ کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔ اسے کنونشن سے جو کچھ ملا تھا وہ ساز و سامان سے خالی ایک کرائے کا کمرہ اور کچھ غیر تربیت یافتہ رضاکار تھے۔ کارکنوں کی ہمت توڑنے والوں میں نہ صرف پیشہ ور مخالفین اور چند ضابطہ پرست حکام شامل تھے بلکہ کچھ نادان دوست بھی تھے جو اس تحریک کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ دو چار پرانے ادیبوں نے گلڈ کی مذمت کرنے کو اپنا مشغلہ بنا لیا اور دوسری طرف بعض نوجوان خیرخواہ جوشِ مدافعت میں اعتدال کی حد سے گزر گئے۔ بعض مخلص کارکنوں کو جن کا اس تحریک سے جذباتی تعلق تھا اور جو زود حس بھی واقع ہوئے تھے، حکومت کے جی حضوریوں اور پٹھوؤں کا لقب دیا گیا حالانکہ ان کا ماضی بالکل بے داغ تھا۔ یہ لوگ کئی مرتبہ ہمت ہار بیٹھے۔ بااثر لوگوں کے ایک اور طبقے نے ان کارکنوں پر تخریب پسندوں کے "ہم سفر" ہونے کا الزام رکھا۔ بعض مشہور ادیب تو رضاکارانہ خدمت انجام دینے سے قطع نظر گلڈ میں شریک ہونے سے بھی اس ڈر سے پیچھے ہٹنے لگے کہ کہیں ان کی شہرت پر پانی نہ پھر جائے مگر بالآخر وہ بھی شریک ہوئے گو یہ فیصلہ انھوں نے بہت غور و تامل کے بعد کیا۔ گلڈ کے ذمہ دار افراد سے بھی بعض انتظامی فروگزاشتیں ہو گئیں جن سے غلط فہمیاں عام ہوئیں۔ تعلقات عامہ کا فقدان، عرصہ دراز تک سرمایے کی قلت، سرگرم اور پختہ کار کل وقتی اور رضاکار کارکنوں کی نایابی، علاقائی اور ذیلی علاقوں کے مرکزوں کے دور دراز فاصلے اور زبانوں کی رکاوٹیں یہ سب ایسی سخت مشکلات ہیں جن کا سامنا گلڈ کو اس وقت بھی کرنا پڑا اور اب بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ گلڈ قائم کرنے والے بعض ممبروں اور عاملہ کمیٹیوں کے اراکین نے کبھی بحث و تکرار یا مذاق میں کچھ غیر ذمہ دارانہ باتیں کہیں جن کا گلڈ کی شہرت پر برا اثر پڑا۔ اخباری دنیا کا ایک حصہ بھی گلڈ پر محض اس لئے حملے کرتا رہا کہ گزشتہ زمانے میں ہم میں سے بعض ممبروں کو سیاسی مسلک کے اعتبار سے اس کی ہم خیالی میسر نہ تھی۔

★ ★ ★ ★
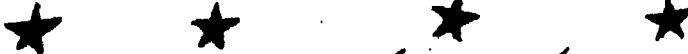
اسی طرح ہم سے یہ توقع بھی نہ رکھنی چاہئیے کہ اگر آئندہ کبھی سیاسی جماعتیں بحال کر دی جائیں تو ہم ان کی حوصلہ افزائی یا حوصلہ شکنی کریں گے یا ان سے کوئی سروکار رکھیں گے۔ ہم میں سے ہر شخص آزاد ہوگا کہ جو راستہ چاہے اختیار کرے مگر صرف انفرادی حد تک۔ آج تک گلڈ نے اپنے پلیٹ فارم سے ایک بات بھی ایسی نہیں کہی ہے جو نظریاتی طور پر اختلافی ہو۔ ایسے نظریات کی علانیہ یا خفیہ حمایت یا مخالفت کرنے والے صرف افراد ہو سکتے ہیں اور ان سے یہ حق نہیں چھینا جا سکتا۔ بلکہ ہم نے تو اب تک اپنے غیر دیانت دار مخالفین میں سے بھی بہت سوں کو اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دیا ہے اگرچہ بہت جلد ہمیں یہ بھی کرنا پڑے گا۔

★ ★ ★

مندرجہ بالا امور کے سبب یا ان کے باوجود ایک اور رجحان پیدا ہوتا نظر آتا ہے جو بہت تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمارا عام تخلیقی سرگرمی کی ترقی کا رخ آج کل اقدار کی تلاش، حقیقت کی تلاش، انفرادی مسرت کی تلاش اور انسانی حالات کو بہتر بنانے کی خواہش کی طرف

اس عنوان کے جزئیات کے بارے میں فکری طور پر ہر شخص کی رائے مختلف ہے مگر یہ سب تخلیقی خیالات مل کر انسانی آزادی اور مسرت کی [illegible]
ایک تیز و تند دھارے کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اس سے پاکستان میں ایسی آزاد دانشورانہ تخلیق کے حصول کے آغاز کی نشان دہی ہوتی ہے
جس کا موضوع انسان کی کل داخلی کیفیات اور خارجی موجودات ہیں۔

مختصر یہ کہ ادارۂ مصنفین پاکستان نے ادیبوں اور ادب کے لئے عزت و احترام کا مقام پیدا کر دیا ہے۔ یہ دانش وروں کی ایک ٹریڈ یونین ہے
جس کا اعلیٰ اور عزیز ترین مقصد اظہار خیال کی آزادی کا تحفظ اور ادبی خدمت ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ محض ذریعے ہیں اگرچہ فی الحال یہ ذریعے
ہی سب سے زیادہ توجہ طلب ہیں۔ اب کہ ممبروں کی تعداد ۷۰۵ تک پہنچ گئی ہے جن میں سے بہت حضرات مسلمہ طور پر بلند پایہ ادیب ہیں۔ گلڈ کے
انتظامی ڈھانچے کو زیادہ استوار اور صحیح بنیادوں پر قائم کرنا پڑے گا تا کہ اس کے موجودہ عوامل اور شواہد کی آمیزش سے تھوڑے ہی عرصے میں اس
تنظیم کا رنگ روپ اور نکھر جائے۔ آج گلڈ ایک قوی اور مستحکم تنظیم ضرور ہے تاہم اپنی منفرد نوعیت کی وجہ سے داخلی اور خارجی حملوں کا آسانی سے شکار
ہو سکتی ہے۔ اگر ممبر صرف جھگڑوں اور اجلاسوں کے چکر میں ہی الجھ کر رہ جانا پسند نہیں کرتے تو انہیں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ اس تنظیم کے
لئے ان میں کتنا خلوص ہے اور پھر ذمہ داری کے ساتھ انہیں اپنا فرض پورا کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اسے ایک آزاد اور طاقتور یونین بنانے اور اپنی انفرادی
اور اجتماعی جدوجہد تیز سے تیز تر کرنے کے آرزومند ہیں تو انہیں اپنا تن من دھن اس کے لئے وقف کر دینا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ یہ کام مستقبل قریب
میں تکمیل کو نہ پہنچ سکے لیکن وہ ایک ایسی طاقت پیدا کرنے میں یقیناً کامیاب ہو جائیں گے جو ان کے بعد آنے والے ادیبوں کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس
مایوسی سے محفوظ رکھے گی جس کا تجربہ خود انہیں اور ان کے پیش روؤں کو ہو چکا ہے۔

گلڈ قائم کرنے کا خیال جو سراسر نیک نیتی کی پیداوار ہے، روز افزوں دلچسپی کی وجہ سے، جیسا کہ حصہ دوم میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے بہت
تیزی سے ایک تحریک کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ لیکن اگر عہدوں کی ہوس، مالی فائدوں کے لالچ، سیاسی نظریہ پرستی، شخصی رقابتوں، گلڈ کو
نشانۂ تضحیک بنانے کے جذبات یا کاہلی و ناکردگی کو اس میں سرایت کرنے سے مسلسل نہ روکا گیا تو اس تحریک کی قوت ٹوٹ جائے گی۔ اس کے بعد
ہر شخص کو انفرادی اور اجتماعی طور پر جو خمیازہ بھگتنا پڑے گا اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں اور پھر ہمارے بعد آنے والوں کو ایسے
سنہری موقع کے لئے جو آج ہمیں نصیب ہے نہ معلوم کتنے عرصے تک انتظار کرنا پڑے۔

رپورٹ کا حصہ دوم گلڈ کے کاموں پر مشتمل ہے جو مرکزی
رپورٹوں کی شکل میں الگ شائع ہو رہے ہیں۔

رپورٹ کا تیسرا حصّہ

دوسالہ منصوبہ (منظورشدہ)

اشاعت گھر

کام جاری ہوگیا ہے۔ سال رواں میں تقریباً بیس کتابیں چھپ جائیں گی۔ ہمارے مجلے "ہم قلم" اور "پوروبا" (بنگلہ) باقاعدگی سے جاری ہیں اور ہر قابل ذکر مقام سے نئے جریدے شائع ہوں گے۔

بیمہ پالیسی

پرانی بیمہ پالیسی ختم ہونے کے بعد اب ہر رکن خود گلڈ میں بیمہ شدہ ہے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ سرمایہ حاصل کرکے ایک خودکفیل گلڈ بیمہ کارپوریشن بنائی جائے۔

گلڈ ہاؤس

ملتان گلڈ ہاؤس میں ترقیات، لاہور گلڈ ہاؤس پر قبضہ اور تحقیق ادارے، کلب اور لائبریری کا قیام، کراچی حیدرآباد راولپنڈی لاہور ڈھاکہ سلہٹ اور چاٹگام میں گلڈ گھروں کا قیام۔

اکیڈمی آف لیٹرز

بڑے پیمانے پر ایک اکیڈمی کا قیام۔ اس کی ابتدائی کارروائیاں پوری ہوگئی ہیں حکومت علاقائی مرکزوں میں مجوزہ ادارے قائم کرنے پر تیار ہوگئی ہے مگر بڑے پیمانے پر ایک مرکزی اکیڈمی قائم کرنے میں دشواریاں ہیں بہرحال یہ ہمارے منصوبے میں شامل ہے کہ ملک کی سب ادبی علمی جماعتیں ایک ادارہ بن کر اپنی شاخوں کے ذریعہ کل ملکی سطح پر تحقیق اور فروغ ادب کا کام کریں۔

غیر زبانوں میں اشاعت

پاکستانی ادب کے ترجمے وسیع پیمانے پر غیر ممالک میں شائع ہوں۔ اس منصوبے کی ابتدائی تیاریاں مکمل ہیں۔ ایک انتخاب منظومات کا انگریزی ترجمہ زیر طبع ہے جس سے دوسری یوروپی اور ایشیائی زبانوں میں ترجمے کئے جانے کے معاہدے ہوچکے ہیں۔ افسانوی ادب کا انتخاب ہوتا ہے جس کا ترجمہ انگریزی اور پھر دوسری زبانوں میں کیا جائے گا اس کے علاوہ مختلف بیرونی ایجنسیوں سے رابطہ پیدا ہوگیا ہے جو ہمارے ادب اور ادیبوں میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ اب انھیں مطلوبہ اطلاعات و مواد مہیا کرنے کی تیاری ہے۔ پروگرام کے مطابق اب سے دو سال میں ہمارے ادب اور ادیبوں سے بیشتر غیر ممالک بڑے پیمانے پر متعارف ہوجائیں گے اس اسکیم میں ہمارے وفود بھی شامل ہیں جن کی تیاریاں مکمل ہیں۔

حقوق کا تحفظ

یہ ہمارے منصوبے کا مستقل جزو ہے اور اب تک ہر طرف سے حملے کا جواب دینے میں کامیاب رہے ہیں۔

ہمت افزائی

(آدم جی ادبی انعام بیس ہزار روپیہ سالانہ کا ایک مستقل انعام ہے جو ہر سال اردو اور بنگلہ ایک ایک بہترین کتاب پر دیا جاتا ہے)

— مستقل انعام (جو جاری ہیں)

آدم جی ادبی انعام۔ بیس ہزار روپئے

اردو بنگلہ

سال رواں کی بہترین تخلیقی کتاب پر

۵۔ گلڈ انعام — پندرہ ہزار روپیہ — اردو بنگلہ سندھی پنجابی پشتو گجراتی
سال رواں کی بہترین ادبی تخلیقات کے شائع ہوئے
جو کتاب کی صورت میں نہ آسکیں۔

۶۔ ادبی شخصیت کا انعام (مجوزہ)

ہر سال پچیس ہزار روپیہ کا انعام کسی ممتاز ترین ادبی شخصیت کو دیا جائے خواہ اس نے سال گزشتہ کچھ نہ لکھا ہو اس انعام کا نصف حصہ غیر ملکی زرمبادلہ میں ہو تاکہ ادیب چاہے تو غیر ممالک کا سفر کر سکے۔
ہمیں امید ہے کہ سالہ ۱۹۶۱ء کے اندر اندر کوئی مخیر فرد یا ادارہ یہ مستقل انعام رائج کر دے گا۔

(۲) معاوضے پر اصرار

ہمارا اصرار ہے کہ ادیبوں کو ان کی تخلیقات کا معاوضہ دیا جائے خواہ وہ پہلی بار چھپیں خواہ ان کا انتخاب ہو اس سلسلے میں کئی ناشروں سے جھگڑے ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ شروع میں ہم ناکام رہے مگر اب اپنے موقف کی اشاعت اور قانونی دباؤ سے ہم کامیابی کے قریب آگئے ہیں۔ یہ مہم جاری رہے گی۔ اس کے کئی شعبے ہیں جن میں کتابوں کی کم سے کم سٹنڈرڈ رائلٹی کا مقرر ہونا کاپی رائٹ قانون میں ترمیمات اشاعتی سہولتیں سب کچھ شامل ہیں۔

فراہمی سرمایہ

روپے جمع کرنے کی مختلف تجاویز زیر عمل اور زیر غور ہیں۔ بنیادی مقصد یہ ہے کہ دس سال کے اندر اندر گلڈ خود مکتفی ہو جائے اس مقصد کے لئے چند کاروباری تجاویز بھی زیر غور ہیں۔ اگلے دس سال میں ہمارا عارضی نقطۂ عروج ۵ لاکھ روپے کی بچت ہے جن سے ہم طویل المیعاد منصوبے بنائیں گے۔

جمیل الدین عالی
اعزازی افسر رابطہ

۲۴ را پریل سنہ ۱۹۶۰ء

تجاویز جو ادارۂ مصنفین پاکستان نے اپنے اجلاس عام منعقدہ لاہور ۲۴ اپریل سنہ ۱۹۶۰ء کو منظور کیں

۱۔ ادیب اور ناشر کے تعلقات

ادارۂ مصنفین پاکستان (مرکز) کا یہ اجلاس عام اس حقیقت کو تشویش سے دیکھتا ہے کہ پاکستان کے اکثر مصنفین کے ساتھ ان کے ناشرین کا رویہ منصفانہ نہیں ہے۔

یہ اجلاس عام اس بات کو مانتا ہے کہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ناشرین تاجران کتب کو بہت زیادہ کمیشن دینے پر مجبور ہیں اسلئے یہ اجلاس عام اس مسئلے کو مرکزی مجلس عاملہ کے سپرد کرتا ہے تاکہ وہ اس مسئلے پر تحقیقات کرنے کے بعد اس کا کوئی ایسا حل تلاش کرے جس سے مصنفین، ناشرین اور تاجران کتب میں خوشگوار رشتے قائم ہو جائیں جن سے پاکستانی مصنفین کے اقتصادی حالات بہتر ہو جائیں۔

۲۔ ناشرین کے لئے قوانین

یہ اجلاس عام حکومت پاکستان سے درخواست کرتا ہے کہ وہ جلد از جلد ایسے قوانین وضع کرے جن سے ادیبوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ ان قوانین کی رو سے ناشرین کے لئے حساب دینا اور ہر کتاب کا جو وہ طبع کریں اس کے مصنف کو ایک معینہ مدت میں معاوضہ ادا کرنا ضروری قرار دیا جائے۔

۳۔ قانون حق تصنیف

ادارۂ مصنفین پاکستان کا یہ اجلاس عام مصنفین کے حق فروختگی کتب اور دیگر مالی حقوق کے سلسلے میں اور کاپی رائٹ قوانین کی خلاف ورزی میں چند ناشرین کے غاصبانہ برتاؤ کو بے حد ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔

اس لئے یہ اجلاس عام ناشرین سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ادیبوں کے ساتھ زیادہ صحت مند اور انسانی برتاؤ کریں تاکہ قومی ادب و ثقافت کو جو اب تک ناشرین کے غیر ہمدردانہ رویئے کی وجہ سے قعر مذلت میں پڑا ہوا ہے۔ فروغ دیا جا سکے۔

یہ اجلاس عام حکومت سے بھی مطالبہ کرتا ہے کہ اس معاملے میں قانونی پیچیدگیوں کو دور کیا جائے تاکہ مظلوم ادیب کو جو زیادہ تر معاشی بدحالی میں مبتلا ہوتا ہے اپنی مالی محدودات کے مطابق اور کم سے کم خرچے میں عدالتوں سے انصاف طلب کر سکے۔

۴۔ وی پی پی اور منی آرڈر

اس اجلاس عام کی رائے میں وی پی پی اور منی آرڈر یا کسی اور متبادل طریقہ کار کے سلسلے میں معاہدہ نہ ہونے کی صورت میں پاکستانی ادیبوں پر ہندوستان کی بڑی منڈی بند ہو گئی ہے جس سے ان کا مفاد مجروح ہوتا ہے۔

اس لئے یہ اجلاس حکومت سے درخواست کرتا ہے کہ وہ حکومت ہندوستان سے ہر دو ممالک میں کتابوں کے تبادلے میں باقاعدہ اجازت ناموں کے اجراء کے ذریعہ یا کسی اور متبادل طریقہ کار کے ذریعے آسانیاں فراہم کرنے یا ہر دو ممالک کے درمیان بلا قید کتابوں کی خرید و فروخت کیلئے سلسلہ جنبانی کرے۔

یہ اجلاس عام مرکزی مجلس عاملہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں حکومت پاکستان پر برابر زور دیتی رہے۔ جب تک یہ مطالبہ پورا نہیں ہوتا۔

۵ — ملازم ادیبوں پر پابندیاں

ادارۂ مصنفین پاکستان (مرکز) کا یہ اجلاس عام حکومت کی توجہ ان ادیبوں کی طرف منعطف کراتا ہے جو حکومت کے ملازم ہیں اور ریڈیو پاکستان کے پروگراموں میں حصہ لینے والے حکومت کے ملازمین کو اپنے افسر اعلیٰ سے تحریری اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے جو نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ تکلیف دہ بھی ہے۔ اس لئے یہ اجلاس حکومت سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے ملازمین پر سے اس پابندی کو اٹھا دے اور اس پرانے قاعدے کو پھر سے جاری کر دے جس کی رو سے اس قسم کے اجازت نامے کی صرف ایک مرتبہ ضرورت پڑتی تھی۔

یہ اجلاس عام حکومت کی توجہ سرکاری ملازمین کے لئے پروگراموں کی تعداد اور شرح معاوضہ پر پابندیوں کی طرف مبذول کراتا ہے۔ فی الحال سیکریٹری کے درجے کے ملازمین مہینہ میں دو مرتبہ اور ان سے نیچے کے درجے کے ملازمین مہینہ میں تین مرتبہ سے زیادہ پروگراموں میں حصہ نہیں لے سکتے اس کے علاوہ حکومت کے ملازمین فی پروگرام پچیس روپے سے زیادہ نہیں لے سکتے، جو بالکل غیر منصفانہ معاوضہ ہے کیونکہ ان کو بھی اپنی تخلیقات کے لئے اتنی ہی کوشش کرنی پڑتی ہے جتنی کہ دیگر ادیبوں کو کرنا پڑتی ہے۔

اس لئے یہ اجلاس عام حکومت سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس پابندی کو ختم کر کے حکومت کے ملازم ادیبوں کو ریڈیو کے پروگراموں میں حصہ لینے کا پورا موقع دے۔

۶ — ملازم ادیبوں پر پابندیاں

ادارۂ مصنفین پاکستان (مرکز) کے اس اجلاس عام کی رائے ہے کہ حکومت کے ملازمین کے بارے میں یہ قانون کہ وہ اپنی تخلیقات کے معاوضہ کا ایک تہائی حصہ حکومت کے خزانے میں حکومت کے حصے کے طور پر جمع کرا دیں۔ آزادی سے قبل کی دفتر شاہی راج کا ورثہ ہے اور حکومت کے ملازمین کے لئے بہ حیثیت ملازم اور بہ حیثیت ادیب دونوں صورتوں میں غیر منصفانہ ہے۔ یہ بے انصافی اس وقت اور زیادہ معلوم ہوتی ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ حکومت کسی اور قسم کی ذریعہ آمدنی میں ملازمین سے اپنا حصہ نہیں مانگتی۔ چونکہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے ملک میں تخلیقی صلاحیت رکھنے والے لوگوں کا فقدان ہے اور جو ہیں بھی ان میں زیادہ تر حکومت کے ملازم ہو جاتے ہیں اس لئے اس قسم کی پابندیاں ادبی ذوق رکھنے والے ذہنوں کی نشو ونما میں سد راہ بن جاتی ہیں۔ یہ ادیبوں کے لئے حوصلہ فرسا بھی ہیں اور ہمت شکن بھی اسلئے یہ اجلاس عام حکومت سے درخواست کرتا ہے کہ وہ سرکاری ملازمت کے بنیادی قوانین میں ایسی ترمیمات کرے جس سے یہ پابندیاں از خود رد ہو جائیں۔

یہ اجلاس عام حکومت سے مزید درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے ملازمین کیلئے ریڈیو پاکستان کے ادبی پروگراموں میں حصہ لینے کی تعداد اور معاوضہ کے سلسلے میں موجود قیود کو بھی اٹھا دے۔

۷۔ فلم سنسر بورڈ

[illegible] پاکستان مرکز کا یہ اجلاس عام مطالبہ کرتا ہے کہ فلم بندی میں ادیبوں کی اہمیت کے پیش نظر پاکستان کے ادیبوں کی واحد نمائندہ جماعت گلڈ کے نامزد کردہ اراکین کو فلم سنسر بورڈوں میں ضرور شامل کیا جائے۔

۸۔ مہاجر ادیبوں کی آبادکاری

جیسا کہ سب جانتے ہیں بہت سے مہاجر اور بے گھر ادیب ابھی تک آباد نہیں کئے جا سکے ہیں۔ اور اس طرح سے ان کی تخلیقی قوتیں ادب کے میدان میں بےکار ہو گئی ہیں۔ ان کے ذہن ہمیشہ تفکرات کا شکار رہتے ہیں۔ اس لئے تجویز کی جاتی ہے کہ گلڈ ایسے بے گھر اور مہاجر ادیبوں کو آباد کرانے کی کوشش کرے تاکہ وہ اپنے ذہنوں کو ادب کی تخلیق و ترویج میں لگا سکیں۔

۹۔ جرائم کے متعلق اور سنسنی خیز ادب

یہ اجلاس عام ایسے ادب کی نوجوانوں میں روز افزوں مقبولیت کو تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے جو مجرمانہ اور سنسنی خیز مواد پر مشتمل ہے اس قسم کے ادب سے نہ صرف جرائم پیشگی اور غیر صحت مندانہ رحجانات پرورش پاتے ہیں بلکہ اکتساب علم کے سنجیدہ رحجانات ختم ہوتے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں ملک اپنے بیشتر نوخیز ذہنوں کے فیض سے محروم رہ جاتا ہے۔

اجلاس عام کے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ملک میں سستی قیمت کا اچھا مواد نایاب ہے۔

بنا بریں یہ عام مرکزی مجلس عاملہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اس مسئلے کا بغور مطالعہ کرے اور اگر ضرورت ہو تو حکومت سے مطالبہ کرے کہ وہ ادارے سے مشورہ کے بعد اس قسم کے ادب کی درآمد بالکل بند کر دے یہ اجلاس عام پاکستان کے ادیبوں سے بھی درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے حقوق کو اس طرح سے غصب نہ ہونے دیں بلکہ اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لا کر قارئین کے مطالبات کو پورا کریں اور اپنے ملک کی کھوئی ہوئی منڈیاں پھر سے حاصل کر لیں۔

۱۰۔ دستور کی دفعات میں ترمیمات

قرار پایا کہ دستور کے معاملے میں مرکزی یا علاقائی دفاتر کی ممکنہ اغلاط، فروگزاشتوں اور کوتاہیوں سے صرف نظر کر دیا جائے۔

مزید قرار پایا کہ مرکزی مجلس عاملہ پاکستان کی مختلف ادبی اور تعلیمی انجمنوں کے دستور کے غائر مطالعے کے بعد ایک سال کے اندر اندر دستور کی دفعات میں ضروری ترمیمات کی سفارشات پیش کرے گی۔

مزید قرار پایا کہ مرکزی مجلس عاملہ کی پیش کردہ ترمیمات علاقائی مجالس عاملہ کو بھیجی جائیں گی جن کی منظوری کے بعد وہ نافذ سمجھی جائینگی۔

۱۱۔ ذریعۂ تعلیم

یہ اجلاس عام اس بات کو بڑے رنج کے ساتھ دیکھتا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے تیرہ سال بعد بھی جامعات ملک خصوصاً کراچی

بیشتر تعلیمی اداروں کا ذریعہ تعلیم ایک غیر ملکی زبان یعنی انگریزی ہے۔ یہاں تک کہ بعض تعلیمی ادارے اپنے تعلیمی معیار کی بلندی کو دکھانے کے لئے پاکستانی زبانوں میں شائع شدہ کتابوں کو اپنے کتب خانوں میں نہیں رکھتے کیونکہ اس سے ان کے خیال میں ان کے اعلیٰ معیار کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے انگریزی کی افادیت بلکہ ضرورت محسوس کرتے ہوئے بھی اس اجلاس عام کی رائے ہے کہ اب انگریزی ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اور وہ بھی ابتدائی اور ثانوی درجوں میں جاری رکھنا قومی مفاد کے منافی ہے۔ کیونکہ اس طریقے سے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں کی نشو ونما نہیں ہونے پاتی حالانکہ ان ذہنوں پر ہی ہمارے ملک کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ تعلیم کے اس طریقہ کار سے ہمارے نوجوان اپنی ثقافت، تہذیب اور تاریخ سے بے بہرہ ہی رہتے ہیں۔ اور ان میں حب الوطنی کا جذبہ جس کی جڑیں ہماری سرزمین کی روایات اور اخلاقیات میں ہوں پیدا ہی نہیں ہونے پاتا۔ اس کے علاوہ غیر ملکی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا ذہن پر بار ہی ناقابل برداشت ہوتا ہے۔

یہ اجلاس عام مذکورہ بالا تعلیمی اداروں کے اس رویے کی کہ وہ اپنے کتب خانوں میں پاکستانی ادیبوں کی تخلیقات نہیں رکھنے دیتے مذمت کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف قومی مفاد کو بلکہ پاکستانی ادیبوں اور ان کے ناشروں کو بھی نقصان پہونچتا ہے۔

اس وجہ سے یہ اجلاس عام حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مذکورہ بالا تمام تعلیمی اداروں کو احکامات جاری کرے کہ وہ اس تعلیمی سال سے انگریزی کو اپنے اداروں میں ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے ختم کردیں اور اپنے کتب خانوں میں پاکستانی ادب کی تخلیقات کو بھی رکھیں تاکہ ان کے طلباء اس سے بہرہ ور ہوسکیں۔

۱۲۔ "ادارے" کی ہیئت

ادارۂ مصنفین پاکستان کا یہ اجلاس عام اس بات کو بہت تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ جن کی ادبی حیثیت بہت مشتبہ ہے اور جنہوں نے تخلیقی، تنقیدی یا تحقیقی کسی بھی صنف ادب میں کچھ نہیں لکھا ہے وہ چند نامعلوم وجوہات کی بنا پر (دگنڈ) "ادارے" کی صفوں میں آگئے ہیں۔

یہ "ادارہ" صرف ایک ادبی ادارہ ہے اور اس ہیئت کو "کارکنوں" "ہمدردوں" اور "سرپرستوں" کے لئے قربان نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اجلاس کی رائے میں "ادارے" کی رکنیت صرف مستند ادیبوں تک محدود رہنی چاہئے۔

اس لئے یہ قرار پایا کہ ہر زبان کے پانچ ذمہ دار بنیادی اراکین "ادارہ" پر مشتمل ایک ذیلی مجلس بنائی جائے تاکہ وہ بہت غور و خوض اور انصاف سے "ادارے" کی تطہیر کریں، ہر رکن کی ادبی حیثیت متعین کریں اور ایک ایسا معیار مقرر کریں جس سے وہ اراکین جو رکن بننے کے اہل نہیں ہیں، رکنیت سے خارج کئے جاسکیں۔

۱۳۔ سالانہ روئداد کے ترجمے

ادارۂ مصنفین پاکستان (مرکز) کا یہ سالانہ اجلاس فیصلہ کرتا ہے کہ ادارے کی موجودہ سالانہ روئداد کے بنگلہ اور اردو ترجمے چھاپ کر تمام اراکین میں تقسیم کئے جائیں۔ اس کے علاوہ جو قراردادیں اس اجلاس میں منظور ہو رہی ہیں وہ بھی دونوں زبانوں میں چھاپ کر اراکین میں تقسیم کی جائیں۔

۱۴- ادارے کی زبان

یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ آئندہ مرکزی "ادارہ" حتی الامکان اپنے کاغذات اور اعلانات انگریزی کی بجائے بنگلہ اور اردو میں شائع کیا کرے گا۔ البتہ جلسوں کے متعلق تمام اراکین کو انگریزی کے استعمال کی اجازت دیتا ہے تاکہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے اراکین زیادہ قریب آجائیں اور ایک دوسرے کی زبان کو آسانی سے سمجھ سکیں۔

۱۵- ادارے کی تطہیر

یہ اجلاس عام ہر علاقے میں ایک جائزہ گیر کمیٹی کے قیام کو منظور کرتا ہے۔ جو پورے غور و خوض کے بعد ان ادیبوں کو جو مسلّمہ ادیب نہیں ہیں ادارے کے معاون اراکین قرار دے تاکہ علمی مقاصد کے لئے مستند و دیگر ادیبوں میں امتیاز رہے۔

یہ قرار پایا کہ یہ کمیٹیاں اپنی سفارشات مرکزی مجلس عاملہ کو علاقائی مجلس عاملہ کی معرفت پیش کریں گی۔ جن پر آخری فیصلہ کا حق مرکزی مجلس عاملہ کو ہوگا۔

(ترجمہ)

مرکزی مجلس عاملہ بابت ۱۹۶۲-۱۹۶۰ء

انتخابات منعقدہ لاہور ۲۴ اپریل ۶۰ء

صدر و نگران ——— ڈاکٹر محمد شہید اللہ

مرکزی عہدے داران

سکرٹیری جنرل ——— قدرت اللہ شہاب

خازن ——— عبد العزیز خالد

(اجلاس عام کی سفارش پر دستوری ترمیم کے مطابق جمیل الدین عالی کو اعزازی اگزیکٹیو سکرٹیری نامزد کیا گیا)

اردو	بنگلہ
(کراچی سے)	(مشرقی پاکستان سے)
جمیل جالبی	ابراہیم خاں
شاہد احمد دہلوی	ابو الحسن
قرۃ العین حیدر	بے نظیر احمد
ممتاز حسین	جسیم الدین
(مغربی پاکستان سے)	رشید کریم
احمد فراز	ڈاکٹر سجاد حسین
اشفاق احمد	عبد القادر
اعجاز حسین بٹالوی	غلام مصطفٰے
جمیلہ ہاشمی	منین الدین احمد
منیر نیازی	ڈاکٹر منیر چودھری
قد پاکستان: احسن احمد اشک	کراچی۔ بیگم یوسف جمال حسین
ندھی :- شیخ ایاز	
بتو :- امیر حمزہ شنواری	
ابی :- صوفی غلام مصطفٰے تبسم	

(نوٹ مندرجہ بالا فہرست حروف تہجی کے مطابق ہے)

منتخب علمی حلقوں کی تشکیل

[illegible]

[illegible] اپریل [illegible]

۱۔ بہاولپور محمد خالد اختر ——— [illegible] ابن سعید۔ علاقائی سکریٹری

۲۔ پشاور پشتو [illegible] ——— بیگم یوسف جمال حسین

[illegible] شنواری

یونس احمر

خاطر غزنوی

۳۔ حیدرآباد اردو ابراہیم خلیل

سندھی شیخ ایاز

نبی بخش بلوچ

۴۔ ڈھاکہ اردو مبین الدین احمد علاقائی سکریٹری

احسن احمد اشک

مولانا محمد اکرم خان

۵۔ راولپنڈی تجمل حسین

مختار صدیقی

نسیم حجازی

۶۔ سکھر اشتیاق حسین اظہر

عابد عباس

عروس ریاض

۸۔ کوئٹہ ثریا فخری

خلیل احمد

صادق نسیم

۹۔ لاہور پنجابی اشفاق احمد علاقائی سکریٹری

ضمیر جعفری

ڈاکٹر فقیر محمد فقیر

۱۰۔ ملتان آغا خاموش

صابر دہلوی

کشفی ملتانی

۱۱۔ منٹگمری انور شبنم دل

جمیل ہاشمی

(مندرجہ بالا فہرست حروف تہجی کے مطابق ہے)

تاریخ قیام :- ۶ رجون ۱۹۵۹ء

چٹاگانگ	نامزدگی
راج شاہی	
سلہٹ	نامزدگی

تاریخ قیام : اپریل ۱۹۶۰ء

لائل پور	منظور حسین قیصر

تاریخ قیام : جنوری ۱۹۶۰ء

سیالکوٹ	محمد اختر منظور بھٹی

بیرونِ پاکستان

تاریخ قیام : مئی ۱۹۶۰ء

بمنگھم (انگلستان)	محمود ہاشمی

ذیلی علاقوں کے قواعد

ذیلی علاقوں کے لئے مندرجہ ذیلی قواعد وضع کئے گئے ہیں۔

۱۔ ادارہ کا ذیلی علاقہ (سب ریجن) کسی شہر یا انتظامی علاقے تک محدود ہوگا۔

۲۔ صرف سکریٹری جنرل یا علاقائی سکریٹری بمشورہ سکریٹری جنرل ہر ذیلی علاقے کے لئے ایک یا متعدد کنوینر مقرر کر سکتے ہیں۔

۳۔ جہاں اراکین کی تعداد ۲۵ یا اس سے زیادہ ہو وہاں پر علاقائی سکریٹری دستور میں مندرج علاقائی انتخابات کے طریقے پر مندرجہ ذیل عہدیداروں کے انتخاب کا انتظام کریں گے۔

۱۔ اعزازی سکریٹری

۲۔ اعزازی خازن

۳۔ تین اراکین مجلس عاملہ

بشرطیکہ ادارے کی مرکزی اور علاقائی مجلس عاملہ کے اراکین متعلقہ ذیلی مجلس عاملہ کے مستزاد (ایڈیشنل) رکن متصور کئے جائیں گے۔

(ا) انتخابات یکم ستمبر [illegible] کے بعد دو سال کی مدت کے لئے ہوں گے۔

۴۔ جہاں اراکین کی تعداد پچیس سے کم ہے سکریٹری جنرل یا علاقائی سکریٹری کے مشورے سے سکریٹری جنرل مندرجہ ذیل عہدے دار نامزد کریں گے۔

۱۔ اعزازی سکریٹری

۲۔ اعزازی خازن

۳۔ عاملہ کے اتنے اراکین جو وہ ضروری سمجھتے ہیں۔

بشرطیکہ عہدے داران استعفے دیں یا کسی بنا پر سبکدوش ہو جائیں یا دوسری جگہ تبدیل ہو جائیں۔ یا کوئی اور وجہ جو تبدیلی کا سبب بن جائے علاقائی سکریٹری ان کی جگہ دوسرے عہدے دار نامزد کر سکتے ہیں۔ یہ تبدیلی سکریٹری جنرل کے مشورے سے کی جائے گی۔

۵۔ جہاں اراکین کی تعداد پچیس سے زیادہ ہو یا جہاں علاقائی سکریٹری کی رائے میں مالی صورت حال اس امر کی متقاضی ہو۔ تو ذیلی عاملہ کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ کسی منظور شدہ بینک میں اس طریقے پر جس پر دستور کے تحت مرکزی یا علاقائی کھاتے کھولے جاتے ہیں اپنا حساب کھول لے۔

۶۔ ہر ذیلی عاملہ اپنے اراکین، علاقائی عاملہ اور سکریٹری جنرل کو جوابدہ ہوگی۔

۷۔ ہر ذیلی عاملہ جو یکم ستمبر [illegible] کے بعد تشکیل پاتی ہے، خود اپنے قوانین کار یعنی طریق کار بنائے گی۔ اور سکریٹری جنرل سے علاقائی سکریٹری کی معرفت ان قوانین کی منظوری لینے کے بعد ان پر کاربند ہوگی۔

۸۔ جہاں کسی قاعدے قرارداد یا طریق کار کی مفہوم کی قواعد یا دستور میں پوری وضاحت نہ ہو اس وقت علاقائی سکریٹری سے رجوع کیا جائے گا جو بمشورہ سکریٹری جنرل کا فیصلہ ناطق ہوگا۔

یہ قواعد آج (۱۰ اگست [illegible]) سے نافذ ہوتے ہیں

(ترجمہ)

مرکزی مجلس عاملہ

چوتھا اجلاس

۴ و ۵ جنوری ۱۹۴۸ء

کراچی

۱- مرکزی رپورٹ کی تلخیص

مجلس عاملہ کے چوتھے اجلاس کی رپورٹ

انتخابات — مرکزی مجلس عاملہ کے تیسرے اجلاس کے فیصلے کے مطابق اس دفتر نے دستور کے ماتحت علاقائی انتخابات منعقد کرائے

حلقہ کراچی

حلقہ کراچی کے انتخابات ۱۰ اپریل ۱۹۶۰ء کو اعزازی افسر رابطہ (موجودہ ایگزیکیوٹو سکریٹری) کی زیر نگرانی منعقد ہوئے۔ آراء بذریعہ خفیہ بیلٹ دی گئیں۔ حلقے کے اجلاس عام کی صدارت کے لئے بیگم یوسف جمال حسین کو منتخب کیا گیا۔ اجلاس عام نے معاون شمار کنندگان کی حیثیت سے ریاض فرشوری۔ عباس احمد عباسی۔ شاہد احمد دہلوی اور قرۃ العین حیدر کو منتخب کیا۔ آرا کے شمار کے بعد نتائج کا اعلان کیا گیا جس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ صرف اس بات پر اعتراض کیا گیا کہ شائع کراچی کی روایات کے خلاف گجراتی کے ذواد بیوں کا انتخاب درست نہیں ہے۔ بہر صورت صدر نے ایک ادیب کے بیان پر کہ اس نے اُردو کے ادیب کے طور پر الکشن لڑا ہے اس اعتراض کو رَد کر دیا۔ (اس ضمن میں اپریل ۱۹۶۱ء کے اجلاس عام نے دستوری تبدیلیاں کر دی ہیں)

خلیل احمد جیلانی سب لفٹنٹ کمانڈر ابن سعید کے مستعفی ہونے کے بعد حلقہ کراچی کے علاقائی سکریٹری منتخب کئے گئے تھے سالانہ روداد پڑھی۔ کچھ اراکین نے رپورٹ کے کچھ حصوں میں صیغۂ واحد متکلم کے استعمال پر اعتراض کیا لیکن زیادہ تر نے علاقائی سکریٹری کی تعریف کی۔ مالیاتی تخمینہ و جدول اخراجات غور و خوض کے بعد منظور کئے گئے۔

حلقہ مغربی پاکستان

علاقائی انتخابات کے نوٹس اور بعدہٗ خفیہ بیلٹ دو مرکزی نگران کی زیر نگرانی تمام اراکین کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیجے گئے تھے خفیہ بیلٹ مہر شدہ موصول ہوئے تھے۔ ۲۶ اپریل کو ایک اجلاس عام منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا افسر رابطہ نے کی۔ جلسہ میں احمد ندیم قاسمی کو الیکشن کمشنر منتخب کیا گیا اور ان کے معاونین کی حیثیت سے عبدالکریم ثمر حافظ لدھیانوی۔ سعید شیخ۔ انجم رومانی کا انتخاب ہوا۔

نتائج انتخاب پر کوئی خاص اعتراضات نہیں ہوئے۔ اجلاس عام نے علاقائی مجلس عاملہ کو اخراجات کم کرنے اور کسی کارگزاری کے نہ ہونے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

حلقہ مشرقی پاکستان

علاقائی انتخابات کی پہلی تاریخ ۱۰ مارچ ۱۹۶۰ء مقرر کی گئی تھی۔ لیکن ڈھاکہ سے موصولہ چند اعتراضات کی بنا پر اعلیٰ افسر رابطہ کی تفتیش و سفارش پر اس تاریخ کی انتخابات ملتوی کر کے ۱۵ اپریل ۱۹۶۰ء کر دیا گیا۔ اراکین کو خفیہ بیلٹ دوبارہ بھیجے گئے اور ایک بیگ میں وصول شدہ خفیہ بیلٹ کے لئے انتظام کیا گیا۔ مرکز نے بیگم یوسف جمال حسین کو علاقائی انتخابات منعقد کرانے کے لئے ڈھاکہ بھیجا گیا۔ معاون شمار کنندگان ابراہیم خان، عبدالقادر، غیاث الدین اور مسلم الدین منتخب ہوئے اور گیارہ بجے نتائج کا اعلان کیا گیا۔

اس کے بعد اس دفتر کو دو شکایتیں وصول ہوئیں جن میں کہا گیا کہ ایسے دو اراکین جو ایک ایک رائے سے جیتے ہیں ان کی رائے شماری غلط ہوئی ہے۔ کراچی میں پھر سے رائے شماری ہوئی لیکن اعلان شدہ نتائج میں کوئی فرق نہیں پایا گیا۔ لاہور کے اجلاس عام نے اس کی توثیق کر دی۔

مرکزی انتخابات

مرکزی انتخابات ــــــ دستور کی دفعات کے تحت اجلاس عام کے انعقاد کی اطلاع اور عہدہ نامزد کردہ امیدواروں کے نام بذریعہ ڈاک تمام اراکین کو بھیجے گئے۔

مرکزی اجلاس عام، پرانی مرکزی مجلس عاملہ اور نئی منتخب شدہ علاقائی مجالس عاملہ کے اراکین پر مشتمل ہوتی ہے چونکہ سابقہ سکریٹری جنرل انتخابات میں حصہ لے رہے تھے اس لئے اعزازی افسر رابطہ نے ۱۱ اپریل ۱۹۶۰ء کو مجلس عاملہ کو کالعدم کر دیا۔ اور اپنی اتفاقی نگرانی میں مرکزی اجلاس و انتخابات منعقد کرائے۔

مرکزی اجلاس عام لاہور میں ۲۴ اپریل ۱۹۶۰ء کو منعقد ہوا۔ ڈاکٹر محمد شہید اللہ نے اجلاس کی صدارت کی۔ موصوف نہ مرکزی مجلس عام کے رکن تھے اور نہ کسی انتخاب میں حصہ لے رہے تھے۔ سکریٹری جنرل نے پہلی سالانہ روداد سنائی۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جہاں تک "ادارے" کے مقاصد کا تعلق ہے تمام ادیبوں کو اس میں ذاتی اغراض اور سیاست سے علیحدہ رہنا چاہیئے۔

اجلاس عام نے مرکز کی کارگزاری کی ستائش کی۔ لیکن حلقوں کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ وہ زیادہ کام کر سکتے تھے۔

قراردادیں پیش کی گئیں۔ ان پر بحثیں ہوئیں۔ کچھ رد کی گئیں اور کچھ منظور ہوئیں (ان کی تفصیل آئندہ صفحات میں ہے) دستور میں ترمیم کرنے کے لئے ایک کمیٹی کا انتخاب ہوا۔ اور اس کی سفارشات پر اجلاس عام نے کچھ ترمیمات قبول کیں۔ دستور کی ترمیم شدہ نقل تمام اراکین میں تقسیم کر دی گئی ہے۔

اجلاس عام نے مرکزی دفتر کی رپورٹ اور پروگرام کی توثیق کی لیکن اشاعت گھر کے سلسلے میں تینوں اسکیموں کو رد کر کے اس بارے میں تمام اختیارات سکریٹری جنرل کو تفویض کر دیئے۔

انتخابات بذریعہ خفیہ بیلٹ ہوئے۔ ڈاکٹر محمد شہید اللہ اور سولہ معاون شمار کنندگان نے آراء شمار کیں۔ اور نتائج کا اعلان کیا گیا۔

دیکس عالم کی سبکدوشی پر سکریٹری جنرل نے اعزازی افسر رابطہ کرنا کریم ثانی ایگزیکیٹو سکریٹری مقرر کیا۔

علاقائی عہدیداران ـــــ حلقہ کراچی میں علاقائی عہدیدار بدستور ہے بلکہ مغربی پاکستان میں علاقائی سکریٹری کے انتخاب پانچ مہینے لگ سکے۔ حلقہ مشرقی پاکستان میں پہلے علاقائی سکریٹری ڈاکٹر انعام الحق منتخب ہوئے مگر ان کی راج شاہی یونیورسٹی میں تبدیلی کی بنا پر ڈاکٹر قاضی مطاہر حسین ان کی جگہ منتخب کئے گئے۔

ذیلی علاقے ـــــ ملتان اور سکھر کے علاوہ تمام ذیلی علاقے سرگرم نہیں ہیں۔ ملتان میں ذیلی سکریٹری نے ایک قطعہ زمین [illegible] کے لئے حاصل کر لیا تھا۔ اطلاع ہے کہ اس کی فروختگی پر قضیہ ہو رہا ہے۔ اس معاملے میں ابھی تک مرکز نے سرکاری طور پر شرکت نہیں کی ہے کیونکہ ابھی ذیلی سکریٹری کی سفارشات درکار ہیں۔

عہدیداروں کی ذاتی مصروفیات کی بنا پر ملتان کی ذیلی کمیٹی کے عہدہ داران میں کچھ رد و بدل کی گئی۔

سکریٹری جنرل نے ذیلی علاقوں کے قواعد کی تشکیل کر کے متعلقہ حلقوں اور ذیلی علاقوں میں بھیجے ہیں۔ حلقہ مغربی پاکستان نے ان قواعد پر عمل درآمد شروع کر دیا ہے لیکن کراچی اور مشرقی پاکستان کے حلقے ابھی تک خاموش ہیں۔ اب تمام ذیلی علاقوں میں انتخابات یا نامزدگیاں ہو جانی چاہئیں۔

اس دفتر کو بتایا گیا ہے کہ ذیلی علاقے ثقافتی مسلسل سرگرمیاں چاہتے ہیں لیکن اس معاملے میں متعلقہ حلقوں سے مناسب مدد یا ہمت افزائی نہیں کی جاتی۔ چنانچہ مرکز کو براہ راست ہمت افزائی اور مدد کرنی پڑتی ہے۔ حالانکہ مرکز کا یہ کام نہیں ہے۔

سکھر ـــــ سکھر میں علاوہ چھوٹے چھوٹے پروگراموں کے ایک دو روزہ ثقافتی پروگرام اعلیٰ پیمانے پر منایا گیا۔ مغربی پاکستان، کراچی اور مشرقی پاکستان کے مندوبین نے اس میں شرکت کی۔ اس ذیلی علاقے نے تین ہزار روپئے از خود جمع کئے اس علاوہ مرکز نے علاقائی سکریٹری کی سفارش پر ایک ہزار روپے سے معاونت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ خیرپور میں ایک اجلاس ہوا جس کے لئے مرکز نے دو سو پچاس روپئے مدد کی۔ سکھر اور خیرپور کے علم دوست حضرات اور علاقائی [illegible] نے وعدہ کیا ہے کہ وہ گلڈ ہاؤس، لائبریری اور دفتر کے لئے پچاس ہزار روپئے جمع کریں گے۔ سکھر نے سندھی ثقافت پر جو ایک کتاب اردو میں بھی شائع کی ہے۔

ذیلی شاخ سیالکوٹ نے "ادارے" کے دستور کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے جو اپریل ۱۹۶۰ء کی ترمیمات کے [illegible] زیادہ کارآمد نہیں رہا ہے۔ پھر بھی ان کا یہ قدم قابل ستائش ہے۔

مرکزی کارکردگی

آدمجی ادبی انعام ـــــ اس دفتر نے خانوادہ آدمجی کو بیس ہزار روپئے سالانہ کی مالیت کے ادبی انعامات دینے پر رضامند

اردو اور انگریزی کی ادبی انعام اور علاقائی [illegible] انعامات کے حوالات سے ایک [illegible] کیا گیا اور دو اکائیوں میں تقسیم کیا گیا۔ جبکہ مغربی پاکستان سے کہا گیا تھا کہ وہ بنگلہ میں اسی قسم کا ایک کتابچہ شائع کرا کے ان اکائیوں میں تقسیم کرائے۔ لیکن ان کے ملنے میں کچھ رد و بدل کی بنا پر اور کچھ تعطل کے سبب یہ کام نہ ہو سکا۔

اس انعام کا انتظام سکریٹری جنرل نے کیا۔ اس سلسلے میں ججوں کی کمیٹی کی تشکیل خاطر خواہ آدمی اور [illegible] سکریٹریٹ کی مدد سے ہوئی۔

وقت مقررہ پر انعامات کا اعلان کیا گیا۔ صدر پاکستان نے از راہ مہربانی ان انعامات کی تقسیم قبول فرمائی اور ۳ جنوری ۱۹۶۱ء کو ایوان صدر میں منتخبہ شخصیتوں کے سامنے یہ انعامات انعام یافتہ ادیبوں کو دیئے گئے اور اس طرح سے ان انعامات کی مناسب سرکاری قدر افزائی بھی ہوئی۔

سکریٹری جنرل کا خیال تھا کہ ان تقسیم انعامات کے موقعے پر دنیا کے مشہور ادیبوں کو بلایا جائے گا لیکن وزارت خارجہ کی امداد کے باوجود مصنفین مذکور کی دقتوں اور ان کے لئے وقت کم ہونے کے پیش نظر ایسا نہیں ہو سکا۔

اس انعام سے متعلق چند نکات ہیں جن پر مرکزی مجلس عاملہ کو غور و خوض کرنا ہے۔ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اس انعام کا انتظام مرکزی مجلس عاملہ اپنے ہاتھوں میں لے لے۔ اس معاملہ کو ایجنڈے پر رکھ دیا گیا ہے۔

افعتی مہم ـــــ اپریل ۱۹۶۰ء میں "جنگ" اور "مارننگ نیوز" میں کتاب "آگ کا دریا" کی مصنفہ کے خلاف ایک اہانت آمیز صحافتی تنقید بیک وقت دو زبانوں میں شائع ہوئی۔ موصوفہ کی شکایت پر ایگزیکیٹو سکریٹری نے موصوفہ کے وقار اور ان کے حق اظہار کی مدافعت کی۔ سنا گیا تھا کہ موصوفہ کے خلاف یہ مہم با اثر حلقوں کے اشارے پر شروع کی گئی تھی۔ لیکن مرکزی دفتر کی مدافعت نے اس مہم کی کمر توڑ دی۔ آخر میں قانونی چارہ جوئی شروع ہونے کے بعد صاحب "تنقید" نے اخبار "جنگ" میں ایک معذرت نامہ شائع کروایا اور ذاتی خط سے بھی معافی مانگی حالانکہ موصوفہ نے سرکاری طور سے اس معذرت نامے کو نہیں مانا ہے لیکن چونکہ انہوں نے اس معاملہ کو آگے نہیں بڑھایا لہٰذا دفتر نے کوئی مزید کارروائی نہیں کی۔

اس مدافعت کا اثر یہ ہوا کہ اس قبیل کے تمام سربراہوں نے ادب پر احتساب کے سلسلے میں اپنی مزید سرگرمیوں کو ختم کر دیا۔ اس کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ادیبوں میں اجتماعی مدافعت کا عملی شعور بھی پیدا ہوا کیونکہ اس مہم میں کراچی اور لاہور کے بہت سے ادیبوں نے مرکزی دفتر کو مدد بہم پہنچائی۔

یہ معاملہ بیرون مملکت بھی بڑی دلچسپی سے دیکھا گیا۔ اور غیر ملکی ادیبوں نے اس کو بہت سراہا [illegible] نے اپنے اجلاس عام میں اس مدافعانہ مہم کی توثیق کی۔

یہ امر نہایت قابل فخر ہے کہ آج تک مقامی صوبائی یا مرکزی حکومت نے کسی ادیب کی آزادی تحریر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

ق تصنیف کی مدافعت ـ "نقش" اور "جائزہ" دو انتخابی مجلوں کو ادیبوں کی بغیر اجازت کے انتخاب شائع کرنے پر متنبہ کیا گیا

[illegible] نے نقوش نے واضح طور پر معاہدہ کر لیا ہے کہ ان کے بغیر تحریری اجازت ناشرین کے وہ ان کی تخلیقات کی نقل
شائع کریں گے۔ لیکن "جائزہ" نے ہماری تنبیہ کا کوئی اثر نہیں لیا۔ مرکزی دفتر نے پشاور اور مردان کے ممبر اراکین کو دو دو سو
دے کر انہیں اس بات میں مدد کی ہے کہ وہ اپنے تصنیفی حقوق کی پامالی پر "جائزہ" کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں
اس کے علاوہ "ہم قلم" کے ذریعے سے حق تصنیف کے قانون میں انقلابی ترمیمات کرنے کی مہم جاری کر دی گئی ہے۔

ایک سال کی مسلسل جد و جہد کے بعد حکومت نے "قانون حق تصنیف" میں ترمیم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے
یہاں ماہرین نہ ہونے کی وجہ سے یونسکو سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے ماہرین بھیجے اور وہ ماہر اب آیا ہی چاہتے ہیں۔ اس
سلسلے میں حکومت نے ادارے سے تمام قسم کی مدد دینے کے لئے کہا ہے۔ ادارے نے حسب ذیل اراکین کی ایک کمیٹی
اس غرض کے لئے بنائی منظور کی ہے۔

بیرسٹر اعجاز بٹالوی
ڈاکٹر جاوید اقبال
ڈاکٹر سجاد حسین
ڈاکٹر منیر چودھری

اس ضمن میں دفتر نے کافی مواد مہیا کیا ہے اور کاپی رائٹ کے موضوع پر کچھ تحقیق بھی کی گئی ہے۔

Book Trust بک ٹرسٹ —— حکومت نے ایک بک ٹرسٹ قائم کیا ہے جس میں ادارے کے سب علاقائی سکریٹری اور ایگزیکیوٹو سکریٹری
شامل ہیں۔ اس کا کام فروری ۱۹۶۱ء سے شروع ہونے والا ہے۔ اس کی تشکیل کے خیال کا اظہار پاکستان رائٹرس
کونشن ۱۹۵۹ء میں کیا گیا جن کا ہم کو مشکور ہونا چاہیئے۔

[illegible] —— پرانی پالیسی کو مرکزی مجلس عاملہ اور اجلاس عام کی ہدایت کے ماتحت ۱۲ جون ۱۹۶۰ء ختم کر دیا گیا۔ کافی تعداد
اراکین سے باقاعدہ فیس وصول نہ ہونے کی وجہ سے یہ دفتر نئی پالیسی کے لئے گفت و شنید نہیں کر سکا۔ ماضی کے
تجربے کی بنا پر یہ طے کیا گیا کہ فی الحال کسی رکن کے انتقال کی صورت میں اس کے پسماندگان کو یکمشت ایک ہزار روپے کا
علیہ "خود گلڈ" کی طرف سے دے دیا جائے۔ چنانچہ مسلم جعفر کے انتقال کے فوراً بعد ان کے ورثاء کو ایک ہزار روپے
دے دیئے گئے۔ جماعتی بیمے کے بارے میں اس دفتر کے کچھ خیالات ہیں ان کے اوپر مجلس عاملہ میں بحث ہو سکتی ہے

[illegible] حقوق —— "ہم قلم" کے ذریعے سے ناانصاف ناشرین کے خلاف بغیر ان کا نام دیئے ہوئے ایک زبردست مہم شروع
کر دی گئی۔ اس کے بعد ناشرین کو تنبیہ کی گئی کہ اگر انہوں نے اپنا رویہ نہیں بدلا تو ان کے نام شائع کر دیئے جائیں گے
اب پر ناشرین و تاجران کتب کی نئی قائم شدہ انجمن نے اجتماعی عمل کے لئے مذاکرات شروع کر دیئے ہیں۔ اس
انجمن کے ایک عہدہ دار اور علاقائی سکریٹری مغربی پاکستان کی سفارش پر مغربی پاکستان سے متعلق اس قسم کے تمام معاملات
کو علاقائی سکریٹری کے سپرد کر دیا گیا ہے کہ وہ اس کا پرسکون حل تلاش کر لیں۔ اس وجہ سے ان ناشرین کے نام کی اشاعت

سرونت روک دی گئی ہے۔

ایک رُکن کو بغیر اس کی اجازت کے اس کی کتاب شائع ہونے پر ناشر کے خلاف دعویٰ کرنے کے لئے چار سو چالیس روپے دیئے گئے یہ معاملہ پیش عدالت ہے۔

ایک دوسرے رُکن کو ناشر کے خلاف دعویٰ دائر کرنے کے لئے سو روپے دیئے گئے۔ یہ دعویٰ دائر کر دیا گیا ہے۔

ہماری مستقل استدعا پر ریڈیو پاکستان نے معاوضہ کی شرح میں اضافہ کا اعلان کر دیا ہے۔ لیکن ہمارے مطالبہ سے بہت کم۔ اس معاملے میں ان سے خط و کتابت ہو رہی ہے۔

ایک رکن کی اقبال اکیڈیمی کے خلاف شکایت پر ادارے نے حکومت سے تحقیقات کے لئے رجوع کیا۔ یہ تحقیقات مکمل ہو چکی ہیں اور ادارے کو مطلع کر دیا گیا ہے۔ اراکین اس کی تفصیلات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارا اس ادارے سے براہ راست تعلق نہیں اس لئے ہم اس معاملہ پر کوئی تبصرہ مناسب نہیں سمجھتے۔

ایک رُکن نے شکایت کی کہ حکومت نے ان کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ گو یہ بات ہمارے دائرۂ کار میں نہیں آتی مگر ادارے نے اس سلسلے میں اس رُکن کی مدد کی۔ اور گورنر مشرقی پاکستان کے تلطف کی بنا پر اس رُکن کی مشکل حل ہو گئی۔ اس کا ذکر برسبیل تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور اس کے بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جہاں اعلیٰ حکام ہمارے ساتھ ہیں۔ نچلے درجے کے حکام ہمارے اراکین کو خواہ مخواہ پریشان کرتے ہیں۔

"ادارے" کی درخواست پر مغربی پاکستان کے گورنر نے لاہور کے ایک ناشر کے خلاف کرشن چندر کے حق تصنیف کی پامالی پر تحقیقات کے احکامات صادر کئے۔ پولیس تحقیقات کر رہی ہے۔ اور اس معاملہ کی شہرت ملک اور بیرون ملک سب جگہ ہوئی۔ ناشرین نے مبینہ طور پر کرشن چندر کے نام سے دو ناول جو انہوں نے نہیں لکھے شائع کر دیئے اور مزید ایک ناول جو ان کی تصنیف تھا بغیر ان کی اجازت کے شائع کیا تھا۔ ادارے کی کارکردگی اور گورنر مغربی پاکستان کے احکامات کے بارے میں ہندوستان کا ردِعمل بہت خوش گوار ہے۔

تحفظ حقوق تصنیف کے سلسلے میں مرکزی دفتر کی ایماء پر "ہم قلم" میں جنوری کے شمارے میں ہندوستان کے وزیر اعظم کے نام ایک کھلی چٹھی بھی شائع ہوئی ہے۔

سندھی کے ایک ادیب عثمان ڈیپلائی نے شکایت کی تھی کہ گورکی کی کتاب "ماں" کے سندھی ترجمہ کو مقامی حکام نے ضبط کر رکھا ہے۔ "ادارے" نے اس معاملے میں مغربی پاکستان کے سکریٹری اطلاعات سے مراسلت کی اب عثمان ڈیپلائی نے اطلاع دی ہے کہ یہ پابندی اُٹھالی گئی ہے۔ یہ چند مثالیں ہیں مختصراً۔ جہاں تک ادیبوں کے حقوق کا تعلق ہے ان معاملوں میں فتح پائی اس کے باوجود ابھی کچھ ناشرین سے ابھی تک معاملات طے نہیں ہوتے ہیں۔ ایسے متعدد معاملات "ادارے" کے سامنے آئے جن میں مصنفوں نے ناشرین سے ناقص معاہدے کئے تھے۔ اور ان پر کوئی قانونی قدم نہیں اُٹھایا جا سکتا تھا چنانچہ ایک اعلامیہ کے ذریعہ ادارے نے جملہ اراکین کو بتا دیا ہے کہ مفت قانونی مشوروں کے لئے وہ ادارے سے رجوع کریں۔ اور حالانکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ وکلا ان کے مقدمات کی پیروی بھی مفت کر دیں۔ وکیلوں سے بھی مفت قانونی مشورے حاصل کرنے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ اشاعتی کاروبار میں اصلاحات کے لئے "ہم قلم" میں ایک زبردست مہم جاری کر دی گئی ہے

جن کی تفصیلات بیان فرما دی ہیں۔

مجلے

مرکزی کمیٹی کے احکامات کے بموجب لاہور اور ڈھاکہ سے مرکزی ادارت میں علاقائی مدد سے دو مجلے اجراء کیے جانے چاہیئے تھے۔ اور علاقائی ادارت میں مرکزی معاونت سے جہاں جہاں مجلے جاری کیے جا سکتے ہوں وہاں سے بھی جاری ہونے چاہئیں۔ لیکن مغربی پاکستان کے سابق علاقائی سیکریٹری لاہور کے مجلے کے لئے اعلان نامہ حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

اگست تک حلقۂ کراچی سے "ہم قلم" ایک اخبار نامہ کی حیثیت سے نکل ہی رہا تھا۔ اگست میں اس کو ایک ادبی ماہنامہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ مرکز نے کراچی حلقہ کی پانچ ہزار روپے کی ضمانت سے مدد کی۔ جس کے سہارے اس حلقہ نے بینک سے قرض لیا۔ پانچ ہزار روپے کے عطیہ کا انتظام بھی کر دیا گیا۔ اب تعداد اشاعت کے لحاظ سے "ہم قلم" اُردو کے ماہناموں میں دوسرے نمبر پر سمجھا جاتا ہے۔ "ہم قلم" ہر چیز کا مناسب حصہ دیتا ہے اور اس کے ذریعے مرکز کی پالیسیوں کی اشاعت اور وضاحت ہوتی رہتی ہے۔

ڈھاکے کے حالیہ دورے میں ایگزیکیوٹو سکریٹری نے "پوروبی" کے معاملات کی از سر نو تشکیل کی۔ یہ سفارش کی جاتی ہے کہ مدیران "پوروبی" کو مرکز پانچ ہزار روپے عطا کرے۔ اس ماہنامہ میں اشتہارات آئینگے جس سے یہ خود کفیل ہو جائےگا۔ ایک بنگلہ مجلے کا ہونا ادارے کے لئے بہت ضروری ہے۔

لاہور نے شاید ماہنامہ کے اجراء کا خیال ترک کر دیا ہے جس کا سبب یہ بھی ہے کہ علاقائی سکریٹری نے اشاعت گھر کے سلسلے میں پوری تن دہی سے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

مشرقی پاکستان کے اُردو ذیلی حلقہ نے ایک اُردو ششماہی "قلم کار" نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور اُمید کی جاتی ہے کہ وہ جنوری کے اواخر میں شائع ہو جائے گا۔ صرف اس ذیلی حلقے کو ایک مجلہ نکالنے کی اجازت دی گئی تھی اسلئے کہ یہ مغربی پاکستان سے بہت فاصلے پر واقع ہے۔

ثقافتی سرگرمیاں

علاقائی سکریٹریوں کی رپورٹیں تفصیل بتائیں گی۔ مختصراً اس سال گلڈ کے زیر اہتمام ۳۵ مذاکرے اور مجالس منعقد ہوئیں جن میں سکھر۔ ملتان۔ چٹاگام اور کراچی نے نمایاں حصہ لیا۔

خارجہ اور وفود

ہندوستان کی اُردو رائٹرس کنونشن میں "ادارے" کی طرف سے غلام عباس کو بحیثیت مبصر کے بھیجا گیا۔ اس کنونشن کے منتظمین کو پاکستان رائٹرس کنونشن سے حاصل شدہ تمام تجربات سے مطلع کیا گیا۔ اور غلام عباس کو ہندوستان بھیجنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ ہندوستان کی کنونشن کو اپنے تجربات سے فائدہ پہونچائیں۔ بدقسمتی سے وہ کنونشن زیادہ کامیاب نہیں رہا اور نہ ہی کسی ہمارے جیسے "ادارے" نے اس سے جنم لیا پھر بھی ہندوستانی ادیبوں نے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

جولائی ۱۹۶۰ء میں ایگزیکیوٹو سکریٹری ایک سرکاری وفد میں عراق کی یوم آزادی کی تقریبات میں حصہ لے

گئے تھے۔ جہاں سے وہ سرکاری فرائض کے سلسلے میں بیروت اور قاہرہ گئے۔ انہوں نے اس دورے کو "ادارے" کے مفاد اور مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا۔ ادارے کے تعارف کے طور پر بیرونی ادیبوں اور دیگر اداروں میں کتابچہ تقسیم کیا گیا جس سے "ادارے" کی کافی شہرت ہوئی۔ عرب دنیا میں ہمارے متراجم کی اشاعت اور فروخت کے سلسلے میں تعلقات کافی استوار ہوئے ہیں۔

سکریٹری جنرل سرکاری فرائض کے سلسلے میں انگلستان، برما، انڈونیشیا اور جاپان گئے تھے جہاں انہوں نے "ادارے" کے لئے بھی روابط قایم کئے۔ اب وہ مغربی جرمنی میں بھی ادارے کے لئے روابط قایم کر رہے ہوں گے۔

اب ہمارے پاس اپنے تراجم کی اشاعت و فروخت کے مکمل انتظامات ہیں لیکن ہمیں معیاری تخلیقات کے اعلےٰ تراجم کی تالیف کرنی ہے۔

۲۲ نومبر ۱۹۶۰ء کو ہزایکسی لنسی سفیر روس کے ذریعے سوویٹ رائٹرس یونین نے طالسطائی کی پچاسویں برسی پر پاکستان کا ایک مندوب ماسکو بھیجنے کی دعوت دی۔ یہ تقریبات ۱۵ نومبر سے شروع ہو رہی تھیں سکریٹری جنرل نے جن کو تمام اس قسم کے اختیارات مرکزی مجلس عاملہ کے تیسرے اجلاس سے ملے ہوئے ہیں ایگزیکیٹو سکریٹری کو "ادارے" کے مندوب کی حیثیت سے جانے کے لئے نامزد کیا۔ ۱۵ نومبر کو ایگزیکیٹو سکریٹری روانہ ہو کر ۱۶ نومبر ۱۹۶۰ء کو ماسکو پہنچے۔ انہوں نے لینن گراڈ اور ترکمانستان کے دو شہر دیکھے جہاں پر انہوں نے "ادارے" کی طرف سے مخدوم قلی کی ۲۲۵ ویں برسی میں شرکت کی۔ وہ ۶ دسمبر ۱۹۶۰ء کو واپس آئے۔ اس دوران میں "ادارے" کے تعاونی کتابچوں کو غیر ملکی اور ملکی مندوبین میں تقسیم کیا گیا۔ لینن گراڈ میں "ادارے" کی طرف سے ادیبوں کو ایک دعوت دی گئی۔ ادارے کے تمام اخراجات دس پونڈ کے قریب ہوئے۔

حکومت نے مشرقِ وسطیٰ میں ایک وفد کے لئے جسے سکریٹری جنرل ستمبر ۱۹۶۰ء میں بھیجنا چاہتے تھے چھ ہزار روپئے کی منظوری دے دی تھی، لیکن جن ممالک میں جانا تھا ان میں قیام وغیرہ کے لئے مذاکرات پورے نہیں ہو سکے نہ وفد کے اراکین کا آخری انتخاب ہو سکا۔ اب یہ معاملہ مرکزی عاملہ کے زیرِ غور ہے۔

مارچ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر تارا چند نے ہند و پاک کی تمام مشترک زبانوں (قدرتی طور سے بالاستثنا پشتو) اور ادب۔ تاریخ اور فلسفہ کی ایک کانفرنس دہلی میں طلب کی ہے۔ اس سلسلے میں علاقائی سفارشات موصول ہو چکی ہیں۔ مرکزی عاملہ کو اس پر فیصلہ کرنا ہے۔

امریکہ کی ایشیا سوسائٹی نے سکریٹری جنرل اور ایگزیکیوٹو سکریٹری سے درخواست کی کہ وہ اپنی تخلیقات کو ترجمے اور اشاعت کے لئے امریکہ بھیجیں۔ ہر دو نے اس کی رائے دی کہ انفرادی "ادارے" کو کہا جائے کہ وہ اس میں کچھ سفارشات کرے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال جو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک مندوب کی حیثیت سے گئے ہوئے تھے انہوں نے سوسائٹی سے اس امر پر مذاکرات کئے۔ اب اس سوسائٹی نے "ادارے" سے اپنی سفارشات بھیجنے کو کہا ہے اور اب مرکزی عاملہ اس پر فیصلہ کرے۔

[illegible]

کو چاہیئے کہ وہ کوئی ایسی ترکیب نکالے جس سے گلڈ کے مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ مجلس
منظور کرے تو راقم الحروف مختلف ممالک میں پاکستانی ادب کے ناشرین تلاش کرے اور ضروری امور طے کر
اس سلسلے میں مختلف شرائط کی تشکیل کرے۔ اس اجازت نامے کی ضرورت اس بنا پر ہے کہ سکریٹری جنرل اس و
تھا رہیں جبکہ مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد نہ ہو رہا ہو۔

نصابی کتابیں ـــــ گزشتہ سال سرکاری حلقوں میں یہ خبر تھی کہ "ادارے" سے نصابی کتابیں لکھوانے کے لئے کہا جائے گا۔ اور
حکومت کو ادارے کی رضامندی کے بارے میں مطلع کر دیا گیا تھا لیکن ابھی تک حکومت سے کوئی اطلاع نہیں ملی
اس کے برخلاف یہ بتایا گیا ہے کہ مختلف نصابی کتابیں لکھنے کے لئے عام دعوت دی گئی ہے۔ مولفین اپنی نصابی
کے مسودے حکومت کے سامنے پیش کریں۔
چونکہ اس معاملے میں اراکین مختلف الخیال ہیں اس لئے مرکزی مجلس عاملہ اس پر غور و خوض کے بعد فیصلہ

گلڈ ہاؤس ـــــ ملتان گلڈ ہاؤس منافع سے چل رہا ہے مگر اب اس معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر عاملہ میں غور ہونا چاہیئے
لاہور میں وزارت بحالیات سے پرنس ہوٹل تین لاکھ پچاسی ہزار روپئے میں لے لیا گیا ہے۔ یہ روپیہ
جلد ادا کرنا ہے۔ اس ہوٹل میں گلڈ کا کتب خانہ۔ دفتر دستاویزات اور دفتر رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس
مستقل آمدنی بھی ہو سکتی ہے۔
ہمارے ایک رکن بے نظیر احمد نے گلڈ ہاؤس کے لئے ڈھاکہ میں ایک ایکڑ زمین عنایت کی ہے۔
سکھر میں گلڈ ہاؤس خریدنے یا بنانے کے لئے اچھے مواقع دریافت ہوئے ہیں۔
کراچی میں اب تک کوئی جگہ نہیں ملی ہے۔ نہ دوسرے شہروں میں جگہ ملی ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہہ دینا ضروری ہے
دفتر کے کارکن ہر جگہ بیک وقت کام نہیں کر سکتے۔ اس وجہ سے علاقوں اور ذیلی علاقوں کے اراکین اور عہدیدار
کو چاہیئے کہ وہ اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ توجہ دیں۔ مرکزی دفتر اس بارے میں ان کی مدد کرتا رہے گا۔

ثقافتی سرگرمیاں ـــــ مرکز کے اہتمام مشرقی اور مغربی پاکستان میں بڑے پیمانے پر ادیبوں کے وفود کا تبادلہ ہوا ان ادیبوں نے دونوں
کے کئی شہر دیکھے اور ہر شہر کے ادیبوں سے مذاکرات کئے
"حلقے" اپنی اپنی سرگرمیوں کی روداد اس اجلاس میں پیش کریں گے۔ لہٰذا ان کا دہرانا بے سود ہے۔ اس دفتر نے شاہ عبد
بھٹائی رح کی برسی کے موقع پر اس برس کی استقبالیہ کمیٹی اور تبلیغی علاقوں میں رابطہ قائم کیا۔ محکمہ تعمیرات نو نے "ادارے
اس برسی میں وفد بھیجنے کے اخراجات کے لئے دو ہزار روپئے دیئے تھے۔ اراکین وفد کا انتخاب خود علاقائی
نے کیا تھا۔
کراچی میں باقاعدہ ادبی مجلس ہوتی ہیں اور ڈھاکہ اور چٹاگام میں بھی کئی تقریبات منعقد ہوئیں۔ ادبی جلسوں
معاملے میں ہم مقامی انجمنوں کے تعاون سے کام کر سکتے ہیں اور ایک ہی انجمن حلقۂ ارباب ذوق ہم سے خاص طور پر

کرتی ہے۔

آدمجی ادبی انعام کی تقسیم انعامات کی تقریب میں حصہ لینے کے لئے مشرقی پاکستان سے مجوب العالم وعبدالستار کراچی آئے تھے جنہوں نے مغربی پاکستان دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ان کو سکھر کنونشن میں شرکت کے لئے اور لاہور ادیبوں سے ملنے کے لئے بھیجنے کا بندوبست کیا گیا۔ اس ضمن میں یہ بتا دینا چاہیئے کہ اب تک مندرجہ ذیل تعداد ایک خطے سے دوسرے خطے میں ادارے کے ماتحت سفر کر چکی ہے۔ ہمارے سب انجمن (ذیلی حلقے) اپنے طور پر بھی چھوٹے پیمانے پر دوسری زبانوں کے ادیب ملاقات سے استفادہ کرتے ہیں۔

مغربی پاکستان میں

مشرقی پاکستانی ادیب جو کنونشن میں شرکت کے لئے آئے	۵۲
مشرقی پاکستانی اراکین مرکزی مجلس عاملہ	۱۰
" " " مرکزی اجلاس عام	۲۲
" " " برائے دیگر مجالس	۸
	۹۲

مشرقی پاکستان میں

مغربی پاکستانی ادیبوں کا وفد جس کے اخراجات حکومت نے برداشت کئے	۱۲
" " " اراکین برائے مرکزی مجلس عاملہ	۱۷
" " " برائے دیگر مجالس	۵
	۳۴

اللسانی کمیٹی ــــــ اس کمیٹی کے اجلاس ڈھاکہ میں یکم فروری کو اور لاہور میں ۱۵ اپریل کو منعقد ہوئے۔ کمیٹی نے اپنی گزشتہ کارروائی پر غور کیا اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل مقرر کیا۔ اب اراکین اپنے اپنے مضامین پر کام کر رہے ہیں۔ اس دوران میں سید شبیر علی کاظمی (چاٹگام) سے اردو بنگلہ کے آٹھ ہزار الفاظ پر مشتمل ایک لغت مرتب کرائی گئی۔ جس کی پڑتال ڈاکٹر محمد شہید اللہ اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کریں گے اور اس کے بعد وہ اسی سال میں شائع کر دی جائے گی یہ ایک نہایت مفید کام ہوا ہے۔ لیکن ابھی یہ بین اللسانی کمیٹی کے مقاصد کی نقش اول ہے ہمارا اندازہ ہے کہ کمیٹی گلڈ کی عاملہ کے سامنے اپنی بنیادی سفارشات اس سال کے اندر اندر پیش کر دے گی۔

یونیسکو کے معاہدے ــــــ ایک معاہدہ جو پاکستانی ثقافتی آثار پر ایک دستاویز مرتب کرنے کے لئے تھا ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے مکمل کرا لیا گیا۔ اب ضروری مرقعے اور تصاویر شامل کر کے یہ مسودہ یونیسکو کے زیر اہتمام شائع کر دیا جائے گا دوسرا معاہدہ پاکستان میں ترویج اشاعت کتب کے مختلف طریقوں، مصنفوں کے معاوضوں، ناشرین اور کتب فروشوں کے کمیشن اور دیگر کاروباری پیچیدگیوں پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کا تھا۔ اب اس معاہدے کا طریقہ کار یونیسکو سے منظور ہو کر کام شروع ہو گیا ہے۔ اگر یہ معاہدہ کامیابی سے پورا ہوا اور یونیسکو نے

ہماری سفارشات مان لیں تو وہ اس مسئلے پر حکومت کو بین الاقوامی پس منظر میں ضروری مشورے دے گی ج
سے نہایت دور رس اور مفید نتائج پیدا ہوں گے۔

تیسرا معاہدہ پاکستانی مصنفین۔ ناشرین۔ تاجران کتب کارٹون بنانے والے۔ تجارتی مصوروں و
کے بارے میں ایک کتاب مرتب کرتے کا ہے جو ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے۔

گلڈ انعامات — مرکزی مجلس عاملہ کے احکامات کی بموجب مندرجہ ذیل انعامات گلڈ کا اعلان کر دیا گیا ہے۔

بنگلہ	۵،۰۰۰
اردو	۵،۰۰۰
علاقائی زبانیں	۱۲،۰۰۰
	۲۲،۰۰۰

چونکہ یہ انعامات "ادارے" کی تیسری سالگرہ سے جاری کیئے جائیں گے اس لئے ابھی پورا ایک سال ہے۔ا
مرکزی مجلس عاملہ کو اس بارے میں ضروری فیصلے کر لینے چاہئیں۔

ہماری درخواست پر علاقائی زبانوں کی انجمنوں سے کچھ تجویزیں موصول ہوئی ہیں وہ اراکین مرکز
مجلس عاملہ کے سامنے پیش کی جارہی ہیں۔

اشاعت گھر — ایک لاکھ روپے کا قرض اپریل ۱۹۶۱ء میں وصول ہوا۔

اس سلسلے میں اجلاس عام نے تمام اختیارات سکریٹری جنرل کو تفویض کر دیئے تھے۔ انہوں نے نم
کے بارے میں علاقائی سکریٹریوں سے تفصیلات بمعہ ان کی سفارشات کے ساتھ طلب کیں۔ یہ سفارشات
علاقائی مجلس عاملہ کی مدد سے علاقائی سکریٹریوں کو کرنی تھیں۔ اس کے علاوہ منتخب شدہ مسودوں کے
تجزیئے بھی طلب کئے گئے اس سلسلے میں اشاعت گھر کے لئے ایک مہتمم کا تقرر نومبر سے کیا جا چکا ہے۔جب
کراچی اور مغربی پاکستان کے حلقوں نے اپنی سفارشات سے مطلع کیا تھا۔

اب کراچی اور مغربی پاکستان کے حلقوں کی منتخب شدہ بارہ کتابوں کی اشاعت کا انتظام مہتمم اشاعت
کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ مشرقی پاکستان نے ابھی تک اپنی سفارشات سے مطلع نہیں کیا ہے جس کی وجہ غالباً یہ
کہ وہاں کے علاقائی سکریٹری اپنے تبادلے کے باعث مستعفی ہوگئے تھے اور اس وجہ سے اس کام کو سرانجام نہ
دیا جا سکا ہے۔ بہر صورت اب توقع ہے کہ نئے علاقائی سکریٹری اپنی سفارشات سے مطلع کریں گے جو
کے بعد مہتمم ان کو ضروری مشورے اور ہدایات دے سکیں گے۔

اس دوران میں مرکز نے منتخبہ پاکستانی شاعری کے ایک مجموعے کا انگریزی ترجمہ شائع کرانے کا انتظا
کر لیا ہے۔ یہ ترجمہ بیرونی ممالک کے لئے ہوگا۔ اس کے مترجم جی۔ اے الانہ ہیں جنہوں نے جناب ا
کیو نیاز اور بیگم یوسف جمال حسین سے مدد لی ہے۔ اس ترجمے کا مقصد پاکستانی ادب کو ان ممالک میں متعارف

کرانا ہے جن میں انگریزی پڑھی جاتی ہے اور انگریزی سے عربی۔ فرانسیسی۔ اسپینی۔ روسی۔ فارسی وغیرہ میں ایسی تبلیغ کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔

مختصراً اشاعت گھر کا کام چل نکلا ہے۔ اس کے نتائج ایک سال بعد معلوم ہو سکیں گے۔

مرکزی دفتر ـــــ مندرجہ ذیل کارکن حسب سابق اعزازی طور سے کام کرتے رہے۔

سکریٹری جنرل

خازن

ایگزیکیوٹو سکریٹری

ایگزیکیوٹو سکریٹری کے سرکاری دوروں اور دوسری مشغولیات کی وجہ سے مندرجہ ذیل اعزازی کارکن مزید ملے گا۔

افسر بکارِ خاص ـــ ابن الوقت

پہلے کی طرح مندرجہ ذیل ملازم رہے۔

آفس ایگزیکیوٹو ـ تنظیم

آفس ایگزیکٹو ـ دفتر

ٹائپسٹ (جزوقتی)

چپراسی ـ ایک

۱۰ر جنوری ۱۹۶۰ء سے زیادہ کام کے پیش نظر ایک اور اعزازی کارکن کا اضافہ ہوا۔ وہ اعزازی مہتمم دفتر کہلاتے ہیں

ڈاک

رسیدات در مرکز یکم فروری ۱۹۵۹ء سے ۲۵ر جنوری ۱۹۶۰ء	۲۳۸۰
مکاتیب از مرکز " " " " " "	۲۲۳۲
	۴۶۱۲

ان اعداد و شمار سے مرکزی دفتر کی مصروفیات کا تھوڑا سا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حسابات ـــــ اپریل ۱۹۵۹ء کے اخراجات و آمدنی کی میزان کی منظوری اجلاس عام نے دیدی تھی۔ اب پورے سال کے حساب یعنی فروری ۱۹۵۹ء سے جون ۱۹۶۰ء کے حسابات چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ نے تشخیص کرلئے ہیں اور وہ مرکزی مجلس عاملہ کے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں۔

عطیات ـــ سال گزشتہ مرکزی حکومت نے ادارے کا بجٹ معلوم کیا تھا اور ادارے نے ایک لاکھ اناسی ہزار روپے کا بجٹ بنا کر بھیجا مگر وہ مرکزی حکومت نے منظور نہیں کیا۔ بلکہ صرف ایک لاکھ روپے کا بجٹ منظور کیا بشرطیکہ ان کے

تمام آڈٹ شدہ حسابات حکومت کو بھیج کئے جائیں۔

۱۴ جنوری ۱۹۶۱ء کو حکومت نے اس عطیے کے لئے احکامات صادر کئے۔ اس عطیے کو اتنی دیر سے وصول کرنے میں ہماری غلطی تھی کیونکہ ہم گزشتہ حسابات کا آڈٹ جلد نہیں پیش کر سکتے تھے۔ اس کی وجوہات یہ تھیں کہ ہمارے پاس کوئی تربیت یافتہ خزانچی نہیں تھا اور خازن ایک بھروسے والا رکن ہی مقرر ہوتا ہے جو ادارے کے لئے تمام وقت نہیں دے سکتا۔

۶۲-۱۹۶۱ء کے لئے حکومت سے تین لاکھ روپے کے عطیے کی درخواست کی گئی ہے۔

استعفے — اس سال نہ کسی عام رکن نے استعفےٰ دیا نہ کسی علاقائی عہدے دار نے۔ مرکزی خازن نے ۷ جنوری ۱۹۶۱ء کو اپنی مشغولیات کی بنا پر استعفےٰ دیدیا ہے۔ ان کی جگہ ابن انشا کو عارضی طور سے خازن بنا دیا گیا ہے۔

ناکامیاں

۱۔ **بیمہ** — ایک کم خرچ زیادہ مفید بیمہ اسکیم نہیں بنائی جا سکی۔ بیمہ کمپنیاں بہت زیادہ قسطیں مانگ رہی ہیں۔

۲۔ **اشاعتی پروگرام** — اب اشاعت گھر کا کام چل نکلا ہے۔ لیکن مسودات کے انتخاب میں ہم نے بہت سا وقت ضائع کیا جس کی وجہ سے ہم اپنے نظام اوقات سے چھ مہینے پیچھے رہ گئے ہیں۔

۳۔ **سفری مراعات** — ریلوے بورڈ نے دوسری مرتبہ بھی ہمارے مطالبے کو رد کر دیا ہے۔ ایک اپیل کر دی گئی ہے جس کے نتائج ابھی سامنے نہیں آئے۔

۴۔ **حق تصنیف** — ابھی تک قانون حق تصنیف میں ہمارے مطالبات کے مطابق ترمیمات نہیں ہو سکی ہیں۔

۵۔ **گلڈ گھر** — ملتان میں گلڈ گھر ۱۹۵۹ء میں بن گیا تھا۔ اس سال صرف ایک گلڈ گھر لاہور میں بن سکا ہے۔ وہ بھی ادھورا ہے کیونکہ اس کی قیمت فراہم کرنی ہے۔ اس دفتر کی رائے میں ہمیں یہ اختیار ہونا چاہیے کہ ہم گلڈ گھروں کے لئے اپنے ذرائع یا بیرونی ممالک کے ذرائع کی مدد سے قرضہ لے لیں۔ اور اس قرضے کو گلڈ گھروں کی آمدنی سے ادا کر دیں۔

۶۔ **مجلے** — صرف حلقہ کراچی سے ایک مجلے کا اجرا ہو سکا ہے۔ ڈھاکہ کا بنگالی مجلہ باقاعدہ نہیں نکلا۔ "قلمکار" بانا آ گیا ہے مگر سہ ششماہی ہے۔ ادارہ "قلمکار" اسے سہ ماہی بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

۷۔ **تطہیر** — ابھی تک مبینہ "غیر ادیب" اراکین کی تطہیر علاقائی عاملہ کی سفارشات نہ ملنے پر نہیں ہو سکی ہے حالانکہ اجلاس عام نے ایک قرارداد اس مضمون کی منظور کی تھی۔

۸۔ **انکم ٹیکس سے استثناء** — انکم ٹیکس سے ادیبوں کی پیشہ ورانہ آمدنی مستثنیٰ قرار نہیں دی جا سکی ہے۔ حکومت کسی طبقے کو کام کاج سے مستثنیٰ قرار دینے پر تیار نہیں ہے۔ لیکن ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ایک تو آمدنی کے بارے میں ادیبوں کا اپنا بیان تسلیم ہونا چاہیے۔ دوسرے آمدنی کی نئی تعریف مقرر ہو جائے۔

تتمہ

۱۹۶۰ء ــــ ہمارے لئے ایک خوشگوار سال رہا ہے۔ نہ صرف ہم نے اپنے ملک میں قدم جمائیے بلکہ ہمیں بیرونی ممالک نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اس دفتر کی رائے میں اب ہم ایک ایسے مضبوط جمہوری ادارے کی شکل اختیار کر رہے ہیں اور اگر اس کو صحیح طریقے سے چلایا جائے تو بہت مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ "سرکاری" حلقوں میں "ادارے" کی مخالفت بہت کم ہوگئی ہے۔ حالانکہ کبھی کبھی اس میں گرمی بھی آجاتی ہے۔ اخبارات نے زیادہ تعاون شروع کر دیا ہے۔ ہم نے تمام ملک میں اپنا دائرہ کار پھیلا دیا ہے اور اب دوسری انجمنوں کے مقابلے میں حکومت کے عطیات کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔

ثقافتی سرگرمیاں پہلے سے زیادہ اور متنوع ہوگئی ہیں جن سے دور رس فوائد مرتب ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ادیب اب فی نفسہٖ معاشرے میں ایک مقام کا مالک ہو گیا ہے۔ چاہے اس کی مالی اور سرکاری حیثیت کچھ بھی ہو۔

(انگریزی رپورٹ سے تلخیص و ترجمہ)

ایجنڈا

مرکزی مجلس عاملہ کا چوتھا اجلاس

۲۹ر جنوری ۱۹۶۱ء
(۱۰ بجے صبح)

۱۔ صدر کا انتخاب
۲۔ گذشتہ اجلاس کی توثیق روداد
۳۔ گذشتہ سال کی سرگرمیوں پر مرکز کی رپورٹ
۴۔ رپورٹ پر عام بحث

(۲ بجے سہ پہر)

۵۔ علاقائی کارگزاریوں کا جائزہ اور ان پر بحث
(کارگزاریوں کی رپورٹ تینوں علاقائی سکریٹری پیش کریں گے)

۶۔ علاقائی بجٹ اور حسابات
(علاقائی سیکرٹری پیش کریں گے)

۷۔ عام مالی ذمہ داریوں اور وسائل آمدنی کا جائزہ

۸۔ رکنیت کی نئی درخواستوں پر غور

۹۔ قوانین حق اشاعت (کاپی رائٹ) کی روشنی میں انتخابی پرچوں کے متعلق رپورٹ پر غور۔

۱۰۔ کوئی اور مد بہ اجازت صدر

۳۰ جنوری ۱۹۶۷ء
(۱۰ بجے صبح)

۱۔ صدر کا انتخاب

۲۔ آدم جی ادبی انعام کے انتظامات پر غور و بحث

۳۔ انعامات گلڈ کے لئے قواعد کی تشکیل

۴۔ نامزدگی وفود برائے ہند و پاک ثقافتی کانفرنس جو مارچ ۱۹۶۷ء میں دہلی میں ڈاکٹر تاراچند ممبر پارلیمنٹ منعقد کر رہے ہیں۔ اس کا بجٹ

۵۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک کو بھیجے جانے والے وفد کے اراکین کی نامزدگی۔ اس سے متعلق امور پر غور

۶۔ ادیبوں کے بیمے کے متعلق تجویزوں پر غور

۷۔ گلڈ کے اشاعت گھر کا جائزہ کار

(۲۔ بجے سہ پہر)

۸۔ نئی درخواست ہائے رکنیت کی پڑتال اور منظوری

۹۔ کمیٹی برائے نصابی کتب کی 'ادارے' سے پہلوتہی کے معاملے پر غور

۱۰۔ لاہور اور ملتان میں گلڈ گھروں کی خریداری انتظام اور ڈھاکہ میں ایک گلڈ گھر کے قیام کا مسئلہ۔

۱۱۔ ذیلی علاقوں کا انتظام۔

۱۲۔ حکومت سے ان قراردادوں کے سلسلے میں مطالبے جن پر ابھی تک کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

۱۳۔ اراکین کی پیش کردہ قراردادیں۔

۱۴۔ کوئی اور مد بہ اجازتِ صدر۔

(ترجمہ)

(نوٹ) نئے اراکین کے ناموں کا ضمیمہ شائع کیا جائے گا

(مع ترمیمات)

مسودہ اوّل کنونشن (۱۹۵۸) منعقدہ کراچی میں پیش ہوا

پیش کردہ:- جمیل الدین عالی

ذیلی کمیٹی برائے تشخیص : شوکت صدیقی ۔ ممتاز حسین ۔ ڈاکٹر سجاد حسین ۔ ظہیر کاشمیری ۔ اعجاز بٹالوی
ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔ قدرت اللہ شہاب ۔ ہاجرہ مسرور ۔ غلام مصطفیٰ ۔ ابراہیم خاں

منظور شدہ

پاکستان رائٹرز گلڈ کنونشن

پاکستان سوسائٹیز ایکٹ ۱۸۶۰ کے تحت رجسٹرڈ ہوا

ترمیمات اوّل اجلاس عام ۱۹۶۰ء میں پیش ہوئیں

مجوزہ:- جمیل الدین عالی

ذیلی کمیٹی برائے تشخیص

ڈاکٹر جاوید اقبال ، اعجاز حسین بٹالوی ، ابوالحسین
ڈاکٹر سجاد حسین ، غلام مصطفیٰ

منظور شدہ

اوّل اجلاس عام ۱۹۶۰ منعقدہ لاہور

اعلامیہ

ہرگاہ کہ تخلیق ادب کے لئے ایک عام سازگار فضا پیدا کرنے اور
پاکستان کے ادیبوں کے جائز حقوق کا تحفظ اور مراعات کے فروغ
کے لئے ایک تنظیم کا قیام ضروری ہے لہٰذا "پاکستان رائٹرز گلڈ
کے نام سے ایک تنظیم قائم کرنا طے پایا ہے جس کا صدر مقام وفاقی
دارالحکومت میں اور علاقائی اور ذیلی دفاتر کراچی اور مشرقی و مغربی
پاکستان میں ہوں گے۔

یادداشت

۱۔ نام:

اس تنظیم کا نام "پاکستان رائٹرز گلڈ" (ادارۂ مصنفین پاکستان) ہوگا جسے آئندہ صرف گلڈ یا ادارہ کہا جائیگا

۲۔ دفتر:

اس تنظیم کا رجسٹرڈ صدر دفتر پاکستان کے وفاقی دار الحکومت میں ہوگا اور کراچی، لاہور اور ڈھاکہ میں علاقائی دفاتر ہوں گے۔ ان میں وہ ذیلی دفاتر بھی شامل ہوں گے جو علاقائی شاخیں قائم کرنا مناسب سمجھیں

۳۔ اغراض و مقاصد:

(الف) ایسے حالات کو فروغ دینا جو خیالات اور ثقافت کے آزادانہ اظہار و فروغ کے ضامن ہوں۔

(ب) ادیبوں کے ادبی مفادات کا تحفظ کرنا تاکہ وہ بے خوف و ہراس پاکستانی ادب کی خدمت کرنے کے قابل ہوسکیں۔

(ج) امداد باہمی کی بنیادوں پر ایک ایسے دار الاشاعت کے قیام و انصرام کے لئے کام کرنا جو اس گلڈ ارکان کی عملی کاوشوں کی اشاعت کے لئے سہولتیں بہم پہنچائے۔

(د) ادیبوں کے لئے مشترکہ بیمے کی تجویز بروئے عمل لانا تاکہ بوقت ضرورت ان کی اور ان کے کنبوں کی اعانت ہو سکے۔

(ہ) پاکستانی ادب کی بیرونی ممالک میں اشاعت کا اہتمام کرنا تاکہ تمام دنیا میں پاکستانی تصنیفات کو متعارف کرایا اور مقبول بنایا جائے۔

(و) بیرونی ممالک میں بھیجنے کے لئے گلڈ کے ارکان پر مشتمل ادبی اور ثقافتی وفود کی تشکیل کرنا۔

(ز) کاپی رائیٹ ایکٹ اور دوسرے متعلقہ قوانین میں ایسی تبدیلیوں کی کوشش کرنا جن سے مصنفوں کی ادبی کاوشوں کے عوض حاصل ہونے والی مالی منفعتوں کا مکمل قانونی تحفظ ہو سکے اور فی الجملہ مصنف اور ناشر کے مابین معقول بنیادوں پر تعلقات استوار ہوسکیں۔

(ح) بوقت ضرورت ملک کی دوسری ادبی اور ثقافتی تنظیموں سے تعاون کرنا اور ان کی حمایت و اعانت کرنا۔

(ط) گلڈ کے اغراض، دائرہ کار اور نصب العین سے مطابقت رکھنے والے ایسے دوسرے اُمور کی انجام دہی جو اس پر اس کی مرکزی انتظامیہ مقرر کرے

دفعات اِشتراک

(الف) ——— رُکنیت ———

۱۔ گلڈ کے ارکان کی دو قسمیں ہوں گی ۔

(الف) بانی ارکان ——— تمام مندوبین جو پاکستان رائیٹرز کنونشن ۱۹۵۸ء میں شریک ہوئے بانی ارکان ہوں گے بشرطیکہ وہ مقررہ چندے اور فیس داخلہ (مرکزی عاملہ کی مقرر کردہ میعاد کے اندر) ادا کردیں گے

(ب) عام ارکان ——— ہر وہ شخص جو اس تنظیم کے اغراض ومقاصد سے متفق ہو نیز ادیب ہو اور قانون شہریت پاکستان کے مطابق پاکستان کا شہری ہو مندرجہ ذیل طریقے پر مرکزی عاملہ کے ذریعے عام رُکن بن سکے گا۔

(i) علاقائی مجلس عاملہ سے باقاعدہ تائید شدہ درخواست مع فیس داخلہ وسالانہ چندہ مرکزی مجلس عاملہ کو بھیجی جائے گی۔ درخواست دہندہ اسی وقت رُکن بن جائے گا بشرطیکہ مرکزی مجلس عاملہ اپنے معمولی اجلاس میں اس کی توثیق کردے۔ مرکزی مجلس عاملہ کسی درخواست کو بجز دو تہائی اکثریت کی منظوری کے مسترد کرنے کی مجاز نہ ہوگی استرداد کی صورت میں مرکزی مجلس عاملہ اس کی تحریری وجہ دے گی اور اس کی ایک نقل متعلقہ علاقائی مجلس عاملہ کو بھیج دے گی۔

اگر علاقائی مجلس عاملہ اسی درخواست دہندہ کی رکنیت کی دوبارہ سفارش کرے تو مرکزی مجلس عاملہ اس کی رکنیت بالفعل منظور کرے گی، اگر ایسا رکن عارضی منظور ہوگا تا وقتیکہ اگلا اجلاس عام اس کی منظوری نہ دے، جس کے سامنے مرکزی مجلس عاملہ اس معاملہ کو تمام وکمال پیش کرے گی۔

(ii) اگر علاقائی دفتر کسی درخواست کی تائید سے انکار کرے تو وہ اس کے تحریری وجود کی ایک نقل مرکزی مجلس عاملہ کو بھیجے گا، جو درخواست دہندہ کو عارضی طور پر رُکن بنا سکتی ہے تا آنکہ اگلا اجلاس عام اس کی قطعی منظوری دے جس کے سامنے یہ معاملہ مندرجۂ بالا شق کے مطابق پیش کیا جائے گا۔

۲۔ رکنیت کا اختتام :-

(الف) موت یا استعفے کی صورت میں۔

(ب) ایک سال تک چندہ نہ ادا کرنے کی صورت میں۔

(ج) دفعہ (۱۰) کے مطابق اخراج کی صورت میں۔

۳۔ مجلس عاملہ مرکزی ہو یا علاقائی، کسی درخواست رکنیت پر غور کرتے وقت طالب متعلقہ کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔

۴۔ فیس رکنیت ——— اس تنظیم کی رکنیت کے لئے درخواست دہندہ کو دس روپے بطور فیس داخلہ ادا کرنے ہوں گے۔

۵۔ چندہ ——— ہر رکن بارہ روپے سالانہ چندہ دیا کرے گا جو بارہ مساوی اقساط میں واجب الادا ہوگا

(ب) ——— دستور ———

۱۔ گلڈ کے معاملات کی انجام دہی کے لئے ایک مرکزی اور کراچی، ڈھاکہ اور لاہور کے لئے ایک ایک علاقائی مجلس عاملہ ہوگی، جن کے ساتھ وہ ذیلی مجالس عاملہ بھی ہوں گی جن کو علاقائی مجالس عاملہ اپنے دائرہ اختیار کے اندر دوسرے مقامات پر تشکیل دیں۔

۲۔ مرکزی مجلس عاملہ ———

(ا) یہ ۱۲ منتخب اراکین اور چار نامزد اراکین پر بہ تناسب ذیل مشتمل ہوگی:-

بنگالی مصنفین	...	...	۱۱
اردو مصنفین	...	...	۱۱
پنجابی مصنف	...	...	۱
پشتو مصنف	...	...	۱
سندھی مصنف	...	...	۱

(اا) پاکستانی رائٹرز کنونشن ۱۹۵۹ء مرکزی مجلس عاملہ کو اور باقی ارکان ہر علاقائی مجلس عاملہ کو ایک سال کے لئے منتخب کرے گی یعنی اگلے اجلاس عام تک جبکہ مرکزی مجلس عاملہ کا انتخاب بطریق ذیل عمل میں آئے۔

الف:- مرکزی مجلس عاملہ میں انتخاب کے اُمیدواروں کی نامزدگی تحریری طور پر ہوگی اور گلڈ کے رجسٹرڈ دفتر کو ہر سالانہ اجلاس عام سے کم از کم ایک تقویمی مہینہ پہلے بھیجی جائے گی۔ اس نامزدگی میں امیدوار کا پورا نام و پتہ با وضاحت درج ہوگا۔ گلڈ کے دو ارکان کی تجویز و تائید ہوگی، امیدوار کا ایک بیان ہوگا کہ وہ گلڈ میں شریک ہونے پر آمادہ ہے، اور یہ کاغذاتی کے لئے مرکزی مجلس عاملہ کو بھیج دی جائے گی۔

(ب) امیدواروں کے نام فرد کارروائی (ایجنڈا) کے ہمراہ ارکان کو بغرض اطلاع بھیجے جائیں گے۔

(ج) انتخاب اجلاس عام میں بذریعہ "خفیہ ووٹ" (بیلٹ) یا "ہاتھ اٹھانے" کے ——— جو طریقہ اجلاس عام مناسب سمجھے ——— عمل میں آئے گا۔ بشرطیکہ اجلاس عام صرف مندرجہ ذیل تعداد منتخب کرے گا۔

- بنگلہ زبان کے ادیب ۹ (جن میں سے ایک کراچی کا باشندہ ہو)

اُردو زبان کے ادیب ۹ (جن میں چار کراچی اور پانچ مغربی پاکستان کے باشندے ہوں گے) اور دو بنگلہ اور دو اردو زبان کے ادیب سکرٹری جنرل کے نامزد ہوں گے۔ اگر ضروری سمجھا گیا تو سکرٹری جنرل ایک گجراتی ادیب کو بھی شامل کرسکتے ہیں۔

(د) پہلی (عبوری) مرکزی مجلس عاملہ کے ارکان ایک سال بعد منتخب ہونے والی مرکزی مجلس عاملہ میں مکرر انتخاب کے اہل ہوں گے۔

(ہ) (پہلی مرکزی مجلس عاملہ کے علاوہ) مرکزی مجلس عاملہ میں منتخب ہونے والے ارکان دو سال تک اپنے منصب پر فائز رہیں گے اور اگلے متصل میقات کے اہل نہیں ہوں گے۔

(و) مرکزی مجلس عاملہ کے کسی رُکن کے قبل از میعاد سبکدوش ہونے پر اس کی خالی جگہ کو مجلس اسی لسانی گروپ میں سے کہ جس سے سبکدوش ہونے والا تعلق رکھتا ہو کسی دوسرے رکن کو بطور خود منتخب کرسکے گی اور یہ انتخاب اگلے اجلاس عام کی توثیق سے مشروط ہوگا۔ منتخب یا توثیق یافتہ رُکن اپنے پیش رو رُکن کے غیر مختتم مدت کار تک اس منصب پر فائز رہے گا۔

(ز) مرکزی مجلس عاملہ کا کوئی رُکن کسی اجلاس عام میں دو تہائی رائے کی اکثریت سے منظور شدہ قرارداد کے ذریعے اپنے منصب سے کسی وقت بھی ہٹایا جاسکتا ہے اور وہی اجلاس عام اس کی خالی جگہ معمولی اکثریت رائے کے ذریعے پُر کرسکے گا۔

(ح) گلڈ کے مالی سرمائے کو خُرد بُرد کرنے کی بنیاد پر مرکزی مجلس عاملہ کے جس رُکن کو اجلاس عام اس کے منصب سے علیحدہ کردے وہ عام رکنیت کا بھی اہل نہیں رہے گا اور اس کا نام سیاہ فہرست میں درج کرکے تمام ارکان اور متعلقہ عہدے داروں میں گشت کرایا جائے گا۔

(ط) مرکزی مجلس عاملہ گلڈ کے کاموں کو اپنی صواب دید کے مطابق چلائے گی لیکن مجلس مذکور اجلاس عام کی قراردادوں، اعلانوں اور ہدایتوں کے خلاف عمل نہ کرے گی۔ اگر ضرورت ہوئی تو یہ فیصلہ کرنا کہ کہاں، کب اور کیونکر اس مجلس نے عام جماعت کی ہدایات کے مطابق عمل کیا ہے، اجلاس عام کا کام ہے۔

(ی) مرکزی مجلس عاملہ علاقائی مجالس اور وہاں کے اُمور میں مداخلت نہ کرے گی بشرطیکہ وہ امور گلڈ کے مقاصد کی خلاف ورزی پر مبنی نہ ہوں۔

۳۔ علاقائی مجالس عاملہ

(ا) تین علاقائی مجالس عاملہ ایک کراچی، ایک لاہور اور ایک ڈھاکہ میں ہوں گی۔ ہر علاقائی مجلس گیارہ ارکان پر مشتمل ہوگی جو اس علاقے کے سالانہ اجلاس عام میں منتخب ہوں گے۔ گلڈ کے بانی ارکان اپنے اپنے علاقوں کے لئے گلڈ کے قیام کے ایک ماہ کے اندر اندر یعنی ۲۸ فروری ۱۹۵۹ء تک پہلی علاقائی مجالس منتخب کریں گے۔

(ii) عہدیداروں (بشمول معتمد و خازن) انتخابات، دائرہ عمل وغیرہ کی تمام متعلقہ دفعات جو مرکزی

مجلس عاملہ پر لاگو ہوں گی علاقائی مجالس عاملہ پر بھی لاگو ہوں گی البتہ نصاب اور ہنگامی اجلاسوں کے سلسلے میں علاقائی مجالس اپنی صواب دید کے مطابق فیصلہ کر سکیں گی ۔ علاقائی مجالس گلڈ کے مقاصد کے لئے مرکزی مجلس عاملہ کے ساتھ قریبی تعاون اور ہم رشتگی سے کام کریں گی اور اپنے میں سے ایک معتمد اور ایک علاقائی خازن منتخب کریں گی ۔ بشرطیکہ علاقائی مجلس مندرجہ ذیل طور سے تشکیل پائے گی ۔

مشرقی پاکستان میں : ایک نمائندہ اُردو زبان کے ادیبوں کے حلقے سے

مغربی پاکستان میں : سندھی، پنجابی اور پشتو زبان کے ادیبوں میں سے ایک ایک نمائندہ

کراچی میں : بنگلہ اور گجراتی زبان کے ادیبوں میں سے ایک ایک نمائندہ

مزید یہ کہ ہر لسانی ذیلی شاخ کا سکرٹری (محولہ بالا) رکن (عاملہ) ہوگا اور یہ ترمیم علاقائی انتخابات کے نتائج پر ۱۹۶۰-۶۲ء (مدت رواں) کے لئے بھی عائد ہوگا ۔

۴۔ عہدیداران ———

(الف) معتمد عام ———

(i) گلڈ کا ایک اعزازی معتمد عام (سکریٹری جنرل) ہوگا جسے پاکستان رائیٹرز کنونیشن ۱۹۵۹ء یکم فروری ۱۹۵۹ء سے آئندہ اجلاس عام کی تاریخ تک کے لئے منتخب کرے گی۔ اس طرح منتخب شدہ سکریٹری جنرل گلڈ کے پہلے اجلاس عام کے آغاز پر سبک دوش ہو جائے گا، اور مکرر انتخاب کے لئے بھی اہل ہوگا۔

(ii) پہلے مرکزی اجلاس عام و مابعد میں منتخب ہونے والا معتمد عام دو سال تک کے لئے اپنے عہدہ پر فائز رہے گا۔ اور متصل میقات میں مکرر انتخاب کے لئے اہل نہ ہوگا ۔

(iii) معتمد عام کی جگہ اتفاقیہ خالی ہو جانے کی صورت میں مرکزی مجلس عاملہ کے ارکان ایک ہنگامی یا معمولی اجلاس، جیسی صورت ہو، طلب کر کے اس کو پُر کریں گے اور یہ آئندہ اجلاس عام کی منظوری کے ساتھ مشروط ہوگا۔ اس طرح منتخب شدہ سکرٹری جنرل جانے والے معتمد عام کی غیر مختتم میعاد تک عہدے پر فائز رہے گا۔

(ب) سکرٹری جنرل ———

(الف) مرکزی مجلس عاملہ اور مرکزی جماعت عام کے اجلاس بلائے گا۔

(ب) صدر دفتر کا انتظام اور اس کی دیکھ بھال کرے گا۔ اور علاقائی مجالس کی امداد بھی کرے گا ۔

(ج) گلڈ کی طرف سے سرکاری و غیر سرکاری حلقوں سے بات چیت اور معاملات طے کرے گا ۔

(د) جماعت اور مرکزی مجلس عاملہ کی ہدایات کے نافذ ہونے کا ذمہ دار ہوگا ۔

(ہ) علاقائی دفاتر کے کاموں میں ہم آہنگی پیدا کرے گا۔

(و) جماعت کو مرکزی مجلس عاملہ کی منظوری یا نامنظوری کے ساتھ رپورٹ پیش کریگا۔ نامنظوری

کی صورت میں مرکزی مجلس عاملہ کے ہر ایک یا جملہ ارکان کو اپنی نامنظوری مع وجوہ کے تحریری یادداشت رکھنے کا حق ہوگا، اور یہ توضیحات معتمد عام کی رپورٹ کا جزو ہوں گے۔

(ف) مرکزی مجلس منتظمہ اور اجلاس عام کی حیثیت میں کارروائی بھی کر سکے گا۔ اگر کوئی خطرناک صورت حال پیدا ہو جو ایسی کارروائی کا مطالبہ کرتی ہو جس کا وہ ان دفعات کی رُو سے مجاز نہیں ہے جن میں اس کے اختیارات واضح شدہ ہیں۔ بشرطیکہ ایسی کارروائیوں پر مرکزی مجلس منتظمہ اور اگلے اجلاس عام کی توثیق حاصل کرنے پڑے گی۔

(س) اگر کسی علاقائی شاخ کی حدود وحات میں مقیم مرکزی منتظمہ کے ان اراکین کی دو تہائی اکثریت کی تحریری رپورٹ پر سکرٹری جنرل اس نتیجے پر پہونچے کہ اس علاقائی شاخ کی مجلس منتظمہ یا اس علاقے کی ذیلی شاخ کی مجلس منتظمہ یا اس علاقائی شاخ کا کوئی رُکن یا کچھ اراکین مناسب طور سے کام نہیں کر رہے تو وہ اس مقصد کے لئے کہ متعلقہ علاقائی شاخ یا اس علاقے کی ذیلی شاخ متعلقہ کا کام انجام دیا جائے۔ اس پورے علاقے یا ذیلی شاخ کی طرف سے ایسی کوئی بھی کارروائی کر سکتا ہے جو وہ مناسب سمجھے، یہ صورت حال اس وقت تک جاری رکھی جا سکتی ہے جو وہ مناسب سمجھے۔

بشرطیکہ اس دفعہ کے ماتحت سکرٹری جنرل جو کارروائی بھی کرے گا اسے علاقائی شاخ متعلقہ کے اگلے باقاعدہ اجلاس عام کی توثیق حاصل کرنی پڑے گی، اور اگر اجلاس عام نے کسی کارروائی کی توثیق نہ کی تو وہ کارروائی کالعدم قرار پائے گی، اور کارروائی سے پیشتر کی صورت حال کا اعادہ کر دیا جائے گا۔

(ب) خازن ———

(i) گلڈ کا ایک خازن ہوگا جو پاکستان رائٹرز کنونشن ۱۹۵۹ء کے اجلاس عام میں ایک سال کے لئے منتخب ہوگا۔

(ii) پہلے انتخاب کے بعد نئے خازن کا انتخاب اگلے اجلاس عام میں دو سال کے لئے ہوگا، اور مرکزی مجلس عاملہ کے رکنیت سے متعلق تمام شرائط اس معاملے میں بھی اسی طرح لاگو ہوں گی مگر وہ ۲۵ اراکین کے علاوہ منتخب ہوگا۔

(iii) خازن کو مرکزی مجلس عاملہ کے مالی امور کے علاوہ کسی اور معاملے میں رائے دینے کا حق نہ ہوگا۔

(iv) خازن کو مرکزی مجلس عاملہ کے مالی فیصلوں کو رد کرنے کا اختیار نہ ہوگا بلکہ وہ مجلس کی ہدایات کی تعمیل کرے گا۔

(v) خازن اجلاس عام کے سامنے ان امور کی مکمل رپورٹ پیش کرنے کا اہل ہوگا جو اس کے اور مرکزی مجلس عاملہ کے مابین زیر بحث آئیں۔

(vi) ہر سال کے حسابات کی پڑتال کے بعد خازن گلڈ کے مالی امور کی رپورٹ تیار کریگا جو اجلاس

عام کو پیش کی جاسکے۔ اور وہ رپورٹ اجلاس عام فرد کارروائی کے ہمراہ گشت کرائی جائے گی یہ رپورٹ خازن کی تمام وکمال ذمہ داری ہوگی اور اسے مرکزی مجلس عاملہ سے منظوری کی حاجت نہ ہوگی۔

(vii) اگر خازن گلڈ کا ملازم ہے تو

الف: :- اس کی خدمات کی شرائط مرکزی مجلس عاملہ طے کرے گی۔

ب :- وہ زیر نگرانی مجلس عاملہ رہے گا اور اجلاس عام کا ماتحت ہوگا۔ ساتھ ہی حق رائے دہی سے بھی محروم ہوگا۔

ج :- اسے اجلاس عام سے خطاب کرنے کا حق ہوگا۔

(ج) اگزیکٹو سکرٹری ——

(i) پاکستان رائٹرز گلڈ (مرکز) میں ایک اگزیکٹو سکرٹری ہوگا

(ii) اسے سکرٹری جنرل نامزد یا (اگر تنخواہ دار ہو) مقرر کرے گا۔

(iii) اگزیکٹو سکرٹری مرکزی علاقائی اور ذیلی ہر مجلس منتظمہ کا ایک اضافی (ایکس آفیشو) رکن ہوگا مگر اُسے ووٹ دینے کا حق نہیں ہوگا۔

(ب) گلڈ کے تمام انتظامی فرائض سرانجام دے گا اور وہ امور بھی طے کرے گا جن کی ہدایت یا اختیار مرکزی مجلس منتظمہ یا سکریٹری جنرل سے موصول ہو۔

(ج) مرکز علاقوں اور ذیلی شاخوں اور عام اراکین کے مابین رابطہ قائم کرے گا۔

(د) سکرٹری جنرل اور مرکزی مجلس منتظمہ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔

۵ - اجلاس ——

(i) مرکزی مجلس عاملہ کم از کم سال میں دوبار اپنا اجلاس کرے گی مجلس کے عام اجلاس کا نصاب پندرہ اور خصوصی یا ہنگامی اجلاس کا دس ہوگا۔

(ii) معمولاً معتمد عام اجلاس بلائے گا جس کے لئے ایک ماہ قبل اطلاع دی جائے گی تا وقتیکہ اس تعین مدت کی قید تمام ارکان ساقط کر دیں لیکن مجلس کے آٹھ ارکان بھی مجلس کا معمولی اجلاس کر سکتے ہیں

(iii) مجلس کا خصوصی اجلاس معتمد عام یا گلڈ کے ایسے ملازم کو کہ جسے اختیار ہو تحریری اطلاع دے کر بلایا جاسکتا ہے اجلاس کی طلبی کا مقصد بتاتے ہوئے مجلس کے کم از کم آٹھ ارکان اسے طلب کر سکیں گے معتمد اجلاس کی طلبی کی اطلاع ملتے ہی اسے تمام ارکان مجلس تک پہنچائے گا اور ہر رکن کے اطلاع پانے کے ایک ہفتے کے اندر اندر اجلاس منعقد ہوگا۔ ایسے اجلاس میں کوئی اور معاملہ زیر بحث نہ آئے گا۔

(iv) مجلس اپنے اختیارات یا ان میں سے چند ایک اپنے باقی ارکان کی ایک یا زیادہ ذیلی مجالس کو تفویض کر سکے گی یہ ذیلی مجالس مجلس عاملہ کی ہدایات اور ضوابط کے مطابق پوری طرح عمل کریں گی۔

۶۔ جماعت کا مرکزی اجلاس

(i) جماعت کا مرکزی اجلاس مرکز ڈھاکہ یا لاہور میں ہر دو سال کے بعد ہوا کرے گا۔ البتہ جماعت کا پہلا مرکزی اجلاس یکم فروری ۱۹۵۹ء سے ڈیڑھ سال کے اندر منعقد ہوگا۔

(ii) اجلاس عام میں شریک ہونے والے نئی منتخبہ علاقائی مجالس منتظمہ کے ارکین اور ریٹائر ہونے والی مرکزی مجلس منتظمہ کے اراکین ہوں گے۔

(iii) اس اجلاس کے انعقاد کے لئے دو مہینے پہلے اطلاع دی جائے گی۔

(iv) اس اجلاس میں حسب ذیل اُمور پر غور ہوگا ....

الف :۔ گلڈ کی سالانہ رپورٹ اور فرد حسابات ۔

ب :۔ سال رواں کا میزانیہ

ج :۔ ایسی قرار دادیں جو اس اجلاس کے لئے خاص طور پر تیار کی گئی ہوں اور مرکزی مجلس عاملہ سے منظور شدہ ہوں ۔

(v) یہ اجلاس اپنی کارروائی کے لئے اس وقت اپنا صدر خود ہی منتخب کرے گا۔

(vi) اس اجلاس اور آئندہ ہر اجلاس عام کے لئے نصاب ۲۰ ہوگا۔

(vii) اہم مواقع پر گلڈ کے پچاس بانی ارکان اور پچیس عام ارکان کی دستخطی تحریری طلبی پر معہ اظہار وجوہ سکرٹری جنرل جماعت کا غیر معمولی اجلاس طلب کر سکے گا۔ اس صورت میں تین ہفتے قبل اس کی اطلاع دی جائے گی اور اس اجلاس کی فرد کارروائی ہمراہ ہوگی ۔

۷۔ علاقائی اجلاس ہائے عام

(i) ہر علاقے میں ایک سالانہ اجلاس عام ہوا کرے گا۔

(ii) اس اجلاس کے انعقاد کی اطلاع ارکان کو ایک ماہ قبل دی جائے گی۔

(iii) اس اجلاس، نیز ہر علاقائی اجلاس عام کے لئے اس علاقے کے جملہ ارکان کی ۱/۴ تعداد نصاب ہوگی

(iv) اہم مواقع پر یا علاقے کے کم از کم پچیس ارکان کی دستخطی تحریری طلبی معہ اظہار وجوہ پر مرکزی مجلس عاملہ سے مشورہ کرکے علاقائی معتمد اپنے علاقے کا غیر معمولی اجلاس عام طلب کر سکے گا۔ اس صورت میں اجلاس کی فرد کارروائی کے ساتھ ساتھ تین دن کی واضح اطلاع دی جائیگی۔

(v) یہ اجلاس اپنے انعقاد کے لئے اپنا صدر خود منتخب کرے گا۔

۸۔ پاکستان رائیٹرز کنونشن

گلڈ کے تمام ارکان کا ایک اجتماع ہر پانچ سال میں بالترتیب مرکز ڈھاکہ، لاہور میں بُلایا جائے گا۔

۹۔ مالی سرمایہ

(i) مالی سرمائے کی فراہمی کے لئے حسب ذیل ذرائع ہو سکتے ہیں :۔

(الف) فیس داخلہ۔

(ب) سالانہ یا ماہوار چندے۔

(ج) قرضے

(د) سرکاری و غیر سرکاری عطیات، اعانتیں، اور تعاون جو قطعی غیر مشروط ہوں سوائے ان شرائط کے جو حسابات اور ان کی پڑتال کے متعلق عائد کر دئے ا اور کسی بیرونی ملک کے سرکاری یا غیر سرکاری حلقے یا کسی غیر ملکی شخص سے حاصل نہ ہوئے ہوں۔

(ہ) کاروبار جو اشتراک باہمی کے عام اصولوں پر مبنی ہو۔

(و) ثقافتی تقریبات اور ادبی محافل

(ii) محفوظ سرمایہ —— پچھلے سال کے دوران میں جمع شدہ چندے کی مجموعی رقم کا دسواں حصہ گلڈ کے محفوظ سرمائے میں جمع ہوگا۔

(iii) پڑتال اور حسابات —— گلڈ کے حسابات تجارتی طریقوں پر رکھے جائیں گے۔ ہر سال ۳۰ جون کو واصلباتی اور متعلقہ نقشے تیار کئے جائیں گے جو مع رپورٹ محاسب اور اجلاس عام کی فرد کارروائی کے، ارکان کو بھیجے جائیں گے۔ گلڈ اور علاقائی سرمایوں کے جملہ حسابات شیڈولڈ بنکوں کے ذریعے چلائے جائیں گے۔

(iii) (الف) ترمیمی اجازت :- ۶۰-۱۹۵۹ء کے حسابات کے گوشواروں میں حکومت پاکستان کے اس فیصلے کی روشنی میں جس کے سبب مالی سال بدل دیا گیا ہے ضروری ترمیمات کر دی جائیں گی اور گوشوارے مجلس منتظمہ کی اگلی نشست میں پیش کر دئے جائیں گے۔

(iv) جمع شدہ سرمائے کو مرکزی مجلس عاملہ کی نگرانی میں خازن کسی شیڈولڈ بنک میں رکھے گا اور مرکزی مجلس عاملہ کی نگرانی میں اس کو مصرف میں لائے گا۔ اس کی پڑتال کرنے کے لئے اجلاس عام کوئی مستقل محاسب مقرر کرے گا۔ لیکن اگر کوئی اجلاس عام چاہے تو کوئی اور مجلس ارکان قائم کر کے اس کو مجاز کر سکتا ہے کہ وہ ان امور پر ایسی پابندیاں لگا دے جو وہ مناسب سمجھیں۔

(v) علاقے کی ضروریات کے لئے وہاں کی شاخ خود سرمایہ فراہم کرے گی۔

(vi) مرکزی حکومت یا کسی اور ذریعے سے حاصل شدہ اعانت، عطیہ وغیرہ اس تناسب سے علاقائی شاخ میں تقسیم ہوگا۔

۳۵ فیصدی برائے علاقہ ڈھاکہ۔ ۳۵ فیصدی برائے علاقہ لاہور۔ ۱۵ فیصدی برائے علاقہ کراچی
۱۵ فیصدی برائے مرکزی دفتر (جہاں بھی وہ واقع ہو)

(vii) علاقائی شاخیں اپنی صوابدید کے مطابق مرکزی سرمائے میں جتنی رقم مناسب سمجھیں جمع کرا سکیں گی مگر مرکزی مجلس عاملہ تمام مرکزی رقوم کو بطریق بالا تقسیم کرے گی۔

۱۰۔ مرکز کا اخراج ——

(ا) صرف اجلاس عام ہی کسی رکن کو خارج کر سکے گا جس کی یہ صورت ہوگی . . . .

(الف) گلڈ کے کوئی دس ارکان متعلقہ علاقائی مجلس کو تحریری طور پر کسی رکن کے اخراج کیلئے نوٹس کی شکل میں تجویز پیش کریں گے اور وہ اس کو مرکزی مجلس عاملہ کو ارسال کرے گی تاکہ فرد کارروائی کے ساتھ اسے گشت کرایا جائے اور اس نوٹس کے ہمراہ مجوزہ اخراج کی وجوہ پر مشتمل ایک بیان بھی ہو، نیز اس رکن کا بیان بھی جس کا اخراج زیر تجویز ہو اور یہ بیان علاقائی مجلس تجویز اخراج کا نوٹس موصول ہونے کے ایک ماہ کے اندر اندر اس رکن سے حاصل کرے گی ایسے رکن کو اجلاس عام کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع بھی دیا جائے گا۔

(ب) اس تجویز پر غور کرنے کے بعد ۲/۳ کی اکثریت سے اجلاس عام کسی رکن کو ایک معینہ مدت کے لئے خارج کر سکے گا بشرطیکہ ایسے اجلاس کا نصاب جماعت عام کے ۲/۳ سے کم نہ ہو۔

(ج) اس طرح خارج شدہ رکن معینہ مدت گزر جانے کے بعد دوبارہ رکنیت کا اہل ہوگا۔

(د) ایک رکن کا اخراج عمل میں آسکتا ہے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے گلڈ کے اغراض یا دستور کی خلاف ورزی کی ہے یا اس پر بری روش ([illegible]) کا الزام ہو۔

۱۱۔ دفعات اشتراک میں ترمیم

پاکستان رائٹرز گلڈ کی دفعات اشتراک میں حسب ذیل طریق پر ترمیم ہو سکے گی . . . .

(الف) اجلاس عام کی تاریخ کا اعلان ہو جانے کے بعد مرکزی مجلس عاملہ کو باقاعدہ دستخطی اور تائید شدہ ترمیمات بھیجی جائیں تاکہ فرد کارروائی کے ساتھ تمام ارکان میں گشت کرائی جائے۔

(ب) جماعت عام کے اجلاس میں امور اشتراک کی مجوزہ ترمیمات پر غور ہوگا اور ۲/۳ کی اکثریت سے منظور کی جائیں گی۔

۱۲۔ جماعت کا ختم ہونا

(الف) خاتمہ خصوصی۔ اگر کچھ اسباب کی بنا پر یکم فروری ۱۹۵۹ء سے ڈیڑھ سال کے اندر اندر متعلقہ دفعات کے مطابق اجلاس عام نہ بلایا گیا تو یہ گلڈ کالعدم سمجھی جائے گی اور اس کا اثاثہ (اگر کچھ ہے) قانون کے مطابق خود بخود قانون کے ماتحت ذی اختیار عمال کو منتقل ہو جائے گا۔

(ب) خاتمہ عمومی۔ ایک اجلاس عام اپنے حاضر اراکین کی تین چوتھائی اکثریت کے ووٹوں سے گلڈ کے خاتمہ کا حکم دے سکتا ہے اور اپنی صوابدید اور رجسٹریشن کے قانون کے مطابق گلڈ کے اثاثوں کے استعمال کے بارے میں بھی فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن گلڈ کو ختم کرنے کی رسمی تجویز پر گلڈ کے جملہ اراکین کی ۱/۵ تعداد (پانچویں حصے) کے دستخط ہوں گے، اور یہ تجویز تحریری طور پر مرکزی مجلس عاملہ کو [illegible] اجلاس عام سے تین ہفتہ قبل بھیجی جائے گی [illegible]

صدر مملکت کے ذاتی وظائف

سنہ ۱۹۵۹ء — سنہ ۱۹۶۰ء

نام	وظیفہ		
بیگم ساحر صدیقی مرحوم	۱۵۰/-	روپیہ	ماہوار
بیگم احمد ریاض مرحوم	۱۵۰/-	"	"
خاندان حیدر دہلوی مرحوم	۲۰۰/-	"	"
مولانا سالک مرحوم	۵۰۰/-	"	"
قابل اجمیری (۵۰۰ روپیہ نقد) علاج کے لئے	۱۰۰/-	"	"
عبدالکریم گدائی	۱۰۰/-	"	"
مولانا شیدائی	۱۰۰/-	"	"
مولانا صدیق حسن بن مولانا شرر مرحوم	۱۰۰/-	"	"
روشن یزدانی	۱۵۰/-	"	"
فضل الحق سل بری	۱۰۰/-	"	"
حاجی لق لق	۱۰۰/-	"	"

یہ وظائف وزارت تعلیم کے ان مستقل وظائف کے علاوہ ہیں جو وہ مشاہیر ادباء اور ان کے خاندانوں کو اپنی صوابدید کے مطابق دیتی ہے۔

آدم جی ادبی انعام

(نئے قواعد)

(ان قواعد میں انعامات کا اعلان ہونے سے قبل کسی بھی وقت کسی بھی قسم کی ترمیم یا تبدیلی شریک ہونے والوں کو پیشگی اطلاع دیئے بغیر کی جا سکتی ہے)۔

۱۔ نام ——— اس انعام کا نام آدم جی ادبی انعام ہوگا۔

۲۔ تقسیم ——— یہ انعام خانوادہ آدم جی کی جانب سے ادارہ مصنفین پاکستان (مرکز) کے توسط سے تقسیم ہوگا۔

۳۔ رقم ——— انعام کی رقم دس ہزار روپے نقد اردو کی بہترین طبعزاد شائع شدہ ادبی کتاب پر، اور دس ہزار بنگلہ کی بہترین طبعزاد شائع شدہ ادبی کتاب پر دی جائے گی۔ یہ رقم نظم اور نثر میں مساوی طور پر دی جا سکتی ہے۔ کسی دوسری صورت میں نہیں۔

۴۔ دائرہ ——— مندرجہ ذیل اصناف ادب میں طبعزاد تخلیقی کتابیں انعام کی مستحق ہو سکتی ہیں۔
شاعری۔ ناول۔ ڈراما۔ غیر افسانوی نثر۔ ادبی تنقید۔ سفرنامہ۔ سوانح حیات۔ انتخابات۔ ماخوذ، تراجم اور تلخیص وغیرہ مستحق نہ ہوں گے۔

۵۔ استحقاق ——— انعام میں شامل کی جانے والی کتاب کے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ وہ پاکستانی شہریت کے قانون کی رو سے پاکستان کا شہری ہو یا شہری بن چکا ہو۔ مصنف کے لئے ادارہ مصنفین پاکستان

کارکن ہونا ضروری نہیں ہے۔ مرحوم ادیبوں کی تخلیقات بھی بھیجی جاسکتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ سال متعلقہ میں شائع ہوئی ہوں۔

۶۔ میعاد ——— کسی بھی سال میں اگست سے جولائی کے دوران پاکستان میں پہلی بار شائع شدہ (پہلا ایڈیشن) کتاب جو مرکزی دفتر میں اس سال ۳۱ر جولائی تک موصول ہو جائے گی اس پر انعام کے لیے غور کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ حدود ——— انعام میں بھیجی ہوئی کتاب آئندہ کسی سال کے لئے انعام کی مستحق نہیں ہوگی۔

۸۔ طریق کار ——— ہر سال ۳۱ر جولائی تک کتاب کی پانچ جلدیں ادارۂ مصنفین پاکستان کے مرکزی دفتر میں (حال واقع ۴۰۔ ہوٹل ایکسلسیر، سانورا ئیٹی روڈ۔ صدر۔ کراچی) بمعہ مقررہ فارم بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ پہنچ جانی چاہئیں۔ یہ کتابیں واپس نہیں کی جائیں گی۔

۹۔ مصنف کی رضامندی ——— پاکستان کا ہر شہری کسی بھی مستحق کتاب کو (اس کے مصنف کی طرف سے اطمینان کے بعد کہ وہ انعام قبول کرے گا) غور کے لئے بھیج سکتا ہے۔

۱۰۔ تاریخ اعلان ——— ۷ر اکتوبر۔ ہر سال

۱۱۔ متوفی کو انعام ——— اگر انعام کے اعلان سے پہلے کسی مصنف کا انتقال ہو جائے تو یہ انعام غائبانہ اس کے قانونی ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

۱۲۔ ممنوعات ——— جج۔ ممبر سکریٹری ادارے کے سکریٹری جنرل اور ان کے خاندان کے اراکین کی تخلیقات اس انعام کے سلسلہ میں غور کئے جانے سے محروم رہیں گی۔

۱۳۔ ججوں کی کمیٹی ——— ہر زبان کے ججوں کی کمیٹی میں پانچ جج ہوں گے۔ مستقل جج یہ ہیں۔

(۱)۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق — اردو کے لئے

(۲)۔ ڈاکٹر محمد شہید اللہ — بنگلہ کے لئے

(۳)۔ جمیل الدین عالی — ممبر سکریٹری

(ب)۔ بقیہ چار ججوں میں سے تین ججوں کا تقرر سکریٹری جنرل کرے گا۔ اور ایک کا تقرر خالزادہ آدم جی کرے گا۔

(ج)۔ ججوں کے کام یا تقسیم انعامات یا انعام کے بارے میں یا کسی بھی متعلقہ امر کے سلسلے میں کسی جھگڑے کی صورت حال پیدا ہونے پر ادارہ۔ بغیر کسی کو اطلاع دیئے ہوئے کسی بھی قسم کے فیصلے کرنے کا مجاز ہے۔

۱۴۔ مقررہ فارم ——— جوابی ٹکٹ والے لفافے کی وصولی کی صورت میں ادارۂ مصنفین پاکستان کے مرکزی یا علاقائی دفتر سے مقررہ فارم بھیجے جا سکتے ہیں۔

چند اہم ادبی انعامات

انعامات		ممالک
نوبل پرائز	---	سویڈن
پریمیو مارگٹا	---	اطالیہ
پریمیو ویریزیو	---	״
نیویارک ہیرالڈ ٹریبیون چلڈرین اسپرنگ بک فیسٹیول ایوارڈ	---	ریاستہائے متحدہ امریکہ
پرائڈ آف پرفارمینس۔ سرکاری سالانہ انعام جو قابل قدر سائنسدانوں فنکاروں اور محققوں کو دیا جاتا ہے	---	پاکستان
پلیٹزر پرائزز ان لیٹرز	---	ریاستہائے متحدہ امریکہ
ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ	---	ہندوستان
پرائز گنکورٹ	---	فرانس
پرائز انٹریل	---	״
شیلر۔ گیڈیکٹنیس پریز ڈیس لینڈیس باڈین وورٹمبرگ	---	جرمنی
سر اسرائیل گولینکز پرائز	---	برطانیہ
سر راجر نیوڈیگیٹ پرائز فار انگلش ورس	---	״
ولیم فوئیل پویٹری پرائز	---	״
اور		
آدم جی ادبی انعام	---	پاکستان

مرکز کے اعلانات

جو

ہم قلم کے پچھلے شماروں میں شائع

ہوئے

ترجموں کا پروگرام

رائٹرز گلڈ کے مرکزی دفتر نے ان ترجموں کی شرح بیس روپے فی ہزار الفاظ تجویز کی ہے جو پاکستان کی کسی قومی یا علاقائی زبان سے اُردو یا بنگالی میں کئے جائیں گے۔ جو حضرات ترجمے سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ گلڈ کو اپنے کوائف حسب ذیل صورت میں بھیجیں۔

(۱) کارکن کا نام و پتہ
(۲) کس زبان میں ترجمہ کر سکتے ہیں
(۳) کس زبان سے ترجمہ کر سکتے ہیں
(۴) اب تک کون کون سے تراجم شائع کر چکے ہیں

یہ معلومات دفتر میں رہیں گی اور بوقت ضرورت ان سے رجوع کیا جائے گا۔

لاہور میں گلڈ ہاؤس

پاکستان: رائٹرز گلڈ (مرکز) نے حکومت پاکستان سے تقریباً چار لاکھ روپے میں ایک وسیع اور عمدہ عمارت حاصل کرنے کا انتظام کیا ہے۔ اس عمارت میں گلڈ کی لائبریری شعبہ تحقیق، شعبہ تالیف، شعبہ مصنفین، شعبہ مترجمین، اشاعت گھر کے دفاتر وغیرہ قائم کئے جائیں گے۔ گلڈ ہاؤس میں گلڈ اور دیگر ادبی اداروں کے جلسے بھی منعقد ہوا کریں گے۔ لاہور میں گلڈ ہاؤس کا قیام گلڈ کے پروگرام کے مطابق اکیڈمی آف لیٹرز کے قیام کا آغاز ہے۔ اس عمارت کا قبضہ چند ہفتوں میں مل جائے گا۔

امید ہے کہ بہت جلد کراچی اور ڈھاکہ میں بھی عمارات حاصل کر لی جائیں گی۔

مصالحت کی مہلت

مرکز کے سابق فیصلے اور اعلان کے مطابق اس ماہ سے ہم قلم میں ان ناشرین کے نام شائع ہونے تھے جن کے خلاف مصنفین نے شکایات داخل کی ہیں اور جن کے خلاف مرکز کی کارروائی کا آغاز ہو چکا ہے۔

اس اثنا میں چند ناشرین نے مرکز سے رجوع کیا ہے کہ انھیں ذاتی افہام و تفہیم کا موقع دیا جائے تاکہ ان کا نقطۂ نظر بھی تفصیلی طور پر واضح ہو جائے۔ ہماری ایک علاقائی شاخ (لاہور) نے بھی سفارش کی ہے کہ ناموں کے اعلان کو اسی سبب سے کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ ناشرین کی ایک انجمن اس ماہ بنی ہے اور اس کی منتظمہ کے اراکین نے بھی ہمیں یہی مشورہ دیا ہے۔ مرکز کا پہلا مقصد ان ادیبوں کے حقوق کا تحفظ ہے جن کے ساتھ ناشرین نے ناانصافی کی ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مرکز عدالتی کارروائی کرنے سے پہلے ہر وہ جائز کارروائی کرنے پر تیار رہے جس کا مشورہ کسی جماعت کی طرف سے بھی دیا جائے۔ مرکز کا بنیادی فرض یہی ہے کہ مصنفین اور ناشرین کے تعلقات خوشگوار

رین اور تخلیقی ادب کی اشاعت میں اضافہ ہو۔ چنانچہ اس اقدام اور تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے مرکز نے فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال تا مرون کی اشاعت روک دی جائے اور مجوزہ مصالحت کے امکانات کا پورا پورا جائزہ لیا جائے۔ بہذا طے کیا گیا ہے کہ کراچی اور لاہور کے قضیئے دونوں علاقوں کے نظما کو سونپ دیئے جائیں تاکہ متعلقہ ناشرین ان سے گفت و شنید کر سکیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ناشرین اس مصالحانہ فیصلے کا خیر مقدم کریں گے۔ اور ہمارے علاقائی سکریٹریوں سے تعاون کریں گے۔ اس مقصد کے لئے ہم نے ایک ماہ کی مدت مقرر کی ہے جس کے بعد ان عہدہ داران کی رپورٹ پر مرکز آئندہ لائحہ عمل کا فیصلہ کرے گا۔ ہم نے سکریٹریوں سے درخواست کی ہے کہ وہ انفرادی طور پر بھی ناشرین متعلقہ کو اس فیصلے کی اطلاع دیدیں جس کے بعد ناشرین متعلقہ کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ ان سے گفت و شنید کا آغاز کریں۔

وعدہ خلاف ناشرین کے لئے مرکز کا اہم فیصلہ

نومبر کے "ہم قلم" اور رائٹرز گلڈ کی دوسری مطبوعات میں ان ناشرین کی فہرست جلی حرفوں میں چھاپی جائے گی جن کے خلاف ہمارے اراکین یا غیر اراکین مصنفین نے شکایات داخل کر دی ہیں یا جن کی شکایات موصول ہوں گی ان کے نام کے آگے شکایات کی مختصر روداد بھی ہوگی ناشرین متعلقہ کو چاہیئے کہ ۱۵ اکتوبر تک مصنفین سے مناسب سمجھوتے کر لیں اور ان سے مرکزی دفتر کو لکھوا دیں کہ قضیہ طے ہو گیا۔ جو ناشرین اس اعلان کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہیں گے یا اپنی دولت کے بل پر قانونی چارہ جوئی کی طوالت کا سہارا لیں گے وہ نہ ادب کی خدمت کریں گے نہ ادیب کی۔ گلڈ ان سے ہر طرح مقابلہ کرے گا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ناشرین مصنفین سے شریفانہ سمجھوتوں پر آمادہ ہو جائیں اس طرح وہ ادب اور ملک کی صحیح خدمت کر سکیں گے اور ہمارا ادارہ خاص طور پر ان کا ممنون ہوگا۔

اُدیبوں کے پتے اور حالات

مرکز کا اعلان

بہت سے قارئین کو مشہور ادیبوں کے پتے درکار ہوتے ہیں۔ گلڈ کا مرکزی دفتر آپ کو پاکستان کے تقریباً تمام مشہور ادیبوں کے پتے بھیج سکتا ہے۔ صرف مرکزی دفتر کو پوسٹ کارڈ لکھ دیجئے۔

جن اداروں اور ادبی رسالوں کو ادیبوں کے حالات درکار ہوں وہ گلڈ کے مرکزی دفتر سے خط و کتابت کریں۔ اس سلسلے میں ان سے پورا تعاون کیا جائے گا۔ اور اگر ضروری ہوا تو ادیبوں سے رابطہ بھی قائم کر دیا جائے گا۔

بیمہ پالیسی

سالانہ مرکزی اجلاس کے حکم سے پرانی بیمہ پالیسی ختم کر دی گئی ہے کیونکہ اس میں پریمیم واپس ملنے کا قاعدہ نہیں تھا اور نئی پالیسی وضع کی جا رہی ہے۔ جب تک نیا نظام نہ ہو مرکز سب اراکین کو بغیر کسی چندے کے ایک ہزار روپیہ کی فوری امداد کی حد تک بیمہ شدہ سمجھتا ہے۔ نئی پالیسی کے متعلق بہت جلد اراکین کو مطلع کیا جائے گا لیکن کسی صورت میں شرح پریمیم پانچ روپے ماہوار سے زیادہ نہیں ہوگی نہ طبی سرٹیفکٹ کی ضرورت ہوگی۔ جو اراکین پریمیم بھیجتے جا رہے ہیں مرکزی خازن کو بھیجتے رہیں۔ رقم نئی پالیسی کے حساب میں جمع ہوتی رہے گی

اُردو ادب ــــ دوسری زبانوں میں

یہ سب جانتے ہیں کہ پاکستانی زبانوں نے بین الاقوامی ادب میں ابھی تک قابل ذکر مقام حاصل نہیں کیا ہے ۔ اس کے جملہ اسباب میں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے ادب کے ترجمے غیر ملکی زبانوں میں کافی تعداد میں نہیں کئے گئے ۔ پُرانے مستشرقین تحقیقی کام زیادہ کرتے تھے اور نئے مستشرقین اور اشاعتی ادارے عام طور پر سیاسی مفادات ملحوظ رکھتے ہیں ۔

گلڈ نے چند غیر ملکی ایجنسیوں سے رابطہ قائم کیا ہے جن کے جوابات حوصلہ افزا ہیں ۔ خاص طور پر چند عرب ممالک کے ناشرین اور ادیب پاکستانی ادب میں کافی دلچسپی لینے پر تیار ہیں ۔ بشرطیکہ انھیں عمدہ کتابوں کے عمدہ ترجمے مہیا کئے جائیں ۔

یہ ایک طویل المیعاد منصوبہ ہے لیکن اس پر عمل کرنے میں تاخیر مناسب نہیں ۔ ہم ان سب اراکین اور غیر اراکین سے جو کوئی سی غیر ملکی زبان اچھی طرح جانتے ہوں درخواست کرتے ہیں کہ وہ موجودہ پاکستانی ادب پر مشتمل اپنے تراجم ہمیں بھیجیں ۔ یہ تراجم ٹائپ شدہ ہوں ہم انھیں متعلقہ ایجنسیوں تک پہنچائیں گے اور اگر انھوں نے ان تراجم کو پسند کیا تو مناسب شرائط پر اشاعت بھی کرا دیں گے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اچھے ادب اور اچھے تراجم کو غیر ملکی ایجنسیوں کی شرکت کے ساتھ گلڈ خود شائع کر دے ۔ ایک افسانے یا ایک نظم کے ترجموں کا معاوضہ طے کرنا نامناسب ہوگا تو ممکن لیکن ان سے پاکستانی ادب کی ترویج میں بڑی مدد ملے گی ۔ ڈراموں ۔ افسانوں نظموں کے مجموعوں اور ناولوں کے ترجموں کی ضرورت زیادہ محسوس کی گئی ہے اور ان کے ترجمے اچھا معاوضہ بھی حاصل کر سکتے ہیں ۔

اراکین سے درخواست

• ہم قلم کے ذریعہ جملہ اراکین سے درخواست کی جاتی ہے کہ اگر وہ کسی علمی یا ادبی نیم سرکاری اداروں سے متعلق ہیں تو وہ اپنے فرائض اور حالات کار کے متعلق تفصیلی طور پر ریجنل سیکریٹری کو مطلع کریں تاکہ ان کی تکالیف اور حقوق کی نگہداشت کے لئے اگر ضروری ہو توجہ جلد کی جاسکے ۔

ایک اعلان

ادارۂ مصنفین پاکستان کے جو اراکین کسی عنوان پر کوئی کتاب تصنیف کر رہے ہوں وہ اپنے زیر تصنیف مسوّدوں کے متعلق ایک تعارفی نوٹ ادارۂ " ہم قلم " کو ارسال کریں ۔ تاکہ انھیں متعارف کرایا جاسکے ۔ اس طرح جہاں پاکستان رائٹرز گلڈ کے علم میں یہ بات رہے گی کہ اراکین کن کن موضوعات پر کام کر رہے ہیں ــــ وہاں ملک کے ناشرین کے علم میں بھی وہ مسوّدات آجائیں گے یہ طریقہ اراکین کی کتابوں کی نشر و اشاعت کے لئے ایک مناسب طریقہ ہوگا اور ان کی تصانیف کے لئے [illegible] ہو سکے گی ۔

آدم جی ادبی انعام کی تقسیم

۲۳ر جنوری سنہ ۱۹۶۱ء کو سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء کا انعام ایک تقریب میں تقسیم کیا جائے گا۔ یہ تقریب کراچی میں منعقد ہوگی۔
معطیوں، ججوں اور انعام یافتگان کے علاوہ شاخ کراچی کی عاملہ، مرکز کے اراکین عاملہ مقیم کراچی تینوں علاقائی شاخوں کے نظما اور دیگر معزز مہمان شرکت کریں گے۔
انعام فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صدر مملکت پاکستان تقسیم فرمائیں گے۔

مصنفین اور ناشرین کے معاملے

مرکز کے علم میں بہت سے ایسے معاملات ہیں جن میں ناشر نے مصنف کے ساتھ صریح ناانصافی کی ہے۔ ہم نے گزشتہ ڈیڑھ برس میں اراکین متعلقہ کے ایما پر ان ناشرین کے خلاف ضروری کارروائی بھی کی ہے اور چند معاملات میں ہمیں کامیابی بھی ہوئی ہے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ مصنفین معاہدے کرتے وقت اپنی ضروریات سے مجبور ہو کر یا ناواقفیت کی بنا پر ناشرین سے عجیب و غریب، بے معنی اور غیر قانونی معاہدے کر بیٹھتے ہیں جن کے سبب بعد میں کامیاب قانونی کارروائی ممکن نہیں رہتی اور صرف اخلاقی اپیل کا سہارا رہ جاتا ہے۔

گلڈ ایسے معاملات میں اخلاقی اپیل سے تو کام لیتا ہی ہے اور اب کہ کراچی، لاہور اور ڈھاکہ سے اس کے پرچے بھی جاری ہو رہے ہیں وہ ان حضرات کے اعمال کی جلد تفصیلات کی اشاعت بھی کیا کرے گا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ ضروری ہے کہ قانونی پیچیدگیوں کے پیش نظر مصنفین معاہدے کرتے وقت گلڈ سے مشورہ لے لیا کریں۔ مرکزی دفتر کو بہترین قانونی مشیروں کے مشورے اور خدمات حاصل ہیں اور ہم ہر مصنف کے معاہدے کا مسودہ بلا معاوضہ تیار کرا سکتے ہیں۔ یہ بات مصنفین کے اپنے فائدے کی ہے۔

آئندہ سے مصنفین مرکزی دفتر کو اپنے معاہدے کی شرائط اور دوسرے ضروری امور لکھ دیا کریں ہم انھیں "مسودہ معاہدہ" صرف دس دن میں بھیج دیا کریں گے۔

مصنفین تیار کردہ معاہدے بھی نظر ثانی یا اہم نکات پر قانونی مشورے کے لئے ہمیں بھیج سکتے ہیں۔ کسی قسم کا قانونی مشورہ دینے کی کوئی فیس وصول نہیں کی جائے گی۔

امید ہے کہ یہ طریقہ ان ناشرین کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا جو مصنفین سے شکایات رکھتے ہیں۔
یہ بلا معاوضہ خدمات جو پاکستانی مصنفین کے لئے ہیں خواہ وہ گلڈ کے رکن ہوں یا نہ ہوں صرف عدالتی کارروائی کے لئے مصنف کو گلڈ کا رکن ہونا ضروری ہے تاکہ گلڈ کو عدالتی قانونی نمائندگی حاصل ہو جائے۔

آدم جی ادبی انعام کے چند اہم قواعد

انعام دس ہزار روپے کا ہوگا - اگر دس ہزار کا انعام ایک کی بجائے دو کتابوں کو دینے کا فیصلہ کیا گیا تو لازماً ایک کتاب نثر کی اور ایک نظم کی ہوگی - انعام نثر کی دو کتابوں یا شاعری کے دو مجموعوں میں تقسیم نہیں کیا جائے گا -

ضوابط مختصراً حسب ذیل ہیں -

- انعام کے لئے صرف طبعزاد کتابوں پر غور کیا جائے گا - اگر کوئی کتاب کسی زبان کے کسی اور فن پارے سے ترجمہ یا ماخوذ ہے تو انعام کے لئے زیر غور نہیں آئے گی - طبعزاد کتابوں میں ناول، مختصر افسانہ، ڈرامہ، شاعری، ادبی تنقید سفرنامے اور سوانح سب شامل ہیں،
- کتاب کے مصنف کا پاکستانی شہریت کے قانون کی رو سے پاکستان کا شہری ہونا ضروری ہے - پاکستان رائٹرز گلڈ کا ممبر ہونے کی شرط نہیں ہے - مصنف کے لئے ضروری نہیں کہ اپنی کتاب خود بھیجے - پاکستان کا کوئی بھی شہری کتابیں بھیج سکتا ہے جو اگست اور جولائی کے درمیان شائع ہوئی ہوں
- انعام کا اعلان، ہر اکتوبر کو کیا جائے گا - کتاب کا پہلا ایڈیشن اس سال کی ۳۱ر جولائی کو ختم ہونے والے سال میں شائع ہونا چاہیئے - اور کتاب کی پانچ جلدیں بذریعہ رجسٹری یا ذاتی طور پر گلڈ کے مرکزی دفتر ۲۰ - ہوٹل ایکسلسیر - صدر کراچی، میں پہنچانی ضروری ہیں -
- مرحوم مصنفین کی کتابیں بھی شامل کی جا سکتی ہیں بشرطیکہ سال متعلقہ میں پہلی بار شائع ہوئی ہوں - کتابیں بھیجنے کے ساتھ کوئی فیس ضروری نہیں ہے -
- جملہ ضوابط اور فارم داخلہ گلڈ کے مرکزی یا علاقائی دفتر سے حاصل کئے جا سکتے ہیں - فارم بغیر قیمت دیا جائے گا - فارم کے بغیر کوئی کتاب وصول نہیں کی جائے گی -

کیا آپ کی حق تلفی ہوئی ہے؟

گلڈ نے متعدد قراردادوں اور ملکی صحافت کی امداد سے حکومت کو کاپی رائٹ قانون پر از سر نو غور و خوض کے لئے آمادہ کرلیا ہے اور اب حکومت نے ایک کمیٹی کی تشکیل کردی ہے جو اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔ اس کمیٹی میں گلڈ کا ایک نمائندہ شامل کرلیا گیا ہے۔ گلڈ کے پاس حکومت کے سامنے اپنے موقف کی وضاحت کرنے کے لئے کافی حقائق اور تجاویز موجود ہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل معاملات کی تفصیلات بھی حکومت کے سامنے پیش کی جائیں۔

۱۔ ایسے کیس جن میں بھارتی ناشرین نے پاکستانی مصنفین کی حق تلفی کی ہے۔

۲۔ ایسے کیس جن میں پاکستانی ناشرین نے بھارتی مصنفین کی حق تلفی کی ہے۔

۳۔ ایسے کیس جن میں مشہور مصنفین کے نام سے فرضی کتابیں جو ان کی تصنیف نہیں چھاپ دی گئی ہیں۔ ایسے کیس بہت ہوئے ہیں لیکن ہمیں ان کی جملہ تفصیلات درکار ہیں ہم متعلقہ مصنفین اُن کے ناشرین، احباب اور دوسرے ہمدرد دوستوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں بہت جلد ضروری تفصیلات سے آگاہ کریں۔ ہم پاکستان اور ہندوستان کے جملہ ادبی اداروں سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس معاملہ میں ہم سے تعاون کریں۔ یہ مسئلہ سب کا مسئلہ ہے لہذا سب کو اپنے تمام وسائل یکجا کرکے کام کرنا چاہیئے۔

گلڈ کے انعاماتِ سالگرہ

پاکستان رائٹرز گلڈ (مرکز) نے سال آئندہ سے ہر ۳۱ جنوری کو دس ادبی انعامات دینے کا اعلان کیا ہے۔ ہر انعام کی رقم ایک ہزار روپیہ ہوگی۔ یہ انعامات اُردو اور بنگلہ کی حسب ذیل اصناف ادب کی بہترین تخلیقات پر دیئے جائیں گے۔

(۱) شاعری (۲) افسانہ۔ طویل افسانہ۔ رپورتاژ (۳) یک بابی ڈرامہ (۴) تنقیدی مضمون (۵) مزاح (نظم یا نثر)

پہلے سال کے انعام کے لئے دسمبر ۶۰ء سے نومبر ۶۱ء تک کی مدت میں شائع شدہ تخلیقات پر غور کیا جائے گا اور انعام کا اعلان ۳۱ جنوری ۶۲ء کو ہوگا۔

یہ انعامات گلڈ کے سالانہ انعاماتِ سالگرہ کہلائیں گے۔

علاقائی زبانوں کے ادب کی ترقی اور حوصلہ افزائی کے لئے گلڈ کی طرف سے انعامات کا سلسلہ جاری کرنے کا اعلان عنقریب کیا جائے گا

جناب عالی!

آپ ایک بڑے ملک کے وزیر اعظم اور ایک بے حد مصروف انسان ہیں لیکن آپ ایک مشہور و معروف مصنف بھی ہیں اگرچہ پیشہ ور [ادیبوں] سے آپ کا ذاتی تعلق نہیں لیکن جماعتی حیثیت سے ضرور ہے۔

ہمارے ملک میں ہندوستانی ادیبوں کی کتابیں ان کی اجازت کے بغیر شائع ہوتی رہی ہیں بلکہ یہ بھی ہوا ہے کہ فرضی کتابوں پر بھی ان کے نام دیئے گئے ہیں۔ ہمیں اس پر ندامت ہے۔ ہمارا پورا ملک، پوری قوم، پورا معاشرہ چند افراد کے اس جرم پر خلش محسوس کرتا ہے لیکن ہم نے پوری قوت سے اس جرم کا سد باب شروع کر دیا ہے۔

شاید آپ نے سنا ہو کہ کرشن چندر کے نام پر جعلی کتابیں چھاپنے والے ناشروں کے خلاف خود گورنر مغربی پاکستان کے حکم پر کارروائی شروع ہو گئی ہے۔ اب ہمیں امید ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے جرائم ختم ہو جائیں گے۔

لیکن جو کچھ یہاں ہوا ہے وہی ہندوستان میں بھی ہوا ہے۔ ہمارے مشاہیر کی قیمتی تصنیفات کو ان کی اور ان کے وارثوں کی اجازت [بغیر] شائع کر دیا گیا ہے اور ان کے نام سے فرضی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔

آپ کو یہ بتانا کہ تہذیبی ڈاکے کے نقصانات کیا کیا ہیں سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ یہ نقصان صرف مصنفین یا ان کے ورثا کو مالی خسارے [کے] طور پر ہی نہیں پہنچتا بلکہ ایکسپلوری تہذیب ایک پوری قوم کی بدنامی کی شکل میں بھی واقع ہوتا ہے۔

افسوس کہ اب تک آپ کے یہاں کوئی ایسی کارروائی نہیں ہوئی جس سے پاکستانی مصنفین اور ان کے ورثا کی داد رسی ہو سکے۔

اس مسئلہ کا حتمی حل تو یہ ہے کہ آپ کی حکومت اور حکومت پاکستان کاپی رائٹ پر ایک معاہدہ کرے اور اس پر عمل بھی کرے لیکن ایک [فوری] حل یہ بھی ہے کہ جعل سازوں اور بد دیانتوں کے خلاف تعزیرات ہند کے تحت فوری کارروائی کی جائے۔ جیسا کہ [یہاں] ہو رہا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ دلی، بمبئی، لکھنؤ، حیدرآباد، کلکتہ وغیرہ میں علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، شوکت تھانوی اور دوسرے مصنفین کی جملہ کتب ہندوستان میں ناجائز طور پر شائع ہو کر نہایت سستی بک رہی ہیں۔ ہم مثالوں سے آپ [کا] وقت ضائع نہیں کریں گے۔ صرف آپ کی ادنیٰ سی توجہ ہزارہا ایسے معاملات کا انکشاف کرا سکے گی۔

ہم پاکستانی ادیبوں کا ایک ادارہ ہیں جو ہندوستانی ادیبوں کے لئے نہایت مخلصانہ جذبات رکھتا ہے اور چونکہ ان میں آپ [بھی] شامل ہیں اس لئے آپ سے توقع رکھتا ہے کہ آپ اس معاملے سے ذاتی طور پر دلچسپی لیں گے۔ یہ آپ کے لئے ایک چھوٹی سی بات ہوگی لیکن ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔

FOR
YOUTHFUL LOOK
AND FLATTERING
OUTLINE

Fateh
SILKRON
AND
SILKOTEX

FATEH Textile Mills Limite

زیرنگرانی

آدم جی انڈسٹریز لمیٹیڈ

کراچی

دیہاتی بھائیوں کے لئے
رس اور گڑ
بیکو کی گنا پیلنے والی مشین عمدگی سے یہ کام سرانجام دیتی ہے۔
ہمارے گاؤں کے لوگ گنے کی فصل کے شیدائی
ہیں۔ گنے سے انہیں وہ پُرلطف رس حاصل ہوتا ہے
جو دیہاتی زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ اسی رس
سے مقوی مزیدار گڑ بنتا ہے جو دیہاتیوں کا من
بھاتا کھاجا ہے۔ بیکو گنا پیلنے کی مشینیں کثیر
مقدار میں تیار ہوتی ہے۔ یہ مشینیں کم سے کم وقت میں زیادہ
سے زیادہ گنا پیل سکتی ہیں۔
بیکو کی گنا پیلنے کی مشینیں بیلوں سے یا بجلی سے چل سکتی ہیں۔
BECO
بیکو پاکستان میں صنعتی ترقی کا نشان ہے۔
دی بٹالہ انجینئرنگ کمپنی پاکستان لمیٹڈ
لاہور حیدرآباد ملتان ڈھاکہ چاٹگانگ لندن
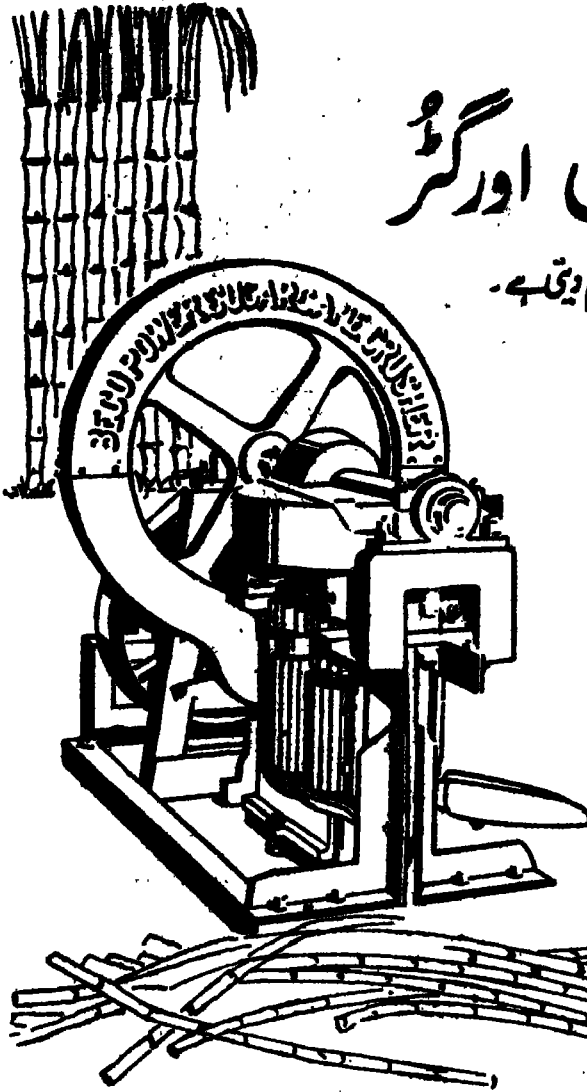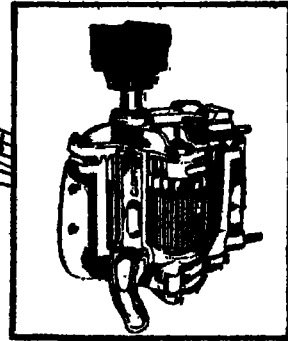
[illegible] بہاولپور لمیٹڈ

[illegible] آفس:- پی آئی ڈی سی ہاؤس - کچہری روڈ - کراچی - نمبر ۲

اکثریت حصص حکومت مغربی پاکستان کے پاس ہے۔
رجسٹرڈ ہیڈ آفس بہاولپور (مغربی پاکستان)

سرمایہ

منظور شدہ	۲۵ لاکھ روپیہ
جاری شدہ	۲۵ لاکھ روپیہ
ادا شدہ	۲۵ لاکھ روپیہ

شاخیں:-

۱	احمد پور شرقیہ	۱۴	کراچی - [illegible]
۲	بہاولپور (ہیڈ آفس)	۱۵	کھوکی
۳	بہاولنگر	۱۶	قصور
۴	چشتیاں	۱۷	خانپور
۵	گوجرانوالہ	۱۸	لاہور
۶	گجرات	۱۹	لیاقت پور
۷	ہارون آباد	۲۰	لائل پور
۸	حاصل پور	۲۱	ملتان
۹	حیدرآباد	۲۲	رحیم یار خان
۱۰	جیکب آباد	۲۳	صادق آباد
۱۱	کراچی - لیاقت بازار	۲۴	سرگودھا
۱۲	کراچی - جوڑیا بازار	۲۵	سکھر
۱۳	کراچی - پی آئی ڈی سی برانچ	۲۶	وزیر آباد

ہر طرح کا بینکنگ کاروبار کیا جاتا ہے۔
انتہائی نفع بخش شرحوں پر رقوم جمع کی جاتی ہیں۔
[illegible]
[illegible] رجوع کریں۔
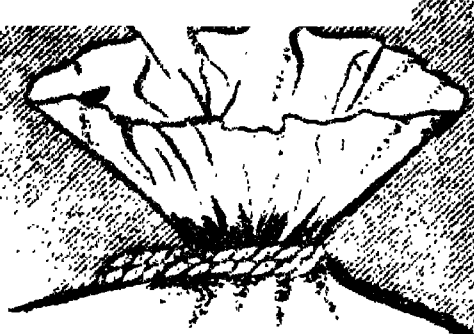
یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ
رجسٹرڈ دفتر: میکلوڈ روڈ، کراچی
منظور شدہ سرمایہ ۲,۰۰,۰۰,۰۰۰ روپے
جاری اور ادا شدہ سرمایہ ۱,۰۰,۰۰,۰۰۰ روپے
زر محفوظ ۵,۰۰,۰۰۰ روپے
زر امانت (۳۰ جون ۱۹۶۰ء تک) ۷,۰۱,۰۰,۰۰۰ روپے
ڈائرکٹرز
حبیب ابراہیم رحمت اللہ (چیئرمین)
محمد سعید سہگل (ڈائرکٹر)
عبدالرزاق دادا (ڈائرکٹر)
میاں ایم یحییٰ (ڈائرکٹر)
محمد بشیر سہگل (ڈائرکٹر)
محمد رفیق سہگل (ڈائرکٹر)
محمد شفیق سہگل (مینجنگ ڈائرکٹر)
آغا حسن عابدی
شاخیں
میکلوڈ روڈ کراچی ● لانڈھی کراچی
صالح محمد اسٹریٹ، کراچی
لائل پور ● شاہ عالم مارکیٹ لاہور
گوجرانوالہ ● ڈھاکہ امام گنج
چٹاگانگ ● ڈھاکہ رمنا
نارائن گنج ● کھلنا ● مانک گنج
باگرہاٹ ● رنگپور ● سکھر
راولپنڈی ● ملتان